فن اور شخصیت
ساحر لدھیانوی
ترتیب:
صابر دت
سرور شفیع

ساحر نمبر کے لئے

نیک خواہشات کے ساتھ

کے۔ ایل۔ نارنگ

(ساقی)

ساحر لدھیانوی نمبر

مدیر اعلیٰ:
صابر دت

مدیرہ
سرور شفیع

موجودہ شمارہ:
۸۰ روپے

بیرون ہند
۲۰ ڈالر

ساحر پبلشنگ ہاؤس
"پرچھائیاں"

رائل ٹریڈ لین، جوہو چرچ، بمبئی ۴۰۰۰۵۴ - فون 572837

○ شمارہ نمبر ۱۷، ۱۸

مارچ ۱۹۸۴ء، ستمبر ۱۹۸۴ء

کتابی شکل میں

○ اشاعت : فروری ۱۹۸۵ء

○ کتابت : عبدالکریم انصاری، کرلا

و دیگر

○ ٹائیٹل کے فوٹوگراف : شاہ علی حیدرآباد

نریندر رسیم جالندھر

○ حُسن کار : اسلم کرتپوری

○ تصاویر بشکریہ انور سلطانہ

○ ڈسٹری بیوٹر :

بیرونِ ہند شمع میگزین، آصف علی روڈ

نئی دہلی

پڑھنے والوں کے نام

ساحر لدھیانوی نمبر "فن اور شخصیت" کا نواں شمارہ ہے۔ اِس شمارے سے پہلے ہم جو نمبر آپ کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں اُن کی ترتیب اس طرح ہے

مہندر ناتھ نمبر
جاں نثار اختر نمبر
کملیشور نمبر
غزل نمبر
آپ بیتی نمبر
فیض احمد فیض نمبر
قتیل شفائی نمبر
نرگس دت نمبر

مہندر ناتھ نمبر سے (جہاں سے فن اور شخصیت نے اپنا سفر شروع کیا تھا) ساحر نمبر تک ہمیں کن کن مراحل سے گذرنا پڑا ہے اس کا ذکر بے سود ہے، کیونکہ ایسا رونا پیٹنا ہر اردو رسالہ کے پہلے صفحہ پر مل جاتا ہے۔ فن اور شخصیت ہندوستان میں اردو کا اپنے مزاج، معیار اور تہذیبی اعتبار کے لحاظ سے منفرد رسالہ ہے۔ اس لئے اس میں اس روایت سے بھی گریز کیا گیا ہے۔

ہم نے اب تک جن شخصیات کے ادبی و سوانحی مطالعے پیش کئے ہیں۔ ان شخصیات کے انتخاب پر اختلاف ممکن ہے۔ لیکن اس اختلاف سے قطع نظر ہم نے اپنے طور پر ہر شخصیت کو مختلف زاویوں سے جانچنے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اِن مطالعوں میں ہمیں شخصیات کے انتخاب کا مجرم ضرور ٹھہرایا جاسکتا

ہے لیکن جانب داری و طرفداری ہمارے مزاج سے بہت دور ہے۔

ترقی پسندوں کی طرح ہم شخصیت پرستی کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں۔

ہم نے فن اور شخصیت کے مطالعوں میں نہ متعصبانہ کردار کشی کی ہے اور نہ تحریکانہ کردار سازی کی ہے۔

یہی وجہ ہے، جہاں ساحر لدھیانوی نمبر میں مہندر ناتھ، کشمیری لال ذاکر، خواجہ احمد عباس اور امرتا پریتم کے توصیفی مضامین ہیں وہاں ندا فاضلی کی بدنام ترین کتاب ملاقاتیں سے "ساحر کے ساتھ ایک ملاقات" جیسی کانٹرو ورشیل تحریروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس شمارہ میں ساحر کے ہم عصر اور ان کے بعد کی نسل کے ادیب و شاعر دونوں ساتھ ساتھ شریک ہیں۔ نئے لوگوں میں ڈاکٹر محمد حسن، عزیز قیسی، جوگندر پال کے مضامین کی معروضیت میں جو توازن ہے ان کے ہم عصروں میں اس کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ سردار جعفری، ظ انصاری وغیرہ ہنوز برسوں پہلے بنی ہوئی رائے کہ ساحر ٹین ایجرس کا شاعر ہے سے ۱۹۸۵ء تک چمٹے ہوئے ہیں۔ ساحر تلخیاں کا مصنف، ریاست کا مترجم، 'ادبِ لطیف'، 'سویرا'، 'شاہراہ' کا مدیر، فلمی نغمہ نگار اور 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' کا شاعر ہوتے ہوئے بھی صرف طالب علموں کا شاعر ہے۔ ایسا کیوں؟

عوامی مقبولیت اچھے ادب کے لئے کبھی مضر رہی ہے نہ رہے گی... کبیر، میرا، نظیرؔ کی شاعری گاؤں کی چوپالوں سے لے کر بڑے شہروں کی سجی بنی لائبریریوں تک پھیلی ہوئی ہے۔

ساحر اور فیض کی مقبولیت ہمارے عہد کی بڑی ادبی سچائیاں ہیں، جن کو جھٹلانا ادبی دیانتداری نہیں ہے۔ اس مقبولیت کے وجہیں جیل، شہر بدری اور فلمی نغمہ نگاری میں تلاش کرنے کے بجائے، ہمیں بدلتی ہوئی قدروں کے سیاق و سباق میں ادب کا از سرِ نو جائزہ لینا چاہیے —— جس سے ادب و تہذیب دونوں کا فائدہ ہے۔

آخر میں ہم ساحر صاحب کی دونوں بہنوں سرور شفیع اور انور سلطانہ کا شکر گذار ہیں جنہوں نے ساحر نمبر کو خوب صورت بنانے میں ہر طرح سے مدد کی۔

—— صابر دت

ساحر لدھیانوی نمبر

ترتیب

صابر دت	5	صابر دت	11
کشمیری لال ذاکر			13
سرور شفیع			65

رو برو

محمود ایوبی	35	بلونت سنگھ	47
نریش کمار شاد مرحوم	52	ندا فاضلی	58

ہجوم بادہ و گل میں

مہندر ناتھ مرحوم	79	امرتا پریتم	88
خواجہ احمد عباس	94	سردار جعفری	96
واجدہ تبسم	99	سی۔ ایل۔ کاوش	109
قمر اجنالوی (پاکستان)	119	حافظ لدھیانوی (پاکستان)	127
یوسف ناظم	138	حمید اختر (پاکستان)	143
ڈاکٹر ظ۔ انصاری	149	جوگندر پال	159

تصور میں لاکھوں دیے جھلملائے

احمد ندیم قاسمی (پاکستان)	165	پروفیسر عبدالقوی دسنوی	174

کلام ساحر (نظمیں)

ردّ عمل، ایک منظر، ایک واقعہ، یکسوئی، شاہکار، نذرِ کالج، معذوری، خانہ آبادی، سرزمین یاس شکست، کسی کو اداس دیکھ کر، میرے گیت، شفاعِ فردا، لمحۂ غنیمت، اجنبی محافظ، شہزادے طلوعِ اشتراکیت، طرحِ نو، کچھ باتیں، گریز، صبح نوروز، ناکامی، مجھے سوچنے دو، سوچتا ہوں۔

موج عارض بھی مری نکہت گیسو بھی مری

ڈاکٹر محمد حسن　　233　　عزیز قیسی　　238

کلام ساحر (نظمیں)

چکلے، تاج محل، ہراس، کبھی کبھی، فن کار، مادام، جاگیر، فرار، کل اور آج، متاعِ غیر ایک تصویرِ رنگ، اسی دوراہے پر، میں نہیں تو کیا، خودکشی سے پہلے، لہو نذر دے رہی ہے حیات، بشرطِ استواری، نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کردو، ایک شام، تیری آواز، خوب صورت موڑ، ایک ملاقات، ہم عصر، انتظار

خون پھر خون ہے

پروفیسر نظیر صدیقی (اسلام آباد، پاکستان)　　287　　کیفی اعظمی　　291

کلام ساحر (نظمیں)

میرے گیت تمہارے ہیں، نورجہاں کے مزار پر، قحط بنگال، احساس کامراں، یہ کس کا لہو ہے، مفاہمت آج، آوازِ آدم، ۲۶ جنوری، خون پھر خون ہے، جواہر لال نہرو، جشن غالب، گاندھی ہو یا غالب، دل ابھی، اے نئی نسل

صبح نو کا شیدائی

سردار جعفری　　337　　سید سجاد ظہیر　　341

کلام ساحر (نظمیں)

آؤ کہ کوئی خواب بنیں، میرے عہد کے حسینو [illegible]، اے شریف انسانو [illegible]، پرچھائیاں

غزل کا مزاج داں

ناز صدیقی مرحومہ 363

کلام ساحر (غزلیں) 377 سے 389

بستی بستی پربت پربت

جاں نثار اختر مرحوم 393

کلام ساحر (گیت) 405 سے 484

جائزے

ڈاکٹر راہی معصوم رضا 486 ۔ ابراہیم جلیس مرحوم 493 ۔ کرشن ادیب 505

الوداع ساحر

قتیل شفائی (پاکستان)	538	یزدانی جالندھری (پاکستان)	539
نسیم افضل (پاکستان)	539	عبدالعزیز خالد (پاکستان)	541
رعنا سحری	540	امرناتھ	545
حبیب جالب (پاکستان)	544	فکر تونسوی	553
خواجہ احمد عباس	549	عذرا اصغر (پاکستان)	557
اے حمید (پاکستان)	555	عبدالقیوم (پاکستان)	567
پرکاش پنڈت (مرحوم)	559		

اثاثہ

آج کا پیار تھوڑا بچا کر رکھو، مسیح پاک روح تھے، پیار کا تحفہ، درشن، کرشن پھر آئیں گے
آخری برائی، اک دیا اور بجھا، مرگھٹ کی سرزمیں سے 592

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، مالک صابر دت نے میٹرو پرنٹنگ اینڈ لیتھو ورکس، ودیا نگری مارگ کمبی میں چھپوا کر ۔ ۴ اگورداس مل مینشن، پہلا مالا، نیشنل لائبریری روڈ باندرہ بمبئی ۵۰ ... ۴ سے شائع کیا۔

تحفہ مرے دَور کا

صابر دت

ساحر صاحب کو جیسا میں نے دیکھا اور پایا

اے مرے دَور کے شاعرِ خوش نوا
تجھ کو پیدا کیا ہے مرے دَور نے
میرے بعد آنے والو نہ دیکھو گے تم
تم کو حسرت رہے گی نہ دیکھا اسے
اس نے بخشی ہے شعر و ادب کو ضیا
یہ مرے دَور کا شاعرِ خوش نوا

اِس کے نغموں سے شام و سحر ہیں حسیں
زندگی کی چمک اِس کے اشعار میں
روحِ گیتی نہاں اِس کے افکار میں
رک گئی چھاؤں بھی رخ جدھر ہو گیا،
شاعرِ خوش نوا
یہ مرے دَور کا شاعرِ خوش نوا

مَیں نے دیکھا ہے اُس کو ہر اک رنگ میں
رنگ بن کر وہ ہر گُل میں ہنستا رہا
اُس کی آواز کے زیر و بم سے سدا
محفلوں کی نکھرتی رہی ہے فضا
دیکھ کر اس کو کھِلتا ہے رنگِ حنا
شاعرِ خوش نوا
یہ مرے دَور کا شاعرِ خوش نوا

تلخیاں اِس کا تحفہ ہے اس دَور کو
پھول دیتا رہا خار چنتا رہا
ہر نئی نسل کا جو بنے جان و تن
آدمِ نو کے وہ خواب بنتا رہے
ایسا تحفہ نہیں ہے کوئی دوسرا،
شاعرِ خوش نوا
یہ مرے دَور کا شاعرِ خوش نوا

میرے بعد آنے والو نہ دیکھو گے تم
تم کو حسرت رہے گی نہ دیکھا اِسے

ورق ورق زندگی

نام: عبدالحئی تخلص: ساحر

ولادت: ۸؍مارچ ۱۹۲۱ء ۔ لدھیانہ (پنجاب) رخصت: ۲۵؍اکتوبر ۱۹۸۰ء، بمبئی

تعلیم: مالوہ خالصہ ہائی اسکول لدھیانہ ۔ گورنمنٹ کالج لدھیانہ

تصانیف: تلخیاں (اردو، ۲۵واں، ہندی ۱۴ واں ایڈیشن)

پرچھائیاں (بین الاقوامی امن کے موضوع پر ایک طویل نظم)

گاتا جائے بنجارا (گیتوں کا مجموعہ) (۱۴واں ایڈیشن)

آؤ کہ کوئی خواب بنیں (نظموں کا مجموعہ) (چوتھا ایڈیشن)

اعزاز: پدم شری ۱۹۷۱ء

انعامات: گولڈ میڈل گورنمنٹ کالج لدھیانہ ۱۹۷۰ء ۔ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ۱۹۷۲ء

اردو اکیڈمی ایوارڈ ۱۹۷۲ء مہاراشٹرا اسٹیٹ لٹریری ایوارڈ ۱۹۷۲ء

دیگر اعزازات: ہند و پاک جنگ کے بعد ۱۹۷۲ء میں ہمارے جوانوں نے کچھ فوجی چوکیوں کا نام ساحر لدھیانوی کے نام پر رکھا۔

ان کی پنڈت نہرو پر لکھی گئی نظم کو سٹی پارک کرنال میں نصب کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو جی کے بت کے نیچے ان کی وصیت کے ساتھ کندہ کیا گیا۔

سینا سیوا کورپس کے لئے ترانہ (مارچنگ سانگ) ساحر لدھیانوی کی تخلیق ہے۔

سول لائن لدھیانہ میں ایک سڑک کا نام ۱۹۷۵ء میں ساحر روڈ رکھا گیا۔

☆

ایک شخصی مطالعہ

پرولوگ

دراصل ہم شاعر، ادیب، ڈرامہ نگار، آرٹسٹ، بت تراش سبھی تیسرے درجے کے مسافر ہیں جو تیسرے درجے کے مسافروں کے ویٹنگ روم میں بیٹھے اس گاڑی کا انتظار کر رہے ہیں جس سے 'نئی صبح' آنے والی ہے۔ ہم اپنے شعروں کے، افسانوں کے، ناولوں کے اور اپنی شگفتہ تحریروں کے کاغذی پھولوں کے ہار لئے اس لمحے کا انتظار کر رہے ہیں جب گاڑی پلیٹ فارم پر لگے گی اور ہم سنہری کرنوں میں مسکراتی 'نئی صبح' کے گلے میں کاغذی پھولوں کے وہ سبھی ہار ڈال دیں گے۔ اب ہمارے پاس صرف کاغذ کے ہی پھول ہیں۔ جو کبھی مرجھاتے نہیں۔ تازہ پھولوں کے ہار تو ہم نے کئی بار اکٹھے کئے لیکن سب انتظار کی تیز دھوپ میں سوکھ گئے۔ ساحر بھی ہم جیسا تیسرے درجے کا ہی ایک مسافر تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی اپنی نظموں اور غزلوں اور گیتوں سے گندھا ہوا بڑا ہی خوبصورت ہار تھا، 'نئی صبح' کے گلے میں ڈالنے کے لئے۔ گاڑی آئی تو ضرور لیکن پلیٹ فارم پر رکی نہیں۔ ساحر بڑا اتاولا تھا۔ اس میں انتظار کی تاب نہ تھی۔ وہ اپنا خوبصورت ہار سنبھالے، چلتی گاڑی کے فٹ بورڈ کی ریلنگ پکڑ کر گاڑی میں چڑھ گیا۔ اُسے بہت جلدی تھی 'نئی صبح' کے گلے میں ہار ڈالنے کی۔ آخر اس نے اپنا ہار بڑی محنت سے بھی تو بنایا تھا۔ ساحر لدھیانوی 'نئی صبح' سے کب ملے گا یہ کوئی نہیں جانتا۔ 'نئی صبح' ہمیں کب ملے گی یہ بھی کوئی نہیں جانتا۔ تیسرے درجے کے مسافر کب تک ویٹنگ روم میں بیٹھے اس کا انتظار کرتے رہیں گے۔ شاید اس کے بارے میں کسی کو علم نہیں۔

اس کے باوجود ہم سب 'تیسرے درجے کے مسافر' اپنے اپنے ہاتھوں میں کاغذی پھولوں کے ہار لئے ویٹنگ روم میں بیٹھے ہیں جوں ہی کوئی گاڑی پلیٹ فارم پر لگتی ہے۔ ہم میں سے ایک مسافر، اپنا ہار لئے خاموشی سے اس گاڑی میں چڑھ جاتا ہے کہ شاید 'نئی صبح' اسی میں سفر کر رہی ہو۔ اور پھر وہ تیسرے درجے کا مسافر، ہمارا ساتھی لوٹ کر نہیں آتا۔ اسی گاڑی میں چلا جاتا ہے۔ اور اس طرح ہمارے کئی ساتھی ہمارا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ کئی اور چھوڑ جائیں گے۔

کچھ دیر کے لئے تیسرے درجے کے ویٹنگ روم میں اداسی چھا جائے گی اور بھرپور سناٹا چھا جائے گا۔

اور اسی لمحے کہیں سے ایک آواز گونجے گی:

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مٹ جانے سے انسان نہیں مرجاتے
دھڑکنیں رکنے سے ارمان نہیں مرجاتے
سانس تھم جانے سے اعلان نہیں مرجاتے
ہونٹ جم جانے سے فرمان نہیں مرجاتے
جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے

پیش لفظ

ڈیر سرور!

آداب!

میرا خط تمہیں مل چکا ہوگا جس میں مَیں نے "فن اور شخصیت" کے 'ساحر نمبر' میں مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا مضمون بھیج رہا ہوں۔ یہ خط اس مضمون کا پیش لفظ ہے۔ حالانکہ نقادوں کی نظر میں مضمون کا کوئی پیش لفظ نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی ادیب مضمون کے لئے پیش لفظ لکھتا ہے۔ بلکہ اکثر اوقات مضمون کو ہی پیش لفظ کے طور پر استعمال کرلیا جاتا ہے۔ لیکن اس مضمون کے لئے مجھے پیش لفظ کی ضرورت کا احساس ہوا ہے ورنہ مضمون بہت طویل ہو جاتا۔ اس کی طوالت کم کرنے کے لئے ہی میں پیش لفظ لکھ رہا ہوں۔

بہت دنوں سے میری خواہش تھی کہ ساحر پر ایک کتاب لکھوں۔ لیکن وہ پوری نہ ہوسکی۔ اور اب میں اس خواہش کو پورا بھی کرنا نہیں چاہتا۔

صابر دت جب دہلی سے اجڑ کر دوسری بار شرنارتھی بنا اور بمبئی میں پناہ گزیں ہوا تو اس کے دو ہی ٹھکانے تھے جو میں نے اسے بتائے تھے۔ سنیل دت اور ساحر لدھیانوی۔ ان دونوں ٹھکانوں میں اسے جو تحفظ اور پیار ملا وہ شاید اسے میرے پاس بھی نہیں ملا تھا۔ اگر ملتا تو وہ مجھے چھوڑ کر کیوں بھاگ جاتا۔ سنیل اور ساحر دونوں اسے کتنا چاہتے تھے اس کا ثبوت مجھے کئی بار ملا۔ کبھی تو یہیں چنڈی گڑھ بیٹھے ہوئے اور کبھی بمبئی جاکر۔ تم اُن دنوں بمبئی میں نہیں تھیں اگر وہاں ہوتیں تو تم بھی میری گواہی دیتیں۔ میں جب بھی بمبئی جاتا میرا مستقل ٹھکانہ یعنی ہیڈ آفس تو سنیل دت کا گھر ہوتا لیکن برانچ آفس جاں نثار اختر کا گھر۔ اور سب برانچ آفس ساحر لدھیانوی کا گھر ہوتا۔ اسی سب برانچ آفس میں کبھی میری دوپہریں گزرتی تھیں اور کبھی شامیں۔ صبحیں مجھے اپنے ہیڈ آفس (سنیل دت کا گھر) پر ہی گزارنی پڑتی تھیں۔ میں بھی پطرس بخاری کے اس قول کا قائل ہوں کہ رات چاہے کہیں رہو لیکن صبح اٹھو اپنے بستر سے۔ اس لئے میں صبح اٹھتا اپنے بستر سے ہی تھا۔ اور نرگس بھابھی کی بھجوائی ہوئی بیڈ ٹی پیتا تھا! اور سنیل اور بھابھی سے گپ شپ بھی چلتی رہتی تھی۔ بھابھی کے جانے کے بعد تو اب ساری داستانیں ہی ختم ہوگئی ہیں۔ ایک شخص کے چلے جانے سے کیا کچھ ہو جاتا ہے اس کا اندازہ تو تمہیں بھی بخوبی ہوگیا ہے اب۔

ایک شام "پرچھائیاں" میں ساحر، صابر اور میں تھے اور بڑی غیر ادبی قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ خالص پنجابی میں۔ اردو کے پنجابی ادیب اور شاعر لکھتے تو اردو میں ہیں لیکن جب آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو وہ پنجابی میں ہوتی ہے جو لطف پنجابی میں گفتگو کرنے

کا ہے وہ اردو میں کہاں ہے؟ یہاں تو 'ک' اور 'ق' کا ہی جھگڑا بنا رہتا ہے۔ تم ہی بتاؤ اردو میں کوئی "ہیر وارث شاہ" جیسی کتاب ہے؟

گفتگو کے دوران میں نے ساحر سے کہا۔

"ساحر ابھی تم پر کوئی بھی معقول قسم کی کتاب نہیں لکھی گئی۔"

"کتاب تو کیا، معقول قسم کا کوئی مضمون بھی نہیں لکھا گیا۔" وہ اپنے مخصوص انداز سے ہنسا اور پھر ایک بیڑی سلگائی۔

تمہیں معلوم ہے نا، ساحر بیڑی کب پیتا تھا۔ نہیں معلوم تو جانے دو۔

"کہو تو میں ایک کتاب لکھ ڈالوں تم پر؟"

"لیکن افسانوی انداز میں۔ نقادوں والی کتاب نہیں۔"

"میں تو ویسی کتاب ہی لکھ سکتا ہوں۔"

"تو لکھ ڈالو ذاکر صاحب!"

دراصل اس صبح بستر پر پڑے پڑے میں نے اپنے ذہن میں کتاب کا خاکہ بھی مرتب کر لیا تھا۔ بلکہ اس کے بارے میں نرگس بھابھی سے بھی بات کی تھی۔ نرگس ساحر کو بہت ہی اچھا شاعر مانتی تھیں۔ گفتگو کے دوران بھابھی نے ساحر سے اپنی پہلی ملاقات کا بھی ذکر کیا جو اس دعوت میں ہوئی تھی جو آر۔ کے اسٹوڈیو میں فیض کے اعزاز میں دی گئی تھی۔ نرگس بھابھی کو فلم 'پیاسا' کے گانے بہت پسند تھے۔ خاص طور سے 'تنگ آچکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم' والا گانا۔ میں نے سوچا شام کو کتاب کے تھیم پر ساحر سے ڈسکس کروں گا۔ اگر اسے خاکہ پسند آیا تو پانچ سات راتیں غارت کر کے کتاب لکھ ڈالوں گا۔ میں تو کتاب سے چپکا نہیں رہ سکتا۔ لکھی گئی تو فوراً ہی لکھی گئی۔ رہ گئی تو بس رہ ہی گئی۔ میرے پاس ایسی کتابوں کے مسودے بھی ہیں جو بس رہ ہی گئی ہیں اور اب کبھی مکمل نہ ہو سکیں گی۔ "خاکہ بتاؤں کتاب کا؟" outline

"ہاں" ساحر نے ایک اور بیڑی سلگالی۔ اور ایک اور پیگ بنا لیا۔ سب کے لئے نہیں صرف اپنے لئے۔ میں نے خاکہ سنانا شروع کیا تو صابر اپنی شرارت آمیز مسکراہٹ سے کبھی مجھے، کبھی ساحر کو اور کبھی اپنے گلاس کو گھورتا، پھر پائپ بھرتا اور پھر سر جھکا کر گم ہو جاتا۔ یہ اس کا اپنا ردعمل ہے جس سے مجھے زیادہ سروکار نہیں۔ کتاب کا خاکہ کچھ اس طرح سے تھا۔ اب تو خیر بہت سی ڈی ٹیلز بھول بھی گئی ہیں۔

جنوری کا مہینہ ہے۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے۔ کسی برانچ لائن کے ایک نام نہاد فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں ایک مسافر بیٹھا ہے جو ایک ادیب ہے۔ (ہندوستان میں ادیبوں کو فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں بیٹھنے کی سہولت کم ہی میسر ہے لیکن میں نے اپنی کہانی کا تقاضا پورا کرنے کے لئے ایسا کیا تھا) وہ کسی ادبی میگزین کی ورق گردانی کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک آسودہ حال نوجوان لڑکی، اپنے آپ کو لانگ کوٹ سے کانوں سے ڈھکے داخل ہوتی ہے اور ایک آرام کرسی کو ایک طرف سرکا کر بیٹھ جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے بیگ میں سے "تلخیاں" کا ہندی اڈیشن نکال کر پڑھنے لگتی ہے۔ ٹرین آنے میں ابھی دیر ہے

اور رات کافی گذر چکی ہے۔ یہ لڑکی کسی دوسری ٹرین سے اتری ہے اور کنیکٹنگ ٹرین کا انتظار کر رہی ہے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد ایک نوجوان لڑکا سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتا ویٹنگ روم میں داخل ہوتا ہے۔ اس کا نوکر اس کا اٹیچی کیس اندر رکھ دیتا ہے اور ویٹنگ روم کے عین درمیان میں پڑی گول میز پر کافی سے بھرا تھرموس جما دیتا ہے اور پھر اس لڑکے کے لئے ایک خالی کرسی میز کے قریب سرکا دیتا ہے۔ لڑکا کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور نوکر چلا جاتا ہے۔

"کیا کمال کی سردی ہے!" وہ نوجوان لڑکا مخاطب تو اپنے آپ کو کر رہا ہے لیکن سنا اس لڑکی کو رہا ہے جو ایک سائڈ کی کرسی پر بیٹھی ہے اور "تلخیاں" کا ہندی اڈیشن پڑھ رہی ہے۔ لیکن سردی کے کارن اس کا دھیان کتاب پر نہیں جم رہا ہے۔ "پہاڑوں پر ضرور برف گری ہوگی۔" لڑکی تو خاموش رہی ہے لیکن تیسری کرسی پر بیٹھا ادیب جواب دیتا ہے جو سب سے پہلے اس ویٹنگ روم میں آیا تھا اور بور ہو رہا تھا اور ریلوں ہی سرسری طور پر ایک... میگزین کے صفحے الٹ رہا تھا۔

"اب تو میدانوں میں بھی گرے گی برف۔" وہ لڑکا مسکرا کر کہتا ہے۔

"بجلی یا برف؟" ادیب جواب دیتا ہے۔

"شاید دونوں۔" وہ ہنسنے لگتے ہیں۔ لڑکی دونوں کی طرف خشمگیں نظروں سے دیکھتی ہے لیکن بولتی کچھ نہیں۔

"ٹرین آنے کا کیا وقت ہے؟" ادیب پوچھتا ہے۔

"آنے کا یا جانے کا؟"

"فی الحال آنے کا۔"

"آپ کافی پیجئے۔ اس اسٹیشن پر گاڑیوں کے نہ آنے کا کوئی وقت ہے نہ جانے کا۔" لڑکا ہنس کر کہتا ہے۔

"وٹ ڈو یو مین؟" لڑکی بوکھلا کر سوال کرتی ہے۔

"برانچ لائن کی گاڑیوں کا یہی جھگڑا رہتا ہے میڈم۔" سچوایشن کو سنبھالنے کے لئے ادیب جواب دیتا ہے اسی دوران وہ لڑکا اپنے ہاتھ میں پکڑی کتاب میز پر رکھ دیتا ہے۔ یہ "تلخیاں" کا اردو ایڈیشن ہے۔ پھر وہ تھرموس سے تین ڈھکن اتار کر ان میں کافی ڈالنے لگتا ہے۔

"لیجئے۔" وہ تھرموس کا ایک پیالی نما ڈھکن ادیب مسافر کو پیش کرتا ہے۔

"وڈ یو مائنڈ اے کپ آف کافی؟" پھر وہ اس مسافر لڑکی سے سوال کرتا ہے۔

"تھینک یو سو مچ۔" وہ لڑکی اپنی کرسی سے اٹھ کر تھرموس کا پیالی نما ڈھکن لڑکے کے ہاتھ سے لے لیتی ہے جو پہلے ڈھکن کی نسبت سائز میں چھوٹا ہے

"آئی شیل ٹیک دِس۔" یہ کہہ کر وہ لڑکا سب سے چھوٹے پیالی نما ڈھکن میں ڈالی ہوئی کافی کو ہونٹوں سے لگا لیتا ہے۔

"جان میں جان آئی ہے۔ وٹ اے تھرِل کولڈ۔" لڑکی کافی کا ایک لمبا سپ لیتے ہوئے کہتی ہے۔

ادیب میز پر پڑی کتاب اٹھالیتا ہے اور اسے ادھر ادھر سے پلٹ کر دیکھتا ہے۔

"یہ تلخیاں، کا نیا ایڈیشن ہے کیا؟"

"جی ہاں۔ دہلی سے لایا تھا پچھلے ہفتے۔"

"آپ کو ساحر پسند ہے؟" ادیب پوچھتا ہے۔

"ارے صاحب کیا شاعر ہے!" لڑکی ایک دم بول پڑتی ہے اور اپنی کرسی پر رکھی کتاب جسے وہ کافی پیتے وقت وہیں چھوڑ آئی تھی لے آتی ہے۔

"تو یہ تلخیاں کا ہندی کا نیا ایڈیشن ہے؟" ادیب پوچھتا ہے۔

"جی۔ میری ایک فرینڈ نے دہلی سے بھیجی ہے یہ کتاب۔"

"تو آپ دونوں ساحر کے فین ہیں؟" ادیب دونوں کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتا ہے۔

"تھنکس لایک دیٹ۔" لڑکا جواب دیتا ہے۔

اور پھر وہ دونوں مسافر آپس میں "تلخیاں" ایکسچینج کرتے ہیں اور لتنے میں ٹرین پلیٹ فارم پر آجاتی ہے۔ اپنی اپنی بدلی ہوئی کتاب لیئے وہ ویٹنگ روم سے باہر نکل کر پلیٹ فارم پر آجاتے ہیں اور ادیب بھی جلدی سے خالی تھرموس اٹھائے ان دونوں کے ساتھ اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھ جاتا ہے۔

ادیب کو اپنی کہانی کے لئے ایک تھیم مل جاتا ہے۔

اور وہ دونوں نوجوان مسافر ساحر کی مدد سے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ ایک مختصر سا سفر۔ کچھ گھنٹوں کا ساتھ۔ گفتگو کی کچھ کڑیاں اور ساحر کی نظم "خوبصورت موڑ" کا ایک حصہ جو وہ لڑکی دھیرے دھیرے گنگناتی ہے۔

تعارف روگ ہو جائے تو اس کو بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے تکمیل تک لانا نہ ہو ممکن
اسے ایک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

خاکہ سننے کے بعد ساحر نے بے ساختگی سے کہا۔

"ذاکر صاحب یہ تو ایک نظم کی کہانی بن سکتی ہے۔"

"مزا آگیا۔" صابر جواب تک صرف اپنی شرارت آمیز مسکراہٹوں ہی تک محدود تھا کھل کر بولا۔

"مجھے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ دیدو۔" میں نے ساحر سے کہا۔

"صابر دت! کتابوں کا سیٹ ذاکر صاحب کو بھجوا دینا۔"

"ٹھیک ہے بھاہ جی۔"

اس رات میں واقعی بہت خوش تھا کیونکہ میری ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل ہو رہی تھی۔ سوچتا تھا کہ چنڈی گڑھ واپس پہنچتے ہی کتاب پر کام شروع کر دوں گا۔

لیکن اگلی شام ایک عجیب اور غیر متوقع بات ہو گئی۔

میں جاں نثار اختر کے گھر بیٹھا تھا۔ خدیجہ بھابی نے بہت بڑھیا کھانا تیار کیا تھا اور بضد تھی کہ میں کھانا وہیں کھاؤں۔ اختر نے بھی اصرار کیا تھا۔ میں نے اس شرط پر حامی بھری تھی کہ وہ مجھے اپنی غزلوں کے کچھ منتخب اشعار سنائے گا۔ اختر بڑا معصوم آدمی تھا۔ اور میری شرط مان گیا۔ وہ بڑی معصومیت سے اپنی غزلوں کے بڑے پیارے پیارے شعر سنا رہا تھا۔ اسی وقت وید راہی کا ٹیلی فون آیا دراصل رات کا کھانا مجھے وید راہی کے ہاں کھانا تھا اور میں نے اسے کہا تھا کہ وہ اندھیری جاتے ہوئے مجھے اختر کے گھر سے لیتا جائے اس نے اب اسی غرض سے ٹیلی فون کیا تھا۔ "ہاں ذاکر صاحب یہیں ہیں اور میرے شعر سن رہے ہیں۔" اختر نے وید راہی سے ٹیلی فون پر کہا تھا۔ بڑا ہی معصوم آدمی تھا اختر۔ اس کی اس معصومیت کی وجہ سے خدیجہ اکثر پریشان رہتی تھی۔

"وہ کھانا یہیں کھائیں گے۔ آپ بھی آجائیے۔"

"ہم آپ کو جلدی فارغ کر دیں گے۔"

"اچھا لیجئے آپ ذاکر صاحب سے بات کر لیجئے۔"

مجھے معلوم نہیں تھا کہ وید راہی نے اختر سے کیا کہا تھا۔ میں نے صرف اختر کے جواب ہی سنے تھے۔

"میں نے دو ایک دوستوں کو بھی بلا رکھا ہے۔ آپ سے ملوانے کے لئے۔" وید راہی نے کہا۔

"یار کیا کروں۔ اختر کو تو انکار کر ہی دیا تھا لیکن خدیجہ بھابھی سے انکار کی ہمت نہیں ہے۔"

"میں ایک صورت بتاتا ہوں۔"

"بتاؤ۔؟"

اختر صاحب نے کہا ہے کہ خدیجہ نے آپ کے لئے بہت بڑھیا کباب بنائے ہیں۔ آپ کباب تو یہاں کھائیں اور کھانا میرے گھر کھائیں۔" میں وید راہی کی بات سن کر ہنسا اور اسے کہا کہ وہ اختر کے گھر ہی آجائے۔ وید راہی کے آنے تک اختر نے اور میں نے وہسکی کے دو ایک پیگ مار لئے اور کباب بھی کھا لئے۔ وہسکی پینے کے دوران اختر نے مجھ سے کہا۔

"آپ ساحر پر کتاب لکھیں گے؟"

"رات ہی تو بات ہوئی ہے ساحر سے۔"

"صبح ساحر نے مجھے بتایا تھا۔"

"کیا کہا تھا اُس نے؟"

"آپ نے اسے کتابوں کا سیٹ بھیجنے کو بھی کہا تھا؟"

"ہاں۔ اس نے یہ کام صابر کے ذمے لگایا ہے۔"

"وہ آپ کو کتابیں نہیں بھیجے گا۔"

"کیوں؟"

"جانتے ہیں ساحر نے مجھ سے کیا کہا تھا؟"

"بتایئے۔"

"اس نے کہا تھا ذاکر مجھ پر کتاب لکھ کر فلم انڈسٹری میں آنا چاہتا ہے۔ میں اسے کتاب لکھنے کے لئے منع کر دوں گا۔"

"آپ نے کیا جواب دیا تھا؟"

"چھوڑیئے اس بات کو" اختر ٹالنے لگا۔

"یہ غلط طریقہ ہے اختر صاحب۔ یا تو آپ مجھ سے اس سلسلے میں بات نہ کرتے۔ کی ہے تو اب ٹالیئے مت۔"

"میں بتاؤں کیا جواب دیا تھا اختر صاحب نے مجھے بتا چکے ہیں۔" خدیجہ بولی جو ہمارے سامنے ہی بیٹھی تھی دیوار سے بیٹھ ٹیک کر۔ وہ اسی طرح بیٹھا کرتی تھی اپنے گھر میں۔ بڑی ہمت والی خاتون تھی خدیجہ بھابھی۔ میں نے تو اپنے نئے ناول "سمندر صلیب اور وہ" کا انتساب بھی اسی کے نام کیا ہے حالانکہ اب وہ ہمارے درمیان میں نہیں۔

"بتاؤ بھابھی۔"

"اختر صاحب نے کہا تھا کہ اگر ذاکر صاحب فلم انڈسٹری میں آنا چاہتے تو اب تک آ چکے ہوتے۔ سنیل دت صاحب سے اور نرگس دت سے تو میرے سامنے بات ہو چکی ہے۔ ایک بار نہیں کئی بار۔ لیکن ذاکر صاحب کو فلم انڈسٹری سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"کیا جواب دیا تھا ساحر نے اس کا؟" میں نے اختر سے پوچھا۔

"صرف مسکرا دیا۔ کچھ نہیں بولا۔"

"آپ لکھیں گے ساحر صاحب پر کتاب؟" خدیجہ نے پوچھا۔

"اب بالکل نہیں لکھوں گا۔"

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ صابر ساحر کی کتابوں کا سیٹ لے کر آ گیا۔ وہ سیدھا ساحر کے گھر سے آ رہا تھا۔ آتے ہی اپنی شرارت آمیز مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولا۔ اعلان کرنے کے انداز میں۔

"ذاکر صاحب، ساحر پر کتاب لکھ رہے ہیں۔ کتابوں کا سیٹ لایا ہوں۔ ساحر نے دی ہیں۔"

"میں نے ارادہ بدل دیا ہے" میں نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"میں ایک فلم کے ڈائیلاگ لکھ رہا ہوں۔ میرے پاس وقت نہیں۔ ساحر سے کہہ دینا۔"

"لیکن کل تو آپ نے اس سے وعدہ کیا تھا اور کتاب کا فارمیٹ بھی ساحر سے ڈسکس کیا تھا۔"

"اب میں نہیں لکھ سکوں گا۔"

میں نے مزید بحث سے بچنے کے لئے مختصر سا جواب دے دیا۔ لیکن خدیجہ بھابھی کو بڑا غصہ تھا۔ اس نے ساری بات بتا دی۔ یہ سن کر صابر کو بھی افسوس ہوا۔ میں نے ساحر کی کتابیں واپس کر دیں۔

جب تک دیدراہی آیا، ہم اس موضوع کو ختم کر چکے تھے۔

صابر اور میں دیدراہی کے ساتھ اس کے گھر اندھیری چلے گئے۔ جہاں کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ رات کو ہم بہت دیر سے لوٹے۔

اس کے بعد میں کئی بار بمبئی گیا۔ ہر بار ساحر سے ملاقات ہوئی۔ لیکن نہ کبھی میں نے کتاب کا ذکر کیا نہ ہی اس نے اس بارے میں کبھی بات کی۔ ایک ذہنی گانٹھ پڑ گئی تھی دونوں کے درمیان جو بہت دنوں تک بنی رہی۔

اور اب تمہیں آخری واقعہ سنا رہا ہوں۔

ساحر کی موت سے ایک ہفتے پہلے کی بات ہے۔ مجھے پونہ جانا تھا ایک میٹنگ کے سلسلے میں۔ صبح کی گاڑی سے بمبئی پہنچا تھا اور شام کو دکن کوئن سے پونا کا ریزرویشن تھا۔ صابر وکٹوریہ ٹرمینس پر آ گیا تھا۔ سامان کلوک روم میں رکھ کر میں باندرہ گیا تھا۔ سنیل دت کے گھر۔ سنیل تو گھر پر نہیں تھے نرگس بھابھی تھیں۔ ان سے ملا۔ چائے پی۔ تھوڑی دیر گھر پریوار کی باتیں ہوئیں اور پھر میں ریڈیو اسٹیشن چلا گیا۔ ریڈیو والے میرا ایک انٹرویو ریکارڈ کرنا چاہتے تھے۔ ریڈیو اسٹیشن سے ہی صابر نے ساحر کو ٹیلی فون کیا۔ اور بتایا کہ میں بمبئی میں ہوں لیکن اس سے نہیں مل سکوں گا۔ کیونکہ مجھے شام کو پونہ جانا تھا۔ ساحر نے صابر سے کہا کہ وہ ٹیلی فون مجھے دے۔

میں نے ٹیلی فون لے لیا اور معمول کی طرح بات چیت پنجابی میں شروع ہو گئی۔

"کل سویرے چلے جانا ذاکر صاحب"، ساحر نے کہا۔

"سویرے میٹنگ ہے۔ رات نوں پہنچنا ضروری ہے۔"

"واپس کدوں آؤ گے؟"

میں نے پونہ سے اپنی واپسی کی تاریخ بتا دی۔ تین دن بعد کی تاریخ۔

"ٹرین توں اُتر کے سیدھے میرے کول آ جانا۔"

"ٹھیک ہے ساحر صاحب۔"

"صابر تہانوں اسٹیشن توں لے آوے گا۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"کیا۔"

"کیا۔"

"تُسں ناراض او میرے نال؟"

"نہیں بالکل نہیں۔"

"جھوٹ کہہ رہے ہو۔" میں نے کوئی جواب دیا تو ساحر پھر بولا۔

"مینوں تہواڈے افسانے بہت پسند ہیں۔"

اب وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک آدھ افسانے کو چھوڑ کر اس نے مجھے نہیں پڑھا تھا۔ اس نے تو میرا ناول "سیندور کی راکھ" بھی نہیں پڑھا تھا جس کی لوگ بہت تعریف کرتے ہیں۔ دراصل پڑھنے پڑھانے کے معاملے میں ساحر بہت کچا تھا۔

میں نے جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔

"اسیں دویں جھوٹ بول رہے آں۔" پھر اس کی ہنسی کی گونج سنائی دی۔ معصوم، پیاری، خلوص بھری ہنسی۔ جس میں گھل کر بڑے سے بڑا جھوٹ بھی پوتر اور نرمل سچ بن جاتا تھا۔

"ساحر یار تیری ہنسی بڑی پیاری ہے۔" میں نے کہا۔

جواب میں وہ ایک بار پھر کھل کر ہنسا اور پھر بولا۔

"پونے توں واپسی تے جہیڑی رات تیس میرے گھر گذارو گے۔ اوس رات اس کتاب دا پہلا صفحہ لکھ دینا جہیڑی کتاب لکھن توں تیس انکار کر دتا سی۔"

"ضرور لکھاں گا ساحر صاحب۔ میں رات بھر لکھدا رہواں گا۔"

اور میری بات کے جواب میں ساحر کی ہنسی دیر تک گونجتی رہی۔ گنگا کے جل کی طرح اُجلی، پوتر، شفاف، نرمل اور گمبھیر۔ اس جل میں تو کھوٹے سے کھوٹا جھوٹ بھی دھل کر سونا ہو جاتا تھا۔ سچا سونا بنا کسی ملاوٹ کے۔

بس آخری بار سنی تھی میں نے اپنے دوست کی یہ ہنسی اس روز ٹیلی فون پر۔

تیسرے روز ہی تو صابر نے صبح سویرے پونہ ٹیلی فون پر اپنی روہانسی آواز میں اطلاع دی تھی۔ کہ ساحر اپنی ہنسی کا سارا سچ کفن میں سمیٹ کر سو گیا تھا۔

تین روز کے بعد، رات کے گہرے سناٹے میں، جس کتاب کا پہلا صفحہ لکھنا تھا مجھے، وہ کتاب بھی تو کفن اوڑھ کر ساحر کے ساتھ ہی قبر میں سو گئی تھی۔ اب نہ کبھی ساحر جاگے گا اور نہ ہی اس کی پوتر اور سچی ہنسی گونجے گی۔ اور نہ ہی اب کبھی وہ صفحہ کھلے گا جس پر مجھے ساحر کا نام لکھنا تھا۔

ساحر کے ساتھ ہی میری کتاب بھی مرگئی!! ساحر کا کفن میری کتاب کا بھی کفن ہے!!

اب تم پیش لفظ اور مضمون دونوں پڑھ لو۔ اگر پیش لفظ اچھا لگے تو صرف اسے ہی چھاپ دو، مضمون رہنے دو۔ اور اگر مضمون اچھا لگے تو پیش لفظ چھوڑ دو۔ صرف مضمون ہی چھاپ دو۔ اور اگر پیش لفظ اور مضمون دونوں پسند آئیں تو پھر پڑھنے والوں کو بھیجنے دو۔ ہاں صابر کی رائے ضرور لے لینا۔ شاید وہ کہے کہ دونوں کی ضرورت نہیں۔ ایسی صورت میں صرف میرا نام ہی چھاپ دو اور دس، بیس صفحے خالی چھوڑ دو۔ کبھی کبھی مضمون ایسے بھی تو چھاپے جاتے ہیں

دعاؤں کے ساتھ: ذاکر

واردات

میں اپنی بات کا آغاز لگ بھگ چھتیس (۳۶) سال پہلے کی واردات سے کر رہا ہوں۔

اُن دنوں دل و دماغ پر ابھی تقسیم میں کھائی شدید چوٹوں کے درد کا احساس باقی تھا۔ انسانی رشتے بری طرح ٹوٹے تھے اور ان رشتوں کی تیز تیز کرچیاں سرحدوں پہ بکھری پڑی تھیں اور روح میں اس طرح چبھتی تھیں کہ روح لہولہان ہو جاتی تھی۔ میں بھی اُن دنوں ایک شرنارتھی تھا۔ اور دہلی کے قریب گوڑ گاؤں میں شرن لے رہا تھا جس میں بے حد گرد تھی اور ویرانی تھی اور اس گرد کو پھانکنے اور اس ویرانی کے خلا کو بھرنے کے لئے میری طرح ہزاروں شرنارتھی گوڑ گاؤں میں بھرے تھے۔ اور اجاڑ مکانوں کی دیواروں کو اپنی بربادیوں کے قصے سناتے تھے۔ جن شرنارتھیوں نے کیمپ میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے ہوش و حواس سنبھالنے میں لگے تھے۔ گوڑ گانوہ میں اگر مجھے کوئی چیز اچھی لگی تھی تو وہ کوئی چھ فرلانگ سیدھی سڑک تھی جو گوڑ گانوہ چھاؤنی کے قصبے کو ریلوے اسٹیشن سے ملاتی تھی۔ اور جس کے دونوں طرف نیم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے جن کی شاخیں محرابیں بنا کر سڑک کے اوپر ایک دوسرے سے گلے ملتی رہتی تھیں۔ نیم کے درخت میں نے اتنی بڑی تعداد میں پہلی بار دیکھے تھے۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ سفیدے اور چنار کے علاوہ کڑوے کڑوے چھوٹے پتوں والے نیم کے درخت بھی خوبصورت ہو سکتے ہیں۔ یہ بات بھی ایک صدی کے تیسرے حصے جتنی ہی پرانی ہے۔ جب ایک تقسیم کے بعد ملک نے ابھی دوسری تقسیم کا منظر نہیں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں ابھی ہریانہ اور ہماچل کی تشکیل نہیں ہوئی تھی بس ایک ہی پنجاب تھا۔ جسے مشرقی پنجاب کہتے تھے۔ کیونکہ مغربی پنجاب اب پاکستان میں تھا۔ ان دنوں جب ہم لوگ لاہور میں رہنے والے اپنے دوستوں کو خط لکھتے تھے تو لاہور کے ساتھ بریکٹوں میں مغربی پنجاب بھی لکھتے تھے۔ اب تو مشرقی پنجاب میں سے بھی دو اور صوبے نکل آئے ہیں۔ لیکن اس وقت میں صوبوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ نیم کے درختوں کی چھاؤں کی بات کر رہا ہوں جنہوں نے دہلی کے آس پاس اپنی ویرانی کے ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ اُن دنوں کا گوڑ گانوہ اور اب کا گوڑ گانوہ، بس پوچھئے مت! وہ چھ چھ سات فرلانگ لمبی ریلوے روڈ تھی اب اولڈ ریلوے روڈ ہو گئی ہے اس کی جگہ اب ایک نیو ریلوے روڈ بن گئی ہے جس کے کناروں پر نئی نئی کشادہ کوٹھیاں بن گئی ہیں اور اولڈ ریلوے روڈ کی ایک طرف چھتیس برس پہلے کی بنی کچی جھگیاں اب چھوٹے چھوٹے پکے مکانوں میں بدل گئی ہیں جن اُجڑے

ہوئے بے گھر لوگوں نے اِن کچی جھگیوں کی بنیادیں ڈالی تھیں ان میں سے بیشتر لوگ مر کھپ چکے ہیں۔ جو کوئی اکا دکا آدمی اپنی پرانی مضبوط ہڈیوں کے سہارے زندہ ہے وہ اِن چھوٹے چھوٹے مکانوں کی دیواروں کے ساتھ اپنی ٹوٹی ہوئی کھاٹ ڈال کر دن بھر کھانستا رہتا ہے اور فضا میں بیماریوں کے جراثیم پھیلاتا رہتا ہے۔ یہ اِکا دُکا لوگ اس زمانے کی یادگار ہیں جب وہ اپنے سروں پر اپنی بربادیوں کی گٹھریاں اٹھائے جگہ جگہ پناہ ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ اور دہلی کے لوگ انہیں 'پاکستانی' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ دلی کے لوگوں نے بڑی بے دلی سے قبول کیا تھا ہم لوگوں کو۔ انہیں خیال تھا کہ یہ اجڑے ہوئے لوگ جنہیں وہ طنز سے پاکستانی کہتے تھے، بھیک مانگیں گے، چوریاں کریں گے، دنگے فساد کرائیں گے اور کبھی وقار کی زندگی نہ جی سکیں گے۔ لیکن راوی اور چناب اور جھیلم کے پانیوں پر پلے ہوئے یہ رانجھے اور یہ ہیریں اپنے ساتھ اپنی اپنی مخصوص روایات لائے تھے۔ محبت کی خاطر فقیر ہو جانے کی روایات، یار کی خاطر کچے گھڑے پر دریا پار کرنے کی روایات۔ ان کے پاس بھیک مانگنے اور چوریاں کرنے کی کوئی روایت نہیں تھی۔ چنانچہ یہ رانجھے اور یہ ہیریں اجنبی دھرتی پر رُل رُل کر جیئے۔ لیکن اپنا وقار نہیں کھویا۔ کڑی محنت کی۔ سردی گرمی جھیلی۔ کڑے بول برداشت کیے لیکن صبر کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور آج دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں کاروبار کرنے والے، کارخانے چلانے والے، بڑے بڑے فارم بنانے والے وہی اُجڑے ہوئے لوگ ہیں جنہیں دلی والوں نے بڑی بے دلی سے قبول کیا تھا۔ آپ اب بھی نکل جایئے۔ دلی کے ارد گرد کے دیہات میں آپ کو کہیں نہ کہیں کلف لگی پگڑی کا سفید شملہ اور لٹھے کا کھڑکھڑاتا ہوا تہمد مل جائے گا۔ اسی سیدھے اونچے سفید شملے اور کھڑکھڑاتے تہمد کی تہوں میں تو یہ لوگ اپنا وقار، اپنی خودداری اور اپنی انا سمیٹ کر لائے تھے۔ جو انہوں نے اس دھرتی پر بکھیری تھیں جو دھرتی اب انہیں قبول کر چکی ہے اور جس نے انہیں اپنے سینے سے لگا کر اپنا سا یا دلار اور پیار دے ڈالا ہے۔

دلی والوں کی دھرتی پر ایک اور شرنارتھی آیا تھا ان دنوں۔

وہ پہلے لدھیانہ سے اجڑ کر لاہور گیا تھا اور اپنے ساتھ یہ پیشین گوئی لے کر گیا تھا کہ لاہور بھی اجڑے گا ایک دن، اور لاہور واقعی اجڑا تھا اور وہ شرنارتھی جس کا نام ساحر لدھیانوی تھا لاہور سے دھکے کھاتا پرانی دلی کی ایک نہایت ہی گنجان بستی پل بنگش کی ایک ننھی سی گلی کے ایک ایسے مکان میں آیا تھا جو کسی مسلم مہاجر کے پاکستان چلے جانے کے بعد پرکاش پنڈت کو الاٹ ہوا تھا (الاٹ تو شاید ساحر کو ہی ہوا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں صحیح علم نہیں) مکان کی ڈیوڑھی علیٰحدہ گلی میں کھلتی تھی اور اس کے ایک کمرے کے تہہ دار دروازے بھی گلی ہی میں کھلتے تھے۔ جب سارے دروازوں کی تہیں سمیٹ دی جاتیں تو وہ کمرہ ایک طرح سے بغیر دروازوں کے ہو جاتا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ کمرہ مال گاڑی کا ایک ڈبہ تھا جس میں کسی مکان کا سامان بھر کر کسی دوسری جگہ بھیجا جا رہا تھا۔

پرکاش پنڈت دہلی آ گیا تھا کیونکہ اسے کسی معقول ادبی کام کی تلاش تھی۔ اس نے 'شعاعیں' کو سنبھال لیا تھا۔ جسے شیام سندر پرویز نے جاری کیا تھا۔ اس میں اسے شاہد احمد دہلوی مدیر 'ساقی' کی بھی سرپرستی حاصل تھی۔ پرویز خود تو بلیک کا بزنس کرتا تھا لیکن اسے کچھ کچھ ادبی ٹھرک بھی تھا اس لئے اس نے "پتھری بلکہ فوراً ان دن" قسم کا ایک پرچہ نکال لیا تھا۔ جس میں اوب سے زیادہ خوبصورتی بحال رکھنے کے نسخے ہوتے تھے۔ 'شعاعیں' کی وساطت سے میں نے سلمیٰ صدیقی کی کہانیاں پہلے پہل پڑھی تھیں۔ پرکاش پنڈت نے مکتبہ شاہراہ کے مالک محمد یوسف جامعی سے "شاہراہ" کو بھی دیکھنے کا کام لے لیا تھا۔ پرکاش پنڈت ایک ذہین اور خوبصورت

شخص تھا۔ اور بڑا بنا سنور کر رہتا تھا اور بن سنور کر کام بھی کرتا تھا۔ بعد میں اس نے 'ہند پاکٹ بکس' میں رہ کر اردو کے بھی اچھے شاعروں کو ہندی جاننے والے لوگوں سے متعارف کرایا۔ یہ اس کا بہت ہی قابل تعریف کام ہے۔ پرکاش پنڈت ایک خوددار آدمی تھا۔ اس کا مجھے ذاتی تجربہ بھی ہے۔

میں جن دنوں کا ذکر کر رہا ہوں اُن دنوں پرکاش پنڈت نے راج پال اینڈ سنز کو چھوڑ دیا تھا (اس نے 'شاہراہ' سے الگ ہو جانے کے بعد اس ادارہ کو جوائن کر لیا تھا) ملک کی طرح اس مشہور پبلیشنگ کنسرن نے بھی اپنا بٹوارہ کر لیا تھا۔ دینا ناتھ ملہوترہ اپنے بھائی سے الگ ہو گیا تھا۔ اور اس نے 'ہند پاکٹ بکس' کا ادارہ سنبھال لیا تھا۔ بعد میں اس نے ایک نیا پبلیشنگ ہاؤس 'سرسوتی دہار' کے نام سے بھی قائم کر لیا تھا۔ پرکاش پنڈت اب "ہند پاکٹ بکس" میں آ گیا تھا اور اس نے دینا ناتھ ملہوترہ کا کام سنبھال لیا تھا۔ ادھر کئی برسوں سے اس سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پھر اچانک ایک دن اس کا ایک خط ملا۔ خط میں اس نے ایک عجیب واقعہ کا ذکر کیا تھا۔ ایک شخص (جس کا نام میں جان بوجھ کر نہیں لکھ رہا ہوں) میرا نام لے کر اس سے ملنے گیا تھا۔ ویسے یہ شخص میرا نام لے کر میرے کئی دوستوں کو ایکسپلائیٹ کر چکا تھا۔ پرکاش پنڈت ان دنوں بہت پریشان تھا۔ اس کی صحت بھی ٹھیک نہیں تھی اور اسے اپنے سب سے بڑے بیٹے کی بھی چنتا تھی جو بے کار تھا لیکن کتابوں کا کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اس نے اپنے باپ کا حشر دیکھ لیا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اس کے باپ کا جو حشر تیس سال کے عرصے میں ہوا تھا اس کا وہ حشر ابھی سے ہو جائے۔ اس آدمی نے پرکاش پنڈت کو یقین دلایا کہ وہ اس کے بیٹے کو کورکشیتر یونیورسٹی میں کوئی معقول سروس دلوا دے گا۔ پرکاش پنڈت نے اسے اچھی خاصی رقم بھی دے دی تھی اور اپنا بیٹا بھی اُس کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ آدمی لڑکے کو اِدھر اُدھر گھماتا رہا اور پھر اُسے آگرہ میں چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ لڑکا پریشان ہوتا ہوا آخر دہلی پہنچا۔ اور ساری داستان اپنے باپ کو سنائی۔ پرکاش پنڈت نے اتنے برسوں بعد مجھے جو خط لکھا تھا اس میں یہی داستان بیان تھی اور اس آدمی کا حلیہ بھی لکھا تھا۔ اور مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں اس شخص کو جانتا تھا۔ میں نے پرکاش پنڈت کو خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ میں اس شخص کو اچھی طرح جانتا تھا اور وہ نہایت ہی فراڈ قسم کا آدمی تھا۔

اور اس طرح کئی برسوں کی ٹوٹی ہوئی ملاقاتوں کا رشتہ ایک بار پھر جڑا اور پرکاش پنڈت اور میں دوبارہ ملنے لگے۔ ایک بار اس نے "ہند پاکٹ بکس" والوں کی گاڑی بھیج کر مجھے منسٹری آف ایجوکیشن سے (جہاں میں ایک میٹنگ اٹینڈ کرنے گیا تھا) شاہدرہ بلوایا اپنے آفس میں۔ میں اس سے پہلے "ہند پاکٹ بکس" کے دفتر تو کیا کبھی شاہدرہ بھی نہیں گیا تھا حالانکہ شاہدرہ بھی انہی شرنارتھیوں نے بسایا تھا جو پاکستان سے اجڑ کر آئے تھے۔ وہیں میری دینا ناتھ ملہوترہ سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ملہوترہ بڑا شائستہ با اخلاق اور سلجھا ہوا آدمی ہے۔ دراصل پرکاش پنڈت مجھے ملہوترہ سے ملوانا چاہتا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ دینا ناتھ ملہوترہ پرکاش پنڈت میں اٹوٹ وشواس رکھتا تھا اور اس پر پوری طرح ڈی پینڈ کرتا تھا۔ "سرسوتی دہار" ابھی نیا نیا قائم ہوا تھا اور پرکاش پنڈت ہی اس کام کو بھی سنبھال رہا تھا۔ اس ادارے سے کچھ بہت اچھی کتابیں چھپی تھیں۔ میرا ناول "لہو پکارتا ہے" پرکاش پنڈت نے اپنی دیکھ ریکھ میں "سرسوتی دہار" ہی سے چھپوایا تھا۔ میں نے

اس ناول کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ میرا یہ ناول ساحر کی نظم "خون پھر خون ہے" کے ایک ٹکڑے سے ہی شروع ہوتا ہے۔
اردو میں میرے اس ناول کا عنوان ہی "خون پھر خون ہے" ہے۔

ناول کے ہیرو کا نام انجم ہے۔

اور ہیروئن کا نام ساحرہ!

شادی کی پہلی رات کو، ترکمان گیٹ کی اندرونی آبادی کے ایک تنگ مکان کے اوپر والی منزل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں انجم اپنی دلہن سے گفتگو کا آغاز کرنا چاہتا ہے۔ وہ جو بھی بات کرتا ہے اسے۔ ساحرہ سنتی ضرور ہے لیکن اس کا جواب نہیں دیتی۔ جیسے اس پر کوئی ردعمل ہی نہیں انجم کی کسی بات کا۔ اور پھر نہ جانے کیسے وہ کہہ اٹھتا ہے "مجھے ساحر لدھیانوی کی ایک نظم بہت پسند ہے جو اس نے کانگو کے شہید لوممبا کے قتل پر کہی تھی! اور جس کی موت کے بارے میں جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ایک قتل کیا ہوا لوممبا ایک زندہ لوممبا سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ تم اس نظم کا ایک حصہ سنو گی؟"

"خون پھر خون ہے؟" ساحرہ نے ایک دم جواب دیا تھا۔

"تو تم نے ساحر کو پڑھا ہے؟"

"مجھے ساحر بہت پسند ہے۔"

خاموشی کا وہ طلسم جو ساحرہ پر اب تک چھایا ہوا تھا ساحر کے نام سے ہی ٹوٹا تھا۔ اس کے محبوب شاعر کے نام سے۔ اور پھر انجم نے نظم کا یہ ٹکڑا اپنی بوجھل، دھیمی آواز میں سنایا تھا! اور ساحرہ رو اٹھی تھی اور اس نے اپنے آپ کو انجم کی آغوش میں ڈال دیا تھا۔

خون چلتا ہے تو رکتا نہیں سنگینوں سے
سر اٹھاتا ہے تو دبتا نہیں آئینوں سے
ظلم کی بات ہی کیا، ظلم کی اوقات ہی کیا
ظلم بس ظلم ہے، آغاز سے انجام تک
خون پھر خون ہے سو شکل بدل سکتا ہے
ایسی شکلیں کہ مٹاؤ تو مٹائے نہ بنے
ایسے شعلے کہ بجھاؤ تو بجھائے نہ بنے
ایسے نعرے کہ دباؤ تو دبائے نہ بنے
خون پھر خون ہے، ٹپکے گا تو جم جائے گا

بل بنگش کی گنجان لوکیلیٹی میں، مال گاڑی کے ڈبے جیسے معمولی مکان میں ساحر سے اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ امی بھی تو ان دنوں دہلی آگئیں تھیں۔ ان دنوں کی امی اور بمبئی میں بیس برس بعد کی امی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ان دنوں تو امی سارے گھر کی رونق ہوا کرتی تھیں۔ خاموش، ضرورت سے زیادہ سنجیدگی اور ڈیٹیچمنٹ تو بہت بعد میں ابھری تھی امی کی شخصیت میں۔ مسز پرکاش پنڈت بھی بڑی تن دہی سے خدمت کرتی تھی امی کی۔ اور وہ انہیں بالکل اپنی ماں کی طرح مانتی تھی۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ساحر، مجاز اور ایک آدھ اور شاعر "آجکل" کے دفتر اولڈ سکریٹریٹ میں جوش ملیح آبادی سے ملنے چلے جاتے تھے۔ ایسے بھی موقعے آئے جب میں بھی ساتھ تھا۔ جوش صاحب بھی تو ان دنوں بل بنگش کے علاقے میں ہی رہتے تھے۔ ایک دو منزلہ مکان میں جو ساحر کے مکان سے پہلے پڑتا تھا اور خاصا بڑا بھی تھا۔ جوش صاحب والے مکان میں ہی تو بعد میں جگن ناتھ آزاد اپنے والد تلوک چند محروم کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ سب سے اوپر والی منزل میں ساحر ہوشیارپوری رہنے لگا تھا۔ بل بنگش کی یہ لوکیلیٹی کچھ برسوں تک ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا مرکز بنی رہی۔ مجاز جب بھی دلی آتا ساحر کے ہاں ہی ٹھہرتا۔ ایک بار جب میں صبح ہی صبح ساحر سے ملنے گیا تو مال گاڑی کے ڈبے نما بڑے سے کمرے میں بچھے پلنگ پر ساحر اور مجاز دونوں پڑے سوئے تھے۔ شاید رات کو کسی مشاعرے سے بہت دیر میں لوٹے تھے۔

ساحر کا دہلی میں مختصر قیام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس زمانے میں ترقی پسند ادیبوں کا مرکز بمبئی نہیں تھا۔ دہلی تھا۔ "شاہراہ" ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا اور سبھی ترقی پسند ادیب اور شاعر اس میں لکھتے تھے۔ میرا ناول "سیندور کی راکھ" بھی پہلی بار "شاہراہ" میں ہی چھپا تھا۔ ساحر سب دوستوں کی تخلیقات بڑی محبت سے اور بنا سنوار کر چھاپتا تھا۔ اور بڑے خلوص سے ان کی رچنائیں حاصل کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میری کہانی "اندھیرے کی کوکھ" اس نے سنی تو مجھے صاف بھی نہیں کرنے دی اور "شاہراہ" میں شائع کر دی۔ کہانی کا مرکزی خیال ایک ایسی ہندو عورت ہے جو تقسیم کے دوران اغوا کر لی جاتی ہے اور جب فوج کی مدد سے اُسے برآمد کر کے ہندوستان لایا جاتا ہے تو اس کے پیٹ میں پورے دنوں کا بچہ ہے۔ ساحر نے جب یہ کہانی سنی تھی تو اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ "شاہراہ" کا وہ پرچہ جس میں میری یہ کہانی چھپی تھی مجھ سے کوئی پڑھنے لے گیا اور اس سے گم ہو گیا (جیسے کہ اکثر ہمارے ساتھ ہوتا ہے) میرے پاس اس کہانی کی نقل بھی نہیں ہے کیونکہ ساحر نے تو اسے رف شکل ہی میں مجھ سے لے لیا تھا۔ میں نے صرف اپنی بات کہی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کی تخلیقات اسی طرح لیا کرتا تھا ان سے۔ ان کی کہانیاں، نظمیں، غزلیں، مضمون اسی طرح حاصل کرتا تھا۔ بڑی معصومیت سے، مسکرا کر، پیار سے۔ ایسی معصومیت اور پیار سے کہ کہانی یا غزل تو کیا کوئی اسے جان دینے سے بھی انکار نہ کر سکتا تھا۔

اور پھر ساحر اچانک ہی دہلی سے چلا گیا ______ اس نے دہلی کیوں چھوڑ دی، یہ ایک الگ داستان ہے۔

ایک شام ساحر اپنی امی کو پرکاش پنڈت اور اس کی بیوی کے پاس چھوڑ کر بمبئی چلا گیا اور چار بنگلہ میں کرشن چندر کے پاس رہنے لگا۔ ساحر کے جانے کے بعد میں امی سے اکثر ملتا۔ اس کا مزاج پوچھتا اور بدلے میں اس کی پیاری پیاری دعائیں حاصل کرتا۔ بزرگوں کی دعائیں بھی تو ہمارے ساتھ ایک معین مدت تک ہی رہتی ہیں۔ ہم لوگوں کے لئے یہ خوبصورت پناہ گاہ بھی تو مستقل نہیں۔ بزرگ چلے جاتے ہیں تو اپنی پیاری پیاری پُرخلوص اور شفقت بھری دعائیں بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

ساحر اور پرکاش پنڈت کی دوستی بڑی مضبوط دوستی تھی۔ ایسی مضبوط دوستیاں آج کے مشینی دور میں نایاب ہیں۔
کبھی کبھی اپنے دوستوں کے بارے میں باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ اس میں کوئی لالچ نہیں ہوتا۔ کوئی اَرگومنٹ نہیں دی جا سکتی نہ۔ آج میرا من واقعی اپنے دوستوں کے بارے میں بات کرنے کو چاہ رہا ہے بھلے ہی اس میں کوئی لالچ نہ ہو۔

میرا ایک دوست سکھ دیو پرشاد ہے۔ ابھی حال ہی میں ہریانہ سرکار سے ہوم سکریٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہوا ہے۔ یہ کئی سال پہلے کی بات کر رہا ہوں جب وہ ڈپٹی کمشنر بن کر کرنال گیا تھا۔ کرنال ضلع کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہاں ہندوستان کی تقدیر پلٹ دینے والی کئی لڑائیاں لڑی گئیں۔ پانی پت کی تین لڑائیاں، تھانیسر کی لڑائی اور پھر کوروکشیتر کا مہا یدھ۔ اسی علاقے میں تو کرشن نے ارجن کو وہ اپدیش دیا تھا جس سے گیتا کا جنم ہوا۔ جہاں کرنال کا ضلع جنگوں کے لئے مشہور ہے وہاں اس کی ادبی حیثیت بھی ہے۔ اب کوروکشیتر کا ضلع بن جانے سے جنگوں کا بھی بٹوارہ ہو گیا ہے۔ الطاف حسین حالی پانی پتی کرنال کے ضلع کے ہی تو تھے۔ پانی پت میں سر سید احمد خاں، علامہ اقبال اور علم و ادب سے تعلق رکھنے والی کئی نامور ہستیاں آ چکی ہیں۔ بو علی قلندر بھی یہیں کے تھے۔ ان کا مزار بھی پانی پت میں ہی ہے۔ حالی بے چارے کی تو ایک چھوٹی سی قبر تھی۔ بو علی قلندر کا تو بہت بڑا مزار ہے۔ یہاں سبھی فرقوں کے لوگ سجدہ گزارنے آتے ہیں۔ جب سکھ دیو پرشاد نے کرنال میں ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے چارج لے لیا تو میرا وہاں جانا لازمی ہو گیا۔ دس پندرہ روز میں تو وہاں جانا ہو ہی جاتا تھا۔ کبھی کسی دفتری کام سے اور کبھی ذاتی دورے کے طور پر۔ سکھدیو پرشاد علم و ادب سے عشق کرنے والا آدمی ہے اور میرا اس سے بہت پرانا تعلق ہے۔ ایک بار جب میں کرنال گیا تو اس نے کہا کہ وہ اس ضلع کی ادبی اور کلچرل ترقی کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہے اور مجھ سے پوچھا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کرے۔ میں نے حالی کی ادبی اہمیت کا ذکر کیا اور تجویز پیش کی کہ وہ حالی کے نام پر کوئی پارک بنوا ڈالے، کوئی لائبریری کھول دے۔ اور سب سے پہلا کام یہ کرے کہ حالی کے پرانے مقبرے کو ٹھیک کرا دے اور اس کو ایسی شکل دلائے جو حالی کی شان کے شایاں ہو۔ اور پھر ہر سال حالی کی یاد میں پانی پت میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کرائے۔ سکھدیو پرشاد نے میری سبھی تجویزیں مان لیں! اور ان کی تکمیل کے سارے پروسس میں مجھے ساتھ رکھا۔ پانی پت کے ماڈل ٹاؤن کے باہر والے حصے میں ایک بہت ہی پرانا اور گندہ جوہڑ تھا جو سوائے مچھروں کو پالنے اور سارے شہر میں سڑاند پھیلانے کے کسی کام نہ آتا تھا! اس نے اس جوہڑ کو ایک شاندار پارک میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور فوراً ہی کام شروع کرا دیا۔ اس برس حالی کے جنم دن پر پہلا آل انڈیا مشاعرہ اسی نامکمل پارک کے وسیع ایریا میں منعقد کیا گیا۔ سکھدیو پرشاد تین سال تک کرنال کا ڈپٹی کمشنر رہا۔ اور تینوں سال پانی پت میں کل ہند مشاعرے ہوتے رہے۔ اسی خوبصورت وسیع پارک میں جس کا نام حالی پارک رکھا گیا تھا۔ حالی کا مقبرہ از سرِ نو تعمیر ہوا اور اس کے نام پر ایک لائبریری بھی کھل گئی۔ میں اس آخری کل ہند مشاعرے کا ذکر کر رہا ہوں جس میں شریک ہونے کے لئے ساحر آیا تھا اور اس کے ساتھ امی عقیل اور انور بھی تھی۔ ساحر کا ڈاکٹر دوست بھی اس کے ہمراہ آیا تھا۔ اس مشاعرے میں ساحر کے علاوہ بمبئی سے کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، اور سردار جعفری بھی آئے تھے۔ کیفی کی طبیعت ان دنوں ٹھیک نہیں تھی لیکن اس نے بھی میرا کہا نہیں ٹالا تھا اور پانی پت کے کل ہند مشاعرے میں شرکت کرنے آیا تھا۔ صابر دت بھی ان کے ساتھ تھا۔ اب امی خاصی بدل چکی تھیں۔ مجھے انہوں نے پہچانا بھی نہیں۔ ساحر کے روکنے کے باوجود ہم امی کو بھی چند لمحوں کے لئے اسٹیج پر لائے تھے اور اس کے گلے میں ہار ڈالے تھے! اس سے تسکین صرف ہمیں ملی تھی ہم جو امی کے پرستاروں اور عقیدتمندوں میں سے تھے اس سے نہ تو ساحر کو کوئی فرق پڑا تھا نہ اس کی امی کو۔

میں نے ساحر کو تیسرے درجے کا مسافر اس لئے کہا ہے کہ ان دنوں ابھی ریل والوں نے تیسرے درجے کے کمپارٹمنٹوں کو دوسرے درجے کا نام نہیں دیا تھا۔ نئے نام کرن سنسکار سے بھی فرق کچھ نہیں پڑا تھا۔ ڈبے وہی تھے پرانے اور خستہ۔ صرف ان پر نیا روغن کر دیا تھا ریل والوں نے۔ ہمارے سماج کا المیہ تو یہی ہے کہ ہم پرانے گلے سڑے ڈھانچوں پر روغن کر دینے سے سمجھنے لگتے ہیں کہ نظام بدل گیا ہے۔ لیکن اس عمل سے نہ تو نظام ہی بدلتا ہے اور نہ عوام کی تقدیر ہی بدلتی ہے۔ سماج کا ڈھانچہ اور عوام کی تقدیر دونوں آپس میں بڑی مضبوطی سے جڑے ہوئے ہیں۔ جو نا آسودگیاں اور تکلیفیں تیسرے درجے میں سفر کرنے والے مسافروں کو ہوتی تھیں وہی نا آسودگیاں اور تکلیفیں اب انہیں دوسرے درجے کے مسافر کہہ کر دی جا رہی تھیں۔ لوگ بھی وہی تھے، ریل کے ڈبے بھی وہی تھے۔ اسٹیشنوں کے پلیٹ فارم بھی وہی تھے۔ کوئی بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ صرف ڈبوں کے باہر "تیسری شرینی" کی جگہ "دوسری شرینی" لکھ دیا گیا تھا۔ وہ بھی ہندی میں، اردو میں نہیں۔ اردو اب بھی تیسرے درجے کے مسافروں کی ہی زبان تھی۔ اسے دوسرے درجے کی زبان نہیں بنایا گیا تھا اور لطف یہ تھا کہ تیسرے درجے کی زبان کے شاعروں کو دوسرے اور پہلے درجے کے لوگ زیادہ شوق سے سنتے تھے اور زیادہ خلوص سے داد دیتے تھے۔ کوی سمیلنوں میں لوگ جاتے تھے۔ کویتائیں بھی سنتے تھے لیکن شعر اردو کے یاد کرتے تھے۔ ہندی کی کویتائیں نہیں۔ اردو کے شعر خاص طور پر عورتیں، اپنی اپنی نوٹ بکوں میں دیوناگری لپی میں لکھتی تھیں اور انہیں بڑے فخر سے اپنی کِٹّی پارٹیوں میں سناتی تھیں۔ اور داد حاصل کرتی تھیں۔ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ یہ کیفیت اب بھی جاری ہے اور اس کا چلن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ تیسرے درجے کی زبان کے شاعروں کو دوسرے درجے کی آبادی کی سرپرستی حاصل ہے۔ (عورتیں ہمارے ملک میں دوسرے درجے کی شہری ہیں۔ انہیں پہلے درجے کی شہری بننے میں اتنی ہی دیر لگے گی جتنی اس انقلاب کے آنے میں لگے گی جس کے لئے جانے کتنی مدت سے کوشش ہو رہی ہے)

ساحر تیسرے درجے کی زبان کا شاعر تھا اس لئے اس نے اپنی روایات کو نہیں توڑا۔ وہ زندگی بھر ہوائی جہاز میں نہیں بیٹھا۔ وہ دوسرے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی طرح ماسکو نہیں گیا۔ کیونکہ وہ ہوائی جہاز میں سفر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے زندگی بھر اپنی دھرتی کی بو باس کو سنوارا اور اپنی دھرتی کے عوام کے دکھ درد کا حصہ دار رہا۔ نہ اس نے کبھی سرمایہ داروں کے قصیدے لکھے اور نہ ہی کبھی ان کی عیش کا حصہ دار بنا۔ نہ اس نے ادب میں ایسا کیا نہ فلم میں! اس نے کبھی عوام سے اپنا ناطہ نہیں توڑا اور اس کی شاعری اسی رشتے کو مضبوط کرنے کی ایک بہت بڑی ادبی اور عوامی کوشش ہے۔

مجھے یہاں ایک واقعہ یاد آ گیا۔

ساحر کو لدھیانہ سے عشق تھا۔ وہ جب بھی دہلی تک آتا ایک آدھ دن کے لئے لدھیانہ ضرور جاتا۔ وہاں اس کے دوست بھی تھے اور پرستار بھی۔ وہ دھرتی بھی موجود تھی جس کی فضا میں وہ جیا تھا وہ کالج بھی موجود تھا جس کی دیواریں اب بھی اس کے شعروں سے گونجتی ہیں۔ ان دنوں لدھیانہ کے ڈپٹی کمشنر سردار سیوا سنگھ تھے۔ ایک نفیس، با اخلاق اور کلچرڈ شخص۔ انہیں بھی علم و ادب سے محبت ہے۔ جن دنوں وہ چنڈی گڑھ یونین ٹیریٹری کے ایجوکیشن اور فائنانس سکریٹری تھے۔ ان کی مدد ہی سے تو میں دو بار انڈو پاک مشاعرے منعقد کرا سکا۔ ان مشاعروں میں رئیس امروہوی، احمد فراز، پروین شاکر، کنور مہندر سنگھ بیدی، صابر دت، خمار بارہ بنکوی، بشیر بدر، جمیلہ بانو اور دوسرے کئی شعراء شریک ہوئے اور چنڈی گڑھ کے چیف کمشنر کے ہنر جی نے انہیں نہ صرف

اسٹیٹ گیسٹ بنایا بلکہ انہیں اعزاز بھی دیئے۔ سردار سیوا سنگھ نے ساحر کی آمد پر لدھیانہ میں ایک بہت اچھا مشاعرہ کرایا تھا۔ لوگوں نے اپنے محبوب شاعر کو جی بھر کر سنا اور جی بھر کر داد بھی دی۔ اسی محفل میں یہ فیصلہ ہوا کہ کلب کے پیچھے والی سڑک کا نام "ساحر روڈ" رکھا جائے۔ جب اسٹیج پر یہ تجویز رکھی گئی تو سردار سیوا سنگھ نے یہ اعلان کرتے ہوئے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور ساحر کے گلے میں پھولوں کا ہار بھی ڈالا۔ ساحر نے جب ڈپٹی کمشنر کا اور لدھیانہ کے دوستوں کا شکریہ ادا کیا تو کہا

"میں ڈپٹی کمشنر صاحب کا اور آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے وہ اعزاز بخشا ہے جس کا میں واقعی مستحق ہوں۔" لوگوں نے تالیاں تو بجائیں لیکن ساحر کے لطیف اشارے کو نہ سمجھ پائے۔ تالیوں کی گونج ختم ہوئی تو ساحر نے کہا:

"میں اس اعزاز کا اس لئے حق دار ہوں کہ میری تمام عمر سڑکوں پر گزری ہے۔" تمام ہال قہقہوں سے گونج اٹھا اور اس ترنم گونج میں تالیوں کی گونجیں بھی شامل ہو گئیں۔ ساحر نے اپنی دھرتی کے سینکڑوں لوگوں کے سامنے یہ قبول کیا تھا کہ وہ تیسرے درجے کا آدمی تھا جس کی تمام عمر سڑکوں پر گزری تھی انہی سڑکوں پر جن پر عوام اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور چھوٹے چھوٹے غم جھولیوں میں ڈالے گھومتے رہتے ہیں اور زندگی سے مایوس نہیں ہوتے۔

ہاں تو میں بات کر رہا تھا پانی پت کے کل ہند مشاعرے کی۔ کیونکہ صابر دت بھی اس مشاعرے میں شریک تھا۔ اس لئے وہ میری بات کی تصدیق کرے گا۔ اس مشاعرے میں ہریانہ سے اتنے لوگ نہیں آئے تھے جتنے کہ دہلی اور پنجاب اور چنڈی گڑھ سے آئے تھے۔ اپنے محبوب شاعروں کو سننے کے لئے۔ لیکن جو لوگ لدھیانہ سے آئے تھے وہ صرف ساحر کے لئے آئے تھے اور بضد تھے کہ اگلے دن ساحر اُن کے ساتھ لدھیانہ چلے کیونکہ وہاں روٹری کلب اور کچھ دوسری انجمنوں نے مل کر ایک مشاعرہ ارینج کیا تھا جس کی صدارت گیانی ذیل سنگھ جی کر رہے تھے جو اُن دنوں پنجاب کے چیف منسٹر تھے۔

"میں ذاکر دا مہماں آں۔ او ایدے کولوں پچھو۔" ساحر نے لدھیانہ سے آئے ہوئے دوستوں سے کہا۔ وہ لدھیانہ جانے کو تیار تھا لیکن ان لوگوں کو اجازت مجھ سے لینی چاہئے تھی۔ کیونکہ وہ میرا مہمان تھا۔

یہ تھا ساحر کا اخلاق! یہ تھی ساحر کی دوستی کی قدریں!

اس سے اگلے روز کاروں میں نہ صرف ساحر لدھیانہ گیا بلکہ سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، صابر دت اور میں بھی گئے۔

لدھیانہ کا وہ مشاعرہ ایک الگ ہی نوعیت کا تھا۔ اس مشاعرہ میں سوائے ہم چھ شاعروں کے کسی دوسرے شاعر نے کلام نہیں پڑھا سوائے کرشن ادیب کے جو ہمارا ہی ساتھی تھا اور ساحر کا بہت پیارا دوست۔ مشاعرہ کی نظامت بلجیت سنگھ سجاد نے کی تھی۔ اس مشاعرے کی سب سے بڑی خوبصورتی یہ تھی کہ گیانی ذیل سنگھ جی نے بڑی ہی خوبصورت تقریر کی تھی بڑی ہی پیاری اردو میں۔ انہوں نے اس تقریر میں ادیبوں اور شاعروں کے لئے جو الفاظ استعمال کئے تھے وہ سنہری الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ انہوں نے ہم سب شاعروں کے گلے میں بہت ہی خوبصورت ہار ڈالے اور ہمیں باری باری اپنے سینے سے لگا کر دعائیں دیں۔ پنجاب کو ایسا اسکالر چیف منسٹر پھر شاید کبھی ہی ملے۔

لدھیانہ سے اگلے روز ساحر اور جاں نثار اختر اور صابر میرے ساتھ چنڈی گڑھ آ گئے۔ کیفی اور سردار جعفری دہلی چلے گئے ساحر ماؤنٹ ویو میں ٹھہرا، جاں نثار اختر میرے گھر۔ ساحر چنڈی گڑھ میری خاطر نہیں آیا تھا اور نہ ہی کسی مشاعرے میں شرکت کرنے آیا تھا۔

پانی پت اور لدھیانہ کے بعد کسی اور مشاعرے کی اب ضرورت ہی کہاں رہ گئی تھی۔

ساحر چنڈی گڑھ اس لئے آیا تھا کہ اس دن اس کے نہایت عزیز دوست شیو کمار بٹالوی کے بچے کی سالگرہ تھی۔ ساحر لدھیانہ سے میرے ساتھ آیا ضرور تھا لیکن اس نے تمام دن شیو کمار بٹالوی کے گھر میں گزارا تھا۔ مجھے وہ اُس دن نہیں ملا۔ اگلے دن جانے سے پہلے اور جاں نثار اختر کو ساتھ لے جانے کے لئے میرے گھر آیا تھا۔ اور پھر وہ اور اختر اور صابر تینوں دہلی چلے گئے تھے۔ آج شیو کمار بٹالوی اس جہاں میں نہیں لیکن اس کی نظمیں پنجابی ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ شیو بھی ساحر کی طرح تیسرے درجے کا ہی آدمی تھا۔ وہ جیا بھی تیسرے درجے کے آدمی کی طرح اور مرا بھی انہیں میں سے ایک ہو کر۔

اب کہاں ہے وہ دوستوں کی خاطر مرنے والا پیارا شخص! جسے اس کے والد چودھری فضل محمد نے قرآن شریف دیکھ کر عبدالحیٔ نام دیا تھا لیکن دنیا نے جسے ساحر کے نام سے یاد کیا اور آنے والی نسلیں بھی جسے اسی نام سے یاد کریں گی۔ ساحر واقعی جادوگر تھا الفاظ کا بھی، فن کا بھی، محبت کا بھی۔ خلوص کا بھی، دوستی کا بھی۔

ساحر!

اگر تم چند لمحوں کے لئے دوبارہ ہمارے درمیان آجاؤ تو دیکھو گے کہ ہم تمہیں اپنے درمیان نہ پا کر کتنے رنجیدہ ہیں۔ میرا یقین نہ ہو تو امرتا پریتم کی کتاب "رسیدی ٹکٹ" منگوا کر پڑھ لو۔ امرتا اپنی کتاب تمہیں تو بنا کسی رسید کے بھی بھیج دے گی۔ سچ مچ بہت پیاری کتاب ہے اس کی شاعری کی طرح۔

شاید تمہارے ہی لئے تمہارے دوست شیو کمار بٹالوی نے یہ مصرعے کہے تھے۔

سِکھر دوپہر سرتے، میرا ڈھل چلیا پرچھاواں
قبراں اُڈیکدیاں، جیوں پُتراں نوں ماواں

میرے سر پر پوری دوپہر کا سورج ہے اور میرا سایہ سکڑتا جا رہا ہے
قبریں، اسی پیار سے میرا انتظار کر رہی ہیں جیسے مائیں اپنے بیٹوں کا انتظار کرتی ہیں۔

ایسے لوگ

ساحر!!

تمہاری بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ڈھیر ساری باتیں۔ چھوٹی چھوٹی معمولی باتیں جن کے بڑے بڑے مطلب ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب نہیں کروں گا۔ اب مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں رہی کہ میں تمہاری باتوں کو یاد کرکے گزرے لمحوں کا غم ڈھوتا رہوں میرے کندھے بھی اب کمزور ہو گئے ہیں، جلدی تھک جائیں گے۔ اب نہیں ڈھو سکتا دکھوں کا اور بوجھ۔ نہیں ڈھو سکتا اب! مجھے معاف کردو!!

صرف ایک آرزو ہے کہ

جب "فن اور شخصیت" کا "ساحر نمبر" ریلیز ہو۔ اور جب تمہارے دوستوں، عزیزوں اور پرستاروں کے ہجوم میں صابر اور سرور اور انور اور حمیدہ فنکشن کے انتظامات دیکھنے میں مصروف ہوں، میں سب کی آنکھ بچا کر اس ہجوم سے اکیلا باہر نکل جاؤں اور پہنچ جاؤں اس قبرستان میں جہاں تم میری اس کتاب کو اپنے کفن میں سمیٹے سو رہے ہو۔ جس کتاب کا پہلا صفحہ میں اس رات نہیں لکھ سکا تھا۔ جو رات مجھے تمہارے ساتھ "پرچھائیاں" میں گزارنی تھی۔ اور پھر رات بھر اکیلے بیٹھ کر لکھنا تھا۔ کہ میں نے کتابیں اسی طرح لکھی ہیں۔

تم اس کتاب کو اپنے کفن میں ہی سمیٹے رکھو دوست کہ وہ کتاب اب کوئی نہیں لکھے گا کیونکہ یہاں صرف زندہ لوگوں پر ہی کتابیں لکھنے اور ان کا اجرا کرنے کا رواج ہے۔ اور ان لوگوں میں تیسرے درجے کے آدمیوں کا شمار نہیں ہوتا۔

کاش تم تین دن اور رک جاتے!

میں تو آ ہی رہا تھا تمہارے گھر۔

کاش!!

☆

کون جانے یہ ترا شاعرِ آشفتہ مزاج
کتنے مغرور خداؤں کا رقیب آج بھی ہے

ساحر لدھیانوی

فرصت
کے

لمحات
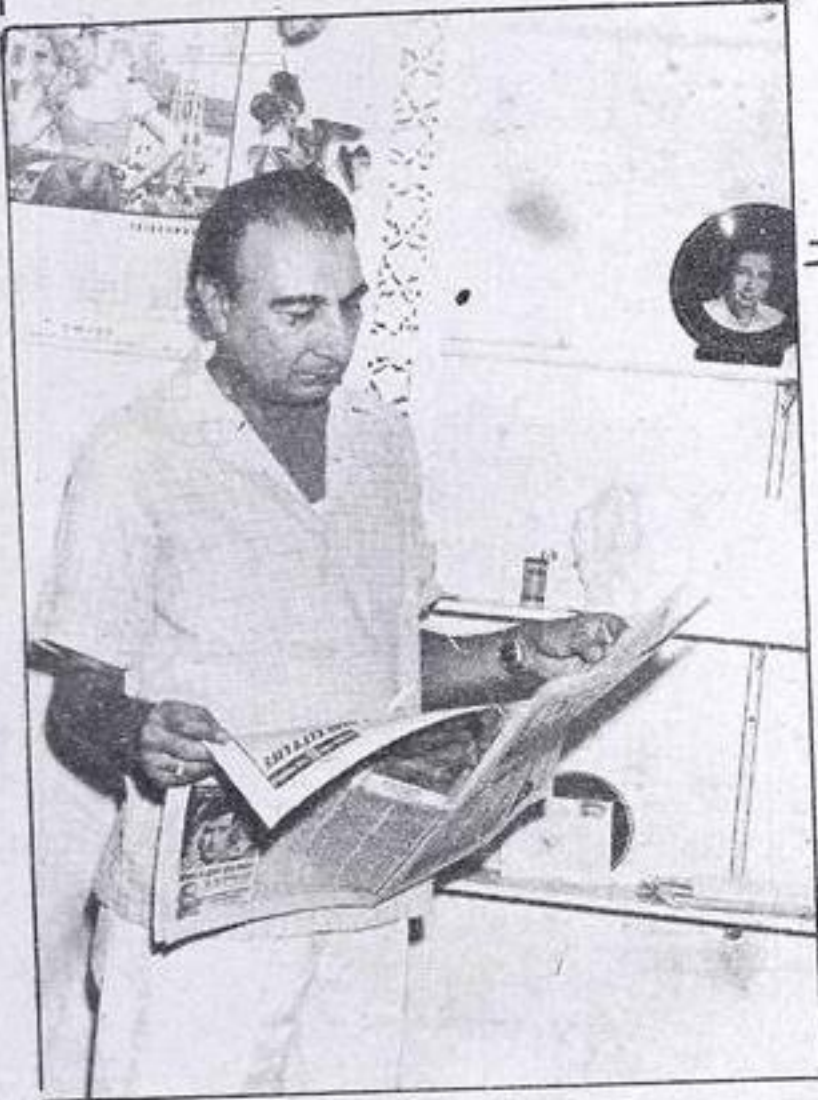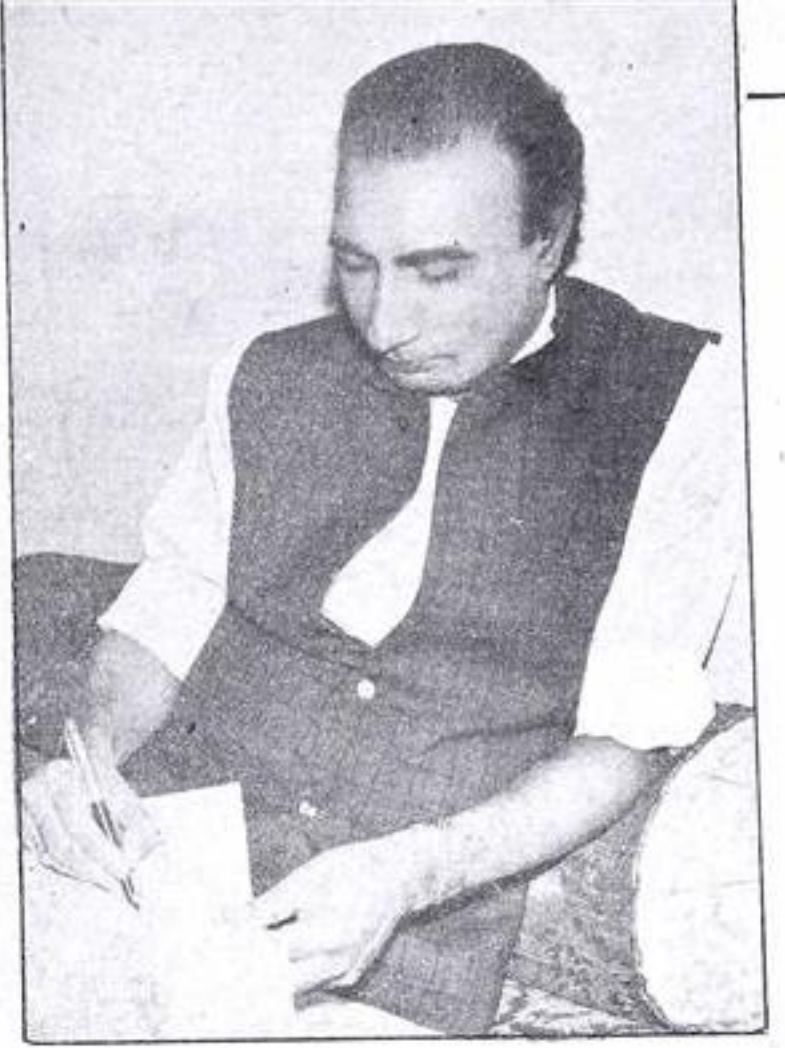
والد فضل محمد
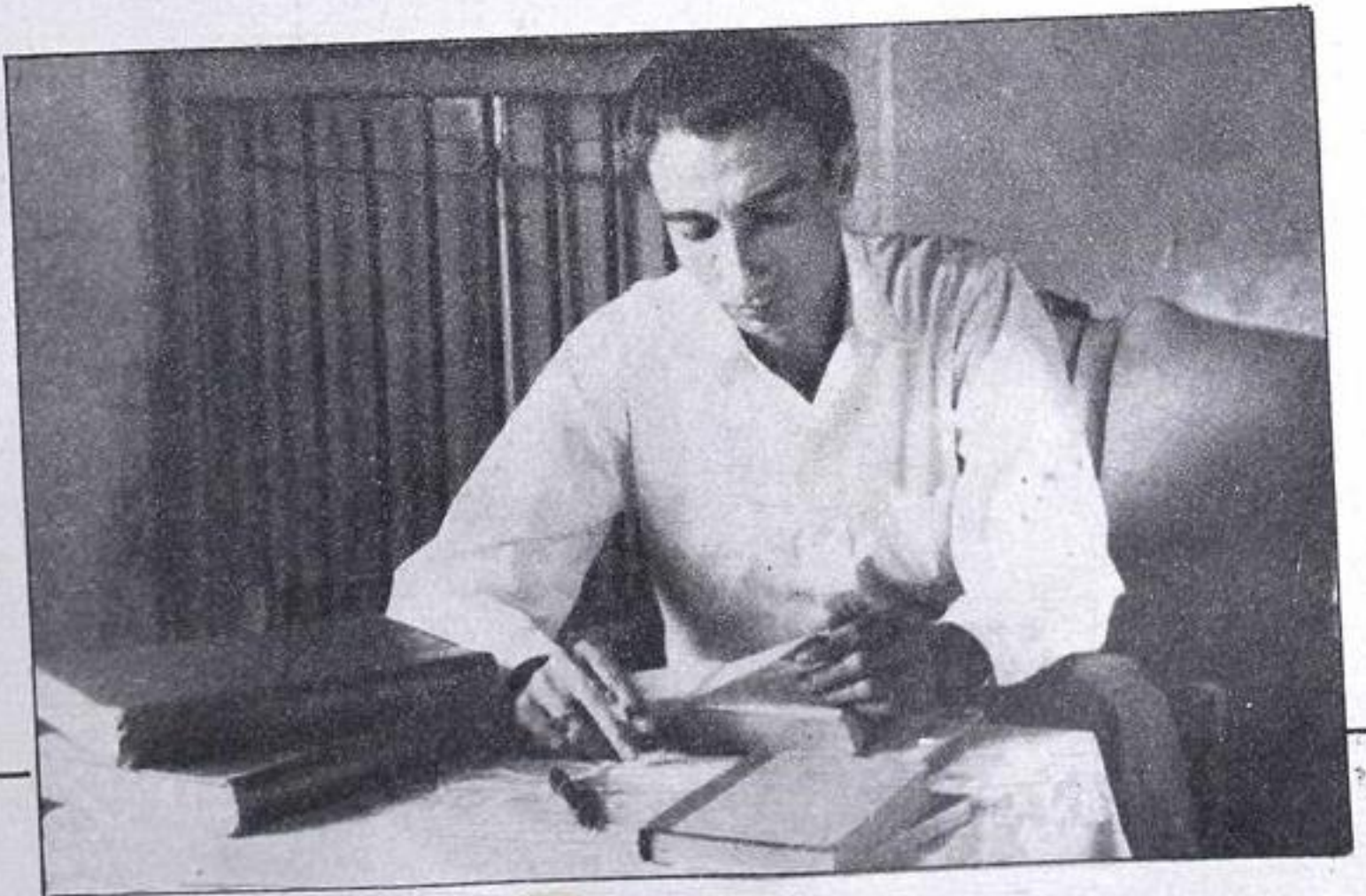
خاندان کی تصاویر

بڑے ماموں محمد شفیع اپنی بیٹیوں سرور شفیع اور انور سلطانہ کے ساتھ

ساحر، ماں جی اور انور سلطانہ

ساحر ماں اور نانی کے ساتھ

سرور شفیع، ماں جی انور سلطانہ اور زیتون بیگم (والدہ) محمد شفیع

ایک فلم کے پریمیئر میں جاتے ہوئے بہن انور سلطانہ اور ماں جی کے ساتھ

ساحر، ماں جی اور سرور شفیع (بہن) کے ساتھ

صابر دت اور ماں جی ساحر سے آٹو گراف لیتے ہوئے
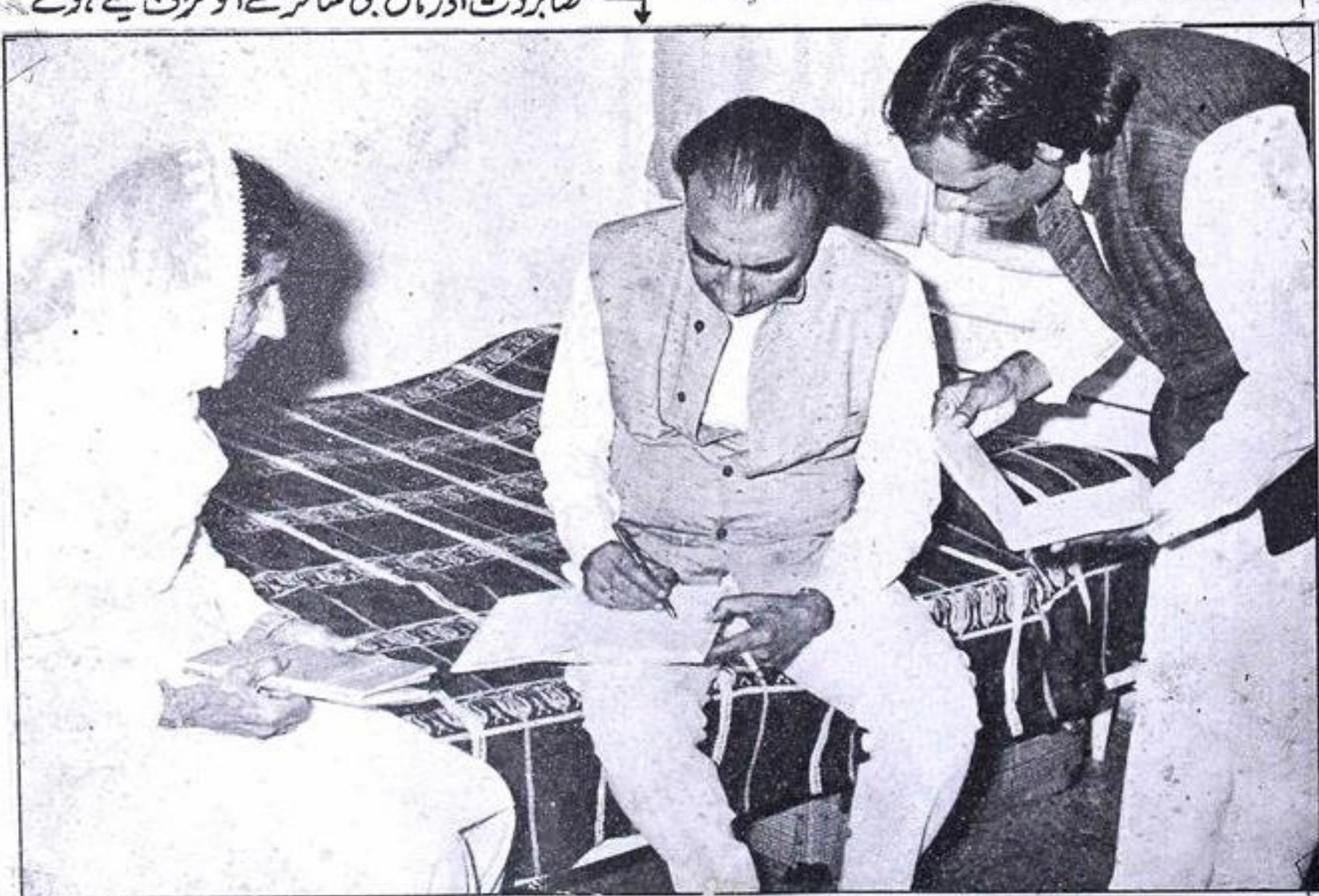
اوپر:
صدر جمہوریہ ہند دی۔ دی گری پدم شری
کے اعزاز سے نوازتے ہوئے۔

سابق وزیر اعلیٰ پنجاب، حال کے صدر جمہوریہ
ہند گیانی ذیل سنگھ جی ایک تقریب میں
گلپوشی کرتے ہوئے۔
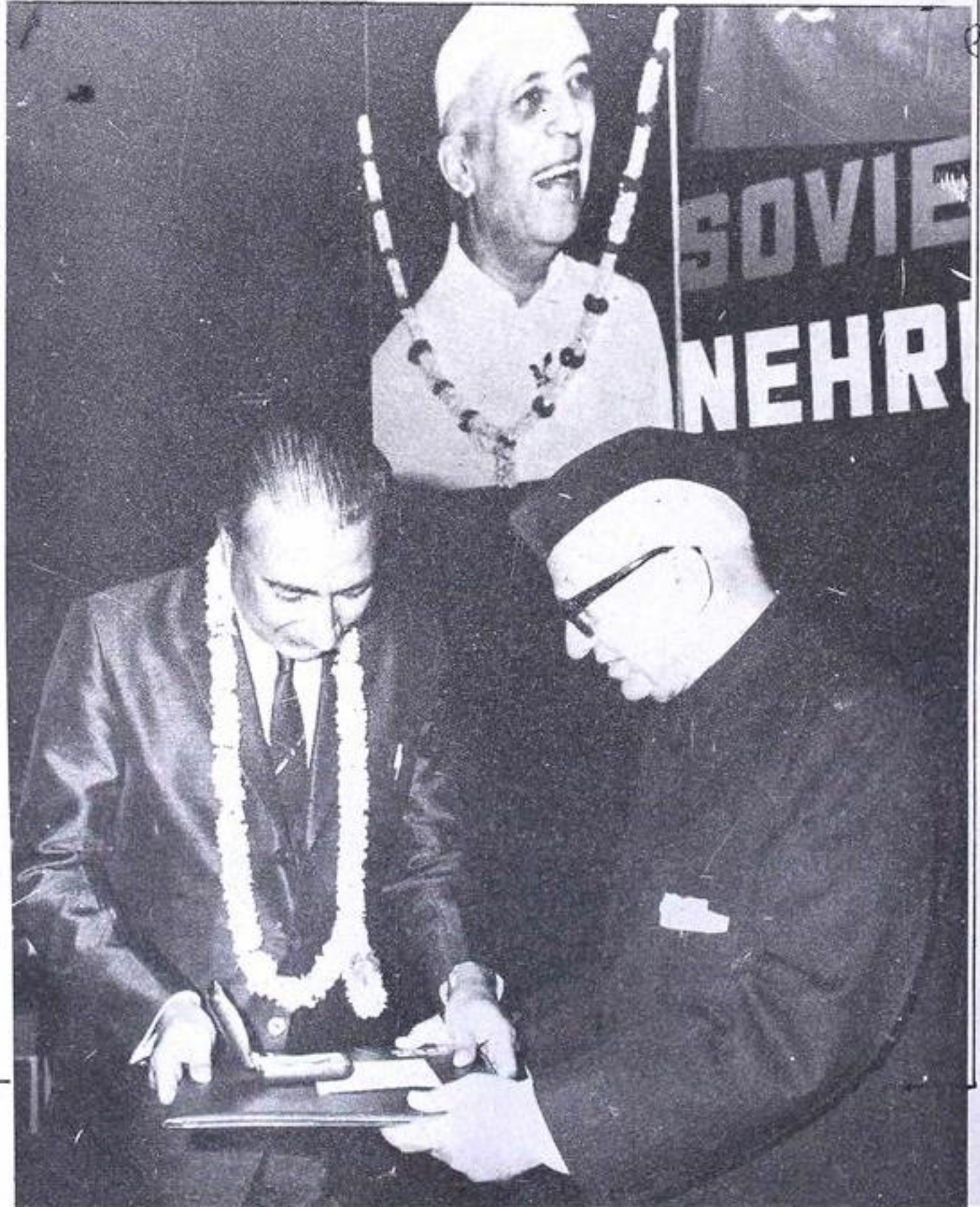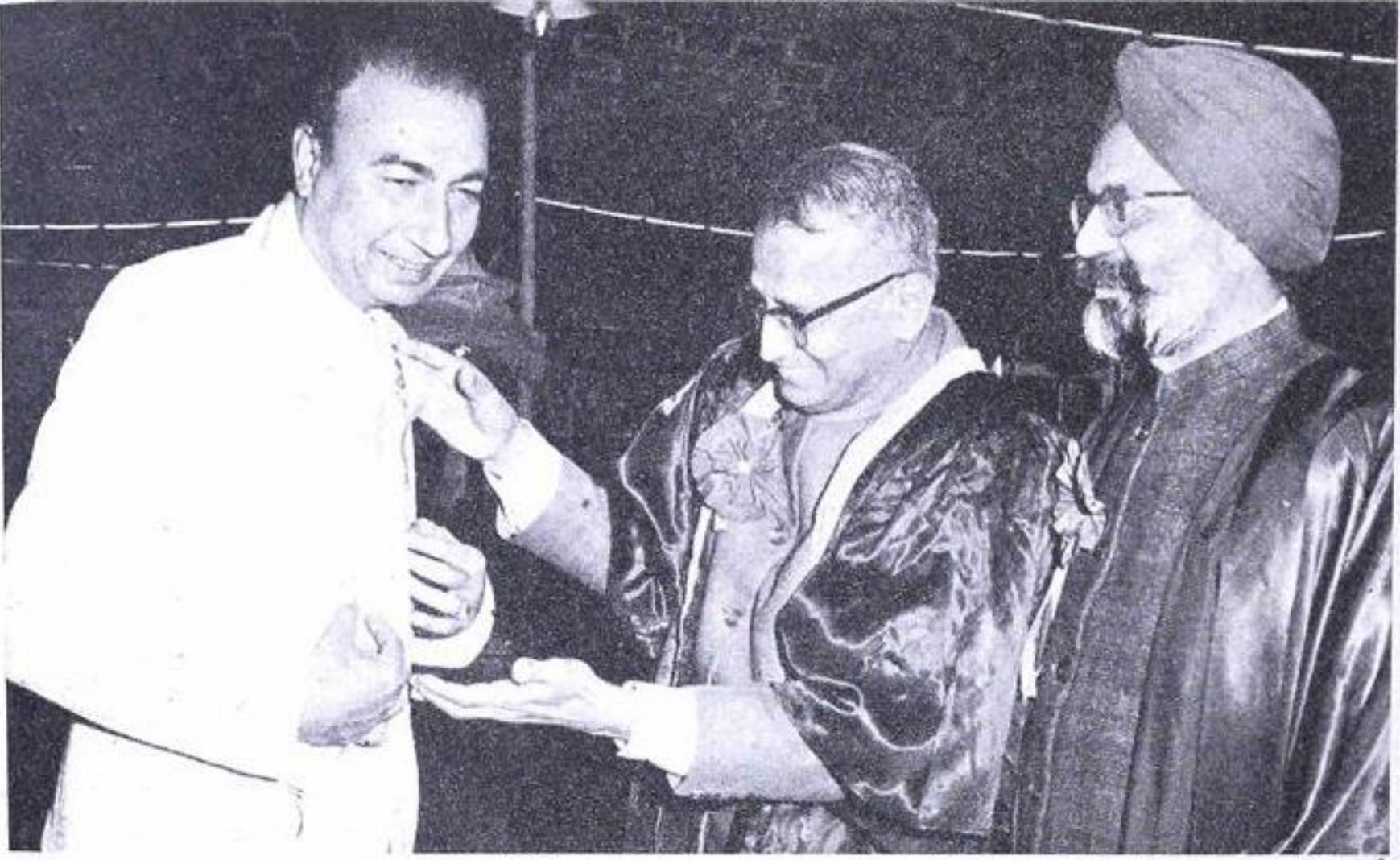
مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر وی. کے
آر. وی راؤ، گورنمنٹ کالج
لدھیانہ کی سلور جوبلی کے موقع
پر گولڈ میڈل پیش کرتے ہوئے

SOVIE
NEHRU

نائب صدر جمہوریہ مسٹر جی.
ایس پاٹھک سوویت لینڈ
نہرو ایوارڈ پیش کرتے ہوئے

جشنِ کرشن چندر کے موقع پر کرشن چندر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے نظم "کرشن پھر آئیں گے"۔ ڈائس پر درمیان میں وزیرِاعظم شریمتی اندرا گاندھی بڑے غور سے نظم سن رہی ہیں۔

دہلی کے ایک مشاعرہ میں اپنی مشہور نظم "پرچھائیاں" سناتے ہوئے۔ ڈائس پر (دائیں سے) فیض احمد فیض، ساغر نظامی (مرحوم) جگر مرادآبادی مرحوم
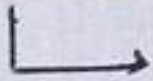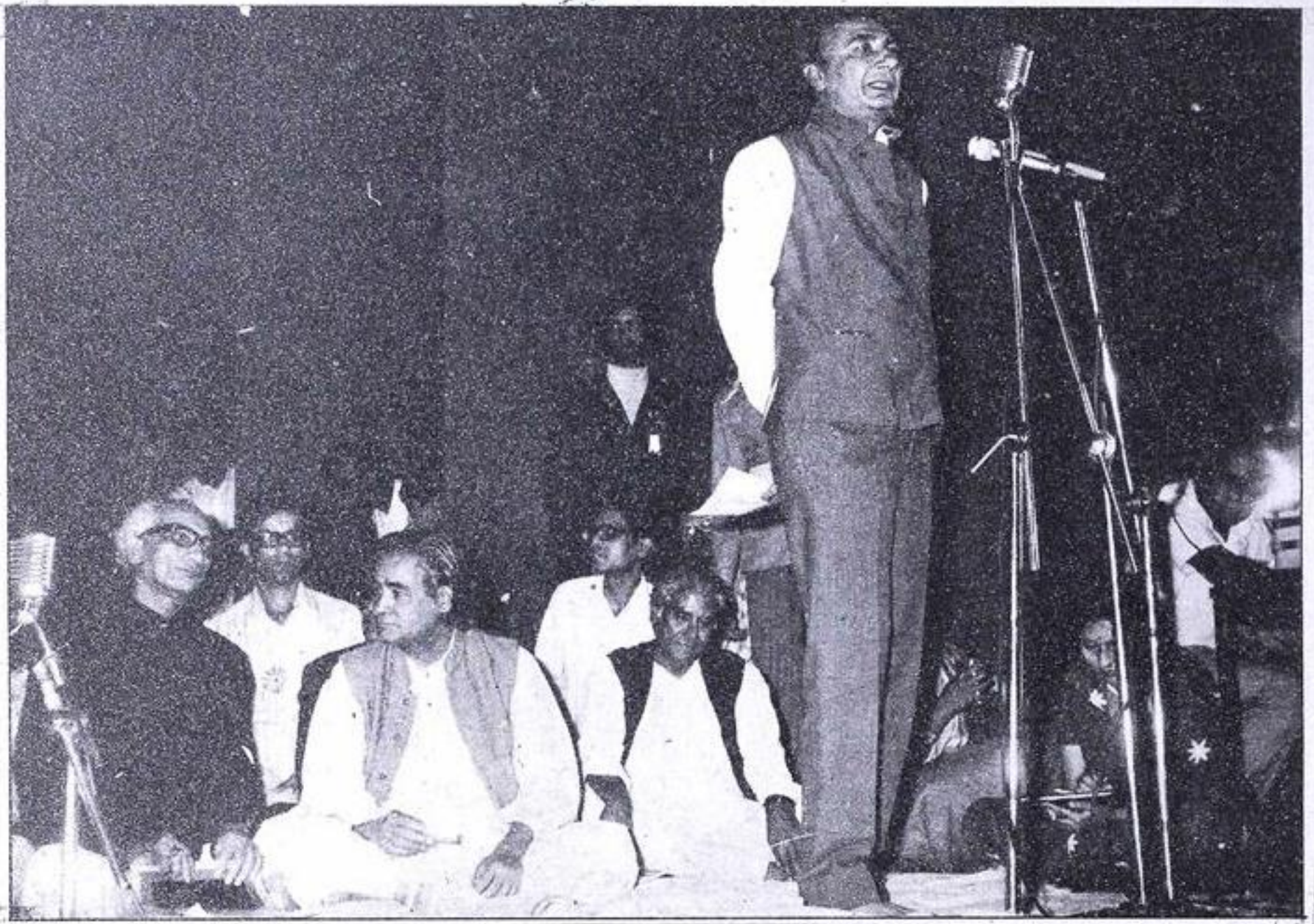
شامِ بہاراں کے مشاعرے میں ساحر نظم سناتے ہوئے۔ ڈائس پر (بائیں سے) سکندر علی وجد (مرحوم) سردار جعفری اور اختر الایمان

گورنمنٹ کالج لدھیانہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پر طلبا کو خطاب کرتے ہوئے۔
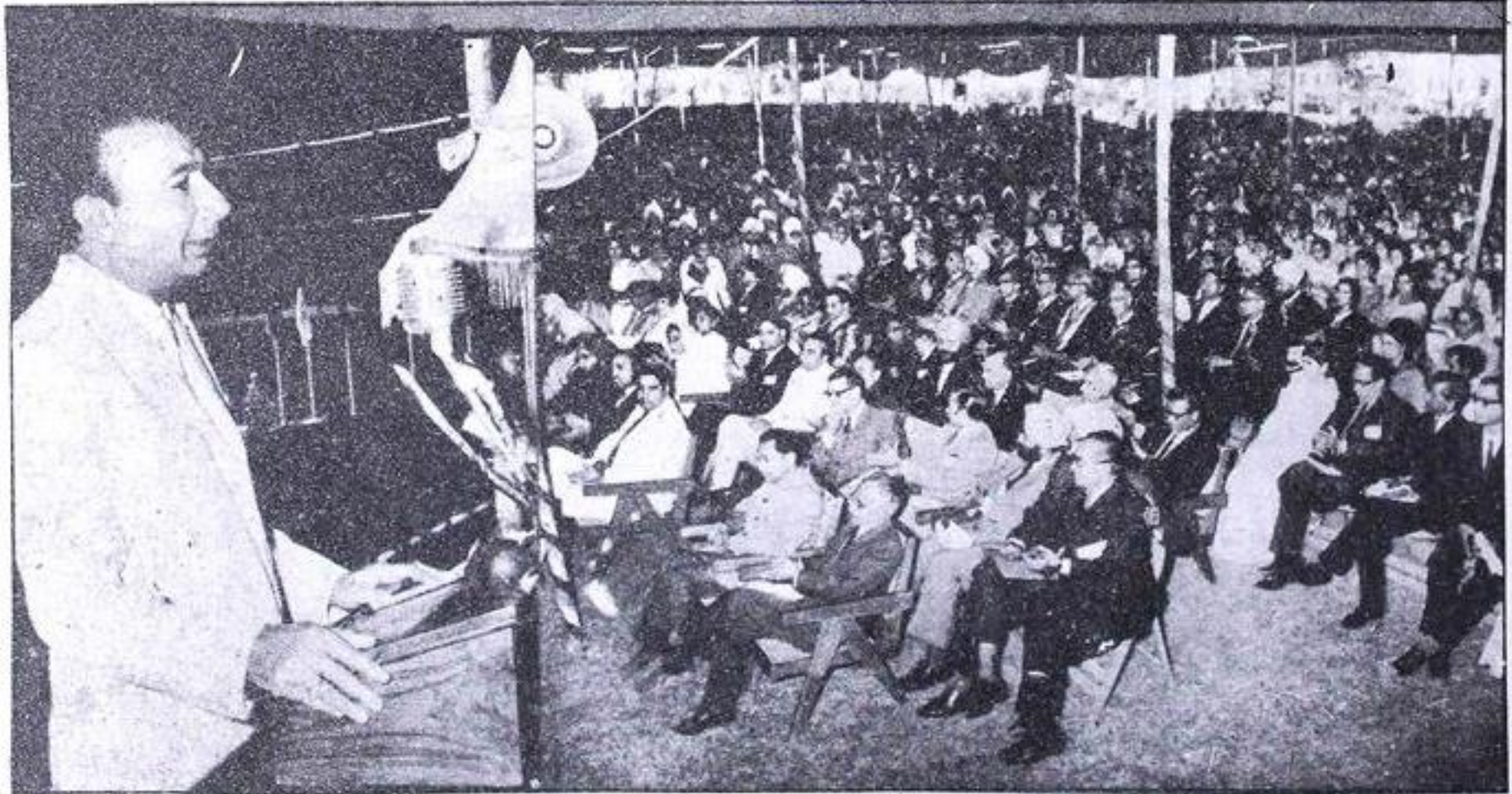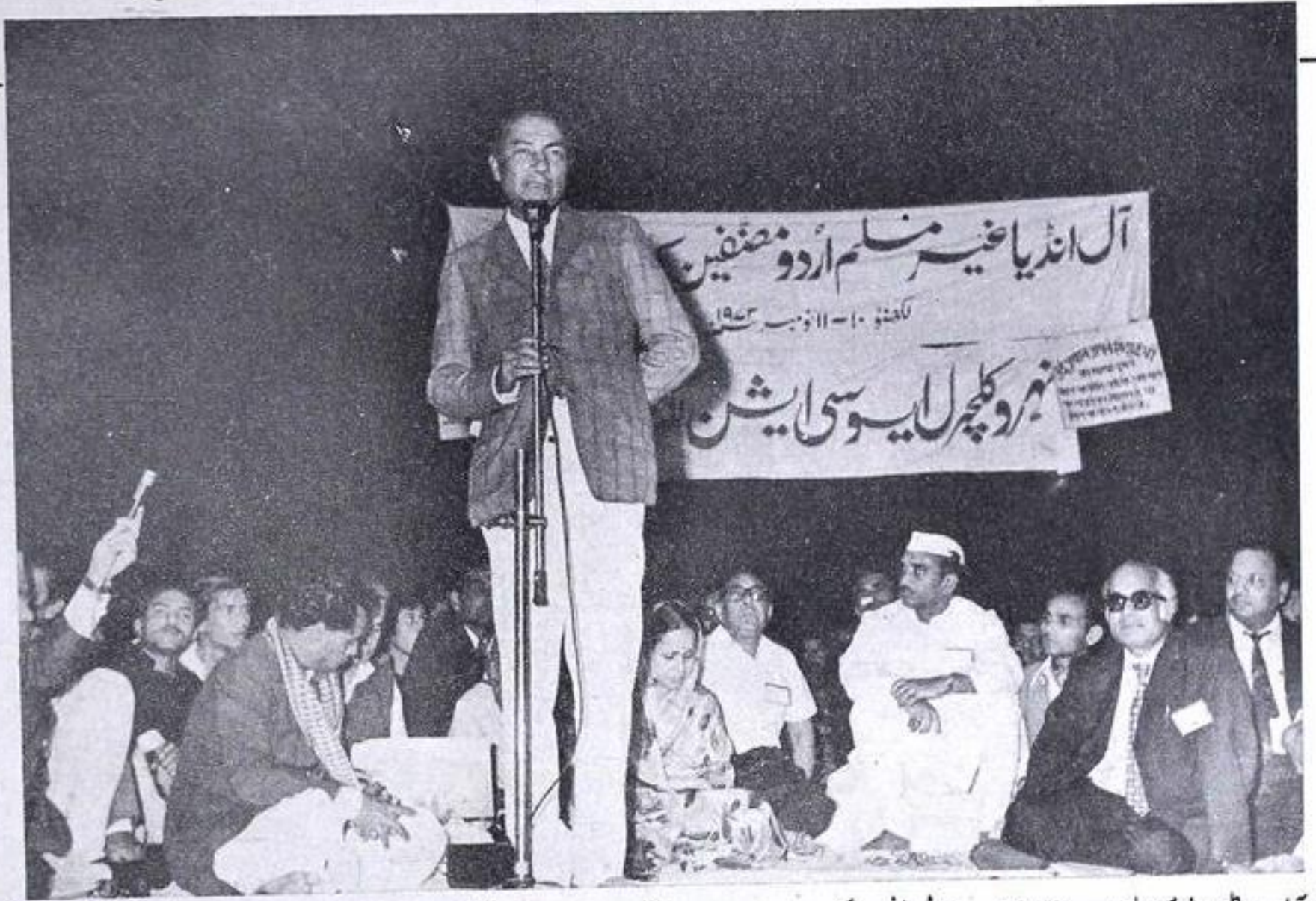
اوپر: آل انڈیا غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس کے مشاعرے میں مائک پر ساحر، ڈائس پر (دائیں سے) رام لال، بھوگنا جی، خمار بارہ بنکوی۔

نیچے: جالندھر میں نریش کمار شاد (مرحوم) کی بیوہ کی امداد کے مشاعرے میں نظم سناتے ہوئے
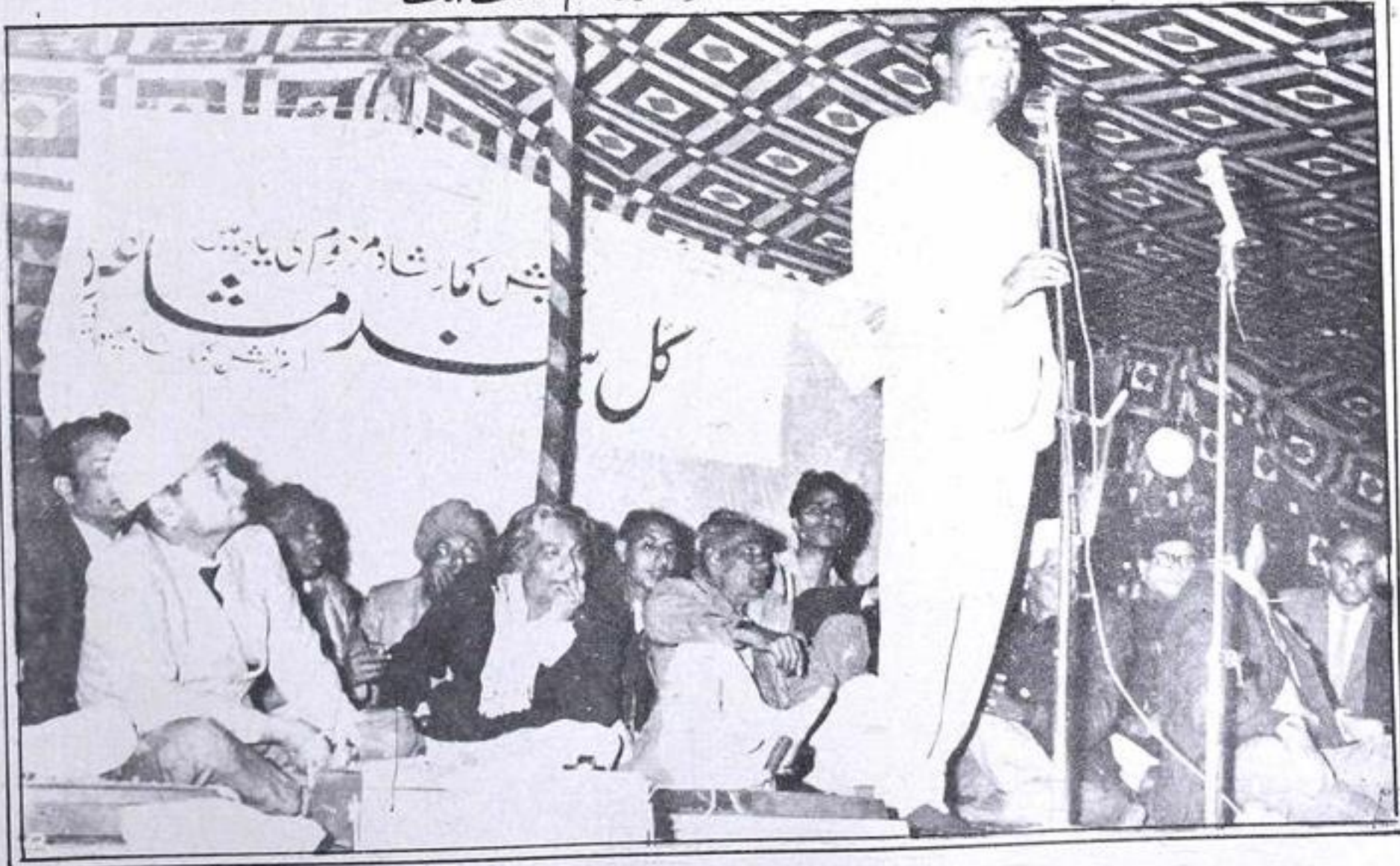
روس کے ہردل عزیز تاجکستانی شاعر جناب ترسون زادے کے ساتھ ـــــــ ↑

مشہور افسانہ نگار جناب کرشن چندر اور ساحر

ماہنامہ "آج کل" دہلی کے دفتر میں
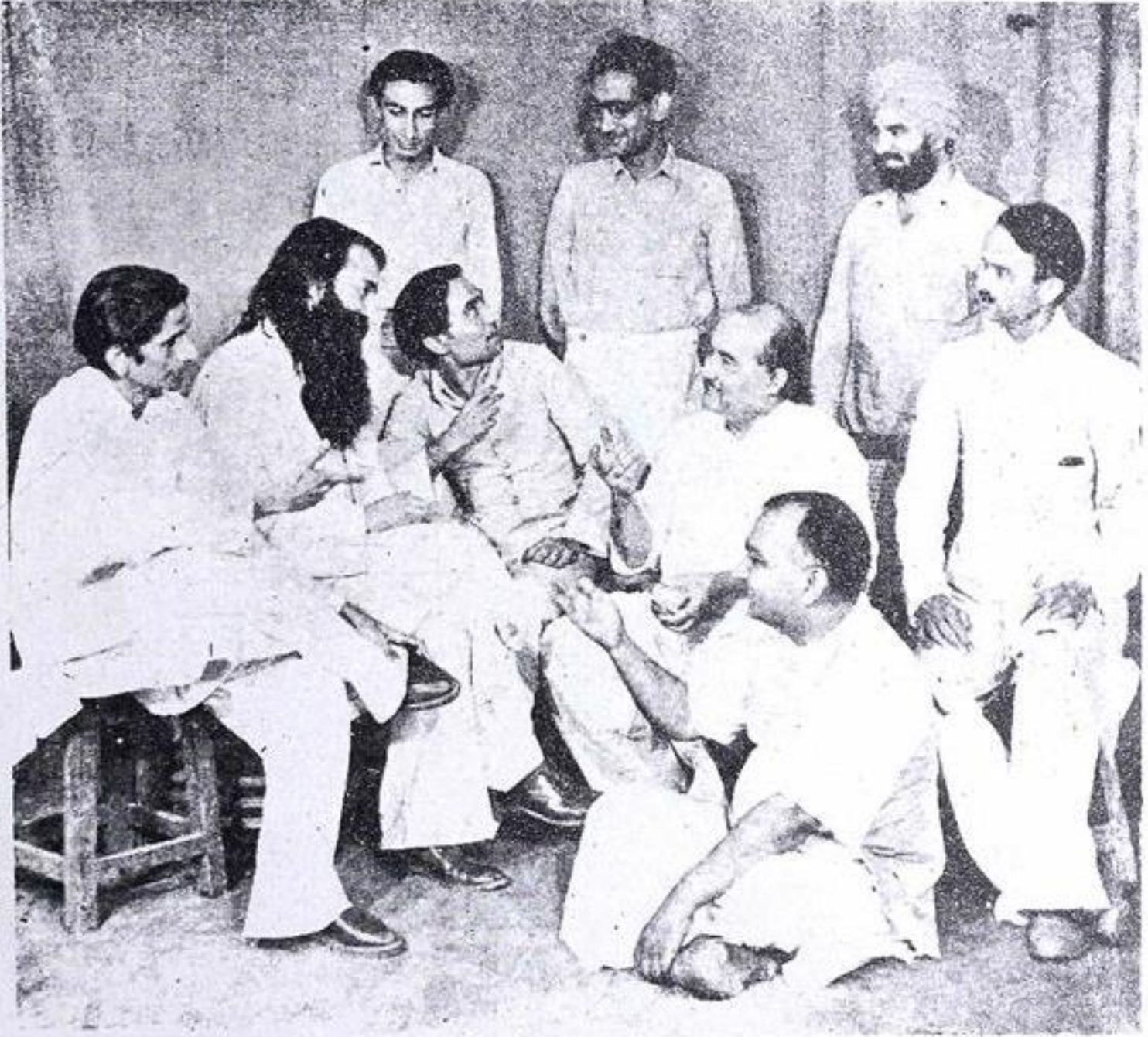
کھڑے ہوئے:۔ بلونت سنگھ ۔ جگن ناتھ آزاد ۔ ساحر لدھیانوی
کرسیوں پر بیٹھے ہوئے:۔ بسمل سعیدی، جوش ملیح آبادی، جاں نثار اختر، دیوندر ستیارتھی ۔ مجاز لکھنوی،
سامنے:۔ عرش ملسیانی

ساحر
اور
قرۃ العین حیدر

ساحر اپنے دوست ڈاکٹر
ملک راج آنند کی
سگریٹ جلاتے ہوئے
مجروح سلطان پوری
اور
ڈاکٹر ظ انصاری

ایک یادگار تصویر

بائیں سے: مہندرناتھ، حبیب تنویر، کرشن چندر، سردار جعفری، عصمت چغتائی۔ راجندر سنگھ بیدی، ممتاز حسین
سلطانہ جعفری، وشوامتر عادل اور ساحر (سمندر کے کنارے)
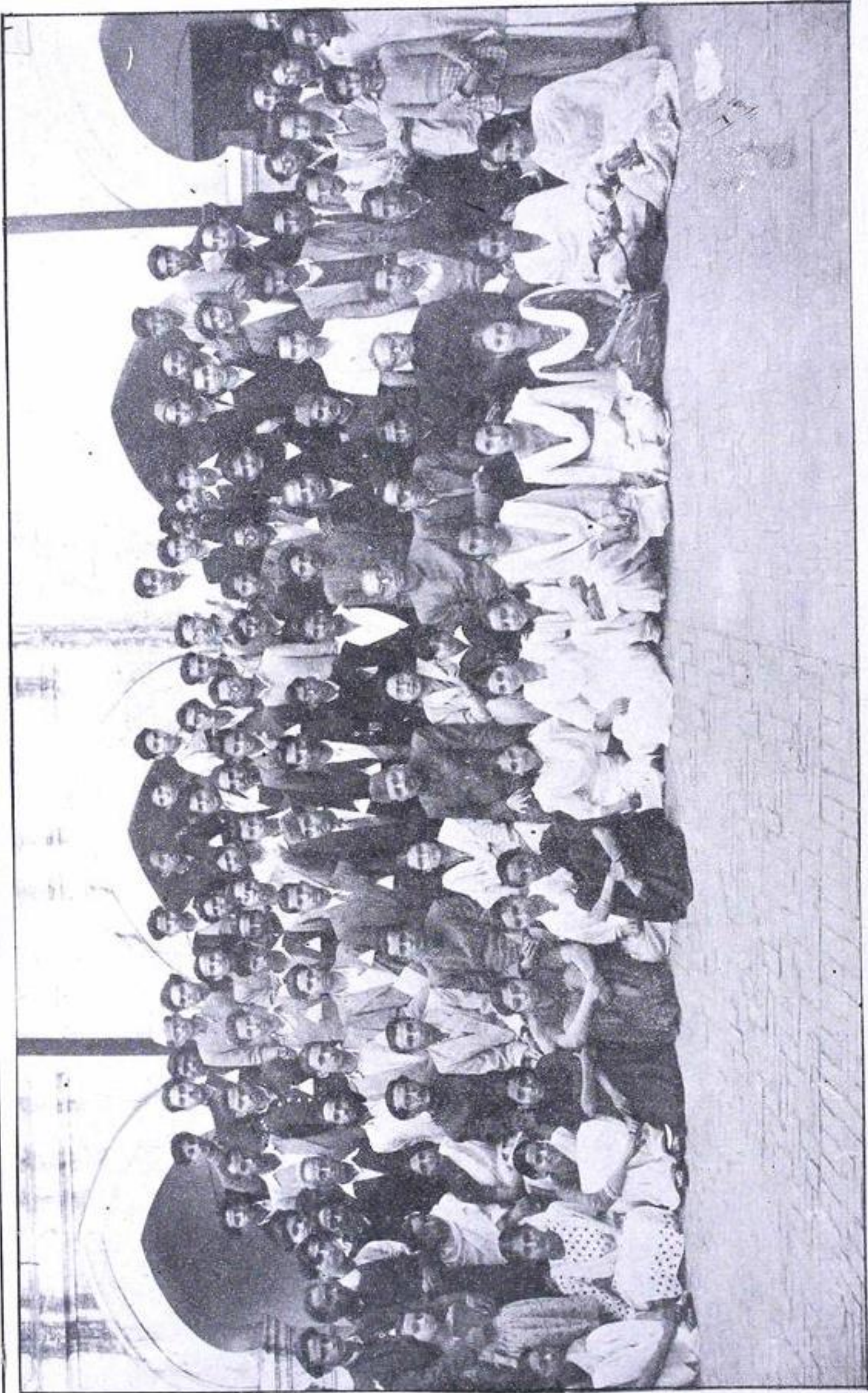
یوپی اردو کنونشن کی ایک یادگار تصویر ۴ دسمبر ۱۹۵۵ء لکھنؤ

بائیں سے کرسیوں پر:- تیسرے نمبر پر مہدی ۔ ساحر ۔ سردار جعفری ۔ ایک خاتون ۔ ڈاکٹر علیم ۔ عصمت چغتائی ۔ سجاد ظہیر ۔ باقر مہدی ۔ مجاز لکھنوی ۔ احتشام حسین
بیٹھے ہوئے بائیں سے چوتھے نمبر پر مشہور افسانہ نگار زہرہ جمال ۔

ساحر، اپنے دوست
قتیل شفائی کے ساتھ
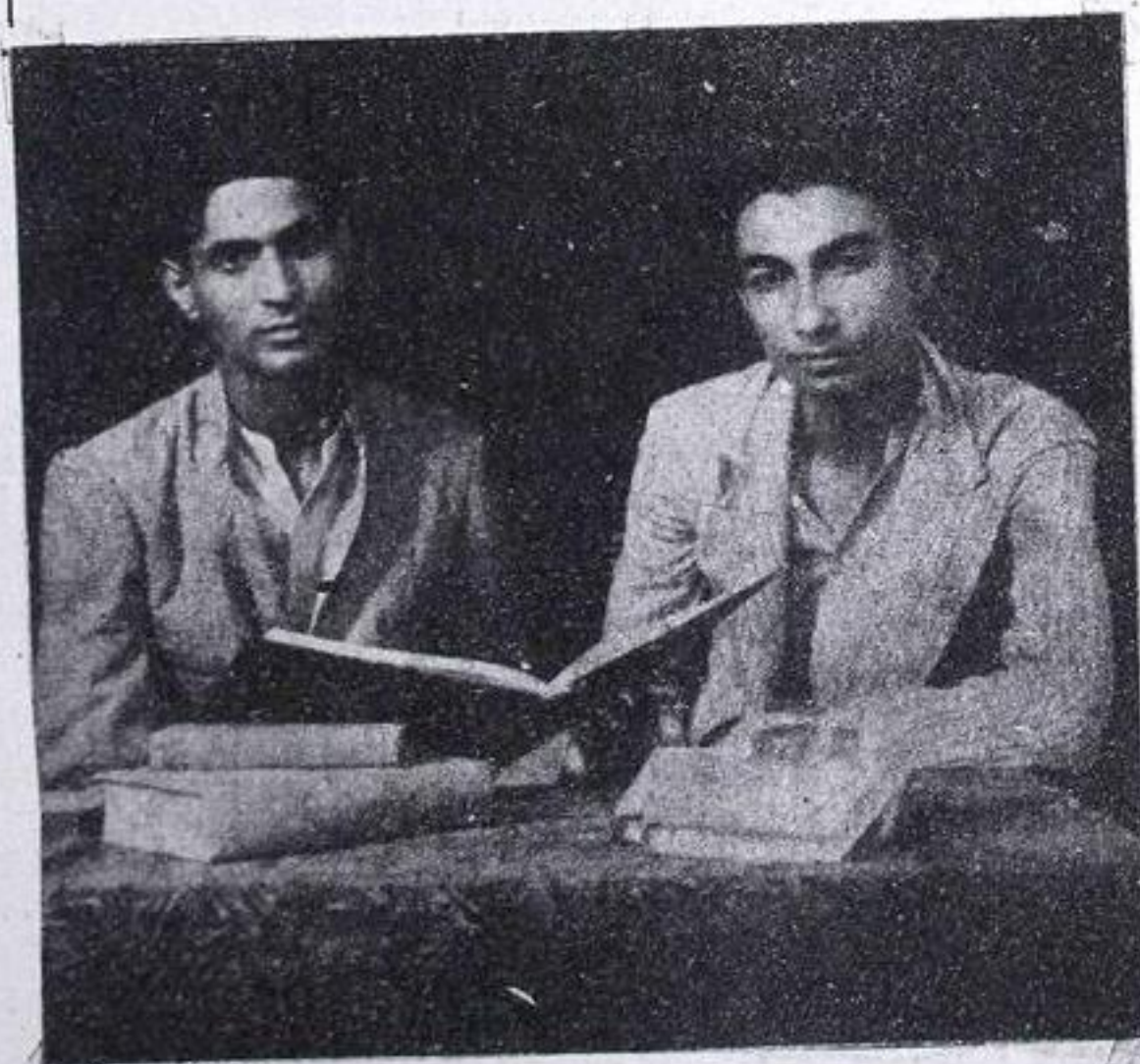
کالج کے ایّام میں
ساحر، شورش کاشمیری
کے ساتھ
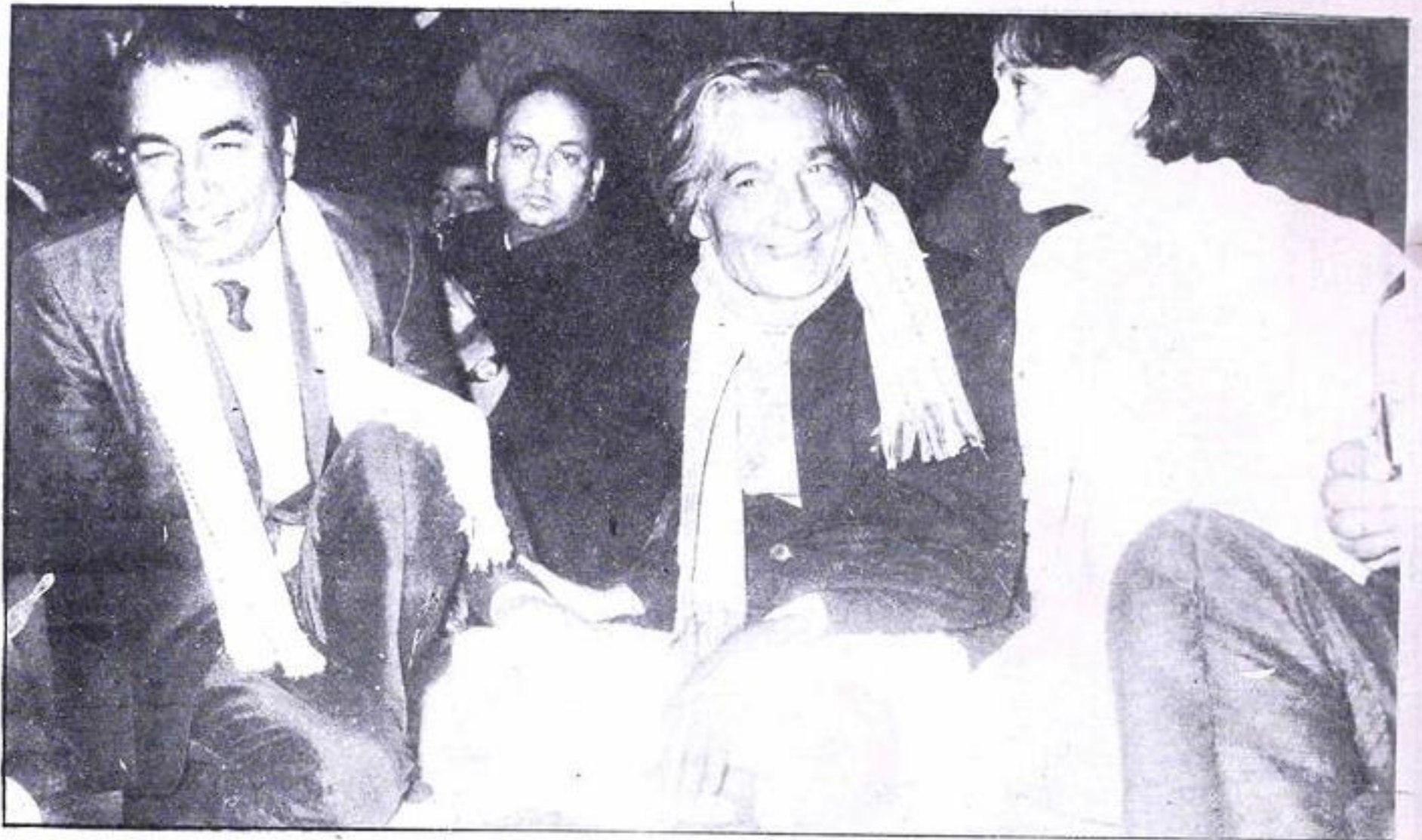
اسٹیج پر، دائیں سے امرتا پریتم ۔ جاں نثار اختر اور آخر میں ساحر

ساحر اور سلام مچھلی شہری

ایشین رائٹرس کانفرنس دہلی ۱۹۵۶ء
کے موقع پر
(دائیں سے) حمیدہ سلطان، فیض احمد فیض
اور آخر میں ساحرؔ

☆

مہندر ناتھ، اندر کمار گجرال، سجّاد ظہیر
کھڑے ہوئے ساحر ان کی باتیں سن رہے
ہیں۔
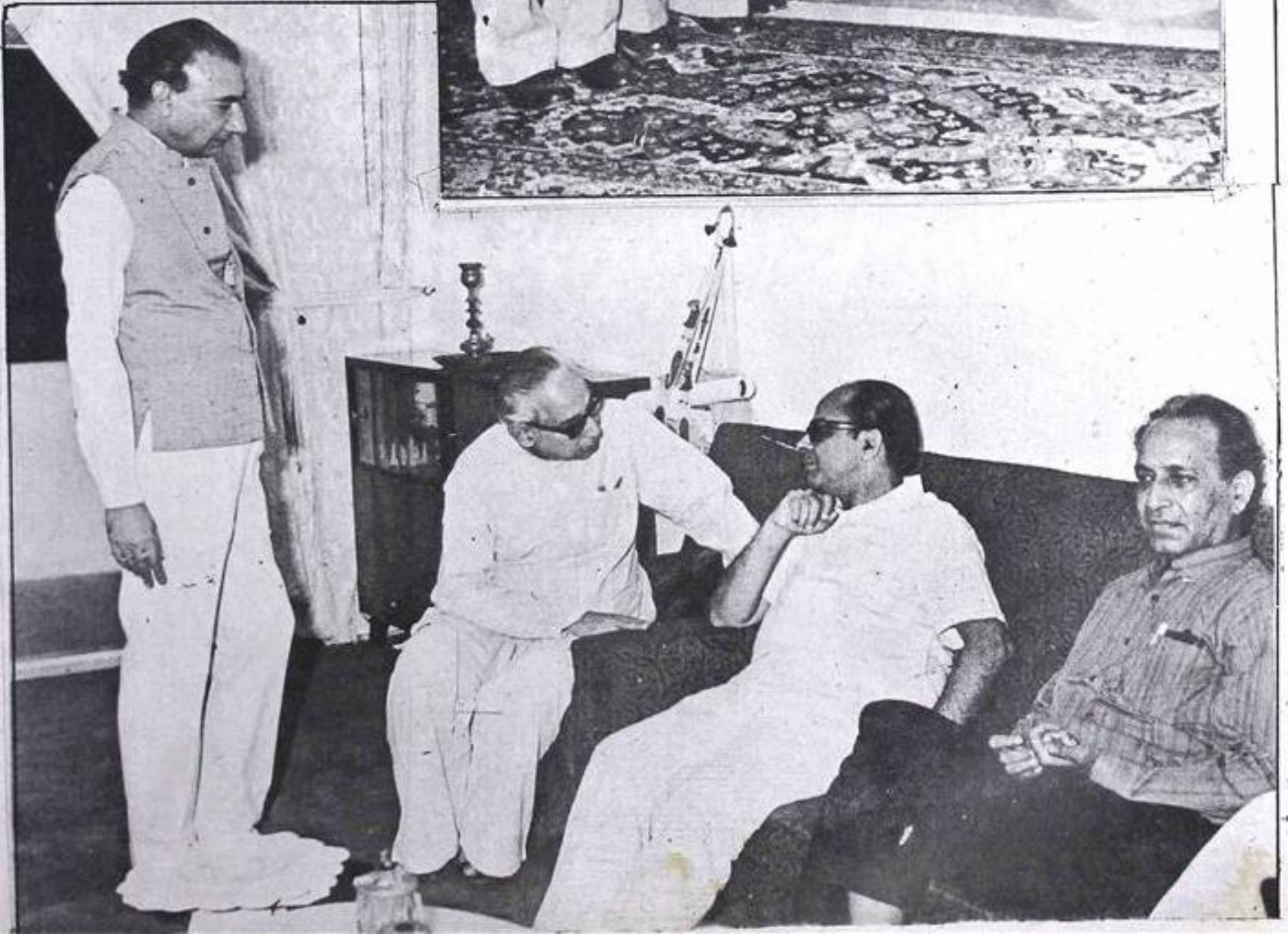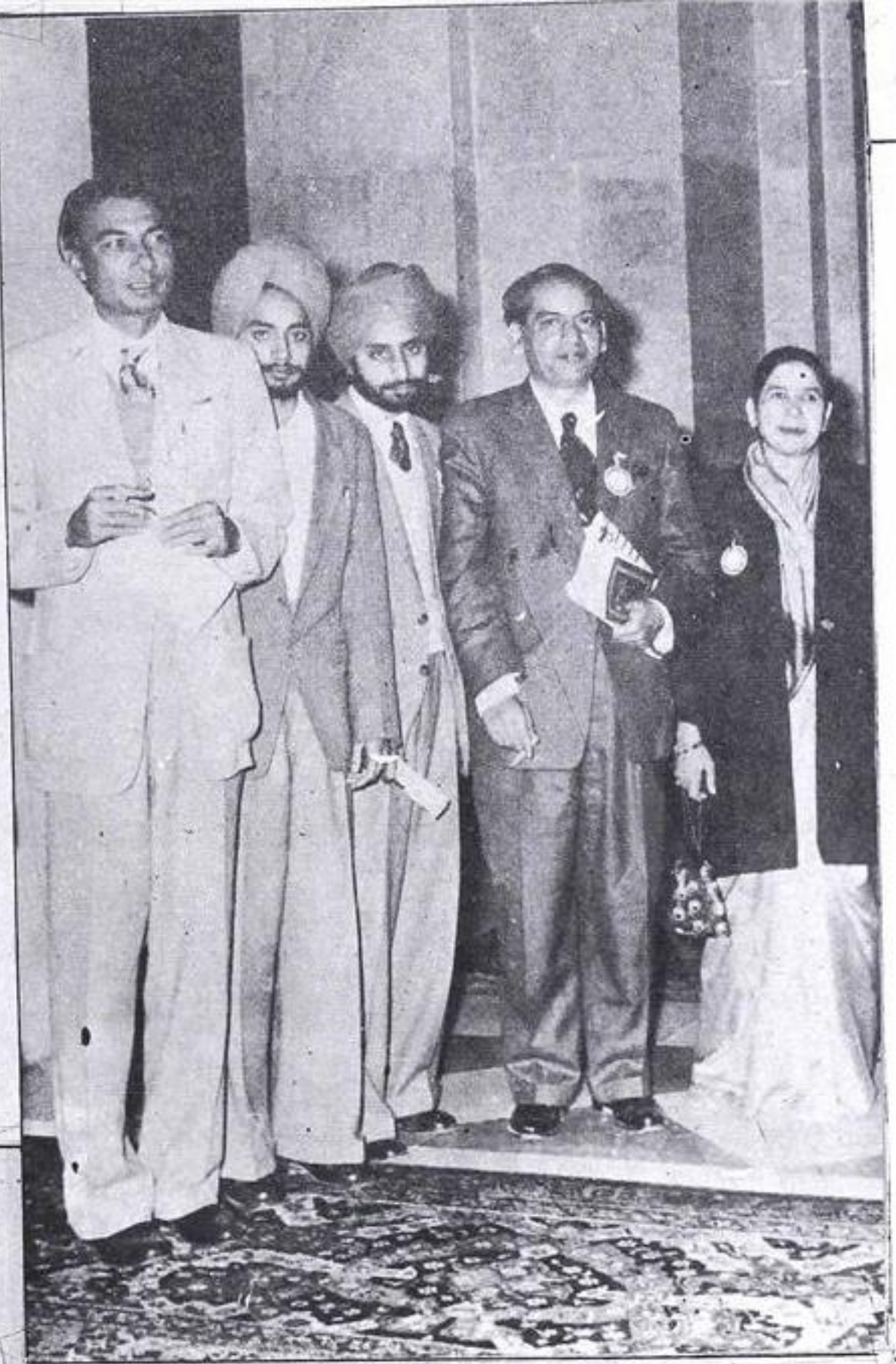
ساحر کے
گھر پر
(دائیں سے)
ساحر (تیسرے نمبر
پر) اور سب سے
آخر میں فراق گورکھپوری

(دائیں سے)
جاں نثار اختر
مہندر ناتھ
اور
ساحر

(دائیں سے) مخدوم محی الدین، سردار جعفری اور ساحر (حیدرآباد میں) ←

↑ ساحر اور واجدہ تبسم

(دائیں سے) انور سلطانہ، عادل رشید اور ساحر ←

سلمیٰ صدیقی، ساحر اور مہندر ناتھ۔ ساحر کے جنم دن پر
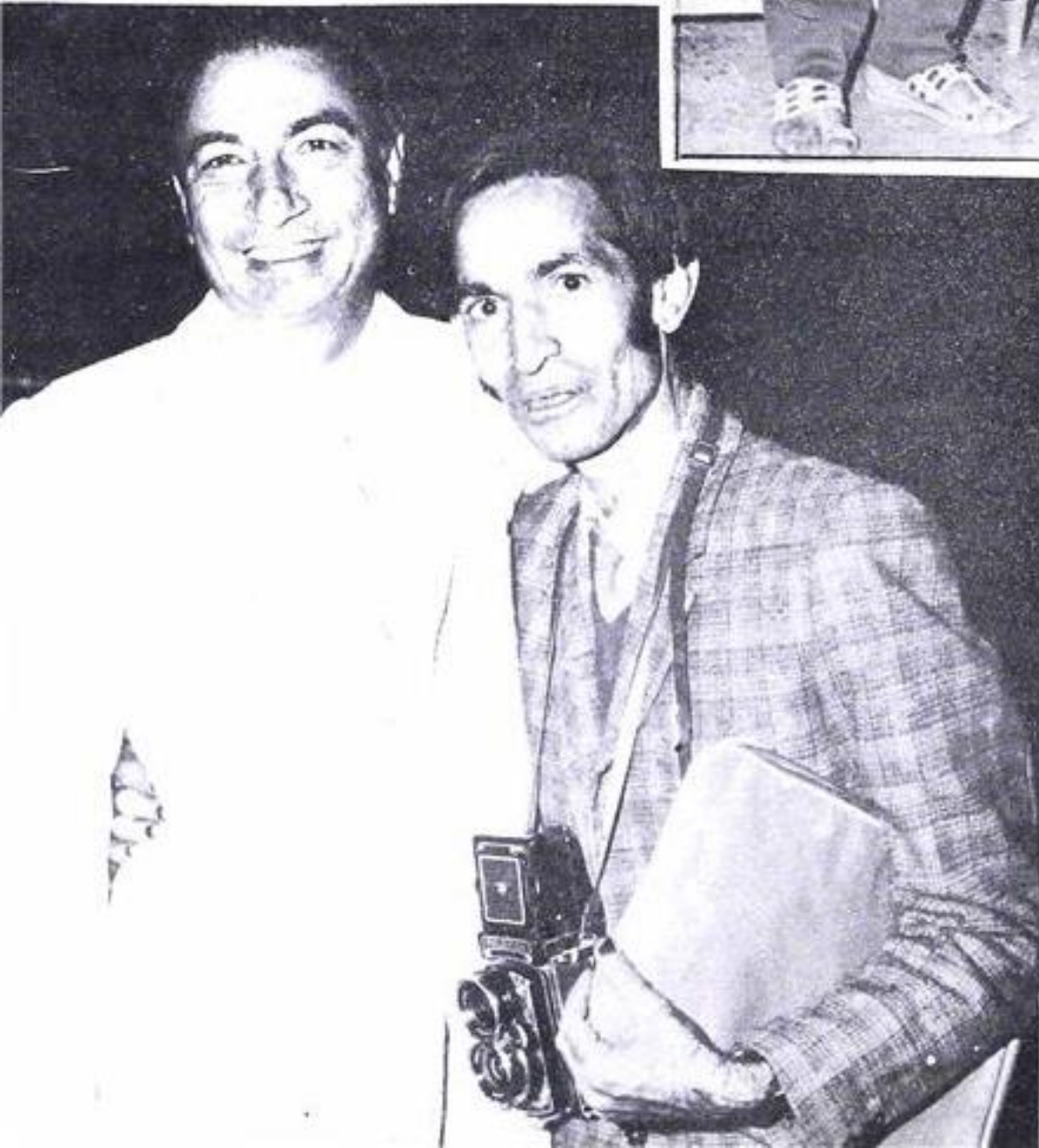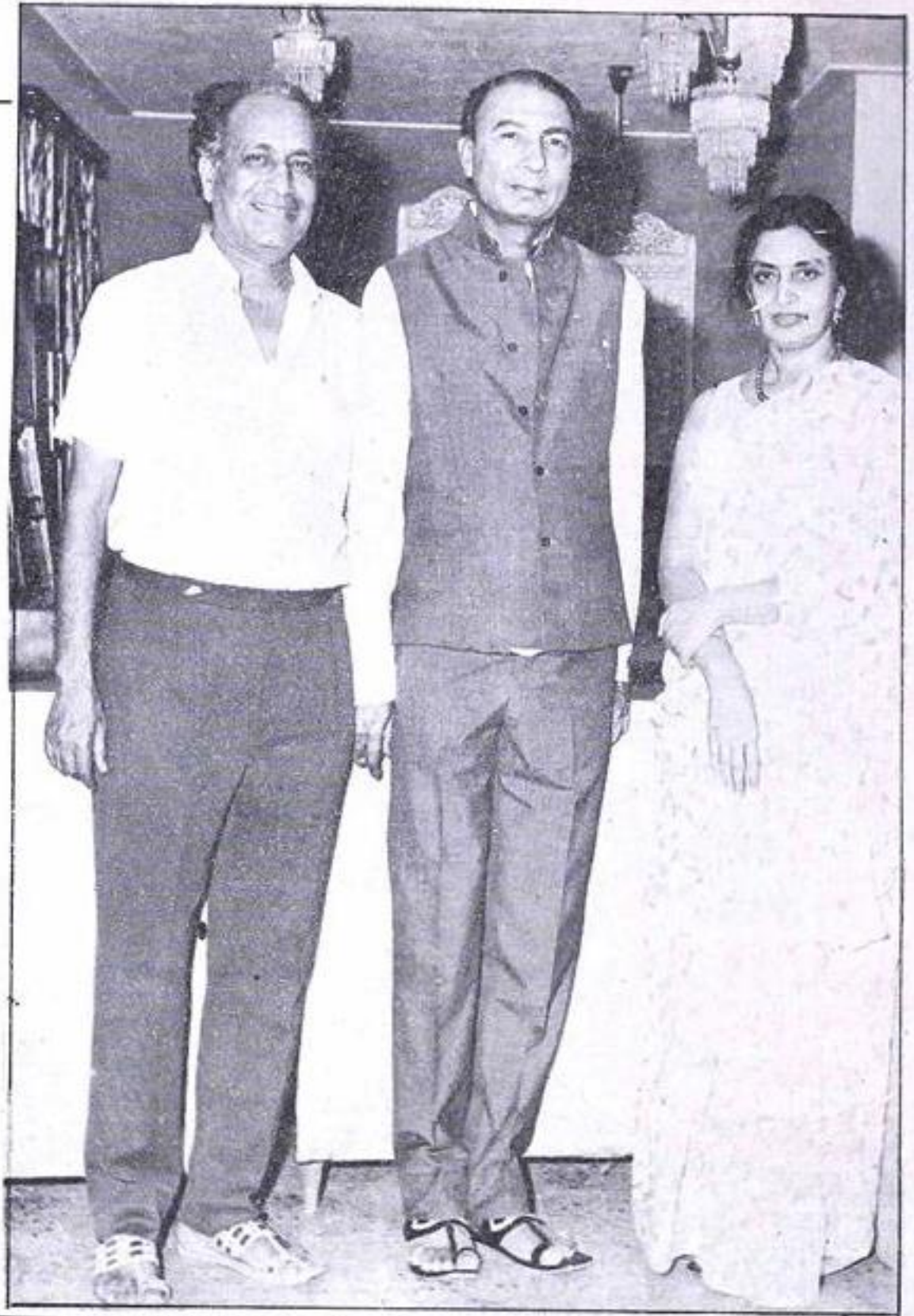
کرشن ادیب اور ساحر لدھیانوی

(دائیں سے) ساحر ۔ جاں نثار اختر ۔ چوتھے نمبر پر کرشن چندر (بائیں سے) مجروح سلطانپوری، خواجہ احمد عباس، سلمیٰ صدیقی
سلطانہ جعفری روسی ادیبوں کے ساتھ۔

(بائیں سے) پہلی صف میں۔ عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، ساحر، پرکاش پنڈت، جاں نثار اختر، پرکاش کے پیچھے دوسری صف میں راجہ
مہدی علی خاں
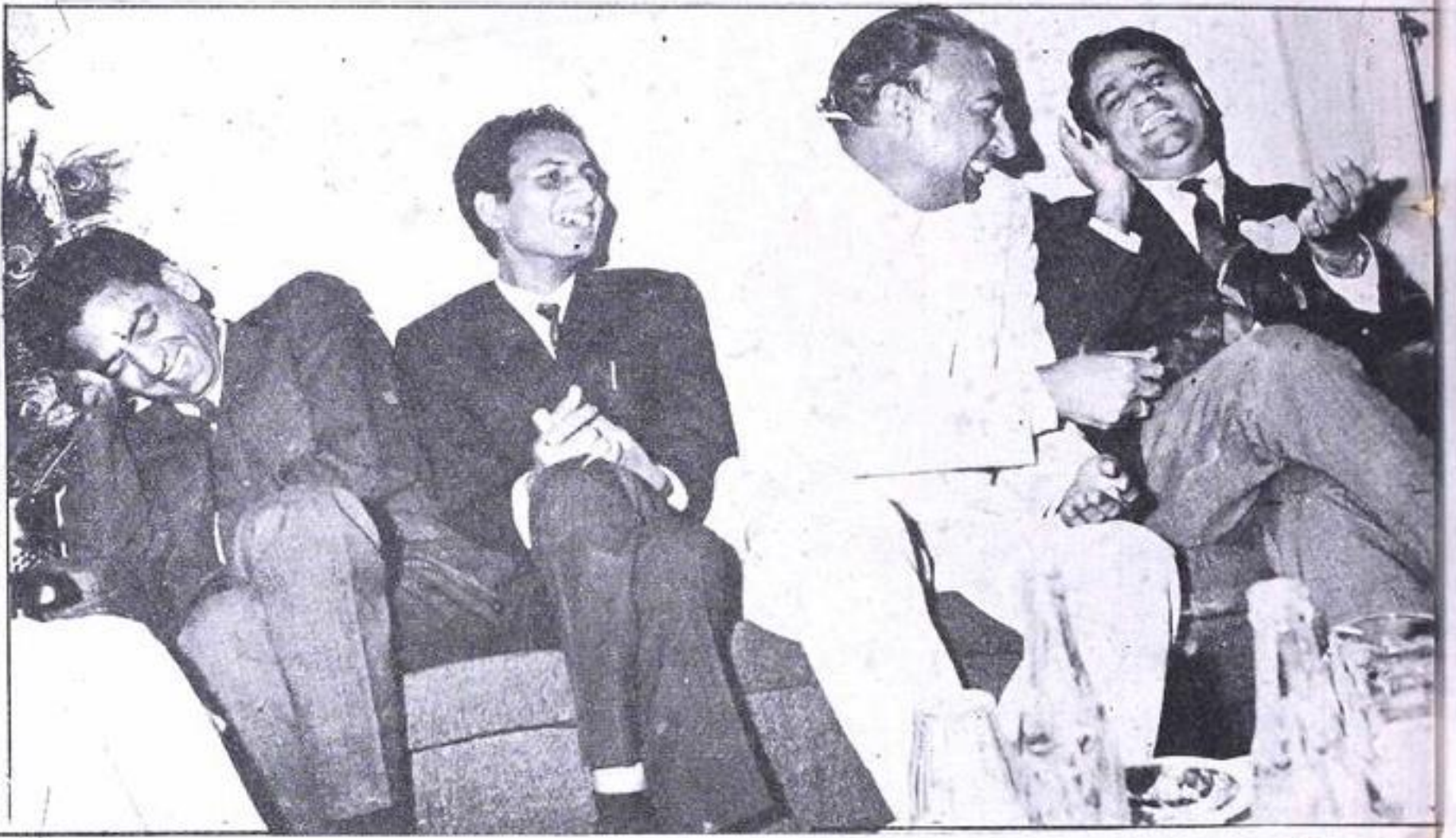
بائیں سے :۔ پنجابی کے مشہور شاعر شیو کمار بٹالوی، تیسرے نمبر پر ساحر

بائیں سے : مخدوم محی الدین، اندلیور، احتشام حسین، سجاد ظہیر، رام لال، امرت رائے، سمترانندن پنت اور ساحر
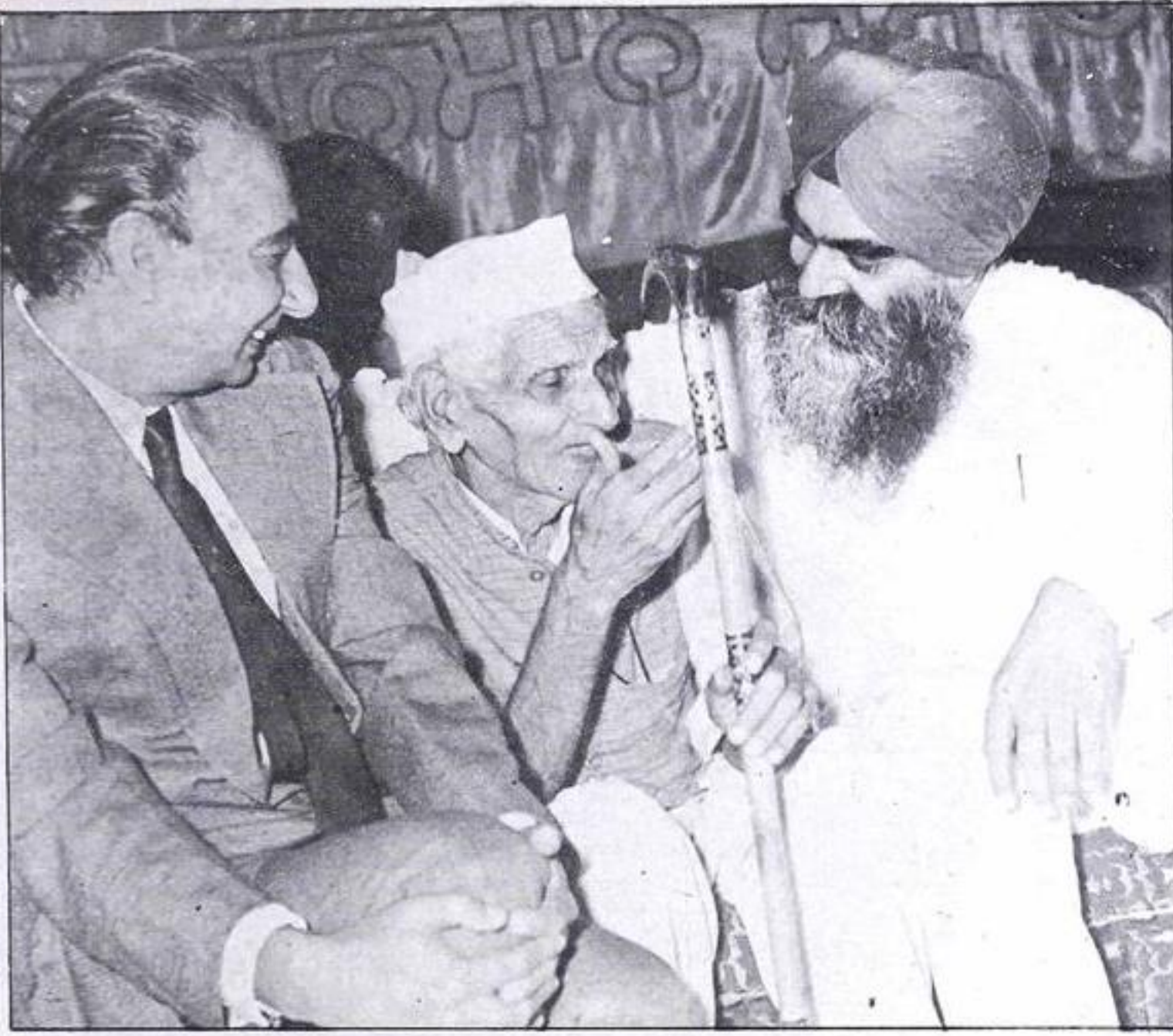
بائیں سے:
ساحر۔ درمیان میں
پنڈت میلارام وفا

(بائیں سے) ساحر، مجروح سلطانپوری، حبیب جالب اور کرشن چندر
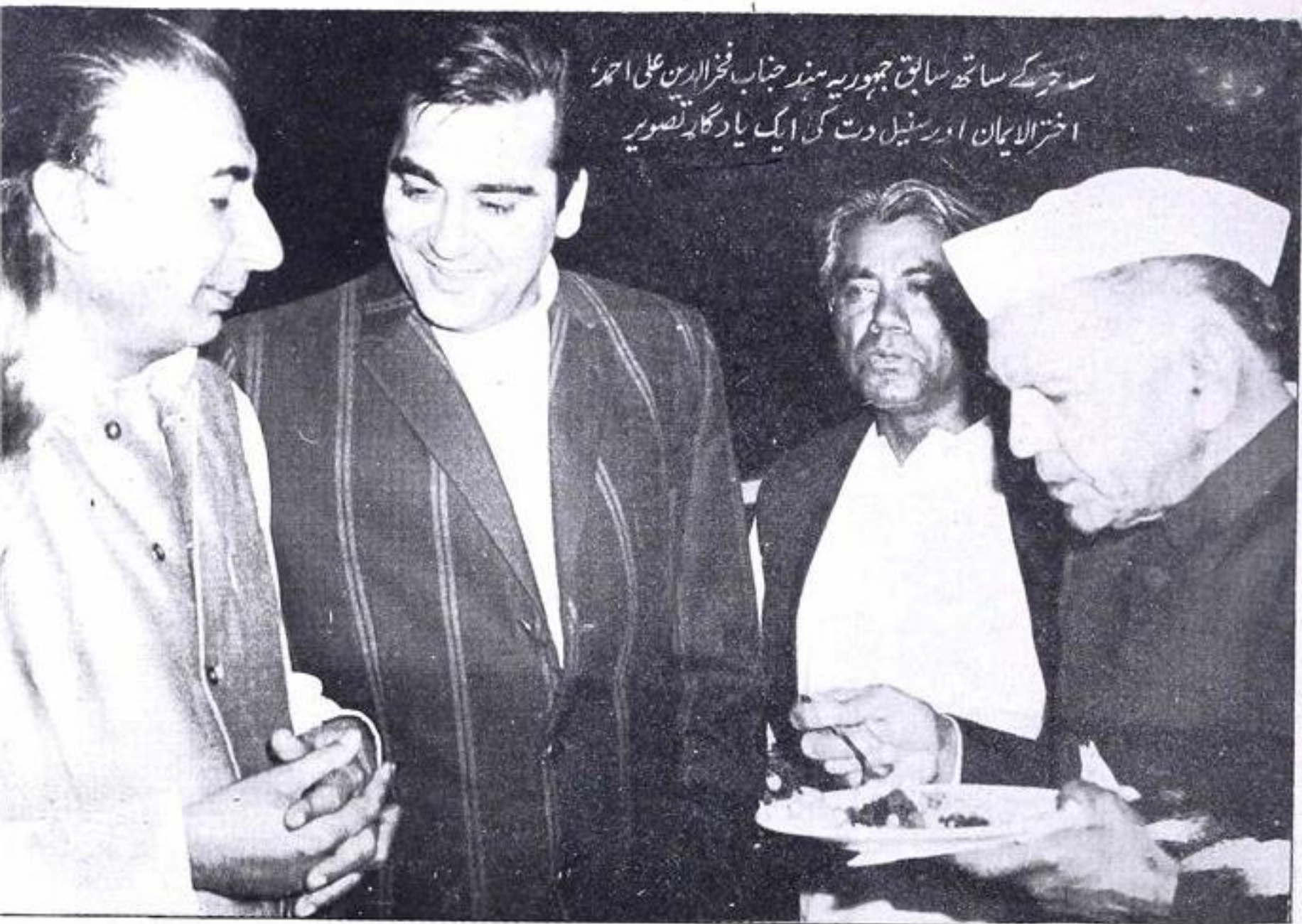
ساحر کے ساتھ سابق جمہوریہ ہند جناب فخرالدین علی احمد،
اختر الایمان اور سنیل دت کی ایک یادگار تصویر

دو خالق — دو فنکار : دلیپ کمار اور ساحر لدھیانوی

ساحر اور بلراج ساہنی

(بائیں سے) آر ایس تارا، گرودت، شوبھا کھوٹے، ساحر، راج شری، وحیدہ رحمن اور موسیقار این دتّہ ←

ایک تقریب میں: ساحر، خواجہ احمد
عباس کی گلپوشی کرتے ہوئے

صابر دت مدیر فن اور شخصیت
ساحر کے ساتھ مصروفِ گفتگو

ساحر ، اندر کمار گجرال
اور
ڈاکٹر رفیق زکریا

ساحر
اور
ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا

ساحر اپنے دوست
لیکھ چوپڑہ کے ساتھ

جس نے

ان کے نغموں کو آوازیں
دھنیں اور
چہرے دیے۔

☆
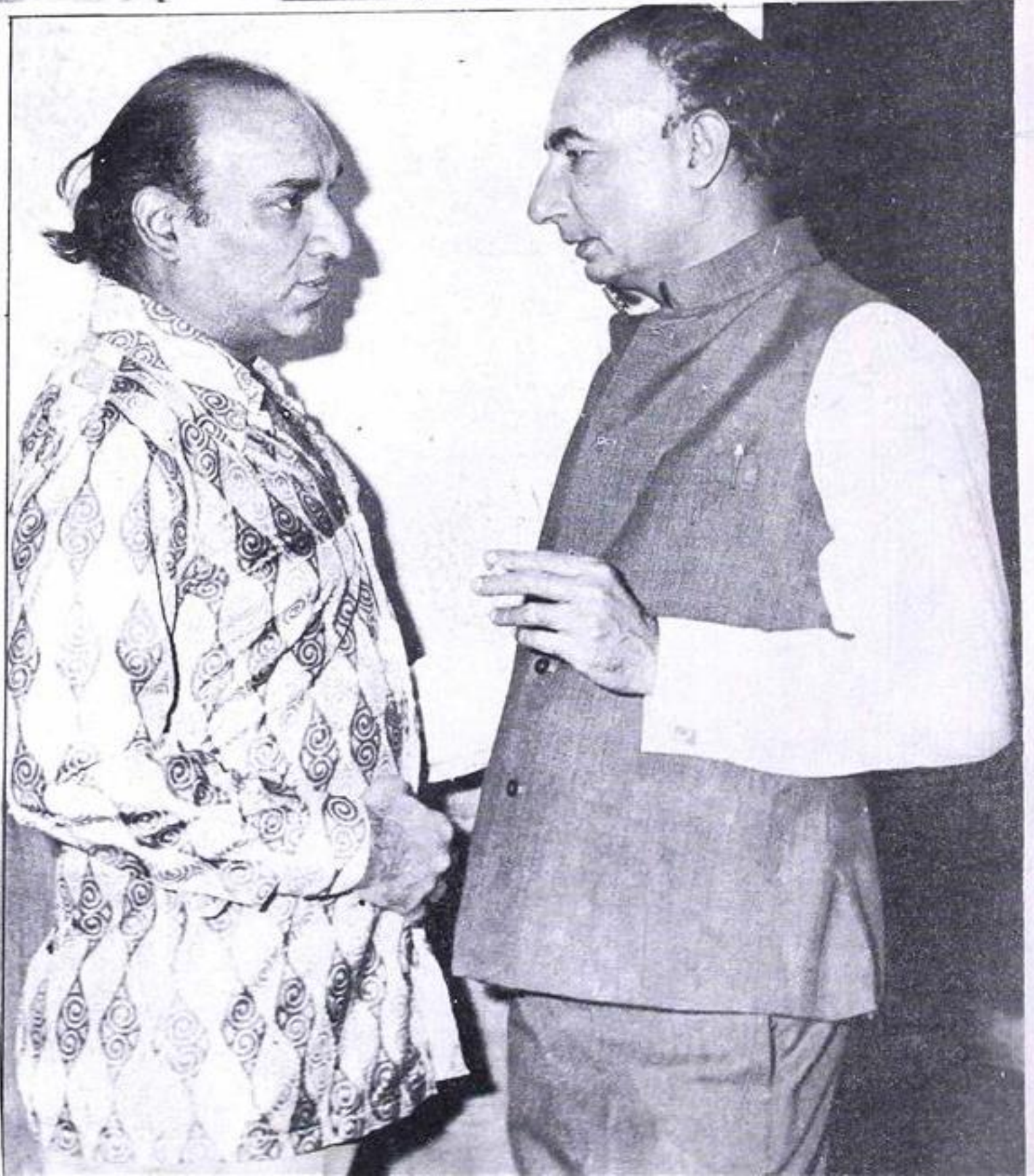
فلم 'کبھی کبھی' کی مہورت پر دائیں سے ساگر سرحدی، یش چوپڑہ، یکیش خیام، ساحر لتا منگیشکر ناریل توڑتے ہوئے موسیقار نوشاد علی

☆

دائیں سے:

موسیقار روی، ساحر، گلوکار مہندر کپور، سجاد ظہیر، رام مہیشوری، اے۔ کے ناڈیاڈوالا، پنالال مہیشوری۔

اوپر: دائیں سے: آرٹسٹ ہرکشن، ساحر اور موسیقار جے دیو۔

★

نیچے: دائیں سے: موسیقار نوشاد علی، خیام اور ساحر لدھیانوی
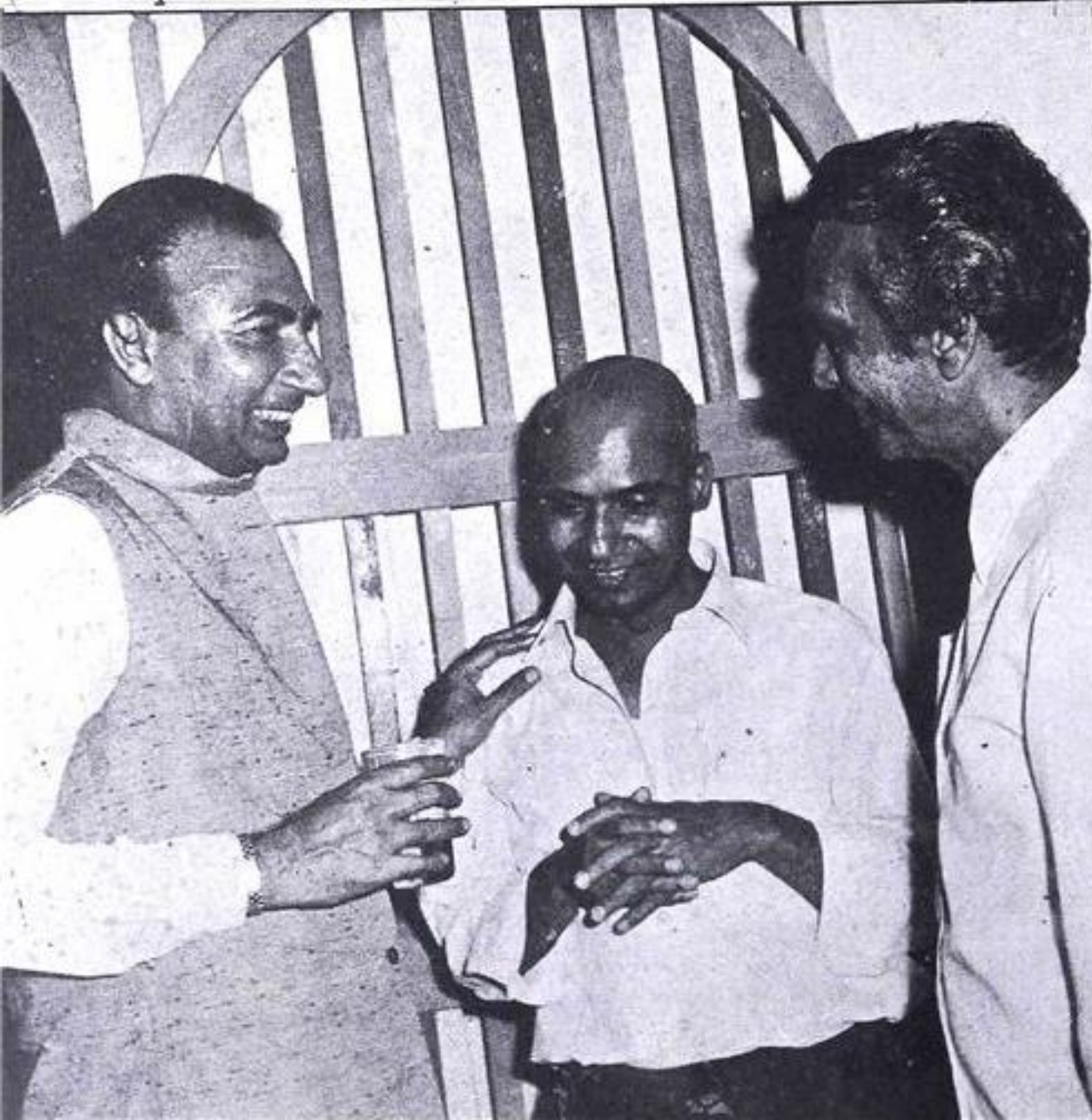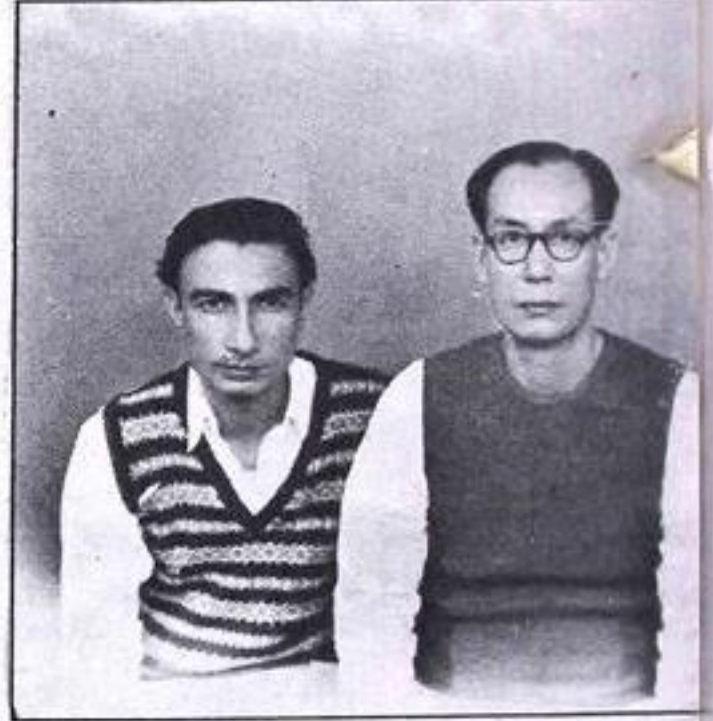
اوپر:
ایس۔ڈی برمن اور ساحر
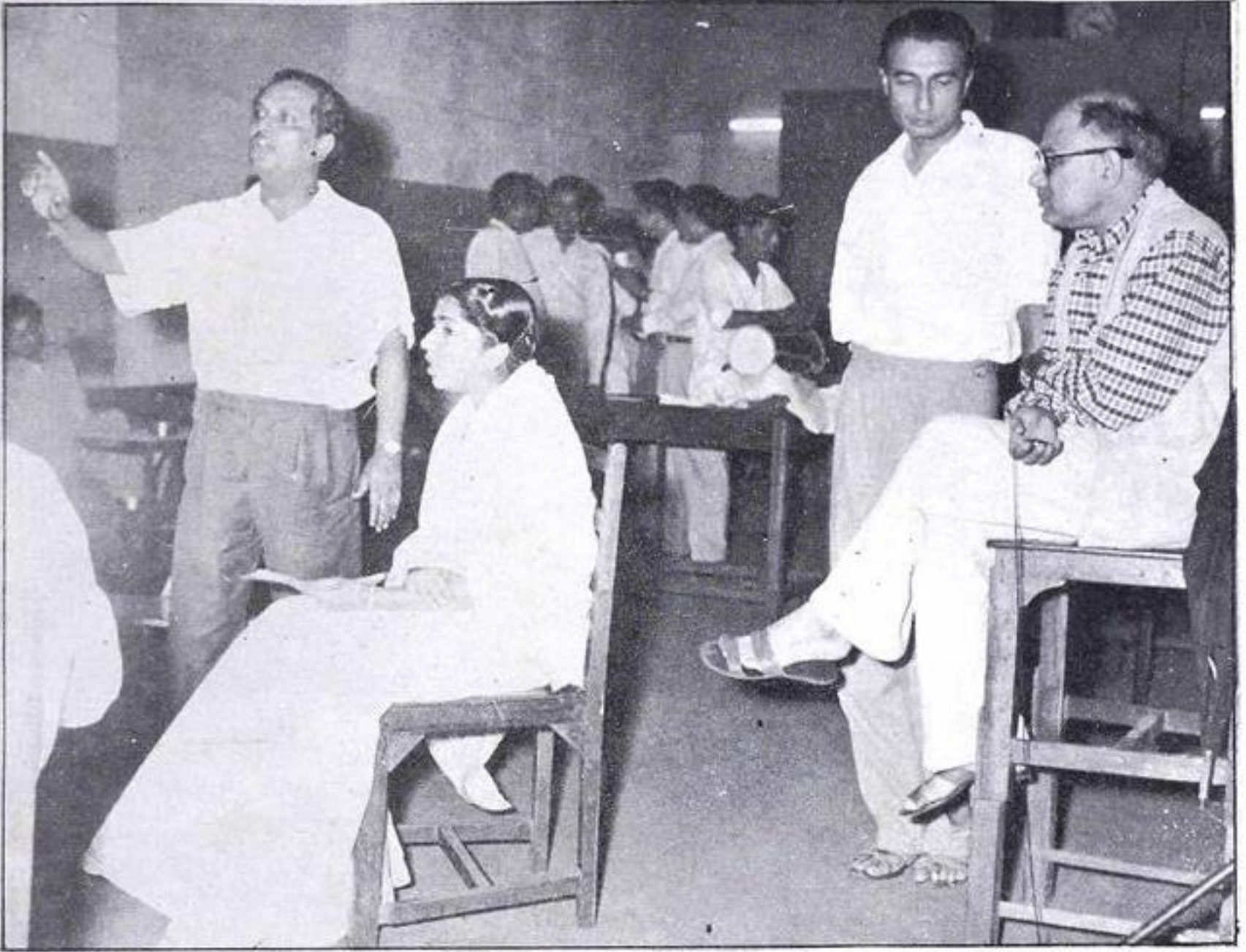
گیت کی ریکارڈنگ

اوپر: دائیں سے خواجہ احمد عباس، ساحر لدھیانوی، کرسی پر لتا منگیشکر
موسیقار انیل بسواس

بازو میں:
دائیں سے: ساحر
آشا بھونسلے،
آر۔ ایس تارا
اور
موسیقار آر این دتہ

دائیں سے: رامانند ساگر۔ ڈاکٹر ظ انصاری۔ شوکت اعظمی اور ساحر لدھیانوی

ساحر کے تخلیق کردہ آرمی سروس کور کا مارچنگ ترانہ کی ریکارڈنگ کے موقع پر دائیں سے موسیقار خیام، تیسرے نمبر پر ساحر، گلوکار مہندر کپور لیفٹیننٹ جنرل ایچ ایس چوپڑہ اور ہدایتکار ریٹش چوپڑہ۔
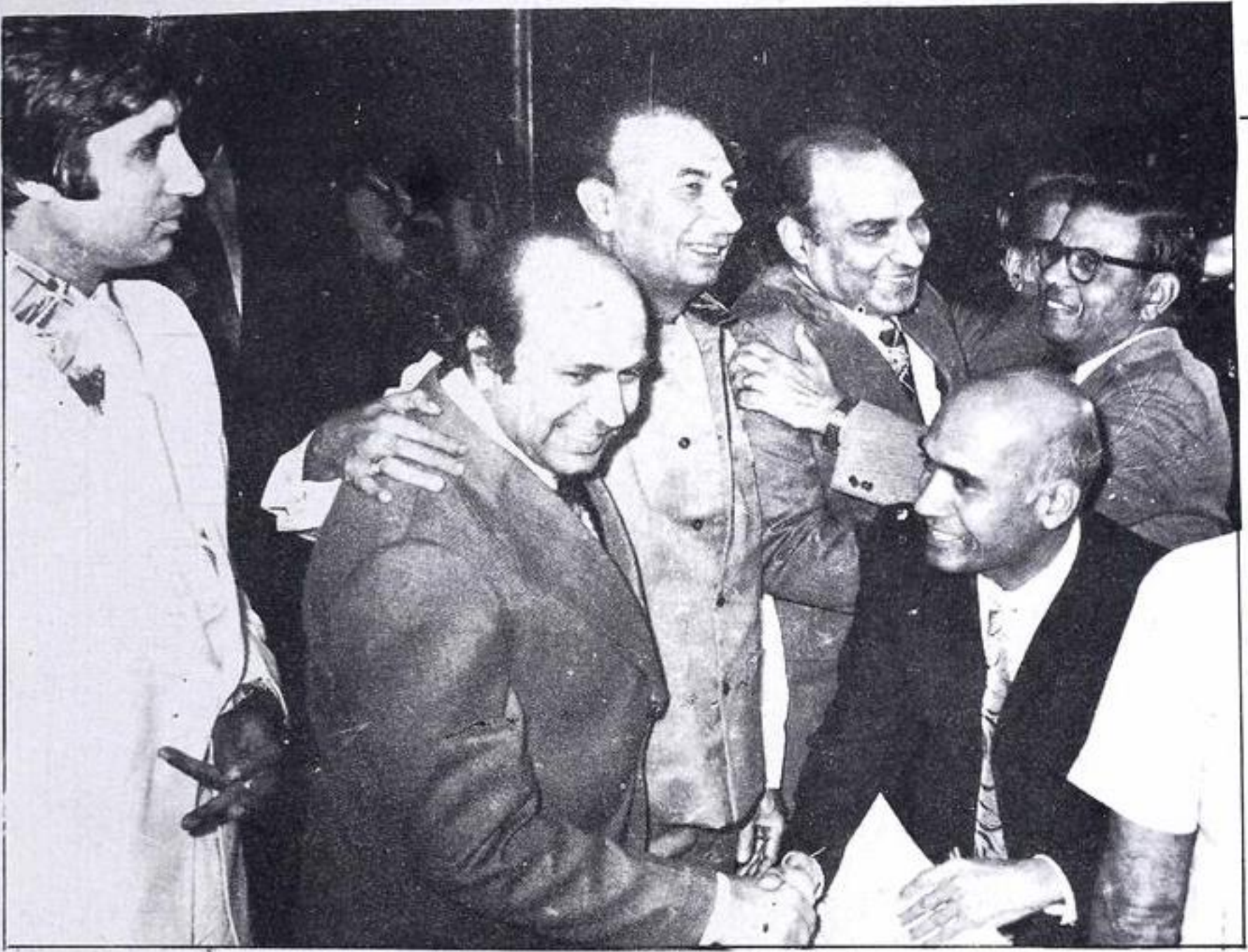
فلم "کبھی کبھی" کے پریمیئر کے موقع پر

بائیں سے: امیتابھ بچن۔ گلشن رائے۔ ساحر۔ خیام۔ یش چوپڑہ اور ڈاکٹر کپور

گلوکار

محمد رفیع، ساحر سے ہاتھ ملاتے ہوئے

درمیان میں موسیقار روشن

ساحر اپنے آرکی ٹیکٹ نریندر بیدی کے ساتھ، جس نے ساحر کی بلڈنگ پرچھائیاں کا ڈیزائن تیار کیا

ساحر
اپنے ڈاکٹر شکلا
کے ساتھ

لدھیانہ میں ساحر کی نانی کا مکان جہاں ساحر نے اپنا بچپن گزارا

ناز صدیقی (مرحومہ) جس نے "ساحر۔ شخص اور شاعر" عنوان سے مقالہ لکھ کر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد سے ایم اے کی ڈگری لی۔

لدھیانہ میں جگراؤں کا پل۔ جس پر بیٹھ کر ساحر، جے دیو اور حمید اختر کو اپنی نظمیں گھنٹوں سنایا کرتے تھے

مالوہ خالصہ ہائی اسکول لدھیانہ
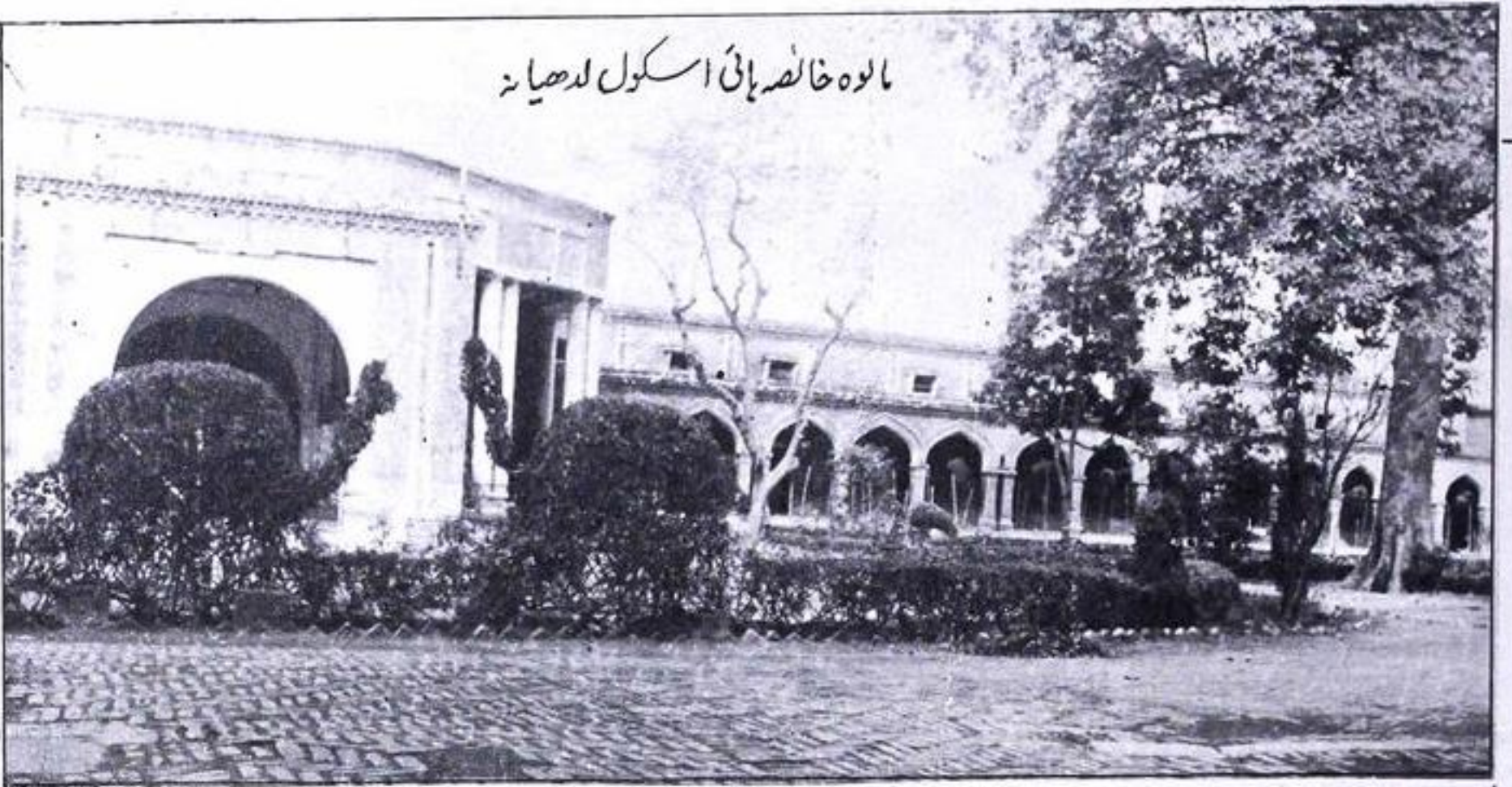
ساحر کی درسگاہیں

گورنمنٹ کالج لدھیانہ

گورنمنٹ کالج لدھیانہ کی ساحر لٹریری سوسائٹی کے جلسے میں پروفیسر سریندر سنگھ نرولا نظم سنا رہے ہیں

TWO DISTINGUISHED ALUMNI OF GOVERNMENT COLLEGE LUDHIANA

Presented with a Gold Medal by the College, on the occasion of its Golden Jubilee, in recognition of his attainments in the field of Literature.

ABDUL HAYEE SAHIR
(Sahir Ludhianvi)

HAR KRISHAN LAL

Presented with a Gold Medal by the College, on the occasion of its Golden Jubilee, in recognition of his attainment in the field of Art.
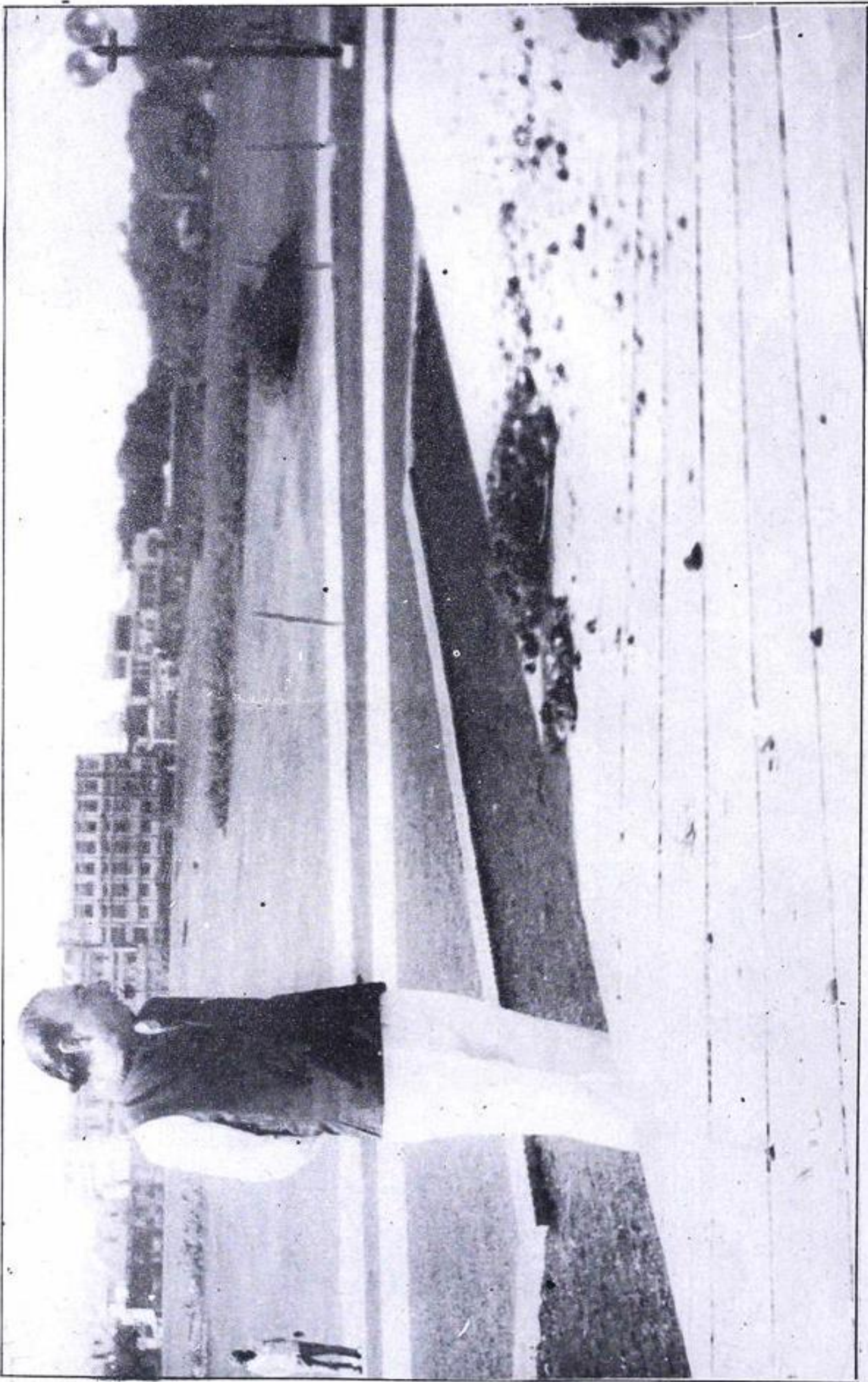
"سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ" لینے کے بعد ساحر لدھیانوی پنڈت نہرو کی سمادھی پر ——————

مدیر فن اور شخصیت

صابر دت

اپنے سابقہ شماروں کا جائزہ
لیتے ہوئے

رو برو
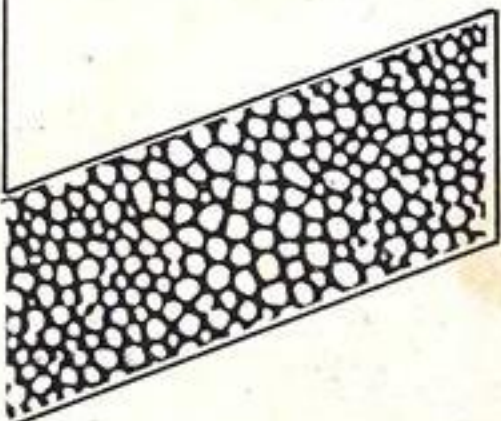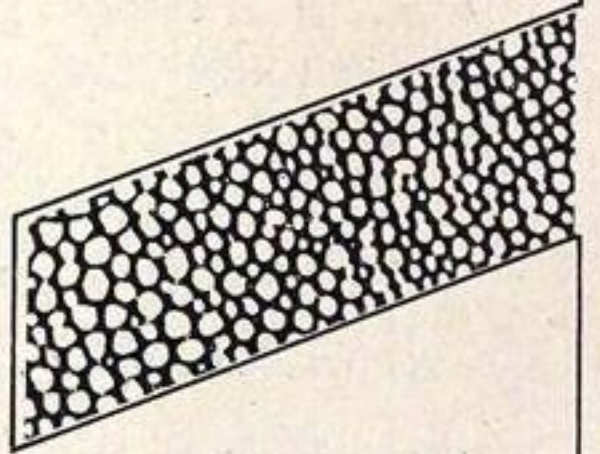
ساحر بہن انور سلطانہ کے ساتھ

انور بی بی کے بھائی جان

محمود ایوّبی
اسسٹنٹ ایڈیٹر بلٹز (اردو)

انور سلطانہ، ساحر لدھیانوی کی ماموں زاد بہن ہی نہیں بلکہ ان کی اولاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ برسوں ایک ساتھ رہنے پر یہ ساحر لدھیانوی کی شخصیت کے ایسے گوشوں سے واقف ہیں کہ کم ہی لوگ اس سے واقف ہوں گے۔ اس مضمون سے نہ صرف ساحر کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ان کی شاعری کو سمجھنے میں بھی یقیناً مددگار ثابت ہوگا۔ اپنے دلدار بھائی کے متعلق انہوں نے جو کچھ بتایا اسے یہاں اس طرح پیش کیا گیا ہے جیسے وہ بول رہی ہوں اور ہم سن رہے ہوں ـــــ تو سنیئے :

تھے تو ہمارے بھائی ـــ پھوپھی زاد بھائی۔ مگر اپنی اولاد سے زیادہ چاہتے تھے۔ سچ پوچھا جائے تو اپنی اولاد بنا کر مجھے الہ آباد سے بمبئی لائے تھے۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ میں آٹھ دس سال کی تھی۔ بھائی جان کی طبیعت خراب تھی۔ تنہا اور خالی گھر میں ان کی طبیعت الجھتی تھی۔ اس لئے ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا کہ گھر میں ایک یا دو بچے ہوں تو ان کی طبیعت پر اچھا اثر پڑے گا۔ بس ڈاکٹر کا یہی مشورہ میرے بمبئی آنے کا سبب بنا۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا۔ ساحر صاحب ہمارے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ہمارے والد اور چچا ان کے بڑے ماموں تھے۔ پھوپھی جان بھائیوں میں چھوٹی تھیں۔ پھوپھا جان سے ناچاقی کے بعد یہ اپنے اکلوتے لڑکے کے ساتھ بھائیوں ہی کے ساتھ رہی تھیں۔ بھائیوں نے چھوٹی بہن اور چنچل چونچال بھانجے کی پوری دلداری کی تھی۔ ان کے آرام اور آسائش کا خیال رکھا تھا۔ جب اسی بہن کے چہیتے بیٹے کو خوش کرنے کا سوال اٹھا تو بلا چوں چرا والدین نے مجھے ان کے ساتھ آنے دیا۔ ہم دو بہنیں تھیں۔ میں یہاں چلی آئی۔ آپا یعنی سردر شفیع الہ آباد ہی میں رہیں۔

جس عمر میں میں بمبئی آئی اس وقت مجھے الہ آباد اور بمبئی کا فرق معلوم تھا اور نہ یہ پتہ تھا کہ فلمی دنیا کیا اور کیسی ہوتی ہے۔

بھائی جان کے قدم فلم نگری میں جم چکے تھے۔ اس وقت وہ چار بنگلہ کے کودر لاج میں قیام پذیر تھے۔ نچلی منزل میں کرشن جی اور ان کا پریوار رہتا تھا۔ اوپر کی منزل پر بھائی جان اور ماں جی یعنی پھوپھی جان اور دادی اماں یعنی بھائی جان کی نانی۔ پھر میں آگئی۔ اس وقت چار بنگلہ بہت ہی پرسکون، بلکہ سنسان علاقہ تھا۔ آس پاس پیڑ پودے تھے۔ یہاں آکر میں کھیل کود میں مصروف رہتی۔ بھائی جان اپنے کام پر چلے جاتے۔ ان کے غائبانہ میں میں آم کے پیڑ سے کچے پکے آم توڑا کرتی یا آموں کا موسم نہیں ہوتا تو یونہی پیڑ پر چڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ میرے اس کھیل میں گھریلو ملازم لڑکا رحیم بھی ساتھ رہتا تھا۔

ان دنوں کی چند باتیں یاد آرہی ہیں جو آپ کو سناتی ہوں حسب معمول میں پیڑ پر چڑھی بیٹھی تھی۔ اتنے میں نہ جانے کہاں سے بھائی جان آگئے۔ انہوں نے جو دیکھا کہ میں پیڑ کے اوپر ہوں تو گھبراہٹ کے مارے ان کا برا حال ہوگیا۔ انہوں نے منت سماجت کر کے مجھے نیچے اتارا اور پھر سمجھانے لگے کہ اگر کہیں گر پڑتیں تو کیا ہوتا۔۔۔۔ ہاتھ پیر ٹوٹ جاتے تب۔۔۔۔ اور پھر سرزنش کے طور پر ہلکے سے ہمارا کان پکڑ لیا۔ عمر بھر میں انہوں نے اگر کوئی سزا دی تو بس یہی۔ اس کے باوجود ہم لوگوں پر ان کا بے حد رعب تھا۔

اصل میں وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بہت گھبرا اٹھتے تھے۔ ابھی جب وہ فلم میں نہیں آئے تھے تب کا ایک واقعہ سنئے جو مجھے بھی گھر کے بزرگوں نے بتایا تھا۔ آپا کو ایک بار وہ سائیکل پر بٹھا کر گھما رہے تھے۔ اتفاق سے سائیکل بے قابو ہوگئی اور آپا گر گئیں۔ اس کے بعد جتنے پریشان بھائی جان ہوئے تھے اتنی آپا یا گھر کا کوئی فرد نہیں تھا۔ کہتے ہیں مارے گھبراہٹ کے وہ رونے بھی لگے تھے کہ نہ جانے سرور کو کیا ہوگیا۔ کہیں ہاتھ پاؤں تو نہیں ٹوٹ گیا۔

ہاتھ پاؤں کے ٹوٹنے ہی کا نہیں بلکہ طبیعت کے بگڑنے کا اندیشہ بھی انہیں ستاتا رہتا تھا۔ وہیں چار بنگلہ والے مکان میں جب ہم لوگ تھے تب ہی ایک واقعہ اور ہوا۔ میں نے بتایا نہ کہ آم کا جب موسم ہوتا تھا تو ہم لوگ کچے پکے آم کے دشمن بنے رہتے تھے اکثر کچے آم توڑ کر ہم لوگ کہیں چھپا یا ڈھک دیتے تھے تاکہ آم کچھ نرم اور زرد ہو جائے تو اسے پکا مان کر کھائیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا ایک بار بھائی جان کی نظر پڑ گئی۔ ان پر جیسے کپکپی طاری ہوگئی۔ سختی سے منع کیا کہ پھر یہ کھانا اور خود بازار سے ٹوکرے بھر بھر کر آم لانے لگے۔ اس کے بعد سے ان کا یہی دستور رہا۔ ہماری پسند اور ضرورت کی چیزوں کا ڈھیر لگانے کا دستور۔

بچپن میں مجھے کھانے کے بعد میٹھا کھانے کی عادت تھی۔ مٹھاس کے نام پر کچھ بھی کھالیتی تھی۔ خواہ گڑ ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے باورچی خانے میں ہم نے گڑ رکھ چھوڑا تھا اور کھانے کے بعد چپکے سے گڑ کا ایک ڈلا لے کر کترنے لگتی تھی۔ روز کا معمول تھا۔ ایک بار بھائی جان نے دیکھ لیا۔ دیکھ یوں لیا کہ انہیں تجسس ہوا کہ کھانے کے بعد ہی میں باورچی خانے میں کیا کرنے جاتی ہوں۔ اس دن وہ بھی دبے قدموں باورچی خانے میں آگئے اور چپکے کھڑے ہوئے ہماری کارستانی دیکھتے رہے۔ انہیں جب یہ پتہ چلا کہ میں مٹھاس کی شوقین ہوں اور روزانہ گڑ سے منہ میٹھا کرتی ہوں تو انہیں بڑی تشویش ہوئی اور یہ سمجھانا شروع کیا کہ گڑ سے تمہارے دانت خراب ہو جائیں گے۔ تمہیں مٹھائیاں پسند ہیں تو میں اچھے قسم کی مٹھائیاں لادیا کروں گا۔ تم وہی کھانا۔ اس کے بعد وہ بھنڈی بازار یا جہاں کہیں بھی اچھی مٹھائی ملتی بلا ناغہ لانے لگے۔ اور دبے قدم پیچھے آکھڑے ہونے کا سلسلہ بھی عمر بھر جاری رہا۔ یہ ان کے پیار کا انداز تھا۔ اس کی تفصیل آگے سنئے گا۔

میں تو خیر بھائی جان کی وجہ سے ممبئی آئی۔ مگر بھائی جان کو حالات نے یہاں پہنچایا۔ ان کے والد یعنی پھوپھا جان بڑے جاگیر دار تھے۔ کافی بڑی جائداد کے مالک۔ مگر ماں جی کو ان کے جاگیر دارانہ طور طریقے پسند نہیں تھے اس لئے دونوں کی زیادہ دن نبھی نہیں۔ وہ شوہر کی جائداد کو ٹھکرا کر صرف بیٹے کو لے کر اپنے میکے یعنی بھائیوں کے پاس چلی آئیں۔ اور اپنے اکلوتے لڑکے کو پڑھا لکھا کر بڑا افسر یا ڈاکٹر بنانے کا خواب دیکھتی رہیں۔ بیٹے نے پڑھائی لکھائی پر توجہ ضرور دی مگر سرکاری افسر بننا پسند نہیں کیا۔ پسند بھی کیا کرتے، وہ تو شاعر تھے پیدائشی شاعر۔ جب ہی تو عین نوجوانی میں اپنی دھاک بٹھالی تھی۔ اور جوانی اور طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے جو شعر کہے تھے اس پر آج تک لوگ سر دھنتے ہیں۔ نقاد انہیں عنفوان شباب (Teen age) کا شاعر کہتے ہیں۔ وہ اس پر خوش تھے کہ وہ نوجوانوں کے جو مستقبل کے مالک ہیں کے شاعر ہیں۔ ان کی نظریں بھی مستقبل ہی پر رہتی تھیں۔

قلم کے زور پر انہوں نے ادبی دنیا میں اپنا لوہا منوالیا۔ کئی بڑے اور اہم پرچوں کے ایڈیٹر رہے۔ وہ لکھنے پڑھنے والے آدمی تھے، اور اسی میں ان کا زیادہ دل لگتا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ اور ماں جی اس ریلے میں لدھیانہ سے پاکستان پہنچ گئیں۔ تقسیم کے وقت فسادات کی جو لہر پھیلی تھی وہ میرے لئے سنی سنائی ہے مگر سن کر بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ کسی ملک پر پھر ایسا دن آئے۔ بہرکیف بھائی جان جو اپنی ماں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ پچاس پچپن سال کی عمر کو پہنچنے پر بھی وہ ماں جی کے لئے جتنا تڑپا کرتے تھے اس کی مثال ڈھونڈے نہیں ملتی تو تقسیم کے وقت کے لرزہ خیز فسادات کی خبر سن کر بھائی جان اپنی ماں کی تلاش میں جب لدھیانہ پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ تو پاکستان سدھار چکی ہیں۔ اس کے بعد ان کا لدھیانہ یا دلی میں رکنا محال ہو گیا۔ یہ ماں سے جا ملنے کے لئے اتنے بے چین رہنے لگے کہ اگر پر ہوتے تو اڑ کر چلے جاتے۔ اس لئے نہیں کہ انہیں پاکستان سے کوئی لگاؤ تھا بلکہ صرف اس وجہ سے کہ ان کی پیاری ماں وہاں تھیں اور وہ خود مصنوعی سرحد کے اس پار تھے۔ خیر صاحب کسی طرح یہ اسی گاڑی پر پاکستان چلے جس پر دوسرے مہاجرین جا رہے تھے۔ بیچ راستے میں انہیں نہ جانے کیا سوجھی یا کچھ اتفاق ہوا کہ چلتی گاڑی سے اتر پڑے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس گاڑی کے مسافر تہہ تیغ کر دیئے گئے۔ اس روح فرسا اتفاق کا ذکر کرنے کے بعد بھائی جان کہا کرتے تھے کہ بس تم لوگوں کی قسمت سے میں بچ گیا۔

خدا نے انہیں اپنے امان میں لیا ہو یا فلم جیسی مشکل لائن میں انہیں جو کامیابی نصیب ہوئی۔ سچ یہ ہے کہ ہم لوگوں ہی کی قسمت سے ہوا۔ ورنہ فلم ان کی پسندیدہ لائن ہرگز نہیں تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ــ "مجبوری اور ضرورت کے تحت مجھے اپنی شاعری کو چھکڑے پر بٹھانا پڑا۔" وہ کہا کرتے تھے کہ بہت ہوا۔ ۱۹۸۲ء میں فلم سے کنارہ کش ہو جاؤں گا۔ بلکہ اس کا اعلان بھی کر دوں گا۔ اور الہ آباد جا کر رہوں گا۔ تاکہ وہ دن نہ دیکھنا پڑے کہ پروڈیوسر کی خوشامد کرنا پڑے۔

ویسے پچیس تیس سال جو میں ان کے ساتھ رہی اس عرصہ میں میں نے دیکھا کہ فلم لائن میں ان کی عجیب دھاک تھی۔ لوگ پروڈیوسروں کے گھر کی خاک چھانتے ہیں۔ گانے انہوں نے بھی لکھے مگر بڑی شان سے۔ میوزک ڈائرکٹروں کو بدلتے دیکھا مگر ساحر لدھیانوی کا مقام وہی رہا۔ اس کے لئے انہیں محنت بھی کافی کرنی پڑی۔

یہ تفصیلات تو خیر بعد کی ہیں۔ جو رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آئیں ورنہ الہ آباد سے آنے کے بعد انہوں نے جب مجھ سے کہا تھا کہ چلو تمہیں رکارڈنگ پر لے چلوں تو میری سمجھ میں خاک بھی نہیں آیا تھا کہ رکارڈنگ کیا ہوتی ہے۔ مگر چونکہ بھائی جان نے کہا تھا اور ان کی کار پر جانا تھا (اس وقت ان کے پاس موریس کار تھی) تو میں چلی تو گئی مگر رکارڈنگ روم میں میں نے جو عجیب و غریب آلات اور ساز دیکھے تو ہول سا طاری ہو گیا۔ ان بے ڈھنگے سازوں کے درمیان ایک خاتون کی میٹھی سریلی آواز نے اپنی طرف ضرور متوجہ کیا تھا ___ یہ لتا منگیشکر تھیں۔ بھائی جان نے ان سے ہمارا تعارف کرایا تھا۔ ہندوستان کی اس باکمال مغنیہ سے یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔

رکارڈنگ اور رکارڈنگ سے زیادہ مشاعرہ میں جب بھی بھائی جان جاتے تو ہم لوگوں یعنی مجھے اور ماں جی کے بغیر نہیں جاتے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بمبئی آنے کے بعد ہماری زندگی سیر سپاٹے ہی کے لئے مخصوص ہو گئی تھی۔ ہماری پڑھائی کی طرف بھی دھیان دیا گیا۔ بھائی جان نے ہمارا داخلہ دادر کے خالصہ اسکول میں کروایا تھا۔ اندھیری سے دادر تک میں روزانہ ٹرین اور بس سے آیا جایا کرتی تھی۔ ہمارا ریلوے پاس فرسٹ کلاس کا ہوتا تھا مگر ہماری دوسری سہیلیوں کا تیسرے درجے کا ہوتا تھا۔ اس لئے فرسٹ کلاس کا پاس ہونے کے باوجود میں اپنی سہیلیوں کے ہمراہ تیسرے درجے میں ہی سفر کرتی تھی۔

اتفاق یہ ہوا کہ ایک دن بھائی جان کے ایک دوست غالباً رام پرکاش اشک جی نے مجھے تیسرے درجے میں سفر کرتے دیکھ لیا۔ انہوں نے بھائی جان سے شکایت کی کہ یہ انور تیسرے درجے میں کیوں آتی جاتی ہے؟ کیا ساحر لدھیانوی کی بہن کو یہ زیب دیتا ہے؟ بھائی جان نے مجھ سے کیفیت طلب کی تو میں نے ماجرا کہہ سنایا۔ جس پر بھائی جان بہت ہنسے اور کہا مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میری بہن اپنی سہیلیوں کی خاطر ایسا کرتی ہے۔ انہیں یہ بات شاید اس لئے اچھی لگی تھی کہ وہ بھی اپنے دوستوں کو بہت عزیز رکھتے تھے بلکہ ان کے لئے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہتے تھے۔ انہی رام پرکاش اشک جی کے لئے انہوں نے جو کیا وہ دوستی کی بہترین، اور قابل قدر مثال ہے۔ مدراس کی فلم 'دو کلیاں' لکھ کر انہوں نے کافی معاوضہ لیا اور ایسا اس لئے کیا کہ اپنے جگری دوست اشک جی کو کینسر کے علاج کے لئے امریکہ بھجوانا تھا۔

خیر صاحب پاس تو ہمارا فرسٹ کلاس ہی کا بنتا رہا اور میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ تیسرے ہی درجے میں سفر کرتی رہی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بھائی جان مجھے اپنی کار پر بھی لے جاتے تھے، لے ہی نہیں جاتے بلکہ اسکول کے وقت سے پہلے ہی مجھے واپس بھی لے آتے تھے۔ میں جب بھی اپنی پڑھائی کے حرج ہونے کی شکایت کرتی تھی تو وہ ہنس کر کہا کرتے تھے کہ ___ " انور زیادہ پڑھ کر کیا کرو گی۔ تمہیں کچھ نوکری تو کرنی نہیں ہے۔ ارے میں تم ہی لوگوں کے لئے تو کما رہا ہوں۔"

واقعہ یہ ہے کہ فلم انڈسٹری جیسی سنگلاخ زمین میں بھائی جان نے جو جھنڈا گاڑا تھا اس کی بدولت ہمارے یہاں پیسے کی کمی نہیں تھی۔ ورنہ عام طور پر ہندوستان کے شاعروں اور ادیبوں کی تو تنگ دستی اور عسرت ہی سے زندگی بسر ہوتی ہے۔ اور شاعروں کے مقابلے میں بھائی جان یقیناً الگ تھے۔ کیونکہ انہوں نے جاگیردار گھرانہ میں آنکھیں کھولیں تھیں۔ بچپن بڑے ناز و نعمت سے گزرا تھا۔ بیچ میں وقت دشواری بھی ہوئی ہو تو ہوئی ہو ورنہ ہم نے انہیں ٹھاٹ باٹ ہی سے رہتے دیکھا۔

ایسا نہیں ہے کہ صرف پیسے آجانے پر وہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کرنے لگے ہوں۔ اصل میں ان کی طبیعت میں نفاست اور سلیقہ تھا۔ شاعروں کی طرح وہ الجھے بال پسند کرتے تھے اور نہ اول جلول زندگی۔ باہر جانا ہو یا گھر میں رہنا ہو وہ کپڑے روز بدلتے

نفاست پسندی

لباس

تھے۔ صرف کپڑے ہی نہیں بلکہ رومال اور بستر کی چادریں بھی۔

کپڑے وہ سفید یا کریم کلر کے مگر اچھے سلے ہوئے پسند کرتے تھے۔ کپڑے کی خریداری سے لے کر سلائی تک ہماری ہی ذمہ داری تھی۔ ان کا ٹیسٹ اور مزاج معلوم ہو جانے پر سارا انتظام میں ہی کیا کرتی تھی یعنی ماں جی کی جگہ مجھ ہی کو سنبھالنی پڑی تھی۔ وہ جب باہر جاتے تھے تو سوٹ کے ساتھ ٹائی اور جوتے ضرور پہنتے تھے۔ لیکن جاڑوں کے علاوہ شاید بوٹ پہننے میں انہیں الجھن ہوتی تھی۔ اس لئے انہوں نے سفید پینٹ کے ساتھ جواہر کٹ پہننے کی وضع اختیار کی تھی جو انہی کی ایجاد تھی! اور اس طرح وہ جوتوں کی بندش سے بچ کر چپل پہن سکتے تھے۔

پہننے کے ساتھ انہیں کھانے کا بھی شوق تھا۔ رات گئے تک دوستوں کی محفل جمی رہتی تھی۔ اس لئے صبح کو دیر سے اٹھتے تھے۔ اٹھتے ہی انہیں چائے چاہئے تھی۔ چائے کے دوران وہ اخبار پڑھتے رہتے تھے۔ اور بیچ بیچ میں تبصرے اور رائے زنی بھی کرتے جاتے تھے۔ پھر غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر (صبح و شام نہانا ضروری تھا) ناشتہ کرنے آتے تھے۔ آملیٹ، پراٹھے اور پوریاں یعنی نمکین چیزیں انہیں بے حد مرغوب تھیں۔ مگر مینو روز بدلنا چاہئے تھا۔ پوریوں کا ذکر آیا تو ان کے بچپن کا ایک لطیفہ سنئے۔ ماں جی بتاتی تھیں کہ وہ لوگ جب لدھیانے میں تھے تو ایک روز رات کے ۱۲ بجے بھائی جان پوریاں اور مٹھائی کھانے کے لئے اور وہ بھی ایک خاص دوکان کی جو کچہری کے پاس ہوا کرتی تھی مچل اٹھے۔ انہیں لاکھ سمجھایا گیا۔ مگر انہوں نے ایک نہیں سنی۔ اصل میں ان کی طبیعت میں شروع ہی سے ضد تھی۔ وہ جب نہیں مانے تب ہمارے والد نے دوکان کھلوا کر ان کی مطلوبہ چیزیں لیں۔ انہوں نے ذرا سا چکھا اور پھر سرہانے رکھ کر سو گئے۔
تو بعد میں بھی ان کا یہی دستور رہا۔ کھانا اچھا ضرور چاہتے تھے۔ مگر زیادہ مقدار میں نہیں۔

لیکن پھر بھی ہم لوگوں کو زیادہ مقدار میں کھانا تیار رکھنا پڑتا تھا کیونکہ بھائی جان کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ ان کے دوست احباب کھانے کے وقت تک موجود ہوں! اور کھانا کھائے بغیر چلے جائیں۔ گھر میں جو بھی پکا ہو اس سے احباب کی خاطر ہونی چاہئے۔ یہ نکتہ سمجھ جانے پر ہم لوگ اس کا اہتمام رکھتے تھے اور یہ جان کر بھائی جان بہت خوش ہوتے تھے کہ ان کے دوستوں کے کھانے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

مگر انہیں یہ بات پسند نہیں تھی کہ کھانا وانا میں خود تیار کروں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دو ایک نوکر اور رکھ لو۔ یہ تم باورچی خانے میں کیوں گھسی رہتی ہو۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ سارا کام نوکروں پر چھوڑ دوں! اور کھانا ہمارے بھائی کی پسند کے مطابق نہ ہو۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ انہیں چینی ڈش بہت مرغوب ہے میں نے کتاب کی مدد سے چینی ڈش تیار کرنا سیکھ لیا تھا۔ مگر وہ اسے ہماری کفایت شعاری پر محمول کرتے ہوئے سن اینڈ سن سے چینی ڈش کا پارسل منگوانے پر مصر رہتے تھے ــــ صرف اپنے لئے نہیں بلکہ ہم لوگوں کے لئے بھی۔ انہیں یہ بات بالکل گوارا نہیں تھی کہ وہ کچھ کھائیں اور ہم لوگ کچھ اور۔ اس لئے کبھی اگر دن کا سالن لے کر بیٹھی بھی تو یہ چاہے کتنا ہی ذائقہ دار کیوں نہ ہو کھانے نہیں دیتے تھے۔ کھانا ہم لوگ ایک ساتھ ہی کھایا کرتے تھے۔ ہاں ان کے دوست احباب ہوتے تھے تو بات الگ ہے۔ وہ نہ صرف اپنے دوستوں کے ساتھ کھاتے تھے بلکہ انہیں یہ بھی منظور نہیں تھا کہ میں یا ماں جی یا گھر کی کوئی عورت مردوں میں آئے۔

ماں جی کہا کرتی تھیں ساحر کو (وہ انہیں ساحر ہی کہہ کر مخاطب کرتی تھیں) اپنے جاگیردار باپ کی طرح دوستوں کا جمگھٹا لگانا پسند ہے اسی طرح اسے عورتوں کی بے انتہا آزادی بھی گوارہ نہیں ہے۔

عورتیں اپنے گھر کی ہوں یا دوسروں کی سبھوں کی حرمت کا انہیں بے حد خیال تھا۔ اگر یہ جاگیردارانہ ماحول کی دین تھی تو کوئی حرج نہیں۔ میں دیکھتی تھی کہ وہ لڑکیاں جو اُن کی فین ہوتی تھیں تو ان کے فون کا نہ خود اچھی طرح جواب دیتے تھے بلکہ ہم لوگوں سے بھی کہا کرتے تھے کہ کسی سے جھڑک کر یا سخت لہجہ میں بات نہ کیا کرو۔ بھائی جان کو خود فون کرنے میں بڑی الجھن ہوتی تھی۔ کرنے ہی میں نہیں رسیو کرنے میں بھی۔ اسی لئے وہ مجھ ہی سے نمبر ملانے کو کہا کرتے تھے۔ جو لوگ یہ نہیں جانتے انہیں بھائی جان کے بارے میں خواہ مخواہ غلط فہمی رہتی تھی یہ لڑکیاں اگر گھر آجاتی تھیں تو بھائی جان کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ ان کو اٹوگراف دینے یا ان سے باتیں کرنے کے بجائے اٹھ کر چلے آتے تھے اور ہماری سرزنش کیا کرتے تھے کہ تم اٹھ کر کیوں چلی آئیں۔ جاؤ تم ان لوگوں سے باتیں کرو، ان کی خاطر مدارات کرو۔ میں جب یہ کہتی تھی کہ بھائی جان یہ لوگ تو آپ سے ملنے آتی ہیں۔ پتہ نہیں کیا باتیں کرنا چاہتی ہیں۔ میں وہاں مداخلت کیوں کروں تو ہنسنے لگتے تھے مگر ہمیں ان کے پاس بھیجے بغیر چین نہیں لیتے تھے۔

اپنی نظموں اور نغموں میں بھائی جان نے عورتوں یعنی مریم اور سیتا کی بیٹیوں کے تقدس کے ساتھ ان کی مجبوریوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ انہوں نے زمانہ کا سرد و گرم دیکھا تھا اور اپنے ملک و معاشرہ کی برائیوں سے واقف تھے ـــ خاص کر عورتیں اس سماج میں کس قدر مجبور و غیر محفوظ ہیں۔ اس سے وہ بخوبی واقف تھے۔ اس لئے وہ ہم لوگوں کے لئے بے حد فکرمند اور پریشان رہا کرتے تھے۔ پریشانی ان معنوں میں کہ تنہا وہ ہم لوگوں کو گھر پر چھوڑ سکتے تھے اور نہ باہر بھیجنا چاہتے تھے۔ ماں جی جب تک زندہ رہیں تب تک تو غنیمت تھا۔ ان کے گزر جانے کے بعد ان کی پریشانیاں بے حد بڑھ گئی تھیں۔ وہ روزی روٹی کی تلاش میں بھی جاتے تھے تو دھیان ہماری طرف لگا رہتا تھا۔ ہاں جب ہم لوگوں کا ایک پرانا نوکر کالی چرن بھٹکتا بھٹکتا پھر آگیا تو انہیں کسی قدر اطمینان ہو گیا تھا۔

گھر سے باہر گرچہ ہم لوگ کار ہی سے جاتے تھے لیکن پھر بھی انہیں اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ وہ بھی ساتھ جاتے ہی تھے بلکہ بعض اوقات تو بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہو جاتی تھی۔ جیسے انہیں پتہ چلا کہ میں خریداری کی غرض سے باہر جانا چاہتی ہوں تو وہ یہ پوچھتے کب جاؤ گی۔ کتنی دیر کے لئے جاؤ گی۔ اس کے بعد واپس آجاؤ گی نا، ضرور آجانا کیونکہ ہمیں بھی ایک جگہ ضروری کام سے جانا ہے۔

لیکن دیکھنے میں یہ آتا کہ مقررہ وقت سے پہلے وہ خود آجاتے اور کہتے چلو ہم بھی چلتے ہیں۔ ہم راستے میں اتر جائیں گے۔ مگر نہ کہیں اترتے تھے اور نہ جاتے تھے بلکہ ساتھ ہی واپس آجاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ لاکھ منع کرنے پر بھی وہ ساتھ ہو لیتے۔ کہتے کہ تم شاپنگ کرنا میں کار میں بیٹھا رہوں گا۔ میں جب کہتی بھائی جان مجھے یہ اچھا نہیں لگے گا تب بھی وہ نہیں مانتے اور ساتھ جاتے۔ میں دوکان میں جاتی اور وہ کار میں بیٹھے رہتے مگر تھوڑی دیر تک۔ کیونکہ پھر پتہ چلتا کہ وہ بھی دوکان پر آکر ہمارے ساتھ ہیں۔ پلٹ کر دیکھتی تو حیرت اور حجاب کا احساس ہوتا مگر وہ سمجھاتے کہ کوئی حرج نہیں اپنا کام جاری رکھو۔

ضروری نہیں تھا کہ دوکان پر اپنے لئے کچھ خریدنے گئی ہوں۔ کیونکہ بھائی جان کے لئے بھی شاپنگ مجھے ہی کرنی

پڑتی تھی۔ ان کی پسند اور مزاج کا اندازہ تھا اس لئے اسی کے مطابق خریداری کرتی تھی۔ وہ صرف ساتھ رہتے تھے۔

ہم لوگ ایک ساتھ بھی گھر سے نکلا کرتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے تو مجھے اور ماں جی سے کہتے کہ چلو ذرا گھوم آئیں۔ چاہے گھومنے پھرنے کی کوئی منزل یا مقصد ہو یا نہیں۔ کچھ اور نہیں تو جوہو سے نکلتے اور باندرہ سے جوس پی کر لوٹ آتے۔

عام طور پر ایسا اس وقت ہوتا تھا جب بھائی جان ناراض ہو چکے ہوں یا ان کی کسی بات پر ماں جی روٹھ گئی ہوں۔ میں بتا نہیں سکتی کہ ماں جی کے خفا ہو جانے پر بھائی جان پر کیا بیت جاتی تھی۔ ان پر ایک اضطراب کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ کسی کل چین نہیں ملتا تھا۔ لگاتار ٹہلتے رہتے اور ماں جی کو منانے کے جتن کرتے رہتے تھے۔ ماں جی کی ناراضگی دیکھ کر ان پر جو پشیمانی طاری ہوتی تھی ویسی پشیمانی ہم نے کہیں اور نہیں دیکھی۔ وہ ماں جی کے پاؤں تک پکڑ لیتے تھے۔

جب ماں جی من جاتی تھیں تو وہ پھولے نہیں سماتے تھے۔ پھر کہیں نہ کہیں چلنے کے لئے اصرار کرتے۔ کچھ اور نہیں تو جوس بلوانے لے چلتے۔ جہاں تہاں رک رک کر کچھ نہ کچھ خریدنے کا اصرار کرتے ــــ قصہ مختصر یہ کہ جب تک انہیں یہ یقین نہیں ہو جاتا کہ سب راضی خوشی ہیں انہیں چین نہیں آتا تھا۔

خرید و فروخت کے سلسلے میں ایک بات یاد آئی جو خاصی تکلیف دہ ہے۔ آخری بار جب وہ الہ آباد گئے تھے تو وہاں انہوں نے محسوس کیا تھا کہ چند چھوٹی چھوٹی چیزوں کی کمی ہے۔ کمی نہیں بلکہ وہ چیزیں ان کے معیار کے مطابق نہیں تھیں۔ اس لئے بمبئی آکر مجھ سے کہا تھا کہ فلاں فلاں چیزیں خرید کر ایک بکس میں رکھتی جاؤ تاکہ اس بار الہ آباد جانا ہو تو لیتے چلیں گے۔ افسوس کہ پھر جانا نصیب ہی نہیں ہوا اور وہ چیزیں ویسی ہی پڑی رہیں جنہیں دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

ہوتا یہ تھا کہ میں خود کبھی الہ آباد جانا چاہتی تو وہ اس کے روادار نہیں ہوتے تھے۔ کہتے تو کچھ نہیں تھے، بس خاموش رہتے تھے۔ میں سمجھ جاتی تھی کہ انہیں یہ بات پسند نہیں ہے۔ ہاں خود ضرور ساتھ لے جاتے تھے اور پھر ساتھ ہی لے کر آنا بھی چاہتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ان کی کوئی رکارڈنگ تھی اس لئے وقت پر آنا ضروری تھا۔ ٹکٹیں بن چکی تھیں۔ مگر میں ہفتہ دس دن اور رکنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو کہا تو کچھ نہیں اور خود آنے کو تیار ہو گئے۔ مگر میں دیکھ رہی تھی کہ کہنے کو تو کہہ دیا ہے مگر اندر سے بہت بے چین ہیں۔ خیر صاحب روانگی کی تاریخ آئی۔ بھائی جان اسٹیشن کے لئے روانہ بھی ہوئے ... مگر کچھ دیر کے بعد لوٹے چلے آ رہے ہیں۔ پتہ یہ چلا کہ پروڈیوسر کو انہوں نے تار دے دیا تھا کہ رکارڈنگ کی تاریخ بھائی جان کے بمبئی لوٹنے تک ملتوی کر دی جائے۔ اس کے بعد انہوں نے ٹکٹ واپس کر دیئے۔ مجھے کچھ شرمندگی بھی ہوئی کہ میری وجہ سے بھائی جان کو یہ زحمت ہوئی۔ اس لئے ہفتہ بھر بعد ساتھ چلنے کا اعلان کر دیا۔ یہ سن کر بھائی جان اتنا خوش ہوئے کہ بیان نہیں کر سکتی۔ پھر انہوں نے ماں جی سے کہا کہ آج انور اور سرور کو اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکچر جانے دو۔

پکچر ہو یا مشاعرہ بھائی جان تنہا نہیں جاتے تھے۔ ٹرین یا ہوائی جہاز سے سفر کرنا انہیں پسند نہیں تھا۔ کہتے تھے کہ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ آدمی اپنی مرضی سے سفر نہ کر سکے۔ اس لئے عام طور پر وہ کار سے سفر کرتے تھے۔ ایک ساتھ دو کاریں چلا کرتی تھیں اور جہاں ان کا جی چاہتا وہاں رکتے۔ ہوٹل یا ریسٹ ہاؤس میں دو کمرے بُک ہوتے۔ ایک کمرے میں میں اور ماں جی ہوتیں اور دوسرے

میں بھائی جان اپنے دوستوں، مداحوں اور ملنے والوں کی بھیڑ میں گھرے ہوتے۔ وہ جہاں بھی جاتے تھے ان کے چاہنے والوں کی ایک بھیڑ جمع ہو جاتی تھی۔ گھر میں یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ ہمارے بھائی جان کتنے اہم اور مقبول شخص ہیں۔ ہاں باہر نکلنے پر اس کا اندازہ ہوتا تھا۔

ایک بات اور یہ بھی دیکھی کہ مقبولیت کے ساتھ ساتھ ان کا رعب بھی بہت تھا۔ پتہ نہیں کیا اقبال تھا کہ مجمع لاکھ بپھرا ہو، پولیس چاہے قابو پانے میں ناکام رہی ہو لیکن اگر بھائی جان نے کھڑے ہو کر کہہ دیا کہ سب لوگ خاموشی سے بیٹھ جائیں اور مشاعرے کی کارروائی کو چلنے دیں تو لوگ فوراً چپ ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے تھے۔

گھر میں بھی ان کا رعب تھا۔ اوپر کی منزل سے جہاں وہ خود رہتے تھے نیچے کی منزل میں جہاں میں اور ماں جی رہا کرتی تھیں کسی وقت آ جاتے تو میں تو کم سے کم گھبرا اٹھتی تھی۔ کہتے تو کچھ نہیں تھے مگر ان کا عجیب رعب تھا۔ گھر کے باہر اور بیشمار لوگوں پر ان کا جو جادو چلتا تھا وہ واقعی حیرت انگیز ہوا کرتا تھا۔

وہ اپنے چاہنے والوں سے بڑے پیار سے ملا کرتے تھے۔ الہ آباد میں جب ہوتے تھے تو لوگوں کو دیوانہ وار ان کے پیچھے بھاگتے دیکھ کر ہم لوگوں کو خوشی اور فخر کا احساس ہوتا تھا۔ بھائی جان کو رکشے کی سواری پسند نہیں تھی۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ آدمی جانوروں کی طرح رکشہ کھینچے اور دوسرا آدمی بے حس بنا اس پر بیٹھا رہے۔ اس لئے سامان وغیرہ تو رکشہ پر رکھ آتے تھے مگر خود کبھی نہیں بیٹھتے تھے۔ وہ جب پیدل نکلتے تھے تو ایک خلقت ان کے پیچھے ہو لیتی تھی۔ کالج کے لڑکے لڑکیاں ان کی ایک جھلک دیکھنے کو اور آٹو گراف کے بہانے چند باتیں کرنے کے لئے بے قرار رہتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان پڑھے لکھے لوگ بھی جن پر ان کے فلمی نغموں کا جادو چل چکا ہوتا تھا۔ ان سے ملنا چاہتے تھے۔ بھائی جان سبھوں کو نوازتے تھے، ہاتھ ملاتے تھے، مسکرا کر حال چال دریافت کرتے تھے۔ چنے مونگ پھلی والا بھی ہوتا تو بڑی اپنائیت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اس بیچارے کی مزاج پرسی کرتے تھے۔ اتنی سی بات سے اس بے چارے کو کتنی خوشی ہوتی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

چھوٹوں سے جھک کر ملتے انہیں ہر جگہ دیکھا۔ بمبئی میں بھی جب اسٹوڈیو یا کسی پروڈیوسر کے یہاں جاتے تھے تو وہ معمولی ملازموں حتیٰ کہ دربانوں اور چپراسیوں سے بھی بڑے انکسار اور محبت سے ملتے تھے۔ تہوار یا تقریب کے موقعوں پر وہ ٹپ تو دیا ہی کرتے تھے۔ عام دنوں میں بھی بھائی جان ان بے چاروں کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان سے ہاتھ ملاتے تھے۔ اپنی سگریٹ تک پیش کرتے تھے۔ سگریٹ وہ 555 ہی پیتے تھے۔

وہ جب تک زندہ رہے، گھر ہی نہیں بلکہ پوری بلڈنگ میں ایک رونق سی رہی۔ صرف میں کہوں تو بہن کی بات سمجھی جائے گی لیکن اور دوسرے لوگوں کے بھی یہی محسوسات ہیں۔ حالانکہ بھائی جان بہت کم آمیز تھے، لیکن کم اخلاق ہرگز نہیں تھے۔ گھر سے باہر جب نکلتے تھے تو سامنے جو بچہ بھی ہوتا اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے، کوئی لڑکی ہوتی تو بڑوں کی طرح اس کی خیریت دریافت کرتے اور خاتون کو بڑھ کر آداب سلام کرتے تھے ـــــ اور یہ سب شاید اس لئے ہوتا تھا کہ بھائی جان کو انسان کا اور انسان کو جنم دینے والی عورت کا بڑا احترام تھا۔

اپنی ماں کے ساتھ تو ان کا سلوک مثالی تھا ہی۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ پچاس پچپن سال کی عمر والے بیٹے کو بالکل بچوں کی طرح

پیش آتے کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ ماں جی کے ماتھے پر ذرا سا بھی بل دیکھ کر بھائی جان کی پریشانی کی انتہا نہیں رہتی تھی۔ ماں جی جب تک ہنس بول نہیں لیتی تھیں انہیں قرار نہیں آتا تھا — بس چکر پر چکر لگاتے رہتے تھے۔ بات رفع دفع ہو جاتی تھی تو پھر کہیں جانے کی تجویز رکھتے۔ ماں جی کے انتقال کے بعد تو جیسے وہ بجھ کر رہ گئے تھے۔ بیٹھے بیٹھے ان کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں اور جب تب قبرستان کی طرف چلے جاتے تھے۔

بھائی جان کا بچوں جیسا رویہ اصل میں ان کی سادہ دلی اور معصومیت کی دلیل تھا۔ میں نے تو انہیں بچوں ہی کی طرح مچلتے دیکھا ہے گرچہ وہ بڑے تھے اور ہمیں اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے لیکن یہ ہمیشہ ہی ہوتا رہتا تھا کہ وہ بالکل چھوٹے بھائیوں کی طرح پیش آتے .... ہم دونوں میں اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ کپڑوں کا انتخاب بھائی جان کے لئے بڑا مشکل کام تھا۔ کپڑے خریدنے سے لے کر سلوانے تک ہی ہماری ذمہ داری نہیں تھی بلکہ الماری سے نکال کر بھی مجھ ہی کو دینے پڑتے تھے۔ ورنہ کبارڈ کے سارے کپڑے بستر پر پھیلا دیتے اور یہ فیصلہ نہیں کر پاتے تھے کہ کون سا کپڑا پہنا جائے۔ تب ماں جی کو یا مجھ کو ان کی یہ مشکل حل کرنی پڑتی تھی۔ مشکل کے حل ہوتے ہی وہ کھل اٹھتے تھے۔

مشاعروں میں جب کہیں جاتے تھے تو انہیں یہ مشکل اور درپیش ہوتی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں کپڑے پھیلائے الجھتے رہتے تھے۔ بنیان میں چھوٹے سے چھوٹا سوراخ یا داغ بھی نظر آجاتا تو بھڑک اٹھتے تھے کہ کیا میں یہی بنیان پہنوں گا؟ اس بیچ میں اگر یہ دیکھ لیا کہ ہم لوگ تیار ہو چکے ہیں اور بھائی جان کی گتھی سلجھی ہی نہیں ہے تو وہ بچوں ہی کی طرح ناراضگی دکھانے لگتے تھے کہ دیکھئے یہ لوگ تیار ہو گئی ہیں جیسے انہیں مشاعرہ پڑھنا ہے اور جسے مشاعرہ پڑھنا ہے اس کے کپڑے تک درست نہیں ہیں۔

زرق برق بھڑک کپڑے انہیں قطعی پسند نہیں تھے۔ ان کے چہرے پر چیچک کے داغ بھی تھے۔ لیکن ان کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔ تحت میں بھی پڑھتے تھے تو مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ یہ اکثر دیکھا کہ مجمع ان پر نثار ہے اور بڑے بڑے گلے باز شاعروں کا چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ بھائی جان ترنم سے بھی پڑھ سکتے تھے۔ ترنم سے ہی نہیں بلکہ موسیقی کے تمام اصولوں کے مطابق گا بھی سکتے تھے۔ فلمی گانے لکھنے میں انہیں اس سے کافی مدد ملتی تھی! ور اکثر میوزک ڈائرکٹر یا سنگر انہیں دیکھتے رہ جاتے تھے! اسی طرح انہیں ہر موقع کے بے شمار اشعار بھی یاد تھے۔ جب موڈ میں ہوتے تھے تو استادوں کے اشعار برابر سناتے تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ آدمی چاہے جس لائن کا ہو اسے اپنی لائن کی پوری واقفیت ہوگی تب ہی وہ کوئی نئی بات پیدا کر سکتا ہے۔ بھائی جان نے شاعری یا فلمی گیت کاری میں جو دھاک بٹھائی اس کا یقیناً یہی راز تھا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ان کی کامیابی کا صرف یہی ایک راز تھا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ان کی طبیعت میں جو سادگی، دردمندی اور سلجھاؤ اور شخصیت میں جو سچائی تھی اس کی جھلک ان کے فن میں بھی ملتی ہے اور اس کی تاثیر سبھوں کو موہتی ہے

آدمی تو آدمی جانوروں اور چڑیوں اور پرندوں تک کے لئے ان کے دل میں درد اٹھتا تھا۔ الہ آباد میں ایک بار ایسا ہوا کہ آپا کی بلّی میرے پاؤں سے آکر چمٹ گئی! ور پیار میں اپنے دانت بھی گڑانے لگی۔ میں نے گھبرا کر جو پاؤں جھٹکا تو بلی کچھ دور جا گری اور وہاں کچھ دیر دم سادھے پڑی رہی۔ بھائی جان یہ دیکھ کر گھبرا اٹھے اور مجھے ڈانٹنے لگے کہ تم نے اس بیچاری کی جان لے لی۔ اب ڈاکٹر کو بلاؤ ..... ورسوا والے مکان میں ایک چڑیا پنکھے سے ٹکرا کر زخمی ہو گئی تو اسے پانی میں کورامن گھول کر ڈراپر سے پلایا۔ اور پھر اس کی مرہم پٹی کرانے ڈاکٹر کپور کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہنستے ہوئے چڑیا کی زخمی ٹانگوں میں ٹنکچر لگا دیا۔ اس کے بعد بھی اس خوش قسمت چڑیا کی تیمارداری ہوتی رہی۔

وہ جھنگی ہو کر اڑانیں بھرنے لگی۔ مگر اس کے بعد بھائی جان نے ڈرائنگ روم کا پنکھا کبھی نہیں چلایا ___ مہمانوں کے آنے پر بھی نہیں۔ پرچھائیوں میں بھی چڑیاں گھونسلے لگا دیتی تھیں۔ وہ بیٹ کر کر کے مکان کو گندہ کرتی تھیں مگر مجال ہے کہ بھائی جان کو کچھ برا لگے۔ بلکہ باہر جاتے وقت کھڑکیاں کھلی چھوڑ جاتے تھے تاکہ چڑیوں کو آنے جانے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے لئے دانہ پانی کا بھی انتظام کرتے تھے۔ مگر چڑیاں ادھر بھٹکتی ہی نہیں تھیں تو انہیں بڑی حیرت ہوتی تھی کہ آخر یہ رکھے ہوئے دانے دنکے کیوں نہیں چگتیں۔ قسمت کی ماری ایک چڑیا پانی میں گر گئی تھی تب بھی ان کی بے چینی اور گھبراہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

بمبئی جیسے مشینی شہر میں اور وہ بھی فلمی دنیا میں آدمی کا دل اتنا نرم ہو اور وہ خود نمود و نمائش سے پاک ہو یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ فلم والے نمائش پر بہت زور دیتے ہیں۔ مگر ہمارے بھائی جان کو یہ کمزوری چھو تک نہیں گئی تھی جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ ماں جی کے انتقال کے بعد ہمارے گھر کی ساری خوشی غائب ہو گئی تھی۔ کوئی اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ گرچہ گھر کی ساری دیکھ بھال ہمارے ذمے تھی مگر میرا بھی کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

جب ہی ایک پروڈیوسر کا فون آیا۔ وہ اپنی فلم کے گانے بھائی جان سے لکھوانے کے لئے آنا چاہتا تھا۔ میں نے ادھر ادھر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ صوفہ ادھڑ گیا ہے۔ وقت کے وقت اس کی مرمت یا تبدیلی تو ہو نہیں سکتی تھی۔ اس لئے میں نے اپنی سمجھ کے مطابق اسی رنگ کی ایک چادر صوفہ پر ڈال دی۔ بھائی جان نے دیکھ کر سبب پوچھا۔ میں نے بتایا تو کہنے لگے کہ دیکھو صوفہ اچھا ہو یا برا۔ پروڈیوسر یہ دیکھنے نہیں آئے گا۔ بلکہ ساحر لدھیانوی سے گانے لکھوانے آئے گا۔ ہمارے گانے میں جان ہوگی تو کہیں بھی بیٹھیں کوئی فرق نہیں اور جان نہیں ہوگی تو کمخواب کے گدّے بھی لگا لو تو بات نہیں بنے گی۔ نمود و نمائش سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل چیز ہوتی ہے آدمی کی اپنی صلاحیت۔

یہ بات سچ ہی تھی.... بھائی جان نے فلم میں اتنی جو دھاک بٹھائی تھی وہ اپنی صلاحیت ہی کی وجہ سے۔ صرف نغمہ نگاری ہی میں نہیں بلکہ ہر معاملہ میں وہ اپنی بات منواتے تھے۔ ریڈیو سے جو فلمی گانے سنائے جاتے ہیں اس میں پہلے شاعروں کا نام نہیں لیا جاتا تھا۔ بھائی جان نے یہ بات منوائی۔ وہ میوزک ڈائریکٹر سے ایک ہی روپیہ کیوں نہ ہو زیادہ لیتے تھے اور اپنا نام میوزک ڈائریکٹر سے پہلے لینے پر زور دیتے تھے۔ ایک فلم والے نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی تھی تو انہوں نے مقدمہ کر دیا تھا۔ اور چھپے چھپائے پوسٹر بدلوا دیئے تھے۔ اسی طرح انہوں نے فلمی دنیا میں نہ صرف شاعروں اور ادیبوں کا مرتبہ و وقار بلند کیا بلکہ اردو فلموں کے لئے سنسر بورڈ سے اردو کا سرٹیفکیٹ دلوانے کی جدوجہد بھی کی۔

وہ گرچہ ٹیون پر لکھتے تھے۔ مگر میوزک ڈائریکٹر اگر اکڑ فون دکھاتا تھا تو یا تو اس فلم ہی کو چھوڑ دیتے تھے یا پھر میوزک ڈائریکٹر بدل جاتا تھا۔ اس لئے دیکھنے میں یہ آتا رہا کہ ساحر صاحب تو اپنی جگہ رہے مگر میوزک ڈائریکٹر بلکہ کمپنیاں بدلتی رہیں۔

بھائی جان کی کوئی خوبی تو تھی جو ان کی ناز برداری ہوتی تھی۔ میری سمجھ میں انہیں موسیقی کا کافی شعور تھا اور گانے والوں اور میوزک ڈائریکٹر کو ان سے مدد ملتی تھی۔ یہ تو خیر بعد کی چیز ہے۔ اس سے پہلے گانے لکھنے کا جو مرحلہ آتا ہے اس سے گزرتے وقت بھائی جان پر جو کڑا وقت آتا تھا وہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ ان دنوں وہ کھانا کم کر دیتے تھے کہ نیند آئے گی۔ کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیتے تھے۔ پنکھے بھی نہیں چلاتے تھے۔ وہ پسینہ سے تربتر اور چہرے پر جلال کی کیفیت لئے مسلسل ٹہلا کرتے تھے۔ کئی کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ انہیں اس کربناک حال میں دیکھ کر ہم لوگوں کو افسوس آنے لگتا تھا کہ بھائی جان کو یہ مصیبت ہم لوگوں کی

خاطر جھیلنی پڑتی ہے۔ ورنہ فلم ان کے لئے بہت باعث کشش نہیں تھی۔ روزگار کی تلاش میں وہ اس لائن میں ضرور آگئے تھے۔ مگر اس سے نکل جانا چاہتے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں وہ فلمی دنیا سے علاحدگی کا اعلان بھی کرنے والے تھے۔ مگر اس سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے چلے گئے۔

میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ بھائی جان کے سوچنے کا عمل برابر جاری رہتا تھا۔ چلتے چلتے بھی وہ سوچا کرتے تھے اور کسی بھی کاغذ پر خواہ سگریٹ کی ڈبی ہی کیوں نہ ہو اس پر کچھ لکھ لیا کرتے تھے۔ وہ کاغذ ایک پر ایک رکھے جاتے تھے۔ صفائی اور نفاست پسند ہونے کے باوجود یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ کاغذات ادھر ادھر ہوں۔ میں دھول ریت جھاڑنے کے بعد اسی طرح رکھ دیتی تھی۔ پھر بھی انہیں معلوم ہو جاتا تھا کہ کسی نے ہاتھ لگایا ہے۔

اپنے کام میں ڈوب جانے کی بھائی جان کی جو صفت تھی غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ نہ صرف گانے لکھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے بلکہ فلم کے دوسرے شعبوں پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ لوگ بتاتے تھے کہ ساحر صاحب کے مشورے گانے کی سچویشن میں تبدیلی یا کاٹ چھانٹ کر دینے پر پکچر میں جان آگئی۔ بعض پوری فلم کا انہوں نے آئیڈیا دیا اور وہ فلم باکس آفس پر ہٹ ہوئی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کیفی بھائی نے ۱۹۴۸ء میں لکھا تھا کہ ـ "آج کل فلمی دنیا پر جتنے خطرات منڈلا رہے ہیں ان میں ساحر لدھیانوی سب سے شدید ہیں۔ معلوم نہیں گیت لکھتے لکھتے وہ کس وقت پروڈیوسر اور ڈائرکٹر ہو جائیں۔

مگر بھائی جان تو اول و آخر شاعر تھے ـ سچے اور صاف دل والے شاعر۔ جن کو اپنے عوام اور خاص کر غریب عوام کیلئے درد تھا۔ میں اگر یہ کہوں کہ بھائی جان اصل میں ایک صوفی تھے تو لوگ شاید اسے بہن کی بیجا عقیدت قرار دیں، لیکن یہ بات صحیح ہے اور میں وثوق کے ساتھ کہہ رہی ہوں کہ بھائی جان مذہب کے، رسوم و قیود کے پابند چاہے نہ تھے مگر مذہب کی۔ سارے مذہب کی اچھائیوں کے قائل تھے۔ اور صرف قائل ہی نہیں بلکہ عمل پیرا بھی۔ انہیں قرآن کی کتنی ہی آیتیں ازبر تھیں۔ ممکن یہ کہا جائے کہ ساحر کا ذہن اور حافظہ غضب کا تھا اس لئے بچپن میں پڑھتے ہوئے قرآن کی آیتیں اگر ان کے حافظے میں محفوظ رہ گئیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ لیکن نہیں انہیں صرف آیتیں ہی یاد نہیں تھیں بلکہ ان کے ترجمے بھی روانی سے سناتے تھے۔ میں کوئی طغریٰ یا آیۃ الکرسی وغیرہ لٹکاتی تھی تو اس پر اعتراض نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک تو غیر رسمی باتیں ہوئیں۔ میں بتانا اصل میں یہ چاہتی ہوں کہ ان کے دل میں غریبوں کا بے حد درد تھا۔ فقیروں کو وہ ٹال نہیں سکتے تھے۔ پانچ پانچ کے نوٹ دیا کرتے تھے۔ جس پر وہ بےچارہ حیرت زدہ رہ جاتا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ ان کی جیب میں جتنی ریزگاری ہوتی وہ ہمارے حوالے کر دیتے تھے ... جس طرح بچوں کو چھیٹے دیئے جاتے ہیں۔ میں فقیروں کو اگر دو چار آنے دیتی تھی تو وہ ناراض ہوتے تھے۔

رمضان کے دنوں میں وہ چوکیداروں اور دربانوں کے لئے نیچے کا کمرہ پورے مہینے کھلا رکھتے تھے اور افطار و سحری بڑی پابندی سے بھجواتے تھے۔

لیکن مذہب کا وہ پہلو جو رسمی اور روایتی ہوتا ہے اس سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ پرچھائیاں کی بنیاد پڑنے لگی تو ماں جی نے لے کے۔ ہنڈیا ڈوالا سے جنہیں وہ اپنا لڑکا ہی سمجھتی تھیں نیو کھودنے کے لئے پہلا پھاوڑا چلوایا تو بھائی جان نے اسے بخوشی منظور کیا۔ لیکن جب ماں جی نے پرانی رسم کے مطابق بنیاد میں بکرے کا خون ڈالنے کی تجویز رکھی تو بھائی جان نے سختی سے منع کر دیا۔ حالانکہ وہ ماں جی کی کوئی بات

ٹالا نہیں کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بھائی جان کوئی ویجی ٹیرین یا ساکاہاری قسم کے آدمی تھے۔ بکرے اور مرغ کا گوشت انہیں بے حد مرغوب تھا مگر یہ بات پسند نہیں تھی کہ کسی جاندار کی بیجا قربانی دی جائے۔

پھر کھانے پینے کا ذکر آ گیا تو ان کا ایک اور وصف سنتے چلئے۔ ان کے کھانے اور چائے کا وقت مقرر تھا۔ کھانے کے وقت دوست احباب ہوتے تو انہیں بلا کھائے واپس نہیں جانے دیتے تھے۔ میں ان کے دوستوں کے لئے بھی کھانا تیار رکھتی تھی تو بہت خوش ہوتے تھے۔ کھانے کا وقت ہو جاتا تھا تو باورچی خانے میں آ کر جھانک لیا کرتے تھے۔ زبان سے کچھ کہتے نہیں تھے لیکن میں ان کے دیکھنے کے انداز سے تاڑ جاتی تھی کہ اب ان کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔

دوستوں کی موجودگی ہی میں نہیں بلکہ جب تنہا بھی ہوتے تھے تب بھی کھانا یا چائے طلب نہیں کرتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ نمک یا گول مرچ کی بھی ضرورت ہوتی تھی تو کچھ بولتے نہیں تھے صرف آنکھیں پھرایا کرتے تھے میں اسی سے اندازہ لگا لیتی تھی کہ انہیں کس چیز کی ضرورت ہے اور جو کبھی کہا کہ بھائی جان آپ کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اسے مانگ کیوں نہیں لیتے تو جواب دیتے کہ جو بات عمر بھر نہیں کی وہ اب کروں۔

شام کے پانچ بجے انہیں چائے چاہیئے تھی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ میں ملازم کو ہدایت دے کر غسل خانہ میں چلی جاتی تھی ادھر بھائی جان اپنے وقت پر سیڑھیوں سے اتر کر آتے مگر مجھے نہیں پا کر ملازم سے چائے طلب نہیں کرتے تھے۔ غسل سے فارغ ہو کر میں دیکھتی کہ وہ ناراض ہیں۔ وجہ یہ کہ وقت پر انہیں چائے نہیں ملی۔ ملازم نے بغیر طلب کے انہیں دی نہیں تھی۔ ملازموں پر ان کا رعب جو بہت رہتا تھا۔ خیر صاحب انہیں پھر منانا پڑتا۔ اپنا واسطہ دینا پڑتا کہ اگر آپ نہیں پئیں گے تو میں بھی نہیں پیوں گی خواہ شام کے غسل کر کے چائے نہیں پینے پر ہماری طبیعت ہی کیوں نہ خراب ہو جائے۔ یہ سنتے ہی وہ چائے پینے کو تیار ہو جاتے تھے۔

ماں جی کے انتقال کے بعد بھائی جان ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ پھر ان پر دل کا جو دورہ پڑا تو ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ ان کے سارے معمولات بدل کر رہ گئے۔ وہ زیادہ تر کھانا اپنے کمرے ہی میں کھاتے اور پہلے میری پلیٹ میں اور تب اپنی پلیٹ میں کھانا لگاتے تھے۔ کھانے کے دوران سمجھاتے جاتے تھے کہ دیکھو انور...... جہاں تک ہو سکا میں نے تم لوگوں کے لئے دنیا دی مال و متاع جمع کر دیا تاکہ ہمارے بعد تم لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ لیکن ایک بات بتائے دیتا ہوں کہ ہمارے بعد تمہارے سر پر ہاتھ رکھنے والے بہت کم لوگ ملیں گے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ دنیا مخلص اور بہی خواہ لوگوں سے یکسر خالی ہے لیکن ان لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ بھائی جان کی یہ باتیں مجھے تڑپا دیتی تھیں۔ میں انہیں کہتی تھی کہ اس قسم کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ آپ کا سایہ ہم لوگوں پر ساری عمر رہے گا۔ لیکن ہماری دعاؤں میں کوئی اثر نہیں تھا۔ اور شاید بھائی جان کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ اب وہ اس دنیا میں کچھ ہی دنوں کے مہمان ہیں۔

آخر کار ۲۵ ؍اکتوبر ۱۹۸۰ء کا وہ منحوس دن بھی آ گیا جب میں انہیں لے کر ڈاکٹر کپور کے یہاں گئی وہاں وہ اچھے بھلے تھے اور ڈاکٹر صاحب سے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ان کا سر ڈھلک گیا اور وہ خاموش ہو گئے ہمیشہ کے لئے۔

ان کے گزر جانے پر ہم لوگوں پر کیسی بجلی گری اس کا اندازہ ہم لوگوں کے سوا کون لگا سکتا ہے۔ خدا دشمنوں کو بھی یہ دن نہ دکھائے۔ ان کے آنکھ موندتے ہی بھائی جان کے بڑے بڑے دوست بدل گئے۔ ان میں سے چند ایسے بھی ہیں جن کا برتاؤ اور سلوک پہلے ہی جیسا ہے۔

یہ کہتے کہتے انور بی بی کی آنکھیں نم اور آواز رندھ گئی۔ ★

ہم کہ ٹھہرے اجنبی

یہاں پر میں بھائی جان کے تین انٹرویوز پیش کر رہی ہوں جو انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے دوستوں کو دیئے تھے ____ پہلا انٹرویو انہوں نے مشہور کہانی کار بلونت سنگھ کو الٰہ آباد میں دیا تھا دوسرا انٹرویو مشہور شاعر نریش کمار شادؔ کو تیسرا انٹرویو جدید نسل کے منفرد شاعر ندا فاضلی کو دیا تھا۔ یہ تینوں انٹرویوز پڑھنے کے بعد آپ کی آنکھوں کے سامنے بھائی جان کے ذہنی سفر کے ارتقا اور سماجی شعور کی تصویر آجائے گی۔

____ سرور شفیع

بلونت سنگھ :۔ آپ کا جنم کب ہوا تھا ؟

ساحر :۔ میرا جنم ۸ مارچ ۱۹۲۱ء میں ہوا تھا۔

بلونت سنگھ :۔ آپ نے شروع کی زندگی کہاں گزاری ؟

ساحر :۔ میرا بچپن لدھیانہ میں گزرا۔ دسویں تک میں خالصہ اسکول میں پڑھا اس کے بعد گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخلہ لیا اور فورتھ ایر میں میں لاہور چلا گیا۔

بلونت سنگھ :۔ آپ کی طالب علمی کی زندگی کیسی رہی ؟

ساحر :۔ میں ایک سال تک طالب علم فیڈریشن کا سکریٹری رہا۔ اور ایک سال پریسیڈنٹ بھی۔ سیاست سے مجھے لگاؤ تھا۔ اسی وجہ سے ایک بار پٹا بھی۔ مجھے والد کا پیار نہیں ملا۔ میں اپنے ماموں کے پاس رہا۔ انہوں نے ہی مجھے پڑھایا لکھایا۔ میرے والد بہت بڑے جاگیردار تھے۔ لیکن مجھے شروع سے ہی جاگیرداری سے نفرت تھی۔ میرے دل پر اسی وقت سے یہ بات نقش ہو گئی کہ کسانوں کے ساتھ جاگیرداروں کا برتاؤ بہت برا ہے۔

بلونت سنگھ :۔ آپ اپنی زندگی کے کسی واقعے سے دوچار ہوئے تھے یا جوں جوں الگ الگ واقعات کا اثر پڑا ویسے ویسے آپ نے شعر لکھے ؟

ساحر :۔ شروع میں تو کبھی ایسا خیال بھی نہیں آیا کہ میں شاعر بنوں گا۔ بلکہ شروع میں میں نے جو کچھ لکھا اسے کسی رسالے نے شائع نہیں کیا۔ اس لئے میں نے کچھ عرصہ کے لئے شاعری بالکل ترک کر دی۔ لیکن پھر اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر لکھنا شروع کر دیا۔ یوں تو بہت کچھ دیکھا بھی اور پڑھا بھی۔ لیکن اسکے اثر سے میں نے لکھنا نہیں شروع کیا۔ اکثر ایسا ہی ہوا کہ جب کبھی کوئی بڑا واقعہ پیش آیا تو اس سے متاثر ہو کر میں نے نظمیں لکھیں۔ بعض دفعہ دوسروں پر گزرے واقعات بھی مجھ پر لاگو ہو جاتے تھے۔ جیسے 'فنکار'، 'مادام'، 'تاج محل'، وغیرہ۔ میرے پہلے مجموعے میں بہت سی ایسی نظمیں تھیں جو کسی رسالے میں شائع نہیں ہوئیں۔

بلونت سنگھ :۔ لکھتے وقت آپ کو کیسا ماحول پسند ہے ؟

ساحر :۔ عام طور پر مجھے تنہائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی میں چلتے پھرتے بھی شعر کہہ لیتا ہوں۔ لیکن بمبئی کی سڑکوں پر ایسا کرنا مناسب نہیں۔ میں اپنے شہر لدھیانہ یا لاہور کی سڑکوں پر ایسا کیا کرتا تھا۔

بلونت سنگھ :۔ اردو کے کن کن شاعروں کا آپ پر خاص اثر پڑا ؟

ساحر :۔ مجھ پر فیض، مجاز، جوش اور اقبال کا کافی اثر پڑا ہے۔ میرا طریقہ بھی فیض سے ملتا جلتا ہے۔ فیض میں شعر کی خوبصورتی بڑھانے کا آرٹ ہے۔ مجھ پر گوپال متل کی شخصیت کا بھی اثر پڑا۔ انہوں نے پہلے پہل مجھے سوشلزم پر پڑھنے کو کتاب دی۔

بلونت سنگھ :۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے آپ کمیونسٹ اور نان کمیونسٹ میں کیا فرق سمجھتے ہیں ؟

ساحر :۔ "میں نہیں سمجھتا کہ کمیونسٹ ہوئے بنا ترقی پسند ادب نہیں پیدا کیا جا سکتا کوئی بھی ایماندار شاعر آج کی حالتوں کا ایمانداری سے بیان کرے تو اس کا کلام آگے بڑھنے سے رک نہیں سکتا۔ میرے خیال میں فیصلہ اسی بات پر ہوتا ہے کہ ہر رائٹر بلا جھجک آج کے حالات کو پوری ایمانداری سے بیان کرے۔"

بلونت سنگھ :۔ ہماری ساہتیہ اکیڈمی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

ساحر :۔ شاید یہ بات سننے میں اچھی نہ لگے اس اکاڈمی میں ایک طرح سے بندر بانٹ ہو رہی ہے۔ اکاڈمی نے شاید ہی بھارت کے زندہ لوگوں کی کوئی کتاب چھاپی ہو۔

بلونت سنگھ :۔ آپ کے خیال میں فلمی دنیا کی ہوا ایک شاعر کو راس آسکتی ہے یا نہیں ؟

ساحر :۔ "یوں تو شاعر فلمی دنیا سے دور رہ کر اچھے اچھے شعر کہہ سکتا ہے مگر میرے خیال میں فلمی دنیا ایک شاعر کو ختم نہیں کر سکتی۔ ایک اچھا شاعر فلمی گیتوں کو زیادہ شاعرانہ اور معنی دار بنا سکتا ہے۔"

بلونت سنگھ :۔ ایک اچھا شاعر جو ادب میں اپنا مقام بنا لیتا ہے وہ اکثر فلمی دنیا میں ناکام کیوں رہتا ہے ؟ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ فلم پروڈیوسر سمجھتے ہیں کہ شاعر ان کے لئے بالکل بیکار ہے۔

ساحر :۔ فلم کا ایک الگ ہی میڈیم ہے اور فلم پروڈیوسر کی الگ خواہش ہے۔ ان کو سمجھے بغیر کوئی اچھے سے اچھا شاعر بھی فلمی دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

بلونت سنگھ :۔ ادب کی دنیا میں اچھے خاصے مشہور ادیب عمدہ کہانی اور ڈائیلاگ لکھ لیتے ہیں لیکن اپنے ڈھنگ کی اچھی کہانی فلم میں پیش نہیں کر سکتے ؟

ساحر :۔ اس کی وجہ بھی لگ بھگ وہی ہے جو میں نے اوپر بتائی ہے۔ ایک فلمی کہانی ادبی کہانی سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ میرے خیال میں فلمی ٹیکنک کو ہمارے کہانی کار باقاعدہ سمجھ کر لکھیں تو وہ ضرور اچھی کہانی فلموں میں پیش کر سکتے ہیں۔

بلونت سنگھ :۔ ہماری فلم انڈسٹری رائٹروں سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہے یا نہیں ؟

ساحر :۔ نہیں ! لیکن میرے خیال سے اب دھیرے دھیرے کچھ تبدیلی آ رہی ہے اور آئندہ اس کا نتیجہ کچھ اچھا نکلے گا۔

بلونت سنگھ :۔ بعض فلمی ڈائرکٹر کھلم کھلا کہتے ہیں کہ کہانی کاروں کی کہانی ان کے کسی کام نہیں آ سکتی۔ گویا فلموں کو ادب سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ؟

ساحر :۔ ادب اور فلمی دنیا کے بیچ میں ایک ایسی لکیر کھینچ دینا میرے خیال میں ٹھیک نہیں۔ بعض بنگالی افسانہ نگاروں کے افسانے بڑی کامیابی سے فلمائے گئے ہیں۔ آج کے رائٹروں کی کہانیاں بھی فلمائی جا سکتی ہیں۔ میرے خیال میں جو ڈائرکٹر ایسا کہتے ہیں انہوں نے آج کے ادب کا مطالعہ کیا ہی نہیں ہے۔ اگر وہ آج کے ادب کا مطالعہ کرتے رہتے تو انہیں اکثر عمدہ پلاٹ کی کہانیاں ملتی رہتیں۔

بلونت سنگھ :۔ بھارتی سنسر بورڈ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

ساحر :۔ بھارتی سنسر بورڈ کامیاب نہیں ہے۔ میرے خیال میں جس زبان کی فلم ہو اس کے بورڈ میں اس زبان کے کم سے کم دو رائٹر ہونے چاہئیں۔ اکثر فلم سے بڑی اوٹ پٹانگ کاٹ چھانٹ کر دی جاتی ہے۔

بلونت سنگھ :۔ ہمارے رائٹروں کی زندگی میں اکثر عورتوں کی محبت کی کمی کی وجہ بڑی گہری فرسٹیشن پائی جاتی ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے ؟

ساحر :۔ ہمارا سماج یک جنسی ہے، یہاں مرد کا بول بالا ہے۔ اس لئے ہمارے یہاں کی عورتیں مردوں کے ساتھ آزادانہ میل جول نہ کر سکنے کی وجہ سے محبت کے گورکھ دھندے سے ہی دور رہتی ہیں۔ اور اگر کوئی عورت بھولے بھٹکے سے محبت کر بھی لے تو سماج کی بندشیں اتنی مشکلات پیدا کر دیتی ہیں کہ وہ اکثر بیوفائی کر کے اپنی جان چھڑاتی ہے۔

بلونت سنگھ :۔ آپ کا اپنی شاعرانہ خوبیوں کے بارے میں کیا خیال ہے ؟

ساحر :۔ اگر میری صحت اچھی رہے تو میرے خیال میں میرے لئے ناامیدی کی کوئی بات نہیں۔ پچھلے سال میری صحت کافی بگڑ گئی تھی جس کی وجہ سے میرے اس کام میں بھی رکاوٹ پیدا ہوئی۔

بلونت سنگھ :۔ اردو کا ہر کامیاب شاعر غزل ضرور کہتا ہے یا اپنی شاعری کی شروعات غزل ہی سے کرتا ہے۔ غزل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

ساحر :۔ ایک طرح سے غزل کا لکھنا آسان ہے ۔ اردو شاعری میں غزل کا رواج خاصہ پرانا ہے ۔ جس سے ہر نئے شاعر کو مدد ملتی ہے شاید اسی لئے اکثر شاعر صرف غزل ہی کہتے ہیں یا کم سے کم اپنی شاعری غزل ہی سے شروع کرتے ہیں ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اچھی غزل لکھنا آسان کام ہے ۔

بلونت سنگھ :۔ ادبی مضمون میں رائٹر کے دل کو جو خوشی نصیب ہوتی ہے آپ اس کو اہمیت دیتے ہیں یا آپ کے خیال میں رائٹر کا کام سماج کی خدمت کرنا ہی ہے ؟

ساحر :۔ میں ادیب کی خوشی کو بہت اہمیت دیتا ہوں ۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی درست ہے کہ کوئی حقیقی ادیب خود کو سماج کے مسئلوں سے الگ نہیں رکھ سکتا ۔ ان سے غافل نہیں رہ سکتا ۔ ادیب یا شاعر پر کوئی ایسی پابندی لگانا غلط ہوگا کہ وہ ہر بار سماج کے کسی مسئلے کا حل اپنی تخلیقات میں پیش کرے ۔

بلونت سنگھ :۔ آپ کے خیال میں بٹوارے کے بعد اردو کی ترقی پاکستان اور بھارت میں کیسی رہی ؟

ساحر :۔ بٹوارے سے ایک بار تو اردو ادب اور اردو ادیب دونوں کو خاصا جھٹکا لگا ۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر حالت درست ہو جائے ۔

بلونت سنگھ :۔ آپ کو ادب کے علاوہ کسی اور چیز سے بھی دلچسپی رہی ؟

ساحر :۔ جی ہاں ۔ میوزک سے کچھ دلچسپی رہی ۔ میں اسکول کے دنوں میں گاتا بھی تھا ۔ لیکن کالج میں پہنچ کر میں نے گانا چھوڑ دیا ۔

بلونت سنگھ :۔ کیا آپ ایک غزل ایک ہی بیٹھک میں لکھ لیتے ہیں ؟

ساحر :۔ جی نہیں میں ایک غزل ایک ہی بیٹھک میں نہیں لکھتا ۔ اکثر کئی بیٹھکوں میں غزل پوری ہوتی ہے ۔ ہاں کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ ایک ہی بیٹھک میں غزل پوری ہو جاتی ہے ۔

بلونت سنگھ :۔ آپ کے خیال میں کسی قسم کا نشہ ایک رائٹر کے لئے ضروری ہے ۔ بعض لوگ اس کے بغیر تخلیق کر ہی نہیں پاتے ؟

ساحر :۔ میرے خیال میں کسی بھی تخلیق کے لئے نشے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ کبھی تخلیق کے بعد ہلکے پھلکے نشے کی ضرورت ہو سکتی ہے لیکن وہ ضروری نہیں ہے ۔

بلونت سنگھ :۔ آپ کی عمر کافی ہو گئی ہے لیکن آپ نے شادی نہیں کی ۔ کیا آپ اس کے خلاف ہیں ؟

ساحر :۔ جی نہیں ۔ میں شادی کے خلاف نہیں ہوں لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے شادی کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوئی میرے خیال میں کسی بھی مرد کا عورت سے تعلق بیوی ۔ شوہر کا ہی ہونا ضروری نہیں ہے ۔ ماں کا پیار اور بہن کا پیار بھی تو ہو سکتا ہے ۔

بلونت سنگھ :۔ ایک مرد میں باپ کا پیار بھی ہوتا ہے ۔ شادی کے بنا اس کی اس خواہش کی تسلی کیسے ہو سکتی ہے ؟

ساحر :۔ مجھے ایسا کبھی محسوس نہیں ہوا ۔ میری دو چھوٹی بہنیں ہیں جنہیں میں بہت پیار کرتا ہوں ۔ ہو سکتا ہے میرے اندر باپ کے پیار کی خواہش اسی طرح سے پوری ہو جاتی ہو ۔

بلونت سنگھ :۔ لباس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

ساحر :۔ مجھے سردیوں میں مغربی لباس اچھا لگتا ہے اور گرمیوں میں جو مل جائے اسی سے گزارا ہو جاتا ہے ۔

بلونت سنگھ :۔ شاعری کے علاوہ آج کل آپ کو اور کن کن چیزوں سے دلچسپی ہے ؟

ساحر :۔ کالج کے زمانے میں کرکٹ کھیلا کرتا تھا۔ بعد میں تصویریں اور ریکارڈ جمع کرنے کا کافی شوق رہا۔ آج کل رائٹروں کی آواز ریکارڈ کیا کرتا ہوں۔

بلونت سنگھ :۔ کھانے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

ساحر :۔ جو بھی چیز آسانی سے مل جائے وہ میں کھا لیتا ہوں۔ کسی خاص چیز کا شوق نہیں ہے۔ پہلے گوشت کھایا کرتا تھا۔ لیکن اب گوشت کھانے سے الجھن ہوتی ہے۔ اپنے پیٹ کی خاطر کسی بے زبان کی جان لینا اچھا نہیں لگتا۔

—— ❖ ——

ساحر کے ساتھ ایک شام

نریش کمار شاد مرحوم

"میں کب اور کہاں پیدا ہوا ؟"

میرے اس سوال کو زیر لب دہرا کر ساحر نے ہنستے ہوئے کہا۔ اے جدت پسند نوجوان! یہ تو بڑا ذاتی سوال ہے۔ اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اس میں اتنا اضافہ اور کر لو "کیوں پیدا ہوا ؟"

میں نے جان بوجھ کر اپنے اوپر بے چارگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ "خوش مذاقی آپ کی مسلم۔ لیکن ساحر صاحب اس کا سہارا لے کر آپ ہم غریبوں کے انٹرویو لینے کے شوق کا مذاق کیوں اڑا رہے ہیں ؟"

ساحر نے ذرا سا جھینپتے ہوئے قہقہہ لگایا اور سگریٹ کا پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ۱۹۲۱ء میں لدھیانہ میں۔

میں نے اطمینان کی سانس لی اور پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے پوچھا۔ تعلیم کہاں اور کہاں تک حاصل کی ؟

بی اے نہیں کر سکا ہوں۔ گورنمنٹ کالج لدھیانہ اور دیال سنگھ کالج لاہور دونوں کالجوں سے نکالا ہوا ہوں ـــ اور اتنا کہنے کے بعد ساحر کے لہجہ میں جیسے فخر و اعتماد کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن اب ان دونوں کالجوں کو ناز ہے کہ میں وہاں پڑھتا رہا ہوں اور اب اس حادثہ کا کہ میں وہاں سے نکالا ہوا ہوں یقیناً انھیں صدمہ ہے۔"

اور مجھے اس وقت بے اختیار ساحر کی نظم "نذر کالج" کا آخری شعر یاد آ گیا۔

لیکن ہم ان فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر یاں نہیں تو یاں کے نکالے ہوئے تو ہیں

اچھا فرمائیے مسٹر عبدالحئی سے آپ حضرت ساحر لدھیانوی کب بنے ؟

۱۹۳۷ء میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اور امتحان کا نتیجہ نکلنے سے پہلے جب مجھے بالکل فراغت تھی سب سے پہلا شعر کہا تھا ـــــ یاد نہیں۔ شاید یاد رکھنے کے قابل بھی نہ ہو۔

ابتدائی شاعری پر اصلاح کس سے لی؟

کسی سے نہیں۔ اور پھر یکایک جیسے ساحر صاحب کو کچھ یاد آگیا اور وہ کہنے لگے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ میں نے اپنی سب سے پہلی نظم ایک دوست کے ذریعہ اپنے اسکول کے ٹیچر فیاض ہریانوی کو اُن کی رائے دریافت کرنے کے لئے بھیجی۔

تو انہوں نے کیا رائے دی؟

یہی کہ اشعار موزوں ہیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے نظم بہت معمولی ہے۔ اتنا کہہ کر ساحر نے اپنے مخصوص لیکن بڑے محبوب اور دل کش انداز میں کہا "ظاہر ہے میرے لئے اس وقت یہی بہت تھا کہ اشعار موزوں تو ہیں۔

اپنا تخلص آپ نے ساحر ہی کیوں تجویز کیا؟

کرسی سے اٹھ کر ساحر کمرے میں ٹہلنے لگے اور ٹہلتے ٹہلتے کہنے لگے۔ چونکہ کوئی نہ کوئی تخلص رکھنا مروج تھا۔ تخلص کے لئے کوئی اچھا سا لفظ مل جائے تلاش میں تھا۔ کہ اقبال نے داغ کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں اس شعر پر نظر پڑی ـــ

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سینکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی

اپنی شاعری سے متعلق مجھے کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی نہیں تھی اور چونکہ میں بھی اپنے آپ کو سینکڑوں میں ایک شمار کرتا تھا اس لئے اپنے تخلص کے لئے مجھے ساحر مناسب معلوم ہوا۔

شروع میں آپ اردو کے کس کس شاعر سے خاص طور پر متاثر تھے؟

اقبال اور جوش ملیح آبادی سے۔

اور اب اگر میں یہ دریافت کروں کہ آپ شعر کیوں کہتے ہیں؟

ساحر نے حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھا تو نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ دیکھ نہیں رہے ہیں بلکہ مجھے اپنی لمبی نوکیلی ناک سے سونگھ رہے ہیں اور ایک بار پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ میری رائے میں ہر آدمی کا جو پیشہ ہے اس میں اس کا شوق اور ضرورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ کبھی شوق پہلے اور کبھی ضرورت۔ سماجی اور سیاسی نظریئے کی تبلیغ کا سوال اس کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ تقسیم وطن کے بعد ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے اپنے وقت کا ایک حصہ مجھے فلمی شاعری کی نذر کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ اپنی زندگی کے بعض

سانحات کی یاد کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی میرا ذہن تخلیق شعر پر مجبور تھا۔
یہ سُن کر مجھے ان کا یہ شعر یاد آگیا۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ دیا ہے مجھ کو وہ لوٹا رہا ہوں میں

اور آپ شعر کہتے کیوں کر ہیں ؟

اِس کے جواب میں ساحر اپنے چیچک زدہ چہرے کو سہلاتے ہوئے بتلانے لگے۔ بعض اوقات کوئی ذاتی واقعہ یا اجتماعی مسئلہ ذہن پر اس طرح طاری ہو جاتا ہے کہ اشعار کے بغیر اس کا تجزیہ کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ اُس وقت کسی خاص ماحول کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے عالم میں کوئی چیز مخل ہوتی بھی ہے تو مخل ہوتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ فلمی گانا لکھنے کے لئے دروازہ بند کر کے کمرے میں ٹہل ٹہل کر اور شعوری طور پر اپنے آپ کو گیت سے متعلق ماحول اور کردار کی نفسیات کے سانچے میں ڈھال کر اشعار کہتا ہوں یا گیت لکھتا ہوں۔

اچھے شعر کی آپ کے خیال میں مختصر ترین تعریف کیا ہے ؟

خوب صورت ہو سچّا ہو اور مفید ہو۔

کیا آپ عروض سے واقف ہیں اور کیا عروض کا جاننا شاعر کے لئے ضروری سمجھتے ہیں ؟

میں خود عروض سے قطعاً ناواقف ہوں۔ اس صورت میں عروض کا جاننا شاعر کے لئے ضروری کیوں کر سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اگر ایک اچھا شاعر عروض سے واقف ہو تو اس کے حق میں زیادہ اچھا ہے۔

آپ کی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ جس نے آپ کی شاعری پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو ؟

کئی چھوٹے اور بڑے واقعات ہیں کسی خاص واقعے کا انتخاب ناممکن ہے۔

آپ اس صدی کا سب سے بڑا شاعر کسے تسلیم کرتے ہیں ؟

نظریاتی اختلاف کے باوجود اقبال کو۔

اُردو کے موجودہ شاعروں میں آپ کو خاص طور پر کون سا شاعر پسند ہے؟

مشکل یہ ہے کہ ہم عصر شاعروں کے بارے میں ذاتی پسند کا انحصار فنکار کے علاوہ اس کی شخصیت پر بھی ہوتا ہے تاہم فیض احمد فیض مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔

اور اردو کے جدید شاعروں میں کوئی قابلِ ذکر شاعر بھی آپ کی نظر میں ہے ؟

نریش کمار شاد۔ ساحر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ حوصلہ افزائی کا شکریہ، لیکن ذرا اور سنجیدگی سے بتائیے۔ میرا مطلب ہے حق گوئی سے کام لیجیے، تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

حوصلہ افزائی یا تمہیں خوش کرنے کا سوال نہیں ــــ ساحر نے اپنی لمبی لمبی انگلیوں کو لہراتے ہوئے کہا ــــ اپنی اس رائے کا اظہار میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ تصدیق درکار ہو تو کنور مہندر سنگھ بیدی سے پوچھ لینا۔

اپنے ذکر کے سلسلے کو ارادتاً منقطع کرتے ہوئے میں نے دوسرا سوال کیا۔ آپ کی نظر میں اب تک آپ کی بہترین نظم کون سی ہے؟

ساحر نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے کہا۔ مختلف اوقات میں مختلف نظمیں بہترین معلوم ہوتی رہی ہیں۔

مثلاً اس وقت کون سی نظم؟

پرچھائیاں ــــ ساحر نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

کیا شعر و شراب لازم و ملزوم ہیں؟

ہرگز نہیں شعر کہنے کے لئے نشے کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ نشے کی حالت میں عام طور پر اچھا شعر کہا ہی نہیں جا سکتا۔

تو پھر آپ شراب کیوں پیتے ہیں؟

میں تو بش شرٹ بھی پہنتا ہوں۔ حالانکہ بش شرٹ پہننا شاعر کے لئے ضروری نہیں ہے۔

شاعری سے قطع نظر ویسے آپ کے شراب پینے کی وجہ کیا ہے؟

میں شراب نہیں پیتا تھا۔ جب بمبئی میں شراب بندی ہوئی تھی اس وقت بھی میں شراب نہیں پیتا تھا۔ بعد میں لو بلڈ پریشر کی وجہ سے طبی طور پر میں نے تین چار سال تک شراب کا استعمال کیا اور اس سے کافی افاقہ ہوا۔ اب البتہ اس کا عادی ہو گیا ہوں۔ رات کو شراب پئے بغیر اچھی طرح نیند نہیں آتی۔

شاعری کے علاوہ آپ کو ادب کی دوسری اصناف سے کس حد تک دلچسپی ہے؟

پڑھنے کی حد تک ہر صنف سے دلچسپی ہے لیکن ــــ ساحر نے انگلیوں کو اپنے بالوں میں الجھاتے ہوئے کہا ــــ شروع شروع میں کچھ کہانیاں بھی میں نے لکھی ہیں اور بعد میں چند تنقیدی مضامین بھی۔

کیا ہمارا موجودہ ادب واقعی جمود کا شکار ہے؟

جمود حرکت کی ضد ہے۔ ادب میں حرکت تو ہے، لکھا بھی بہت کچھ جا رہا ہے یہ دوسری بات ہے کہ وہ زیادہ بلند پایہ نہ ہو۔

آپ کا سیاسی نظریہ کیا ہے؟

میں کبھی کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں رہا۔ غلام ہندوستان میں آزادی کے مثبت پہلو ڈھونڈنا اور ان کا پرچار کرنا میرا نصب العین ضرور رہا ہے اور اب ذہنی طور پر اقتصادی آزادی کا حامی ہوں جس کی واضح شکل میرے نزدیک سوشلزم ہے۔

آپ کے خیال میں ہندوستان میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ساحر نے ڈپلومیٹک انداز اختیار کرتے ہوئے جواب دیا "اردو زبان کے مستقبل کو ہندوستان کے مستقبل سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں اردو کا وہی مستقبل ہے جو خود ہندوستان کا ہے۔ یعنی جس رفتار سے تعصب اور تنگ نظری میں کمی پیدا ہوگی اسی رفتار سے ملک اور اُردو دونوں آگے بڑھیں گے۔

اب ذرا ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق فرمائیے؟

مَیں سمجھتا ہوں ترقی پسند تحریک نے ادب اور ملک کی بڑی خدمت کی ہے۔ اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے کچھ غلطیاں بھی ضرور سرزد ہوئی ہیں۔ لیکن جو لوگ صرف اس کی خامیاں ہی گنتے ہیں۔ میں اُن سے مطمئن نہیں ہوں۔

لیکن یہ تو آپ مانتے ہیں کہ اس کا شیرازہ اب بکھر چکا ہے؟

جی ہاں منظم صورت اب باقی نہیں ہے۔

اور کچھ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ تحریک محض چند افراد کے حصولِ شہرت اور باہمی ستائش کی تحریک تھی۔ اس سے انہوں نے اپنا اُلّو سیدھا کیا اور تحریک کا بولو رام ہوگیا۔ اُس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ع " لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے"

مجھے توقع تھی کہ میری بات کے جواب میں ساحر اپنا مصرعہ پڑھ کر پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں گے لیکن انہوں نے خلاف توقع بہت تحمل سے کہنا شروع کیا۔

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ اس تحریک کے افراد نے کافی قربانیاں دی ہیں صعوبتیں جھیلی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایک دوسرے کی شہرت میں اضافے کا باعث ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ سے سماج اور ادب کے منفی میلانات کے خلاف اُن کی نظریاتی یکسانی تھی۔ اب اگر تحریک میں کرائسس پیدا ہو تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں سرمایہ داری کے توڑ کے لئے اشتراکی نظام کا جو خوش آئند تصوّر تھا اس میں بھی شخصی آزادی اور کچھ دوسرے معاملات کے متعلق بعض عملی خرابیاں محسوس ہوئیں۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ فلمی شاعری اور خاص طور پر اپنی فلمی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ادبی شاعری کے لئے بھی شروع میں روایتی شاعری کرنی پڑتی ہے اس کے بعد شاعر اپنے دل پسند اسٹائل سے کام لیتا ہے۔ میں نے بھی ابتدا میں فلمی دنیا کی روایت سے ملتی جلتی شاعری کی اور بعد میں اپنی جگہ بنانے کے بعد میں اس قابل ہوا کہ بہت سی فلموں میں اپنی پسند کی فلمیں انتخاب کر سکوں۔ اس طرح میں بآسانی اور بخوبی اپنے خیالات و جذبات کا پرچار کر سکا —— اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ساحر نے کہا —— فلم کے اس پہلو کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے خیالات و جذبات کا پرچار کرنے کے لئے یہ ایک پاورفل میڈیم ہے۔

یہ بتائیے کہ پرانے فلمی شاعروں میں کونسا شاعر آپ کو پسند ہے؟

پرانے شعرو میں پسندیدہ شاعر

"آرزو لکھنوی" کے

"اور ہم عصر فلمی شاعروں میں"

ساحر کے بھرے ہوئے چہرے پر ہلکی سی پریشانی کا رنگ دوڑا لیکن جلد ہی انہوں نے متوازن ہوتے ہوئے مسکرا کہا "بات یہ ہے کہ میں فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا صدر ہوں اس لئے اس سوال کا جواب دینا مناسب نہیں ہے کیونکہ اب سب فلمی شاعروں کو ایک نظر سے دیکھنا میرا فرض ہے۔

دفعتاً مجھے ساحر کی کسی پرانی نظم کا شعر یاد آگیا۔

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

اس کا جواب دینا تو غالباً آپ نامناسب خیال نہیں کریں گے۔ میں نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا کہ آپ نے ابھی تک ...... شادی کیوں نہیں کی ؟

ساحر جیسے اس غیر متوقع سوال کو سن کر چونک سے گئے۔ اور پھر حسب عادت اس سوال کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے جواب دیا "کیونکہ کچھ لڑکیاں مجھ تک دیر سے پہنچیں اور کچھ لڑکیوں تک میں دیر سے پہنچا"

مشترکہ قہقہے کے بعد میں نے کہا "اچھا ساحر صاحب مجھے اب اجازت دیجئے کیونکہ میں بمبئی میں اپنی قیام گاہ تک بروقت پہنچنا چاہتا ہوں۔

ایک ملاقات

ندا فاضلی

"ساحر صاحب، آج موسم کچھ زیادہ گھٹا گھٹا سا ہے۔"

"ہاں موسموں کی گھٹن کا تلخیاں میں کئی جگہ ذکر ہے۔"

"آج کل مارکیٹ میں جاپانی گھڑی سیکو، بہت سستی مل رہی ہے۔"

"جی ہاں، تلخیاں میں اسمگلنگ پر کافی گہرے طنز مل جائیں گے۔"

"آزادی کے بعد اردو کتابوں کی مارکیٹ بہت کم ہو گئی ہے۔"

"نہیں صاحب، 'تلخیاں' کے اکیتس سے زائد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔"

"اشیاء کی قیمتیں دن بدن آسمان کو چھو رہی ہیں۔"

"صحیح ہے، لیکن جب 'تلخیاں' کا پہلا ایڈیشن لاہور میں چھپا تھا، اُس وقت حالات ایسے نہیں تھے۔"

تلخیاں.... تلخیاں.... تلخیاں.... ساحر لدھیانوی سے بات چیت کرنے کے لئے، ہیمنگ وے کے بوڑھے مچھیرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اتفاق سے آپ اُن کے فلیٹ میں ہی بیٹھے ہوں تو یہ ضرورت مجبوری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یوں بھی ساحر کے ملنے جلنے والے عام طور سے وہی لوگ ہوتے ہیں جو ساحر سے کم، ساحر کے بینک بیلنس، فلیٹس اور ساحر کی شراب سے زیادہ ملاقات کرتے ہیں۔ لیکن ایک بار ایک ایسے صاحب بھی ساحر سے ملنے چلے آئے جو شاید بمبئی میں نئے نئے آئے تھے اور صرف ساحر سے ملنا چاہتے تھے۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔ وہ ابھی مشکل سے چند منٹ بیٹھے ہوں گے کہ وہسکی کے تین پیگ چڑھائے ہوئے ساحر کی اجازت کے بغیر، ساحر کے بینک بیلنس نے انہیں دھکے دیکر باہر نکال دیا۔ بے چارے نئے نئے تھے، اگر جانکار ہوتے تو دوسروں کی طرح وہ بھی فلمی شہرت اور ادبی وقعت میں امتیاز کرنے کی بھول نہیں کرتے۔

ساحر کی تلخیاں کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں لیکن ساحر پیدائش سے اب تک ایک ہی ایڈیشن میں چل رہے ہیں۔ ساحر

دراصل اپنے آپ کو نہ بانٹ سکنے کی کشمکش کے شکار رہیں۔ وہ پیر کے انگوٹھے سے سر کے بالوں تک، ابھی تک پورے جڑے ہوئے ہیں اگر جڑا ہوا آدمی ٹھیک وقت پر ٹوٹ پھوٹ کر بکھرنا شروع نہ ہو تو شخصیت میں نئی نئی گتھیاں پڑ جاتی ہیں۔ ساحر کا سب سے بڑا المیہ ان کی یہ ہی سالمیت ہے۔ جس نے ان کے اندر نرگسیت کی ٹیڑھ ابھار دی ہے۔ ساحر کی عمر بھلے ہی کچھ ہو لیکن ذہنی طور پر وہ ابھی تک پندرہ سولہ سال والے کھلنڈرے پن ہی میں سانس لے رہے ہیں۔ وہ جسم سے ضرور بڑھ گئے ہیں لیکن ذہن مادرانہ شفقتوں کے حصار کو پار نہیں کر سکا ہے۔ وہ ابھی تک امی ماں کے اکلوتے بیٹے ہیں، جو خود کو اور دوسروں کو اپنی ماں کی آنکھوں سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں ساحر کی گفتگو کا پسندیدہ موضوع ساحر لدھیانوی ہی ہے۔ اس موضوع کی خشکی کو وہ طرح طرح کے اچھے برے لطیفوں سے کم بھی کرتے رہتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ ساحر کو اپنی اس کمزوری کا علم نہ ہو۔ لیکن رات دن محفلوں اور صحبتوں میں گھومنے والا ساحر اپنے اکیلے پن کے شدید احساس کے شکنجوں میں اس بری طرح پھنسا ہوا ہے کہ اب باوجود شعوری کوشش کے بھی وہ اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ ساحر قدرت کی ظرافت کا انتقام اپنے اردگرد کے ماحول سے لینا چاہتے ہیں۔ لیکن تگ و دو کی عملی دنیا میں جب وہ پچپن کروڑ کی بھیڑ میں اپنے آپ کو ایک اکائی کی حیثیت میں پاتے ہیں تو سوائے بے معنی جھلاہٹوں کے ان کے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں رہتا، ساحر کی جھلاہٹیں ساحر کا مرض ہیں۔ ساحر کے یار دوست ان کمزوریوں کے ساتھ انہیں گوارا بھی کرتے ہیں۔ ہوش میں تو وہ تجارتی مصلحتیں نبھا بھی لیتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی دو تین پیگ اندر اترتے ہیں، خود ساحر کے لئے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ساحر کو فلموں میں کافی تگ و دو کرنی پڑی ہے۔ کرشن چندر کے ورانڈے میں بستر بچھا کر سونا پڑا ہے، فلمسازوں کے آگے پیچھے پھرنا پڑا ہے۔ میوزک ڈائرکٹروں کے گھروں کے برسوں طواف کرنے پڑے ہیں، تب کہیں جا کے رئیسانہ ٹھاٹ کے دن دیکھنے کو ملے ہیں۔

ماضی کی تلخ یادوں نے انہیں کسی حد تک sadist بھی بنا دیا ہے۔ دوسروں کے منہ پر برا بھلا کہہ کر، اور ضرورت مندوں کو بار بار اپنے گھر کے بے مقصد چکر کٹوا کر انہیں اب سکون بھی ملتا ہے۔ ساحر کے پاس جو بھی کسی کام کے لئے جاتا ہے، کبھی مایوس نہیں لوٹتا مگر جھوٹے وعدے کرنا اور مہینوں دوسروں کو ان میں الجھائے رکھنا ان کی مخصوص ہوبی بھی ہے۔ ان بے مقصد چکر کاٹنے والوں کی مجبوریوں سے وہ نئے نئے لطیفے تراش کر اپنی شام کی محفلوں کو رنگین بھی بناتے ہیں۔ ساحر کو اپنے ہاتھ سے پیسہ دینے میں مزہ آتا ہے۔ لیکن اگر کہیں کسی کا روزگار لگ رہا ہو تو اس میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لطف کو بھی وہ کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لیکن ان تمام کجرویوں کے باوجود ساحر اس الٹے سیدھے سماج میں زندگی کرنے کے فن سے واقف ہیں۔ وہ نئی نئی controversies میں الجھ کر دوسروں کو ہمیشہ اپنی طرف متوجہ کئے رہتے ہیں دوسروں کے ذہنوں سے کس طرح زندہ رہا جاتا ہے اس فن سے وہ بخوبی واقف ہیں۔

کسی سے بار بار ملئے اور بھول جائیے اور پھر اچانک کبھی یوں ہی اس کے بارے میں سوچنے لگئے۔ نہ جانے کہاں کہاں ذہن لے جاتا ہے۔

ٹوٹی ہوئی زنگ لگی تلوار، بچوں کے گول گول انگوٹھے، سرکنڈوں کے سوکھے کھیت، کچی ململ کے ہلکے گہرے ڈوپٹے، پیتل کی ترازو اور دور دور تک پھیلا ہوا اندھیرا۔ . . . . . عجب عجب رنگ پھیلتے ہیں نئی نئی تصویریں ابھر آتی ہیں۔ ہر تصویر اپنے طور پر مکمل، مگر دوسری تصویر سے مختلف۔ اور پھر سب رنگ اور تصویریں گھل مل کر ایک بالکل نئی تصویر کا روپ دھار لیتی ہیں۔

مسکراتی ہوئی ایک بڑی سی تصویر۔ نہ جسم، نہ ہاتھ نہ پیر، نہ ناک۔۔۔۔ لیکن ایک مکمل اور زیادہ سچی تصویر۔۔۔۔

شکل و صورت

ساحر سے ملنے سے پہلے میں بھی 'تلخیاں' کے سرورق پر پھیلی ہوئی چوڑی پیشانی، چیچک کے داغ، گمبھیر آنکھوں اور ضرورت سے زیادہ لمبی ناک کو ہی ساحر سمجھ رہا تھا۔۔۔۔ لیکن کیمرہ کی آنکھ بھی کتنا دھوکہ باز ہوتی ہے۔ ساحر نے اپنی صحیح تصویر کبھی کسی کیمرہ کو نہیں سونپی۔ وہ جو نہیں تھے وہ ہی ہمیشہ دوسروں کو دکھاتے رہے ہیں

ساحر صاحب، آپ تک پہنچنا بہت کٹھن ہوتا ہے۔ مجھے چار پانچ روز پریشان ہونا پڑا تب کہیں جاکر آپ سے ملاقات ہو پاتی ہے اور اسے بھی اتفاق کہیئے۔ کمال اسٹوڈیو سے میں نے یونہی نمبر لگا دیا تھا۔ شاید آپ نے اسٹوڈیو کا نام سن کر اپنے ہونے کا اعلان کر دیا۔ ویسے عام طور سے تو آپ باتھ روم سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ "آج سے اے مزدور کسانو، میرے گیت تمہارے ہیں۔

"اجی نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں پچھلے ہفتے سے عجیب عجیب پریشانیوں میں مبتلا ہوں۔ گھر میں بہت کم رہا ہوں۔ پہلے کرشن چندر اچانک بیمار ہوئے اور پھر میرے ایک ہم جماعت علیل ہوئے۔ انہیں امریکہ علاج کے لئے روانہ کرنا تھا۔ زیادہ وقت پیسہ جٹانے کی دوڑ دھوپ میں ضائع ہوا۔ جو کچھ کمایا تھا وہ مکان کی تعمیر میں لگا دیا تھا۔ اب تو معاف کیجئے۔۔۔۔۔" ساحر اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ٹیلی فون ٹیبل کی طرف اٹھ کر چل دیئے۔

"ہلو۔۔۔۔ ! جی میں ساحر بول رہا ہوں۔ کون؟ اچھا۔ کہیئے کیسے ہیں۔ جی جی۔ ارے کب۔۔۔۔؟ اسپتال میں داخل کر دیا ہے۔ آپ کی بیوی۔۔۔ ! سو روپیئے۔۔۔۔ بہتر ہے۔۔۔۔ نیچے کھڑے ہیں اچھا میں ابھی دیئے دیتا ہوں۔ فون رو کے رکھئے۔"

ریسیور نیچے رکھ کر ساحر اندر کمرے میں گئے اور دو تین منٹ بعد واپس آکر جیسے ہی ریسیور اٹھایا ان کا چہرہ جو کچھ لمحے پہلے نہایت سنجیدہ اور فکر مند تھا اچانک مسکرا اٹھا۔ لیجئے ندا صاحب، موصوف فرما رہے ہیں ساحر کو بے وقوف بنا دیا۔ کیا خوب، تھوڑی دیر بعد اس کا اظہار کرتے تو کیا بگڑ جاتا۔ شاید کسی ساتھ والے سے بات کر رہے ہیں۔ مگر فون پر آواز برابر سنائی دے رہی ہے۔

ساحر کافی دنوں تک فلموں کے کامیاب گیت کار رہے ہیں۔ فلموں میں گیت لکھنا تو کوئی زیادہ کٹھن نہیں، ہاں گیت لکھنے کے مواقع حاصل کرنا نہایت مشکل ہے۔ طرح طرح سے اپنا ڈھنڈورا پیٹنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جاکے فلم سازوں کو گیت کار کی صلاحیتوں کی اطلاع ملتی ہے۔ ساحر اس راز سے واقف ہیں۔ ان کا ذہن ایسی کہانیاں گڑھنے میں زیادہ خلاق ہے جس کے ہیرو وہ خود ہی ہوتے ہیں۔

دُنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ہاں صاحب، اب فرمائیے۔ ساحر قہقہہ لگاتے ہوئے سگریٹ سلگا رہے تھے۔ وہ کہاں سے بات چھوڑ کے گئے تھے۔ اب انہیں یاد نہیں تھا۔ کبھی کبھی ادھوری بات بھی کتنی مکمل ہو جاتی ہے۔

ساحر کا مکان کافی کشادہ ہے، بمبئی میں جن کے پاس پیسہ ہوتا ہے، وہ پانچ چھ فلیٹوں کی جگہ کو ایک فلیٹ کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ اور پھر ساحر کی تو پرچھائیاں کے نام سے پوری بلڈنگ ہی ہے پچھلے دنوں سجاد ظہیر نے جب مہندر ناتھ سے ترقی پسند تحریک کو از سر نو زندہ کرنے کو کہا تو مہندر ناتھ نے نہایت سنجیدگی سے کہا تھا " بنے بھائی جو لوگ ترقی پسند ہیں ان کا سوشلزم تو کبھی کا آچکا ـــ آپ کے ذہن میں جو سوشلزم کا تصور ہے وہ توان کے لئے اب نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اب بھلا اس تحریک سے کیا فائدہ؟"

ساحر کے مجموعہ کلام 'تلخیاں' کے پہلے ایڈیشن میں پیش لفظ کے طور پر کچھ شعر درج تھے جو بعد کی اشاعتوں میں ترمیم واضافہ کا شکار ہوگئے۔

انہیں میں یہ شعر بھی شامل تھا۔

رجعت پسند ہوں نہ ترقی پسند ہوں

اس بحث کو فضول و عبث جانتا ہوں میں

ساحر بنیادی طور سے ہلکے پھلکے رومانوی ذہن کے شاعر ہیں اُن کا لہجہ، جو موضوعی لحاظ سے فیض کا تقلیدی رنگ لئے ہوئے ہے، نیم پختہ ذہنوں کے لئے خاص دلکشی رکھتا ہے۔ ان یہاں نوجوانی کے کھلنڈرے پن کا سیدھا سادا اور وضاحتی اظہار کالج کے لڑکے لڑکیوں میں ایک زمانہ میں مقبول رہا ہے۔ محنت و سرمایہ کی فارمولائی کشمکش کے راست بیان اور محبت کے غیر تجرباتی ارشادات نے ان کے اشعار میں QUOTABILITY کا حسن تو ابھار دیا ہے، مگر یہ صرف مشاعرون کے سامعین اور آزادی سے پہلے کم عمر لڑکے لڑکیوں کے رومانی خطوط تک ہی محدود ہے۔ ساحر کی پوری شاعری انفرادی تازگی کے بجائے تعمیمی فرسودگی لئے ہوئے ہے۔ جس میں ہر جگہ اپنے عہد کے فیشن کی چھاپ نمایاں ہے۔ مجاز اپنی موت سے کئی سال پہلے، 'آوارہ' میں جس ذہنی پختگی تک پہنچ گئے تھے ساحر ہنوز اس سے کوسوں دور ہیں۔ اور یہی ان کی فلمی وادبی مقبولیت کا راز بھی ہے۔ ساحر نے اپنی شاعری کو اپنی شخصیت کی پیچیدگیوں سے ہمیشہ دور رکھا۔"

"ساحر صاحب، ترقی پسندی ایک تنقیدی اصطلاح کے طور پر پچھلے تیس پینتیس سال سے استعمال کی جارہی ہے وہ تمام شاعر جو اس دور میں ابھر کر سامنے آئے ہیں ان کو اسی علامت سے پہچانا جانے لگا، حالانکہ ان شاعروں میں سوائے معصریت کے شاید ہی کوئی فنکارانہ مماثلت ہو۔ ان شاعروں کو اپنے انداز، اسلوب اور شخصی رجحانات کے لحاظ سے کئی خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

۱۔ فیض اور مخدوم ۲۔ سردار جعفری، نیاز حیدر اور کیفی اعظمی ۳۔ مجاز، جذبی اور جاں نثار ۴۔ سلام مچھلی شہری ساحر لدھیانوی اور قتیل شفائی، . . . . ! ان میں سے کس گروپ پر ترقی پسندی کا زیادہ اطلاق ہوتا ہے، یہ تو آپ ہی بہتر بتا سکتے ہیں۔ لیکن کیا آپ اس تنقیدی میکانکیت سے متفق ہیں، جس میں اچھی اور بری شاعری کے فرق کو نمایاں کرنے کے بجائے شعری تخلیقات کو صرف نظریاتی اور موضوعاتی رُخ سے پہچانا جاتا ہو آپ خود کو عزاً ان میں سے کس گروپ سے زیادہ

قریب محسوس کرتے ہیں؟"

"جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اپنے آپ کو فیض اور مجاز سے زیادہ قریب پاتا ہوں۔ سلام مچھلی شہری کے ہاں جدّت ہے۔ موضوعات کا پھیلاؤ بھی ہے۔ اس نے ہیئت اور موضوع میں تجربے بھی کئے ہیں۔ اچھی شاعری بھلے ہی کسی مخصوص نظریہ پر پوری نہ اُترتی ہو، لیکن اس سے اسکی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر اقبال سے شدید ترین نظریاتی اختلافات کے باوجود ان کی شاعرانہ عظمت کا معترف ہوں۔ لکھتے وقت ہر ادیب کو اپنی شخصیت کے ساتھ سچا رہنا چاہئے۔ جو کچھ بھی کہا جائے اس میں ضمیر کی شرکت ضروری ہے۔ یعنی اندر سے بھی کچھ ایسا لگتا ہو۔ نہیں تو اَن کہی بات اندر ہی اندر گولا بن جائے گی جو کشٹ دے گی۔ شعر کہنے کے بعد اس پر کونسا لیبل چسپاں کیا جائے گا، یہ ادیب کی نہیں لیبل فروشوں کے سوچنے کی بات ہے۔ ادب درحقیقت شخصیت کے اظہار کا نام ہے۔ یہ ایک نفسیاتی عمل ہے۔ اگر وہ اپنے مزاج کے خلاف کسی لیبل کے لئے لکھتا ہے تو اندر سے کوئی تسکین نہیں ہوگی۔ آزادی سے ساڑھے تین سال پہلے ایک چھوٹے شاعر کا مجموعہ 'تلخیاں' شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک نظم 'خودکشی سے پہلے' بھی شامل ہے۔ اس مجموعہ کے بعد کئی اصلی اور جعلی ایڈیشن چھپ کر بک چکے ہیں۔"

ساحر بولتے وقت ہاتھ کے اشاروں اور چہرے کی کیفیتوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ جب یہ کام دیتے نظر نہیں آئیں گے تو کھڑے ہو کر ذرا اونچی آواز کر کے بولیں گے۔ اگر سامنے والا پھر بھی مطمئن نہ ہو تو آخری حربہ کے طور پر ایک خاص قسم کے پنجابی قہقہے کا استعمال کرینگے اب آپ کی مرضی ہے جواب بھی قائل نہ ہوں۔ وہ تو اپنی بات مکمل کر چکے۔ اب آپ ہی کوئی دوسری بات چھیڑیں تو وہ بولیں۔ نہیں تو ... آدھی سے زیادہ سگریٹ بجھانے میں مشغول ہو جائیں گے۔ یا سگریٹ کا پیکٹ آپ کی طرف بڑھا دیں گے۔ لیکن سگریٹ پیش کرتے وقت اپنا کوئی شعر پڑھتے ہوئے اپنی عظمت کی چمک آپ کی آنکھوں میں ضرور دیکھنا چاہیں گے۔ ساحر ہر وقت ایک عجیب سی بے سکونی کے عالم میں رہتے ہیں۔ جس کو بھولنے کے لئے وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنے یا بولتے رہنے کا شکار ہو چکے ہیں۔

"ساحر صاحب، 'تلخیاں' کی بیشتر نظمیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے، آپ اپنے معاصرین میں فیض سے زیادہ متاثر ہیں موضوع اور اسلوب دونوں میں یہ تاثرات نمایاں ہیں۔ لیکن ان اثرات کی رَو فیض کی ابتدائی رومانی نظموں تک ہی محدود رہی۔ اور وہ بھی موضوعات کی حد تک، فیض کے لہجے کی گرمی، سنجیدگی اور تہہ داری ان میں نہیں ملی۔

'پرچھائیاں' (ساحر کی طویل نظم) سے پہلے کی نظموں کی کینوس بھی فیض کی ان نظموں کی طرح چھوٹی ہے۔ وہی ایک غم عاشق، ایک حسین محبوبہ اور درمیان میں کھڑا ہوا کوئی سرمایہ دار جو دولت سے محبوبہ کا مول تول کر کے بے چارے عاشق کو خودکشی کرنے کے لئے چھوڑ جاتا ہے۔ انہیں تین کرداروں کو بار بار رومانی انداز میں دہرایا جاتا ہے۔ کہیں غربت کے کارن محبت ٹوٹتی ہے، کہیں جہاد پر جانے کی وجہ سے ناطہ ٹوٹتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کا لہجہ ایک خاص عمر میں بہت مانوس اور پُرکشش لگتا ہے۔ لہجہ میں اس قسم کی رومانوی کشش الفاظ کو موضوع کے متعارف چہروں تک ہی محدود رکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اچھی شاعری کے لہجہ ہی میں موضوع ہوتا ہے۔ جب کہ آپ کے یہاں یہ عمل دو متضاد رُخوں کو یکجا کرنے کی شعوری کوشش سے پیدا ہوتا ہے۔ لہجہ شاعر کی شخصیت کی مانند کہیں گہرا، کہیں تہہ دار اور کہیں یک سمتی ہوتا ہے اس میں لفظی تزئین سے نہیں، اس شخصیت کی تزئین سے کام چلتا

ہے جو از خود الفاظ کے مخصوص انتخاب اور وزن و بحر کے برتاؤ میں شامل ہو جاتی ہے۔ آپ کی نظموں شہکار، تاج محل، نور جہاں اور پرچھائیاں آپ ہی کی دیگر نظموں سے الگ لگتی ہیں۔ ان میں فیض کی ابتدائی نظموں کے اثرات بھی کم کم نظر آتے ہیں۔ ان نظموں کو پسند کرنے والوں میں شاید عمر کی بھی کوئی قید نہیں۔ لیکن یہ نظمیں بھی روایتی انداز لئے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے موضوع کو الفاظ کی چھوٹی چھوٹی کیلوں سے ایک خاص ترتیب سے جڑ دیا گیا ہے کوئی لفظ بھی دائیں بائیں نہیں جھانکتا۔"

"میں عمر کے لحاظ سے صرف کیفی کو چھوڑ کر اپنے معاصرین میں سب سے چھوٹا ہوں۔ فیض، سردار، نیاز سب مجھ سے سینئر ہیں۔ مجاز کا آہنگ جب شائع ہوا تھا اس وقت میں میٹرک کا طالب علم تھا اور فیض کے مجموعے کی اشاعت کے وقت میں بی اے میں پڑھ رہا تھا۔ میری کچھ نظموں میں فیض کے اثرات ضرور ہیں۔ مجاز کے ہاں کلاسکی رچاؤ ہے، وہ مجھے پسند ہے۔ شاید 'چکلے' میں اس کا اثر ہو۔ ہر شاعر اپنے سینئر شاعروں سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن سرقہ اور اثرات میں فرق ہے۔ میری کئی نظموں کے موضوع 'تاج محل'، 'چکلے'، 'گریز'، 'خوبصورت موڑ'، وغیرہ مختلف ہیں۔ سو فیصدی اوریجنل تو کوئی نہیں ہوتا۔

فیض کے یہاں تشبیہات زیادہ ہوتی ہیں میری نظموں میں صفات Adjectives سے فضا پیدا ہوتی ہے شاعر کی خود کی شخصیت اس کے فن اور اسلوب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک اپنا حلقہ ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق موضوع اور اسلوب کوئی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ میں مزاجاً متوسط طبقے کا فرد ہوں۔ شاید میں اب تک ڈی کلاس نہیں ہو پایا۔ برسوں پہلے میری نظمیں مزدوروں میں خاموشی سے سن لی جاتی تھیں۔ لیکن تالیاں کیفی کو زیادہ ملتی تھیں۔ بعض لوگوں کی رائے ہے "ساحر کالج کے لڑکے لڑکیوں میں زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ یہ نیم پختہ ذہن کی شاعری ہے"۔ لیکن مجھے ایسا سوچنے والوں کے ذہن کی پختگی پر شک ضرور ہوتا ہے۔ میں اسی ماحول سے نکلا ہوں۔ اس سے متاثر ہونا فطری ہے۔ لیکن شاعر کی عمر کے ساتھ شاعری کے موضوعات اور ان کا برتاؤ بھی بدلتا ہے۔ ہمارے زمانے میں حفیظ اور عدم بزرگ شاعروں میں بہت پاپولر تھے۔ ہم بھی مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ انہیں کے ساتھ پڑھتے تھے اور زیادہ پسند کئے جاتے تھے۔ آج بھی فراق کہتے ہیں، مشاعروں کے ٹکٹ تو ساحر صاحب کے نام پر ہی بکتے ہیں۔"

"لیکن ساحر صاحب، مشاعرہ کی خاموشی یا تالیاں تو اچھی بُری شاعری کی کسوٹی نہیں بنائی جا سکتیں۔ غالب پسند نہ کئے جانے والے شاعر رہے ہیں۔ فانی، حسرت، یگانہ کے مقابلے میں نوح ناروی چھتیں پھاڑ دیتے تھے۔ ہندی کے اچھے شاعر اگئے سے لے کر دھرم ویر بھارتی اور سرویشور دیال تک نیرج کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ملارمے، سیت پرس اور ربو دلیر وغیرہ کو ان کے عہد میں ہی بنا تشریحات کے کہاں سمجھا یا گیا۔ فرانس اور یورپ کے دوسرے علاقوں میں تو مشاعرہ نام کی چڑیا ہی عنقا ہے۔ تو کیا وہاں اچھی شاعری پیدا ہونے کا امکان نہیں۔ پچھلے دنوں بمبئی کے ایک مشاعرہ میں شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی سے زیادہ سامعین نے ایک سستے شاعر کو سننا پسند کیا۔ کبیر، نانک اور تُکا رام کے سامعین اور مشاعرہ سننے والوں میں فرق ہے۔ صوفی شعراء اور مذہبی پیشوا کے ارد گرد بیٹھنے والے مخصوص عقائد کی سطح پر ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں۔ مشترکہ اقدار کا وجود ترسیل کے لئے بہت ضروری ہے۔ اور پھر ان کے

کلام کی مقبولیت عقیدت مندانہ ہے۔ ان کے عقیدت مندوں میں ان کے کلام کو سمجھنے والے کتنے ہیں یہ ہنوز ایک مسئلہ ہے کبیر کی الٹ بانیاں آج بھی اچھے اچھے سکالرس کے لئے معمہ بنی ہوئی ہیں نانک اور تکا رام کے ارشادات کو بنا ویدانتی سوجھ بوجھ اور اس کی علامتی اظہاریت کے سمجھنا محال ہے۔ آج کے عہد میں جب کہ ہر فرد اپنے وجود کی سطح پر سانس لے رہا ہے۔ ماحول میں اپنے ڈھنگ سے اپنی تلاش کر رہا ہے۔ شعر سنتے ہی قاری اُسے کسی گولی کی طرح گٹک لے شاید اب ممکن نہیں۔ اچھا شعر دھیمے دھیمے کھلنے والی کلی کی مانند ہوتا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ پڑھنے والے سے معیاری سوجھ بوجھ کا تقاضا کرتا ہے۔"

"یہ صحیح ہے، مشاعرہ میں شعر کی مقبولیت کوئی معیار نہیں۔ لیکن اچھے شعر کی تعریف یہ بھی نہیں کہ وہ نامقبول ہو آرٹ فن کار کے تجربات کا اظہار ہے۔ ہر ادیب اپنی نظر سے اپنے ماحول کو دیکھتا ہے۔ اور اس میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ اسے convey کرنا چاہئے۔ ایسا کہنے کی کوشش بھی کرنی چاہئے۔ اس کے لئے شوق، محنت اور لگن کی ضرورت ہے۔ مشاعرہ کی کامیابی میں شعر کے علاوہ کچھ اور عوامل بھی کام کرتے ہیں۔ کسی خاص وقت کا موڈ اس کے اعتبار سے موضوع کا انتخاب وغیرہ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کمتر درجہ کی نظم صرف اس لئے کامیاب ہو جاتی ہے کہ اس میں کسی سُلگتے مسئلہ کو سیدھے سادھے طریقہ سے بیان کر دیا گیا ہوتا ہے یہ سچ ہے کہ مشاعرہ کو معیار نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن بقول اہرنسبرگ 'وقتی ادب کی بھی ایک خاص عہد میں بہت اہمیت ہوتی ہے'۔"

اہرنس برگ کا یہ قول کئی سال پہلے، 'آخر شب' میں کیفی کی احتجاجی شاعری کے ڈیفنس میں درج کیا گیا تھا۔ اہرنسبرگ نے اس ایک جملہ کے علاوہ بھی کچھ کہا ہے یا نہیں، یہ تو اہرنس برگ کے مطالعہ سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن ضرورت سے زیادہ مادی مصروفیتوں میں اتنی فرصت کہاں کہ اپنی تخلیقات کے علاوہ کسی دوسرے کی کتابوں کو پڑھا جائے۔ لیکن یہ حقیقت ہے لکشمی اور سرسوتی کی برسوں پرانی رقابت کو ساحر نے جس خوبصورتی سے دوستی میں تبدیل کیا ہے وہ صرف اُردو ہی نہیں عالمی ادب میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ خود ساحر کے ہی لفظوں میں برناڈشا کو تو ایک لفظ کا صرف ایک پاؤنڈ ہی ملتا تھا، میں نے تو ایک ایک گیت کے پانچ ہزار سے دس ہزار لئے ہیں۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

امّی کہتی تھیں

سرور شفیع

ہمارے بھائی جان کتنے مقبول اور کس درجے کے شاعر تھے یہ تو شعر و ادب کے ناقدین ہی بتا سکتے ہیں۔ میں اس مضمون میں خاندانی پس منظر میں بھائی جان کے بچپن کی شرارتوں کو یا اُن کے بارے میں جو کچھ مجھے میری امّی بتایا کرتی تھیں۔ آپ کو سنانے کی کوشش کروں گی۔

اُمّی بتاتی تھیں کہ بھائی جان کے والد (یعنی ہمارے پھوپھا مرحوم)، بڑے مہمان نواز واقع ہوتے تھے۔ زیادہ تر وقت دوستوں میں صرف کرتے۔ لوگوں کو خوب دعوتیں دیتے۔ ہر وقت اپنے ارد گرد چار چھ لوگوں کو بٹھائے رکھتے پھوپھی امّی کو یہ سب برداشت نہ ہوتا اور کبھی کبھی شوہر سے جھگڑ پڑتیں۔ پھوپھا صاحب اپنی عادتوں سے باز نہ آتے بلکہ اپنی عادتوں میں اضافہ کرتے جاتے۔ جب بھائی جان نے دنیا میں آنکھیں کھولیں تو پھوپھی امی کو خیال آیا کہ میرا بیٹا بڑا ہو کر باپ کی عادتیں اپنائے گا۔ میں تو اپنے بیٹے کو ایک قابل انسان بنانا چاہتی ہوں۔

پھوپھا صاحب یہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک جاگیر دار کا بیٹا زیادہ تعلیم حاصل کر کے کسی دوسرے کی نوکری کرے۔ وہ کہا کرتے میرے پاس بے شمار دولت ہے وہ میرا سارا کام کاج سنبھالے گا۔ لیکن پھوپھی امی اس پر راضی نہ ہوئیں۔ اور شوہر سے جھگڑ کر وہ اپنے میکے چلی آئیں۔ بھائی جان کی پرورش نانی کے گھر ہوئی دونوں ماموں کے سائے میں۔

بھائی جان جب پیدا ہوئے تھے تو ان کو ایک بڑے عالم کی گود میں ڈالا گیا۔ انہوں نے ہی انکے کان میں اذان دی تھی اور ان بزرگ نے بھائی جان کو دیکھ کر کہا تھا کہ یہ لڑکا بڑا قابل اور ہونہار نکلے گا۔ یہ سن کر پھوپھی امی کے دل میں ارمان جاگے وہ کہتی تھیں کہ میں اپنے بیٹے کو جج یا سول سرجن بناؤں گی۔ لیکن ان کی یہ دونوں باتیں پوری نہ ہوئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کا بیٹا اس سے بھی اعلیٰ مقام حاصل کرے گا۔

جب بھائی جان آٹھ سال کے ہوئے تو ان کے عقیقہ کا بڑا جشن منایا گیا۔ لوگوں کو شاندار دعوت دی گئی اُن کو دولہا بنایا گیا۔ سرخ بنارسی شیروانی اور پاجامہ پہنایا گیا اور دولہا بنا کر گھوڑی پر سوار کر کے مسجد میں لے جایا گیا۔ دونوں ماموؤں

نے اور نانی نے چاندی کا سکّہ ان پر سے وارا۔ بھائی جان بچپن سے بہت سادہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ پہنے ہوئے لباس کو دیکھ کر بہت پریشان ہوئے بڑی مشکل سے پہنا بھی تھا۔ مسجد سے آتے ہی انہوں نے سہرہ اتار کر ایک طرف ڈال دیا اور شیروانی بھی آتار کر پھینک دیا۔ کسی کے سامنے کپڑے نہیں اتارتے تھے کمرے میں جا کر قمیص اور شلوار پہنا اور رو کر کہنے لگے یہ کپڑا میں کبھی نہیں پہنوں گا یہ پاگلوں والے کپڑے ہیں۔ میں تو چٹے کپڑے پہنوں گا (یعنی سفید) پنجابی زباں میں بولتے ہیں۔

بھائی جان بچپن ہی سے بڑے ضدی تھے۔ جس بات کو کہتے اس کو منوا کر چھوڑتے۔ بڑی عجیب عجیب ضدیں کرتے۔ نہاتے وقت خود بدن میں صابن لگاتے اور تولیہ باندھ کر نہاتے تھے۔ پھوپھی امی سے کہتے آپ چلی جائیں تو میں نہاؤں گا۔ ۔ ۔ ۔ دودھ پیتے وقت بھی ضد کرتے۔ کہتے اس میں پانی ملاؤ۔ جب پانی ملا دیا جاتا تو کہتے (پانی کڈو) یعنی پانی نکالو پھر پیوں گا۔ پھوپھی امی حیران و پریشان ہو جاتیں۔ کبھی کبھی وہ رو پڑتیں۔ بہن کو پریشان دیکھ کر بھائی جان کے بڑے ماموں یعنی میرے والد تھے وہ کہتے میرے کول آجا میں پانی کڈتا ہوں۔ (یعنی میرے پاس آجا میں پانی نکالتا ہوں) پہلے اپنی آنکھیں بند کرو۔ پھر تماشہ دیکھو۔ بھائی جان آنکھیں بند کر لیتے ماموں دو گلاس لیتے اور ایک میں پانی ڈال دیتے اور دوسرے میں دودھ پھر ماموں کہتے آنکھیں کھولو۔ پانی نکال دیا۔ بھائی جان بڑی خوشی خوشی دودھ پی لیتے۔

پڑوس میں ایک سکھ فیملی رہتی تھی۔ ان کا کلاس فیلو لڑکا گرچرن سنگھ تھا اور بھی سکھ بچوں سے بھائی جان کی دوستی تھی۔ جب پھوپھی امی پنیاں بناتیں تو بھائی کو کھانے کو دیتی تھیں۔ بھائی جان کہتے پہلے گرچرن کو دیجیے پھر میں کھاؤں گا پھوپھی امی کہتی کہ میں دیدونگی مگر ضدی بھائی جان جب تک گرچرن اور دوسرے بچوں کو دلوا نہ دیتے اسوقت تک خود نہ کھاتے۔ جب اُن بچوں کو مل جاتا تو بڑے خوش ہو جاتے۔ جو بھی کچھ کھاتے پہلے اپنے دوستوں کو بُلاتے اور پھوپھی امی سے کہتے اِن سب کو دیجیے۔ دینے کے بعد کہتے کھالو اور پانی پیئو۔ ۔ ۔ ۔ کسی بچے کے کپڑے پھٹے ہوئے ہوتے تو پھوپھی امّی سے کہتے اس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ یہ بہت گندہ ہے میرے صاف کپڑے دو۔ یہ نہا کر پہنے گا۔ پھوپھی امی کہتی کہ دے دوں گی۔ جہاں دینے میں تاخیر ہوئی خود دوڑے دوڑے جاتے اپنے بکس سے اپنی قمیص اور شلوار نکال کر لاتے اور دیدیتے اور کہتے یہ کپڑے نہا کر پہن لو پھر تم کو گڈی کا تماشہ دکھاؤں گا۔

بھائی جان کا کھیل بھی بہت انوکھا تھا۔ وہ جب بھی کھیلتے تو ماچس کی ڈبیاں اور سگریٹ کے ڈبّے اور ٹارچ لے کر کھیلتے۔ دو چار لڑکوں کو ہمیشہ ساتھ لے کر کھیلتے۔ ان ڈبّوں کی دیوار بناتے اور ارد گرد لکڑیاں لگا کر رومال باندھتے اور رومال پر ٹارچ دکھاتے اور اپنے دوستوں سے پنجابی میں کہتے میں نے منڈوا بنایا ہے (یعنی سینما ہال بنایا ہے) ٹارچ سے جو سایہ آتا اُس کو کہتے گڈّی ناچ رہی ہے، یہ ان کا کھیل تھا بہت کم ہنستے اور بہت کم بولتے مخلوص اور پیار بہت تھا۔

بھائی جان کو پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ بازار جاتے تو ہر طرح کی کتابیں خرید لیتے۔ پھوپھی امی کہتی کہ جب آپ بڑے ہو جائیں گے اور اچھی طرح سے پڑھنے لگیں گے تو خرید لینا۔ کہتے نہیں میں تو ماموں سے پڑھ کر سنوں گا۔ کتابوں کو جمع کرتے اور خوش ہوتے۔ جب چوتھی کلاس میں پہنچے تو ماموں کے ساتھ بازار گئے۔ کتاب کی دوکان پر پہنچے تو سامنے بال جبریل رکھی

نظر آئی کہنے لگے یہ کتاب لونگا ماموں نے کہا بیٹا جب بڑے کلاس میں پہنچنا تو دلا دوں گا۔ بس رونے لگے اور ضد کرنے لگے کہ میں اس کو لونگا آپ مجھے پڑھ کر سنائیں گے میں سمجھ لونگا۔ ماموں کو بال جبریل خریدنا پڑا۔ روز رات کو ماموں سے کہتے آپ مجھے پڑھکر سنائیں میں یاد کروں گا۔ اور پنسل کاغذ لے کر بیٹھتے اور اسے دیکھ کر لکھتے۔ امی بتاتی تھیں کہ بہت اچھی تحریر تھی۔ جس طرح لکھا ہوتا اسی طرح لکھنے کی کوشش کرتے۔ جب میٹرک میں پہنچے تو خود شعر کہنا شروع کر دیا۔ رات رات بھر اپنی حویلی کی چھت پر منظر کشی کرتے، کھانے پینے کا ہوش نہ رہتا۔ . . . پھوپھی امی کھانے پر انتظار کرتیں۔ وہ اس بات پر بھی پریشان ہو جاتیں کہ امتحان عنقریب ہے پڑھائی کرتے نہیں۔ کس طرح کامیابی ہوگی؟ دوستوں کے ساتھ گھومنا اور بحث کرنا اس کے سوا پڑھائی پر غور نہیں کرتے یہ تو میرے ارمانوں پر پانی پھیر دے گا۔ کیا باپ کی طرح یہ بھی نکلے گا۔ اُن کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کا بیٹا اس دنیا کا کتنا بڑا شاعر ہوگا۔

ادھر پھوپھی امی شوہر کی طرف سے دکھی تھیں۔ شوہر سے تنازعہ اور زیادہ بڑھتا گیا۔ باپ کی نظر بیٹے پر تھی، وہ اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن پھوپھی امی بھائی جان کو ایک پل کے لئے جدا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ شوہر بیوی میں کشیدگی بڑھ گئی۔ نوبت مقدمہ بازی کی آگئی بیوی نے حق کا دعویٰ کر دیا۔ بھائی جان کی جانب سے پھوپھی امی بہت پریشان تھیں کہ کہیں باپ بیٹے کو اٹھوا نہ لے۔ مقدمہ برسہا برس چلا۔ کامیابی پھوپھی امی کی ہوتی رہی۔ . . .

جیسے جیسے وقت گذرتا گیا۔ اور بھائی جان میں سمجھ آتی گئی۔ والدہ کی پریشانی کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ والد سے نفرت کرنے لگے۔ جاگیرداری اور سرمائے داری پر نظم لکھنی شروع کر دی، اور مشاعروں میں حصہ لینے لگے۔ باہر بھائی جان کی بڑی تعریف ہوتی مگر پھوپھی امی اداس رہتی تھیں۔ ان کو بیٹے کی کامیابی کا یقین نہ تھا۔

ایک بار کالج کے مشاعرہ میں پھوپھی امی بھی گئیں۔ لیکن بھائی جان کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ ان کی والدہ بھی میرے کلام کو سننے آئیں ہیں۔ جس وقت بھائی جان نے نظم پڑھی۔ لوگوں کی تالیوں سے ہال گونج اٹھا۔ واہ واہ کی آوازیں آنے لگیں۔ پھوپھی امی یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں کہ میرے بیٹے سے زمانہ خوش ہے اس نے کوئی غلط راستہ نہیں اختیار کیا۔ بیٹے کی کامیابی پر پھولے نہ سمائیں۔ بیٹے کی تعریف سُن کر ان کے والد صاحب بھی بہت خوش ہوئے اور چاہا کہ ان کا بیٹا میرے پاس آیا کرے۔ مگر بھائی جان نے دیکھا کہ والد نے میری ماں کو بہت ستایا۔ اور جھگڑ کر ماں کے گھر بھیجدیا۔ ماں کو عدالت کا منہ دکھایا۔ ایسے باپ کے پاس جانا میری ماں کی توہین ہوگی جس ماں نے اور ماموؤں نے مجھے پڑھا لکھا کر اس قابل بنایا۔ آج ان کو چھوڑ کر باپ کی دولت کا وارث بنوں۔ ایسا میں ہرگز نہیں کروں گا۔ میں خود اپنے قوت بازو سے اپنی ماں کو دولت کے تخت پر بیٹھا دوں گا۔ مجھے اپنے باپ کا ایک حبہ نہ چاہئے۔ اس دولت کا میں مالک بنوں جو غریبوں اور مزدوروں کا خون پی کر اور حق مار کر جمع کی گئی ہے جس نے میری ماں کو خون کے آنسوں رلائے ہیں۔ جوانی برباد کی ہے۔ والد کے طور طریقے کو دیکھتے ہوئے ان کو ان سے نفرت پیدا ہو گئی۔ ماں کو اپنا سب کچھ سمجھا دونوں ماموؤں کو اپنا سرپرست جانا۔

بھائی جان کبھی کسی سے کچھ مانگتے نہ تھے۔ وہ مانگنا معیوب سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ کھانا مانگنے سے گریز کرتے جب بھوک لگتی پلنگ پر آکر لیٹ جاتے اور دونوں گھٹنوں کو پیٹ سے لگا لیتے اور آنکھیں بند کر لیتے دوسرا طریقہ یہ تھا کہ وہ آنگن کے نل سے

ہاتھ دھوتے یہ کھانا مانگنے کا طریقہ تھا۔ پس پھوپھی امی سمجھ جاتیں کہ بھائی جان کو بھوک لگی ہے۔ کھانے کے بڑے شوقین تھے۔ بہترین کھانا پسند کرتے۔

ناشتے میں بہترین ناشتہ ہوتا تھا۔ پوری۔ پراٹھا حلوہ۔ انڈے کا آملیٹ۔ آملیٹ بہت پسند کرتے۔ نمکین چیزیں بہت پسند تھیں۔ باقی چیزیں دوستوں کے لئے۔ روز دوستوں کی دعوت کرتے۔ خود کم کھاتے دوستوں کو خوب کھلاتے دوستوں کے بغیر تو کھانا نہ کھاتے اگر کوئی دوست کھانے کے وقت نہ آتا تو فون کر کے بلایا جاتا تنہا کھانا کھانا پسند نہ تھا۔ کھانے کے وقت بحث ضرور ہوتی۔ سچائی کو منوا کر رہتے۔ کبھی کبھی تو کھانا چھوڑ دیتے اور رات کے کھانے پر جو بحث شروع ہوتی تو صبح کر دیتے۔ کھانا اپنی جگہ پر ویسے رکھا رہ جاتا۔ جھوٹ سے بڑی نفرت تھی۔ دھوکے بازوں پر بہت ناراض ہوتے سچائی کے دلبر تھے۔

مزاج میں صفائی۔ نفاست جو بچپن میں تھی وہی بڑے پن میں موجود رہی۔ کپڑے سادے ہوتے مگر صاف کلف استری والے پہنتے ذرا سا داغ دھبہ لگ جاتا تو فوراً اتار دیتے بٹن ٹوٹ جاتا تو یہ کبھی نہ کہتے کہ بٹن ٹوٹ گیا ہے۔ کپڑا پہنتے وقت اپنے ارد گرد کپڑوں کو پھیلا لیتے اور یہ دیکھتے کہ کس پینٹ کے ساتھ کون سی قمیص پہنوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں تو پھر پھوپھی امی ان کے کپڑے نکال کر دیتیں۔ خوشبو وغیرہ کے بڑے شوقین تھے۔ بڑا شاہانہ مزاج تھا۔

بھائی جان کا شاہانہ مزاج ہونے کے علاوہ شاعرانہ بھی تھا۔ شاعری کے علاوہ گانے کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ سنگر بننا چاہتے تھے۔ مگر قدرت نے ان کو شاعر بنا دیا۔ ۱۹۵۰ء میں بمبئی آئے اور فلموں کے گانے لکھنے لگے۔ گانے مشہور ہوئے اور شہرت پائی خدا نے بھائی جان کو عزت شہرت سب کچھ عطا کیا۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا اپنی قوت بازو سے حاصل کروں گا۔ حاصل کیا۔

۱۹۵۴ء کی بات ہے کہ اچانک ہمارے والد صاحب علیل ہو گئے اطلاع ملی تیسرے دن الہ آباد پہنچ گئے۔ ماموں کی بڑی خدمت کی روپے پیسوں کا کوئی خیال نہیں کیا۔ بھائی دل کے بڑے نرم واقع ہوئے تھے۔ کسی کی بیماری اور تکلیف برداشت نہ کر سکتے۔ ماموں کو دیکھ کر بےچین سے رہتے۔ بار بار ڈاکٹر سے پوچھتے کتنے دنوں میں ٹھیک ہو جائیں گے۔ کوئی خطرہ کی بات تو نہیں ہے میں بمبئی لے جانا چاہتا ہوں ڈاکٹر کے اطمنان بخش جواب سے بہت خوش ہو جاتے۔ والد صاحب صحت یاب ہو گئے۔ بھائی جان اپنے ہمراہ والد صاحب کو اور چھوٹی بہن انور سلطانہ کو بمبئی لے آئے۔ میں الہ آباد میں تھی۔ امی کے ساتھ عرصہ ایک سال تک والد صاحب بہتر رہے۔ لیکن موت نے پیچھا نہ چھوڑا اور ۱۹۵۵ء میں موت نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ والد کی جدائی کا اثر ہم لوگوں کے علاوہ بھائی جان پر بہت پڑا۔

بھائی جان نے ہم دونوں بہنوں کی یتیمی پر رحم کھایا۔ ممانی کے سہاگ اجڑنے کا بہت خیال کیا۔ ہم دونوں بہنوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا میں تم دونوں کا بڑا بھائی ہوں۔ میں کسی طرح کا فرق نہیں رکھوں گا۔ تمہیں باپ جیسا پیار ملے گا۔ تم دونوں کی خواہش پوری کروں گا۔ ممانی جان آپ کو بھی میری طرف سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ہر کمی کو پورا کروں گا۔ گر ماموں صاحب کی جگہ تو نہیں لے سکوں گا۔ بھائی جان نے ہم دونوں کو بہنوں کی طرح نہیں بلکہ بیٹی کی طرح رکھا۔ مرتے دم تک قول کو نبھایا۔

میں الہ آباد میں تعلیم کے سلسلے میں رہتی تھی چھوٹی بہن بھائی جان اور پھوپھی امی کے ساتھ رہنے لگی۔ میری تعلیم اور گھر کا

خرچ بھائی جان نے برداشت کیا۔ برابر الہ آباد مجھے خرچ بھیجتے رہے۔ یہ رویّہ والد صاحب کی زندگی میں بھی تھا۔ ہم دونوں کو بھائی جان اور پھوپھی امی بہت چاہتی تھیں۔ محبت کی بات تو یہ ہے کہ میں گود میں تھی۔ بھائی جان سائیکل چلانا سیکھ رہے تھے امی سے کہنے لگے کہ میں بی بی کو گھما کر لاتا ہوں۔ امی نے مجھے دیدیا ایک ہاتھ سے مجھے پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے سائیکل مگر سنبھال نہ پائے لے کر گر پڑے میں نیچے سائیکل میرے اوپر۔ میں نے رو رو کر سڑک والوں کو جمع کر لیا۔ بس بھائی جان ہکّی بکّی بھول گئے۔ مجھے چپ کرانے کے لئے لاکھ جتن کیا مگر میں کہاں چپ ہونے والی۔ گھر پر آکر امی سے کہنے لگے کہ بی بی کو سٹ لگ گئی ہے (یعنی چوٹ لگ گئی) میں لے کر گر پڑا ہوں۔ بڑے پریشان کبھی کیلا میرے منہ میں ڈالتے کبھی مٹھائی۔ جب روتے روتے میں چپ ہوگئی تو بھی پریشان ہوگئے اور امی سے کہنے لگے یہ تو روتی نہیں۔ کبھی اپنے کمرے میں جاتے کبھی مجھے آکر دیکھتے ان کی محبت کا یہ عالم تھا۔

بڑے ہونے پر بھی وہی محبت ہم دونوں کے ساتھ رہی۔ میرے لئے الہ آباد میں ہر طرح کی چیزیں بھیجتے۔ زیور، کپڑا۔ ہر ماہ منی آرڈر کرتے والد مرحوم کا خیال نہ آنے دیا۔ باپ جیسا خلوص دیا۔ امی کی بہت عزت کرتے۔ وہ رشتہ داروں کے ساتھ ہی خلوص ہمدردی کرتے تھے بلکہ غیروں کے ساتھ ہمدردی کرتے۔ دوسروں کے غم میں شریک ہوتے۔ لڑکیوں اور عورتوں کی بہت عزت کرتے ہر کو اچھی رائے دیتے۔ کسی کی مدد بھی کرتے تو ایک دوسرے پر ظاہر نہ ہونے دیتے۔ کسی بوڑھی عورت کو کام کرتے دیکھتے تو بہت دکھی ہوتے جو کچھ روپئے دینا ہوتا تو چھپا کر دیتے۔ اپنی نظموں میں عورتوں کو بہت بڑا مقام دیا ہے۔ ان کا فلمی گانا ہے۔

"عورت نے جنم دیا مردوں کو"

بھائی جان نے فلمی لائن میں ہونے کے باوجود بہت سادی زندگی گذاری اسی طرح سے ہم دونوں کو بھی سادگی میں دیکھنا پسند کرتے تھے اور کہتے تھے۔ سادی زندگی گذارو۔ اور نیک کام کرو جس سے دنیا میں نام ہو۔ ہر غلطی کو اپنی نظر سے روکتے تھے۔ کبھی کبھی ناراض ہو جاتے۔ جب دوستوں کی خاطر میں کمی ہو جاتی۔ جب میں چھٹیوں میں الہ آباد سے بمبئی آتی تو دوستوں کو خوب پارٹی دیتے نوکر کے علاوہ ہم دونوں بہنیں مل کر طرح طرح کے کھانے تیار کرتے پھوپھی امی کہتیں جب سے سرور آئی ہے اسکو کھانا پکانے میں لگا دیا اسکو فرصت سے کبھی نہیں رہنے دیا۔ میری چھٹیاں اِن مصروفیات میں بڑی جلدی گذر جاتیں ہیں کبھی پھوپھی امی ناراض ہو جاتیں تو بھائی جان ہنس کر میرے سر پر ہاتھ رکھتے اور کہتے تم تھک جاتی ہو۔ کل کسی کو کھانے پر نہیں بلاؤں گا اچھا سرور بی بی کل تم کو بمبئی لے چلوں گا فلاں پکچر کی ٹرائل پر۔ اور ریکاڈنگ پر۔ بات کو پوری بھی کرتے۔ جب چھٹیاں پوری ہو جاتیں میں الہ آباد جانے کی تیاری کرنے لگتی کہ کالج کھل گیا ہے تو مایوس ہو جاتے۔ ٹکٹ آجاتا پھر واپس کر دیتے۔ میں پریشان ہو جاتی کہ میری کتنی غیر حاضری لگے گی۔ پندرہ دن اور روک لیتے سہیلیوں کا خط آنا شروع ہو جاتا۔ سرور کب آرہی ہو الہ آباد کالج کھل گیا ہے۔ بمبئی چھوڑنے کا دل نہیں چاہتا۔ میں ان کو لکھ کر بھیج دیتی کہ بھائی جان آنے نہیں دیتے کیا کروں؛ پھر میں پھوپھی امی کی خوشامد کرتی کہ بھائی جان سے سفارش کیجئے۔ پھوپھی امی میری جانب سے سفارش کرتیں کہ سرور کا کالج کھل گیا ہے اُس کو الہ آباد جانا ہے۔ اُس کی پڑھائی کا نقصان ہوگا۔ بھائی جان یہ سنتے اور کہتے کیا کرے گی زیادہ پڑھ کر۔ کیا؟ اس کو ملازمت کرنی ہے میں کس کے لئے کماتا ہوں انہیں لوگوں کے لئے۔ اپنی شاعری کو بازار میں بیٹھا دیا ہے۔ کس چیز کی کمی ہے۔ میں یہ سُن کر خوف زدہ ہو جاتی۔ بڑی منت وسماجت کے بعد ٹکٹ آتا۔ پھر مجھکو بھائی جان بمبئی

لے جاتے کچھ ساڑیاں اور کچھ سوٹ کا کپڑا دلاتے۔ جس دن چار بجے شام کو میری روانگی الہ آباد کے لئے ہوتی۔ کار میں سب لوگ خاموش کوئی بات نہیں۔ بھائی جان کا موڈ خراب رہتا اور میں بھی دل ہی دل میں کہتی اِس بار امی سے کہوں گی کہ اب ہم لوگ بمبئی میں آ کر رہیں گے۔ بھائی جان چاہتے ہیں کہ سب لوگ ساتھ میں آ کر رہیں یہ سوچتے سوچتے راستہ طے ہو جاتا۔ سامان قلی اتارتا اور پلیٹ فارم کے اندر لے جاتا جہاں الہ آباد کی ٹرین کھڑی مسافروں کا انتظار کر رہی ہوتی۔ سب لوگ ڈبے کے اندر جانے کے لئے سیٹوں کو غور سے دیکھنے لگتے۔ کون سا ڈبہ ہے بھائی جان بھی جلدی جلدی اپنی لانبی لانبی ٹانگوں سے قدم بڑھاتے ہوئے لسٹوں میں میرا نام دیکھنے لگتے۔ اور اپنی گھڑی بھی دیکھتے کہ ٹرین چھوٹنے کا وقت تو نہیں ہو گیا ہے۔ خدا خدا کر کے نام ظاہر ہوتا۔ فسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں بھائی جان داخل ہوتے اندر اِدھر اُدھر دیکھتے پھر اشارے سے قلی کو سامان رکھنے کے لئے کہتے سامان رکھوانے کے بعد امی کو ہاتھ پکڑ کر بیٹھاتے اور مجھ سے کہتے گھبرانے کی بات نہیں ناشتہ وغیرہ منگوا لینا میں ٹی ٹی سے کہے دیتا ہوں۔ ٹی ٹی سے ملتے اور میرا بھی تعارف کراتے اس سے کہتے میری بہن الہ آباد جا رہی ہے۔ خیال رکھئے گا۔ ٹی ٹی ہاتھ ملاتے ہوئے کہتا ساحر صاحب تشویش کی کوئی بات نہیں ہے بات ہی بات میں انجن نے ایک دھکا مارا ڈبہ اپنی جگہ سے دوسری جگہ جا کھڑا ہو جاتا۔

بھائی جان مجھ سے کہتے سرور بی بی چلو بیٹھ جاؤ۔ ٹرین چھوٹنے والی ہے۔ چل پڑی تو بمبئی میں رہ جاؤ گی پریشان نہ ہونا میں اگلے ماہ آؤں گا پھر تم میرے ساتھ آنا۔ یہ پیار بھرے الفاظ سے مجھے تسلی دیتے اور سر پر ہاتھ رکھتے۔ انور اور بھائی جان ہاتھ ملاتے پھوپھی امی پیار دیتیں۔ امی بھی سب کو پیار دیتیں گارڈ کی سیٹی کی آواز سے گاڑی چل پڑتی میں کھڑکی سے بھائی جان کے ہلتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتی رہتی۔ آخر وہ ہاتھ بھی چھپ جاتا۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو جاتی۔ دوسرے دن نو بجے رات کو ٹرین الہ آباد اسٹیشن پر رک جاتی۔ گھر آتے آتے دس بج جاتے۔ مگر موڈ میرا خراب رہتا دوسرے دن کالج جاتی۔ سہیلیوں کے گلے سننے میں آتے۔ بمبئی چھوڑنے کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اُن لوگوں کو وہی قصہ سنانے لگتی کہ بھائی جان آنے ہی نہیں دے رہے تھے۔ دو بار ٹکٹ واپس کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ تم لوگ بمبئی میں آ کر رہو۔ مگر امی کا جی نہیں لگتا میں کیا کروں۔ میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ پڑھائی ختم کرنے کے بعد بمبئی میں ہی رہوں گی۔ بھائی جان کے خلوص کی کیا تعریف کروں۔ ایک ہفتے کے بعد خط لکھا تھا۔

سرور بی دعائیں۔

میں اگلے ماہ الہ آباد آ رہا ہوں تم سول لائن میں پلاٹ دیکھو۔ یا جہاں تم کو پسند ہو میں تمہارے لئے ایک چھوٹا سا بنگلہ بنوانا چاہتا ہوں۔ تمہارا اور ممانی جان کا کیا خیال ہے۔ امی سن کر کہنے لگیں تو کبھی تو کہتے ہیں بمبئی میں آ کر رہو اب الہ آباد میں بنگلہ بنوانے لگے۔ کیا بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ تم خاموش رہو میں سمجھاؤں گی یہاں بنگلہ بنوانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اکیلی جان پر اتنا بڑا بوجھ اٹھانے نہیں دوں گی۔ جس میں رہتی ہوں کیا بُرا ہے۔ سب کچھ تو موجود ہے۔ روپیہ خرچ کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ امی کی باتوں کو غور سے سن لیا مگر بھائی جان کو خط میں کیا لکھوں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ امی نے کہا کہ لکھ دو جب آپ آئیں گے تو باتیں ہوں گی۔ خط کا سلسلہ جاری رہتا۔

بھائی جان اپنے لکھنے کے مطابق الہ آباد آتے تو میرے لئے تو عید ہو جاتی۔ گھر بھر جاتا۔ لوگوں کا آنا جانا شروع ہو جاتا۔ اس قدر چہل پہل رہتی کہ کالج سے چھٹیاں لے کر گھر بیٹھ جاتی۔ بھائی جان کے پرستاروں کا تانتا لگا رہتا۔ جب تک رہتے ہماری اُن کی بات چیت نہ ہوتی۔ لڑکیاں آٹوگراف لینے آتیں کبھی زنان خانے میں آتے کبھی مردانے میں آتے۔ تھوڑے سے وقفے میں مل کر چلے جاتے پندرہ بیس دن رہتے جب واپسی ہوتی تو کہتے میں تو اپنی بہن سے مل بھی نہیں پایا۔ بیس دن بڑی جلدی گذر جاتا۔ جب بھائی جان کہتے کہ مجھے فلاں تاریخ کو پہنچنا ہے تو مجھے احساس ہوتا۔ پھر میں کہتی بھائی جان اتنی جلدی جا رہے ہیں ایک ہفتہ اور رہ جائیں۔ بھائی جان کہتے مجھے گانا دینا ہے۔ اگر گانا نہ دیا تو پیسے نہیں ملیں گے اچھا بھائی اداس نہ ہو دو دن اور ٹھہر جاتا ہوں۔ پھوپھی امی سے کہتے (ماں جی) سرور بی بی کہتی ہے کہ دو دن اور ٹھہر جاؤ۔ تو ٹھہر جاتا ہوں۔ ہمیں تو کار سے جانا ہے ہمیشہ بائی کار الہ آباد آتے تھے۔ جو ملنے آتے اُن سے بھی کہتے میں دو دن اور ٹھہر رہا ہوں میری بہن کہہ رہی ہے۔ کل اسے کچھ دلانے لے جاؤں گا۔ جب کہ بمبئی سے کپڑے وغیرہ لے آتے تھے۔ دو دن پھر ویسے ہی مجمع لگا رہتا معذرت مانگ کر مجھے مارکیٹ لے جاتے اور کپڑے وغیرہ دلاتے کار ہی میں بیٹھے ہوئے باتیں کرتے۔ میں نے یہاں پر کئی لوگوں سے کہہ دیا پلاٹ کے بارے میں وہ لوگ مجھے لکھیں گے۔ امی کہتی بیٹا آپ خرچ بہت کرتے ہیں۔ بھائی جان کہتے ممانی جان خرچ نہیں کروں گا تو خدا دے گا نہیں اچھا اچھا اب زیادہ خرچ نہیں کروں گا۔ ہنس کر کہتے اور چلے جاتے۔ پرسوں کا دن آ جاتا بھائی جان بمبئی کے لئے روانہ ہو جاتے بھرا ہوا گھر خالی ہو جاتا کئی دن تک عجیب سا لگتا۔ آنے جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ میں بمبئی جاتی بھائی جان الہ آباد آتے۔ بھائی جان کو الہ آباد بہت پسند تھا۔ ان کی خواہش تھی۔ کہ الہ آباد میں بنگلہ بنوائیں۔ چھ ماہ الہ آباد میں رہیں اور چھ ماہ بمبئی میں۔

میں نے بھی دل لگا کر پڑھنا شروع کیا کہ کامیابی میرے لئے لازمی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ کامیاب ہوتی رہی اور ٹریننگ بھی پاس کر لیا۔ اور سروس کے لئے اپلائی بھی کر لیا۔ تقدیر میری اچھی تھی کہ دو ماہ کے بعد مجھے سروس بھی مل گئی۔ میں نے پھوپھی امی کو خط لکھ کر بھیجا کہ مجھے سروس مل گئی ہے بھائی جان کو خط لکھا وہ پڑھ کر خفا ہوئے۔ اور والدہ سے کہنے لگے کہ سرور نے میری توہین کی ہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ بھائی بہنوں کا خیال نہیں کرتا۔ پھوپھی امی نے سمجھایا کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ ہر لڑکی کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہئے۔ ناراض ہونے کی کیا بات ہے بس بھائی جان مان گئے اور پھوپھی امی سے کہنے لگے کہ سرور کو کچھ روپے بھیج دیجئے وہ اپنی سہیلیوں کو پارٹی دیدے۔ منی آرڈر آیا اور ساتھ ہی ساتھ پھوپھی امی کا خط بھی آیا کہ یہ روپئے آپ کے بھائی نے بھیجے ہیں کہ اپنی سہیلیوں کو پارٹی دو۔ لیکن ناراض بھی ہیں کہ تم نے سروس کر لی ہے۔ ساری خوشیوں پہ پانی پڑ گیا۔ میں نے پارٹی دی مگر دل بجھا بجھا سا رہتا چہرے سے خوشی نمایاں نہ تھی۔ مجھ سے میری سہیلیوں نے پوچھا کہ سرور تم خوش نظر نہیں آ رہی ہو کیا بات ہے؟ میں نے سارا قصّہ سنا دیا۔ بھائی جان نے خط کا جواب بھی دینا بند کر دیا۔ میرا خط معذرت کا برابر جاتا رہا مگر جواب سے محروم رہتی پھوپھی امی کے پاس لکھ کر بھیجتی مجھ سے کیا غلطی ہو گئی۔ صرف ملازمت ہی تو کی ہے۔ پھوپھی امی کا تسلی بخش خط آتا۔ آپ پریشان نہ ہوں تم کچھ دنوں کے لئے بمبئی آ جاؤ ساحر تم کو دیکھ کر خوش ہو جائے گا۔ اور ناراضگی بھی ختم ہو جائے گی۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ بمبئی پہنچ گئی۔ بھائی جان اسٹیشن پر لینے آئے۔ میں نے سلام علیک کیا سر پر ہاتھ رکھا۔ اور کہنے لگے تم آ گئیں ٹیچر صاحبہ۔ میں نے کہا آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ بھائی جان نے کہا تمہیں کس چیز کی کمی تھی۔ تم نے ملازمت کی میں چپ پھوپھی امی کہنے لگیں بی بی گھر چل کر باتیں کرنا۔ کیا ہو

ہر خوشی تم پوری کرتے ہو اس کی خوشی یہ تھی کہ وہ ملازمت کرے کرنے دو۔ کوئی غلط کام نہیں کیا گھر پر آئے ہنا یا کچھ ناشتہ وغیرہ ہوا۔ میرا منہ بنا ہوا تھا۔ میں چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے آواز دی سرور بی یہاں آنا میں ڈر گئی اب اور کچھ سننے میں آئے گا خدا خیر کرے۔ ریکا ڈنگ پر چلنا ہے لتا منگیشکر کو دیکھنا ہے بس تیار ہو جاؤ۔ اب میں سمجھ گئی کہ بھائی جان سب کچھ بھول گئے ریکا ڈنگ پر لے گئے لتا جی سے تعارف کرایا۔ سنجیدگی خوشی میں بدل گئی بھائی جان دل کے بڑے نرم تھے۔ وہ انسانوں کے علاوہ جانور وں اور پرندوں سے بھی پیار کرتے تھے۔ انہوں نے گھر میں آئی ہوئی چڑیوں کو بھی پیار دیا جب بھی ناشتہ کرتے انکو مکھن لگی ہوئی ڈبل روٹی کھلاتے وہ چڑیاں اس قدر مانوس ہو گئیں کہ ان کے کاندھے پر آکر بیٹھ جاتی تھیں۔ اگر کبھی دیر سے اٹھتے تو وہ چڑیاں ان پر جاکر بیٹھ جاتیں۔ اور چوں چوں کرکے اٹھاتی تھیں۔ بھائی جان نے ان پر گانا بھی لکھا ہے، بند یہ ہے۔

چھن چھن کرتی آئی چڑیا

دال کا دانہ لائی چڑیا

ایک بار کا ذکر ہے کہ کچھ چڑیاں آپس میں کھاتے ہوئے لڑنے لگیں اس میں سے ایک چڑیا پانی کے جگ میں گر پڑی بس بھائی جان پریشان ہو گئے۔ ہم دونوں کو بلانا شروع کر دیا چڑیا پانی میں گر گئی ہے چڑیا پانی میں گر گئی ہے جلدی آؤ۔ چڑیا پانی میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ انور نے آکر جلدی سے چڑیا کو نکالا اور کپڑے میں لپیٹ کر اس کو گرم کرنے کے لئے رکھ دیا۔ عادت کے مطابق بھائی جان تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد چڑیا کو جاکر دیکھتے وہ سُست پڑی رہی تین گھنٹے کے بعد بھائی جان نے چڑیا کو پھر دیکھا وہ ہوش میں آچکی تھی۔ تولیہ کا پلو ہٹاتے ہی چڑیا پھُر سے اُڑ گئی۔ بھائی جان قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے میں نے اس دن بھائی جان کی ہنسنے کی آواز سنکر ہم سب لوگ ان کے قریب پہنچ گئے۔ بھائی جان کہنے لگے چڑیا اُڑ گئی۔ ہم لوگ بھی ہنس پڑے اس روز بھائی جان بہت خوش نظر آئے۔ میں بعد میں سوچنے لگی کہ بھائی جان ہر جاندار شے کے ساتھ کس قدر ہمدردی کرتے ہیں۔ ایسی عادت سب میں ہونی چاہیئے اُن کے خلوص اور ہمدردیوں کو کس طرح بیان کروں۔ میں تو اِس پر ہی زیادہ نظر رکھتی تھی

۱۹۶۲ء کی بات ہے کہ بھائی جان اپریل کے مہینے میں الٰہ آباد بائی ٹرین آئے گرمی کی شروعات تھی۔ مجھے کوئی اطلاع نہ ملی کہ بھائی جان پھوپھی امی اور انور سب لوگ آرہے ہیں۔ نہ خط میں لکھا کہ ہم لوگ آنے والے ہیں۔ اتوار کا دن تھا۔ میں گھر میں تھی۔ اچانک گھنٹی بجی میں نے دروازہ کھولا تو بھائی جان پسینے میں تر سامنے نظر آئے میں حیران ہو گئی بھائی جان مسکرائے۔ میرے سر پر پیار دیا۔ میں نے پوچھا بائی کار آئے ہیں۔ کہنے لگے نہیں ٹرین سے آیا ہوں۔ پسینے میں تر ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اسٹیشن سے پیدل چل کر آئے تھے۔ اُس زمانے میں رکشا چلتا تھا اور اس کو آدمی کھینچتے تھے۔ بھائی جان اُس رکشے پر نہیں بیٹھے۔ لاکھ کہا گیا پھوپھی امی کی بات نہ مانی اور کہنے لگے آدمی کو آدمی کھینچے اس پر نہیں بیٹھوں گا۔ سب لوگ پیدل چلو۔ سامان رکشے پر رکھو۔ گھر قریب ہے سب لوگ پیدل چل کر آئے۔ رکشے والے کو دس روپیہ دیا۔ جب کہ دو روپیہ بھاڑا ہوتا ہے۔ رکشے والے نے گھر کے اندر آکر سلام کیا اور ہاتھ ملایا اور کہنے لگا صاحب آپ بڑے دیالو ہیں۔ بھگوان آپ کو بہت دے گا بھائی جان نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ اور کہا اچھا اچھا۔ میں تو بھائی جان کو دیکھ رہی تھی۔ خوشی کی لہر ان کے چہرے پر دوڑ رہی تھی۔ اور چہرہ سرخ

ہو رہا تھا۔ اسٹیشن پر ہی کچھ لوگ مل گئے تھے وہ ساتھ آ گئے مجھ سے کہنے لگے سرور بی کچھ لوگ راستہ میں مل گئے اُن کے لئے چائے وغیرہ بھیج دو۔ میں نے جلدی جلدی چائے تیار کی اور نوکر کے ہاتھ بھیج دیا۔ بھائی جان اُسی حال میں دوستوں کے پاس جا بیٹھے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد دوستوں نے کہا ساحر صاحب اجازت چاہتا ہوں۔ آرام کیجیے کچھ دیر آرام کیا۔ شام کو پانچ بجے مجھ سے کہنے لگے۔ سرور بی تیار ہو جاؤ زمین دیکھنے چلنا ہے۔ میں منہ دیکھنے لگی۔ کہنے کے مطابق میں نے عمل کیا کیوں کہ ناراضگی کا مجھے بڑا خوف تھا۔ کہیں پھر نہ ناراض ہو جائیں میں تیار ہو گئی۔ کسی کی کار آکر نیچے کھڑی تھی۔ میں پھوپھی امی اور انور بھائی جان کے ساتھ میں گھر سے باہر دیکھا کہ لوگ کھڑے ہیں بھائی جان سے ملنے کے لئے لوگوں نے ہاتھ ملایا اس میں کچھ ایسے معمولی لوگ بھی تھے جو ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگے صاحب کیا گانے لکھتے ہیں۔ آپ کیسے لکھتے ہیں۔ بھائی جان نے کہا خدا کی مہربانی ہے۔

اُسی وقت ایک فقیر پاس آکر کھڑا ہو گیا جس کا جسم مرض کی وجہ سے سُوجا ہوا تھا۔ کپڑے پھٹے بُرا حال اُس کو دیکھ کر ایک پانچ روپئے کا نوٹ نکال کر دیا اور کہنے لگے جاؤ کھانا کھا لینا۔ وہ فقیر کبھی نوٹ کو دیکھتا کبھی بھائی جان کا منہ دیکھتا راہ کے چلنے والے بھی کھڑے ہو گئے۔ فقیر قدموں پر گر پڑا بھائی جان پریشان ہو گئے اور کہنے لگے اٹھئے اٹھئے یہ اور روپئے لو۔ ایک پانچ کا نوٹ اور نکال کر دیا۔ پھوپھی امی سے کہنے لگے کہ میری قمیص لا کر دیدو۔ قمیص دینی پڑی۔

بعد میں ہم سب پلاٹ دیکھنے چلے گئے کریلہ باغ۔ سول لائن راجہ پور دیکھا۔ مگر مجھے پسند نہ آئی ایسے تو ٹالا کیوں کہ امی نہیں چاہتی تھیں کہ اتنا بڑا بوجھ بھائی جان کو دیا جائے۔ سارا دن چکر کاٹا۔ جہاں بھی بھائی جان اترتے لوگ جمع ہو جاتے اور آٹو گراف لینے لگتے۔ کوئی سگریٹ کے ڈبے پر تو کوئی کاپی پر یہ دیکھ کر مجھے حیرانی ہوتی۔ میں نے بھی سوچا کہ میں بھائی جان سے آٹو گراف لونگی وہ مجھے کیا لکھ کر دیں گے۔ گھر پر آکر بھائی جان کے سامنے اپنی آٹو گراف بک پیش کی۔ بھائی جان بولے بیوقوف میں تمہارا بھائی ہوں۔ تم کو اس کی کیا ضرورت نہیں ہیں۔ میں اپنا جیسا منہ لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور سوچ لیا کہ میں ضرور آٹو گراف لے کر رہوں گی۔

بھائی جان سے ملنے میرے اسٹاف کی ٹیچر آئیں انہوں نے اپنا آٹو گراف بک پیش کیا اُسی میں میں نے بھی پیش کر دیا۔ بس میری آرزو پوری ہو گئی۔ بھائی جان نے لکھا۔

ہزار برق گرے لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں

بھائی جان کو یہ بات معلوم بھی نہ ہوئی کہ میں نے بھی بک دیا ہے ان کی تحریر آج تک موجود ہے۔ عرصہ پندرہ دن بھائی جان الہ آباد میں رہے پھر بمبئی چلے آئے جانے کا وہی سلسلہ رہا۔ کبھی میں اور کبھی بھائی جان آتے۔

۱۹۷۶ء میں ایک منحوس خبر سننے میں آئی کہ پھوپھی امی جو تسلی مجھے دیتی تھیں۔ وہ اپنا پیار ساتھ لیتی ہوئی۔ ہم لوگوں سے روٹھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی گئیں۔ ٹیلیگرام ملتے ہی میں بمبئی کے لئے روانہ ہو گئی عرصہ ایک سال تک میں اور امی جان بھائی جان کے ساتھ رہے۔ والدہ کے انتقال کے بعد بھائی جان کچھ بدل گئے تھے مسکراتا چہرہ اداس نظر آنے لگا والدہ کی

جدائی پریشان کرتی رہی۔ لوگوں سے کم ملتے اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے۔ چار سال تک ماں کے غم کو سینے میں چھپائے رہے۔ مشاعرہ وغیرہ میں بھی جانا چھوڑ دیا۔ میری ملازمت بھی ختم ہو گئی۔ لیکن الہ آباد جانا ضروری تھا۔ بھائی جان سے اجازت لے کر الہ آباد روانہ ہوئی سفر کچھ عجیب کشمکش میں طے کر رہی تھی۔ اب میرا بمبئی رہنا لازمی ہے بھائی جان اور انور اکیلے ہوں گے۔ اسی اُدھیڑ بُن میں لگی رہی کیا کروں کہاں رہوں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ذہن کو بدلنے کے لئے میں بھائی جان کی دی ہوئی کتاب "آؤ کہ کوئی خواب بُنیں" نکالی اور پڑھنے لگی۔ لیکن بار بار بھائی جان کی وہ باتیں ذہن میں گھوم جائیں۔ دونوں بہنوں سے کہتے بولو تم لوگوں کو اور کیا چاہئے میں پورا کردوں۔ میں اب فلم لائن چھوڑنے والا ہوں۔ میرا خیال ہے چھ ماہ میں الہ آباد میں رہوں چھ ماہ بمبئی میں۔ میں کیا کہتی کہ مجھے کیا چاہئے سوائے خاموشی کے میں کچھ نہ بولی۔ کبھی کتاب کو بند کرتی کبھی کھولتی اور پڑھنے لگتی ٹرین تیزی کے ساتھ چل رہی تھی برابر کی سیٹ پر ایک سانولی رنگ کی لڑکی بیٹھی ہوئی مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی کہ میں بہت پریشان نظر آرہی ہوں۔ اس سے رہا نہیں گیا۔ مجھ سے پوچھا آپ کہاں جا رہی ہیں۔ میں نے کہا الہ آباد۔ اس نے فوراً کہا میں بھی الہ آباد جا رہی ہوں میں سول لائن میں رہتی ہوں۔ آپ میرے گھر بھی آئیے۔ اس نے پوچھا آپ اتنی پریشان کیوں ہیں۔ کون سی بک پڑھ رہی ہیں میں نے کہا اپنے بھائی کی دی ہوئی ہے اس میں ان کے کلام ہیں۔ اس نے کہا آپ کے بھائی کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا ساحر لدھیانوی وہ اچھل پڑی اور کہنے لگی میں تو اُن کی بہت فین ہوں۔ اُن کی پکچر میں بہت دیکھتی ہوں۔ اُن کے گانے بہت گاتی ہوں۔ ساحر صاحب الہ آباد آتے ہیں۔ میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں۔ جب وہ آئیں تو آپ ملوائیں گی۔ یہ میرا پتہ ہے۔ آپ اپنا ایڈریس دیں۔ ایک دوسرے نے ایڈریس دیا۔ اس کا نام مادھوری تھا۔ ۲۴ گھنٹے کا سفر طے کیا۔ الہ آباد اسٹیشن آیا دونوں نے کافی دیر تک اسٹیشن پر باتیں کیں۔ گھر پہنچے۔ دماغ گھوما جا رہا تھا۔ بھائی جان اور چھوٹی بہن انور کا خیال آرہا تھا۔ الہ آباد آکر ملازمت کا خیال آتا رہا کس طرح ملازمت حاصل کی تھی۔ بھائی جان خفا ہو گئے تھے۔ ملازمت بھی چلی گئی پھوپھی امی بھی دنیا سے چلی گئیں۔ گھر میں بیکار کام کاج میں وقت گذارتی سہیلیاں آتیں تھوڑا سا وقت گذر جاتا۔ ایک ماہ کے بعد مادھوری بھی آئی اور مجھے سمجھاتی رہی۔ اُس کا آنا جانا برابر ہوتا۔ مگر میرا دل کہیں آنے جانے کو نہ چاہا۔ بھائی جان برابر آتے رہے۔ میرا جانا نہ ہوتا کیوں کہ امی جان کی بھی صحت خراب ہو گئی تھی۔ سفر کی اجازت ڈاکٹر نہیں دیتا تھا۔ بھائی جان امی کو دیکھنے آتے۔ اور کچھ دن رہتے اور چلے جاتے مشکل سے ایک ہفتہ۔ میں مادھوری کو اطلاع بھی نہ دے پاتی۔ نہ اسے معلوم ہوتا کہ بھائی جان آئے ہیں۔ وہ بھائی جان سے بہت ملنا چاہتی تھی۔

۱۹۸۰ء مارچ میں بھائی جان الہ آباد مشاعرے میں آئے۔ پندرہ ۱۵ دن رہنے کے بعد چلے گئے۔ اس وقت بھی امی کی صحت خراب تھی۔ ان کے لئے سفر مناسب نہ تھا۔ بھائی جان نے بمبئی پہنچنے کے بعد مجھے ایک خط ستمبر میں لکھا کہ سرور بی بی میں اکتوبر میں آرہا ہوں عید الضحیٰ الہ آباد میں مناؤں گا "فلم انصاف کے ترازو" کا گانا پورا کر کے آؤں گا۔ خط پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی میں نے مادھوری کو ایک خط لکھا کہ بھائی جان اکتوبر میں آرہے ہیں تم ضرور ملنے آنا وہ مارچ میں مشاعرہ میں آئے تھے۔ تم کو معلوم نہیں۔ مادھوری کا جواب جلد ہی آگیا۔ اس نے لکھا تھا کہ مارچ میں میں ہسپتال میں تھی مشاعرہ بھی اٹینڈ نہ کر سکی

مجھے معلوم ہوا کہ ساحر صاحب آئے ہیں۔ اکتوبر میں ضرور آؤں گی، میں اس گھڑی کا انتظار کرنے لگی۔ جس دن بھائی جان آنے والے تھے۔ اکتوبر کا مہینہ شروع ہوگیا۔ بھائی جان کی آمد کا انتظار ہونے لگا۔ دن تیزی سے گذرنے لگا۔ عیدالضحیٰ آئی بھی اور چلی بھی گئی۔ دل پریشان ہوگیا کیا بات ہے۔ بھائی جان نہ آئے بڑی مایوسی ہوئی۔ میں اور امی جان دونوں اُداس ہوگئے۔ عید بھی اچھی نہیں گذری۔ مادھوری بھی بھائی جان کا پتہ لگانے عید کے دن آئی تھی۔ پوچھ رہی تھی۔ ساحر صاحب کب تک آئیں گے۔ میں نے بڑی بے دلی سے جواب دیا معلوم نہیں۔ شاید گانا پورا نہیں ہوا ہوگا۔

۲۶ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کو مادھوری ایک منحوس خبر کے ساتھ ہاتھ میں اخبار لئے میرے پاس آئی۔ مجھے روتا ہوا دیکھ کر کہنے لگی سرورجی یہ کیا اخبار میں لکھا ہے۔ ساحر صاحب کا ہارٹ فیل۔ اُو خدا تو نے یہ کیا کیا۔ میری ملاقات بھی نہ ہوسکی میں بڑی بدنصیب ہوں میں نے روتی ہوئی آنکھوں سے مادھوری کو دیکھا۔ یہ آنکھیں بہت پہلے سے رو رہی تھیں۔ بہت پہلے خبر مل چکی تھی۔ لوگوں کا مجمع گھر میں لگا ہوا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ بھائی جان آئے ہوئے ہیں۔ ان کے پرستار ان سے ملنے آئے ہیں۔ میں سب کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ امی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ لوگوں نے میرے آنسو پوچھے اور سمجھایا۔ اور کہا سفر کی تیاری کرو۔ میں سفر کے لئے تیار ہوگئی۔ اپنے محسن بھائی جان کے آخری دیدار کے لئے۔ بھائی جان کی تصویر آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔

غموں کا بوجھ لئے سفر طے کر رہی تھی۔ دو دن کا لمبا سفر طے نہیں ہو رہا تھا۔ دوسرے دن گھر پہنچی تو بہت سی عورتوں کے بیچ انور خاموش بیٹھی تھی۔ مجھے اور امی کو دیکھ کر رونے لگی۔ آپا بھائی جان نے بھی ساتھ چھوڑ دیا میں نے ہر طرف نظر دوڑائی ساری چیزیں اپنی جگہ پر تھیں۔ مگر بھائی جان کسی گوشے میں نظر نہ آئے۔ اُن کے دیوان کی دو مسند بھی حسرت سے اُن کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔ بھائی جان ہم لوگوں کو بھی انتظار میں چھوڑ گئے۔ اُن کو لحد کی آغوش پسند آئی۔ ماں کے پہلو میں سکون لیا۔ سب کے لئے اپنی یادیں چھوڑ گئے۔

مجموعہ
بادۂ گل میں

ساحر بحیثیت دوست اور شاعر

مہندر ناتھ (مرحوم)

مہندر ناتھ اور ساحر صاحب آپس میں جگری دوست تھے۔ کئی برس تک ساحر فلم رائیٹرس ایسوسی ایشن کے صدر اور مہندر ناتھ جنرل سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ فلم رائیٹرس ایسوسی ایشن کے سالانہ فنکشن کے بارے میں ان دونوں میں جھگڑا ہو گیا، بعد میں دوستی ہو گئی۔ مہندر ناتھ نے ساحر پر ایک مضمون لکھا اور انتقال کے پانچ دن قبل دیا۔ میں نے ساحر صاحب کو دکھایا اور کہا کہ بھائی صاحب اسے رکھ لو، جب کبھی آپ پر کام کروں گا تو لے لوں گا۔ آج نو برس کے بعد ان کی بہن انور نے ان کے کاغذات میں سے یہ مضمون نکال کر دیا ہے۔ جسے میں شائع کر رہا ہوں ۔۔ یہ مہندر کی آخری تحریر ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔

صابر دت

ساحر پر لکھنا اتنا آسان نہیں۔ ساحر مجموعۂ اضداد ہے۔ ساحر جس بلندی پر پہنچا ہے وہاں تک پہنچنے کے لئے ساحر نے بڑی جدوجہد کی، جس راہ سے وہ گزرا ہے وہ راہ صاف اور ستھری نہیں تھی۔ راستہ سرسبز و شاداب نہیں تھا۔ زمین بڑی بنجر تھی۔ گرانڈیل پہاڑوں سے گزرتے ہوئے، ریگستانوں کو عبور کرتے ہوئے، تپتی ہوئی دھوپ میں جھلستے ہوئے، ٹھنڈی راتوں میں سردی سے اکڑتے ہوئے، کھائیوں میں گرتے ہوئے، کبھی تیزی سے چلتے ہوئے، کبھی تھک ہار کر سستاتے ہوئے، کبھی روتے ہوئے، کبھی ہنستے ہوئے، کبھی گر کر، کبھی اٹھ کر، ساحر نے اردو ادب اور فلمی دنیا میں اپنی جگہ بڑی محنت اور ذہانت سے بنائی ہے۔

میں ساحر کو کئی برسوں سے جانتا ہوں۔ دلی میں پرکاش پنڈت کے ساتھ گھومتے دیکھا، پھر بمبئی میں ملاقات ہوئی۔ بڑی سرسری اور غیر رسمی سی ملاقاتیں تھیں۔ جب ساحر بمبئی میں وارد ہوا تو اس کے پاس ایک دیوان تھا بہ عنوان "تلخیاں"، یہی اس کی زندگی کا سرمایہ تھا۔ "تاج محل" پر جو نظم ساحر نے لکھی تھی اس کے چھپتے ہی ساحر ہندوستان کا مشہور اور مقبول شاعر ہو گیا تھا۔ شہرت اور ایک دیوان کے ہوتے ہوئے بھی فلمی دنیا میں جگہ بنانا آسان نہیں۔

فلمی دنیا کا ماحول عجیب وغریب ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی بالکل قدر نہیں کی جاتی۔ ان دنوں سرِعام کہا جاتا تھا کہ ادبی شاعروں اور افسانہ نگاروں کا فلمی دنیا میں کیا کام۔ یہ صنف ہی الگ ہے۔ اگر آپ بالکل ان پڑھ اور جاہل ہیں تو کامیابی جلد ہی آپ کے قدم چومے گی۔ فلم کا ادب سے کیا تعلق۔ درحالانکہ ایک معیاری ناول سے بھی ایک اچھی فلم تخلیق ہو سکتی ہے۔ گو آج کل اس قسم کی واہیات باتیں بہت کم لوگ کرتے ہیں۔ ماحول اور حالات بدلے ہیں۔ اب اس فلم انڈسٹری میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔ میں تو آج سے پچیس۔ تیس برس پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ جبکہ اس انڈسٹری میں ناخواندگی کا طوطی بولتا تھا اور خاص لیکھکوں، ڈائرکٹروں، ایکٹروں کے لئے یہ بات قابلِ فخر سمجھی جاتی تھی۔ کہ ان کا تعلق ادب، ثقافت، تہذیب اور سیاست سے زیرو کے برابر ہے۔

میں اور کرشن جی ورسوا کو رلاج میں رہتے تھے۔ کرشن جی پونا چھوڑ کر بمبئی آ گئے اور میں بھی کرشن جی کے ساتھ رہنے لگا۔ انہی دنوں کرشن جی "سرائے کے باہر" پروڈیوس اور ڈائرکٹ کر رہے تھے۔ میں اس فلم کا ہیرو تھا۔ 'سرائے کے باہر' ایک ترقی پسند فلم تھی جس قسم کی فلمیں بنانے پر آج کل زور دیا جاتا ہے۔ یعنی New wave فلم۔ بالکل اسی قسم کی فلم، کرشن جی نے آج سے ۲۵ برس پہلے بنائی تھی، نئی کاسٹ لے کر اگر کرشن جی "سرائے کے باہر" آج بناتے تو نئی فلموں کی شروعات کا سہرا ان کے سر باندھا جاتا۔ انہی دنوں ساحر فلمی دنیا میں اپنی جگہ بنانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور کون ہاتھ پاؤں نہیں مار رہا تھا، زندہ رہنے کے لئے کون جدو جہد نہیں کرتا اور کرنی چاہئے بھی۔ اس سرمایہ دارانہ نظام میں جہاں شرافت اور ذہانت کی کوئی قدر نہیں کرتا، وہاں اپنی جگہ بنانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ساحر ان دنوں بیکار تھا، کام کاج کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ مجھے یاد ہے انہی دنوں ساحر نے کرشن چندر کا ایک اسکرپٹ کاپی کیا تھا اور اسے کاپی کرنے کا معاوضہ ۴۵ روپے ملا تھا۔ "تلخیاں" اور تاج محل کے مصنف کو پیٹ بھرنے کے لئے نقل نویس بھی بننا پڑا۔ یہ ہے ہمارے دیش کا المیہ۔ اور ابھی تک ہمارے دیش کے لیکھکوں اور دانشوروں کی زیادہ تعداد اسی ظلم اور استبداد کی شکار ہے۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ساحر اور ساحر کی ماں جی کورلاج آ کے رہنے لگیں۔ میں بہت کم گو انسان ہوں۔ گو آج کل باتیں زیادہ کرتا ہوں۔ ان دنوں تو ہاں اور نہ پر ہی اکتفا کرتا تھا۔ کبھی ساحر سے ملاقات ہوتی تو ہم دونوں آداب یا نمستے کہہ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے۔ ان دنوں ساحر کی صورت سے ایک عجیب قسم کی اداسی ٹپکتی تھی۔ لانبا قد، لمبوترہ زرد چہرہ، دبلا پتلا جسم، چہرے پر چیچک کے داغ، لمبی ناک، ذہین آنکھیں، ہونٹوں پر اداسی۔ سر سے کر پاؤں تک گھبراہٹ، بے چینی کے آثار نمایاں تھے۔

یہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا۔ مجاز، سردار، کیفی، ساحر، فیض، مخدوم، مجروح، اختر الایمان اور کتنے ہی شاعر انقلابی گھن گرج سے متاثر ہوئے۔ انقلابی نظمیں اور غزلیں لکھتے، جلسے اور جلوسوں میں شریک ہوتے۔ ہر شاعر اور نثر نگار سوشلزم اور مارکسزم کی بات کرتا۔ کھیت واڑی کے قریب کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا دفتر تھا۔ یہیں پر بہت سے ترقی پسندوں سے ملاقات ہو جاتی۔ چہروں پر رونق تھی، آنکھوں میں چمک تھی۔ انقلاب لانے کے لئے، ہر نفس اپنی زندگی قربان کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس قسم کا انقلابی ماحول میں نے کبھی نہ دیکھا۔ ہندوستان کے ترقی پسند شاعر یا افسانہ نگار اور دانشور یا تو کمیونسٹ

پارٹی کے ممبر تھے، یا کسی نہ کسی طرح سے اس پارٹی سے منسلک تھے۔

یہ ایک سنہری دور تھا۔ اس عہد میں ترقی پسند شاعروں اور افسانہ نگاروں نے لافانی نظمیں، غزلیں اور افسانے لکھے۔ عوام کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کیا۔ اپنے آپ کو عوامی تحریکوں سے منسلک کیا۔ اور عوام کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھا۔ ان کی بدحالی، پسماندگی، ان کے غموں کو ان کی بھوک کو اپنی بھوک سمجھا۔ ان کے لئے جیئے اور مرے بھی۔ شاید ان ہی دلوں کی وابستگی، ان سب ترقی پسندوں کے دلوں میں انقلاب کی شمعیں روشن کئے ہوئے ہے۔ وہ خواب جو آج سے تیس برس پہلے ترقی پسند شاعر یا افسانہ نگار دیکھا کرتے تھے آج وزیر اعظم اندرا گاندھی کی قیادت میں پروان چڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں اور شاید انہی خوابوں کی سزا ہماری جدید پود ترقی پسندوں کو دے رہی ہے کہ تم نے آج سے تیس برس پہلے انقلاب کا پرچم بلند کیا تھا۔ ایسے حسین خواب کیوں دیکھے تھے۔ کیوں مقصدی ادب کا نعرہ لگایا تھا۔ اس کی سزا انہیں ملنی چاہیے۔

ساحر بھی انہی مشہور و معروف شاعروں میں سے ایک ایسا شاعر ہے جس نے اشتراکی نظام کے حق میں اور سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کے خلاف نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ شاید جدید نسل کے ادیب اسی لئے ساحر کے اس جرم کو معاف نہیں کر سکے۔

مجھے یاد ہے ایک بار ساحر سے ملاقات ہوئی تو ساحر نے میری ایک مشہور کہانی "حنائی انگلیاں" کے چند پیراگراف زبانی سنائے اور اس کہانی کی بہت تعریف کی۔ ساحر کی زبانی اپنی کہانی کے چند پیراگراف سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ تقسیم سے پہلے کورلاج، ترقی پسند ادیبوں کی آماجگاہ بن گیا۔ باہر سے جو ادیب آتا سیدھا کورلاج کا رخ کرتا۔ کوٹھی بڑی تھی۔ اور کرشن جی کا دل بھی بڑا تھا۔ اور ان کی اقتصادی حالت بھی اچھی تھی۔ کرشن چندر کی شہرت، ان کی وسیع القلبی اور مرنجان مرنج طبیعت سبھی کو کورلاج کھینچ لائی۔ کورلاج ایک قسم کا روسی تیرتھ بن گیا جہاں ترقی پسند ادیبوں کا جمگھٹا رہتا۔

جب انسان کا دل بڑا ہو اور کھانے پینے کی بہتات ہو تو ساری دنیا اس میں سما جاتی ہے۔ اس لئے ادیب آتے رہے اور جاتے رہے۔ اب ساحر کورلاج کی اوپر والی منزل میں رہنے لگے۔

"سرائے کے باہر" ریلیز ہوئی۔ فلم چلی، مگر ہٹ نہ ہوئی۔ کرشن جی نے دوسری فلم "دل کی آواز" بنائی۔ یہ فلم فیل ہو ہو گئی۔ بہت گھاٹا ہوا۔ تین کاریں تھیں بک گئیں۔ فلمی دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ کبھی بلندی۔ کبھی پستی۔ کام کرنا چاہیے۔ نفع یا نقصان تو بزنس میں ہوتا ہے۔

اب ساحر آہستہ آہستہ ترقی کے زینے پر چڑھ رہا تھا۔ فلم "بازی" میں ساحر کے گیت ہٹ ہوئے۔ بس پھر کیا تھا۔ پروڈیوسروں کا تانتا بندھ گیا۔ بمبئی آ کر اور "بازی" کے ہٹ ہونے تک ساحر نے کئی بازیاں ہاری تھیں۔ کتنی شکستوں کا سامنا کیا تھا۔ کتنے میوزک ڈائرکٹروں کے گھروں کی جبہ سائی کی تھی۔ کتنے ہی اپنے انمول گیت دوسرے گیت کاروں کو بیچے تھے اور کتنے ہی ڈائرکٹروں کے گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے تھے۔ اور کتنے لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازے ساحر کو دیکھ کر بند کئے تھے۔ شاید اس کا علم کسی کو نہیں، وہ تو اس وقت ساحر کی کار اور اس کے شاندار فلیٹ کو دیکھ کر کڑھتے اور جلتے ہیں کہ اس شاعر کے پاس اتنی دولت اور شہرت کیسے اور کیوں آ گئی۔ ساحر نے ڈاکہ نہیں ڈالا، چوری نہیں کی۔ شہ زوری نہیں کی۔ ہاں مسلسل جد و جہد کرتا رہا۔ نامساعد

حالات سے لڑتا رہا۔ سوشلزم پر ایمان لا کر گیت لکھتا رہا۔ اور اس نے فلمی گیتوں کو ایک نیا مواد اور نیا موڑ دیا۔ اور جب گیت ہٹ ہوئے تو ساحر کو فلمی دنیا میں شہرت اور دولت ملی۔

میں کورلاج چھوڑ کر ادھر چلا آیا۔ ملک کے دو حصے ہو گئے۔ بہتوں سے رشتے ناطے ٹوٹ گئے۔ جن لوگوں کو انقلاب پر بھروسہ تھا اٹھ گیا۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی وہ حیثیت نہ رہی جو پہلے تھی۔ کانگریس برسراقتدار تھی۔ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ بہت سے ترقی پسند شاعر اور افسانہ نگار فلمی دنیا میں شہرت حاصل کر چکے تھے اور شادیاں کر لی تھیں۔ صاحب اولاد ہو گئے تھے۔ اخراجات بڑھ چکے تھے۔ انقلاب کا دور دور تک سایہ نظر نہ آتا تھا۔ ان حالات میں شاعر اور افسانہ نگار کیا کرتے۔ ٹاٹا اور برلا کی جبہ سائی کرنے سے رہے۔ کتابیں لکھنے سے کیا ملتا تھا۔ اردو کا پتہ کٹ چکا تھا۔ کوئی پبلیشر اردو کی کتاب چھاپنے کے لئے تیار نہ تھا۔ بس ایک فیلڈ تھی قسمت آزمانے کے لئے یا پیٹ بھرنے کے لئے اور وہ فیلڈ تھی فلم کی۔ سبھی اس میں کود پڑے۔ اور کیا کرتے۔ کہاں سے کھاتے۔ محبت کرنے میں کیا برائی ہے۔ گیت لکھتے ہیں۔ کیا ہرج ہے۔ یہ کوئی ڈاکہ، رہزنی یا چوری تو نہیں ہے۔ ایک ایسا آرٹ ہے جو ساری دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ ساحر بھی اسی فلمی دنیا میں غوطہ زن ہوا۔ جب ابھرا تو فلمی دنیا کے افق پر ایک درخشاں ستارہ بن کر چمکا۔ لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ چاروں طرف سے ساحر، ساحر۔ ساحر کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس طرح اور شاعر بھی مقبول ہوئے جیسے شیلندر، شکیل اور مجروح۔ مگر جو مقبولیت اور شہرت ساحر کو فلموں میں ملی وہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کو نصیب ہو۔ فلموں اور خاص کر گیتوں کا اثر سارے ہندوستان میں پڑا۔ اور اس طرح ساحر کی مقبولیت اور شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔

اسی مقبولیت کے دور میں میری اور ساحر کی دوستی کا آغاز ہوا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب کیوں آئے اور اس کے اسباب کیا تھے۔ شاید خیالات کی ہم آہنگی یا رفاقت کا جذبہ یا ایک راہ پر چلنے کا عزم یا اشتراکیت پر پورا بھروسہ۔ بہرحال کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دو انسان دوست کیوں بن جاتے ہیں۔ پھر دشمن بھی اور پھر دوست۔ اس کیمیاوی عمل کا تجزیہ کرنا آسان نہیں۔ ہم دونوں، فلم رائیٹرس ایسوسی ایشن میں کام کرتے تھے۔ پھر ایک دن میں اس فلم رائیٹرس ایسوسی ایشن کا جنرل سکریٹری بنا اور ساحر اس ایسوسی ایشن کا صدر۔ ایک دوسرے کے قریب آنے کے اور مواقع ملے تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز ساحر میرے پاس آتا یا میں ساحر کے گھر جاتا۔ وہاں جاں نثار اختر سے ملاقات ہوتی۔ ہم تینوں شراب پیتے، گپیں ہانکتے۔ ساحر پروڈیوسروں اور شاعروں کے بارے میں دلچسپ قصے سناتا۔ اسی دوران مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ ساحر کو طنزیہ انداز میں بات کرنے کا خاص ملکہ ہے۔ فقرے بازی میں ساحر کا جواب نہیں۔ دوسروں کا مذاق اڑائے گا۔ خود بھی مذاق برداشت کرے گا۔ اپنی تعریف زیادہ کرتا ہے۔ دوسروں کی کم۔ اچھی شراب پیتا ہے اور پلاتا ہے۔ لوگ فون کرتے ہیں۔ تو جن سے نہ ملنا ہوا انہیں کہلوا دے گا کہ ساحر گھر میں نہیں ہے یا باتھ روم میں ہے۔ یہ ہلکی سی چھیڑ چھاڑ ساحر کا محبوب مشغلہ ہے۔ ساحر کے اس رویے سے اس کے بہت سے دوست بدظن ہو گئے اور چند دشمن بھی۔ ایک بار راجندر سنگھ بیدی نے مجھ سے شکایت کی۔ "بھئی مہندر جب کبھی ساحر کو فون کرو۔ جواب ملتا ہے کہ ساحر باتھ روم میں ہے۔ ساحر باتھ روم میں کیا کرتا ہے۔" میں بھلا کیا جواب دیتا۔ ساحر کو ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ سے خوشی محسوس ہوتی ہے۔ انہی دنوں جناب اعجاز صدیقی نے کرشن چندر نمبر نکالنے کا اعلان کیا۔ اردو رسالوں اور خاص کر ادبی رسالوں کی اقتصادی

حالت سے ہر کوئی واقف ہے۔ اتنا بڑا نمبر نکالنے کے لئے روپے کہاں سے ملیں گے۔ مالیگاؤں کے چند ادب نواز دوستوں نے اعجاز صاحب سے کہا۔ ہم مالیگاؤں میں ایک مشاعرہ منعقد کرتے ہیں اور آپ کو پانچ ہزار روپے دیں گے بشرطیکہ اس مشاعرے میں ساحر لدھیانوی شرکت کریں۔ اعجاز صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں ساحر کو راضی کرلوں۔ مالیگاؤں کے مشاعرے میں شرکت کے لئے ____ میں نے ساحر سے بات کی اور ساحر راضی ہوگیا۔ اس سے پہلے بھی جب کبھی میں نے کسی شخص کی مدد کے لئے ساحر سے کچھ کہا۔ ساحر نے میری بات نہ ٹالی۔

مالیگاؤں کے مشاعرے میں چند دن باقی رہ گئے۔ اعجاز صاحب سے پھر ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا ساحر کے علاوہ کیفی اعظمی اور خواجہ احمد عباس کو شرکت کے لئے راضی کرلینا چاہئے۔ میں نے کہا وہ بھی چلیں گے ____ میں کیفی سے ملنے گیا۔ انہوں نے ہاں کرلی۔ پھر پوچھنے لگے اور کون جائے گا۔ میں نے کہا۔ ساحر، خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر ____ "خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر پر مجھے پورا یقین ہے کہ وہ چلے چلیں گے، مگر ساحر کبھی نہیں جائے گا۔ عین وقت پر تمہیں دھوکا دے گا۔ مجھے کئی بار دھوکا دے چکا ہے" کیفی مسکرا کر بولے۔ بھیا ایک بار ساحر میرے ساتھ V.T. سے گاڑی میں بیٹھے اور مجھے سینٹ پرسینٹ یقین تھا کہ ساحر اس بار مجھے دھوکا نہیں دے گا۔ دادر اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ اور میں باقی شاعروں سے گفتگو کرتا رہا۔ جب گاڑی دادر اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو مجھے ساحر کی یاد آئی۔ ادھر اُدھر دیکھا ساحر غائب تھا۔ اب سوچ لو۔ تمہارا بھی یہی حشر ہونے والا ہے، مہندر۔ ساحر کا کوئی بھروسہ نہیں۔ سوچ سمجھ کر اس کا نام اشتہار میں دو۔ ورنہ وہ دُرگت ہوگی کہ یاد کروگے۔"

واپسی پر میں عباس صاحب کو راضی کرلیا، مالیگاؤں جانے کے لئے۔ کرشن جی کو پہلے ہی اطلاع دے چکا تھا۔ اور ساحر کا نام اشتہاروں میں چھپ چکا تھا۔

کیفی کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے اور رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ اگلے دن مَیں نے سوچا کہ ساحر کے گھر جاکر بات پکی کرلوں۔ مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ شام کو ساحر آیا اور کہنے لگا۔ مہندر پرسوں چلنا ہے اس لئے آج شراب خریدلی جائے۔ بھلا میں کیا جواب دیتا۔ ہم دونوں شراب خریدنے چلے گئے۔ ساحر نے تین سو روپیوں کی شراب خریدی اور مجھ سے کہا کہ میں تمہیں کرشن جی کو اور کیفی کو اپنی گاڑی میں لے چلوں گا، عباس صاحب کے لئے کسی اور گاڑی کا انتظام کردیا جائے۔ کیونکہ عباس صاحب پیتے پلاتے نہیں۔ مفت میں پریشان ہوں گے۔ چلنے سے پہلے ساحر نے مجھ سے کہا، کہ پرسوں صبح سب لوگ میرے گھر آجاؤ وہیں سے مالیگاؤں چلیں گے۔ اب مجھے پکّی امید ہوگئی کہ ساحر مجھے دھوکا نہیں دے گا۔ پھر بھی کیفی کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ میں نے سوچا۔ ہوسکتا ہے پرسوں ساحر گھر میں نہ ہو اور جہاں تک شراب کا تعلق ہے وہ تو گھر میں بھی پی جاسکتی ہے۔ بہرحال اگلا دن بڑا اذیت ناک تھا۔ وہ تو گزر گیا۔ اس سے اگلے دن میں سب سے پہلے ساحر کے گھر پہنچا۔ دیکھا تو ساحر گھر میں تھا۔ اب یقین آگیا کہ ساحر گھر سے بھاگ کر نہیں جائے گا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد کرشن جی اور کیفی بھی آگئے۔ اور پھر ساحر کی گاڑی میں یہ قافلہ مالیگاؤں روانہ ہوا۔ تب جاکے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مالیگاؤں میں لوگ ساحر اور دیگر لوگوں کا انتظار کررہے تھے۔ اچھا خاصا مشاعرہ ہوا۔ لوگوں نے کھل کر داد دی۔ رات کے دو بجے ہم سب لوگ ساحر کی گاڑی میں بمبئی کی طرف روانہ ہوئے

رات کا وقت تھا۔ ڈرائیور دن بھر کا تھکا ماندہ تھا۔ گاڑی چلاتے چلاتے اونگھنے لگا۔ سامنے سے بڑی بڑی ٹرکس آرہی

تھیں اگر ڈرائیور نے کار چلاتے ہوئے ذرا سی غلطی کی تو موٹر سمیت ہم میں سے کسی کا پتہ نہیں چلے گا۔ ساحر نے ڈرائیور کو اونگھتے ہوئے دیکھ لیا۔ کار رکوا کر خود گاڑی چلانے لگا۔ اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اس کمبخت کو کیا معلوم کہ ہندوستان کے چار مشہور و معروف ادیب اس کار میں سفر کر رہے ہیں۔ اگر ایکسیڈنٹ ہو گیا تو اردو زبان چار مشہور ادیبوں سے محروم ہو جائے گی۔

ساحر کی یہ خوبی ہے۔ جب کسی کی مدد کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے تو بڑی فراخدلی سے مدد کرتا ہے۔ اس واقعے کے بعد جناب سجاد ظہیر میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ "عوامی دور" کے لئے چندہ چاہئے۔ ذرا ساحر سے کہہ کر ایک معقول سی رقم دلوادو۔ میں نے بنّے بھائی سے کہا کہ ساحر آپ کا بہت احترام کرتے ہیں، آپ خود چلے جائیے۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔ بنّے بھائی کہنے لگے نہیں بھائی، تمہارے بغیر یہ کام نہیں ہو گا۔ میں بنّے بھائی کے ساتھ ہو لیا۔ ساحر کے گھر گئے۔ اور ساحر نے بنّے بھائی کا کام کر دیا۔ یہاں میں صرف اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ساحر نے ہمیشہ دوستوں کی مدد کی۔ مرحوم رام پرکاش اشک جو کینسر جیسے موذی مرض کے شکار ہو گئے تھے۔ ساحر نے پہلے ان کا ٹاٹا ہسپتال میں علاج کرایا۔ جب وہاں کے ڈاکٹروں نے جواب دیدیا تو ساحر نے رام پرکاش اشک کو امریکہ بھیجا اور تقریباً چالیس ہزار روپے ڈاکٹر کپور کی ہتھیلی پر رکھے تاکہ امریکہ میں رام پرکاش اشک کا اچھی طرح علاج کرائیں۔ مگر موت اور کینسر کا علاج ابھی تک نہیں ملا۔ رام پرکاش اشک مر گیا ـــــــ آج کل کتنے دوست ہیں جو اپنے دوستوں پر اتنا روپے خرچ کر سکتے ہیں۔ اور پھر آج تک میں نے ساحر کی زبان سے یہ الفاظ نہیں سُنے کہ اس نے رام پرکاش اشک کی بیماری پر اتنی رقم خرچ کی۔ اسی طرح ساحر نے کتنوں کی مدد کی۔ جس کا یہاں ذکر کرنا اچھا نہیں لگتا۔ یہ ساحر کی دوست نوازی اور فراخدلی کا ایک رخ ہے جو بیحد قابلِ تعریف ہے۔

ساحر بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔ دوستوں اور شاعروں کو بلا کر بڑی پرتکلف دعوت دے گا۔ بڑھیا شراب پلائے گا مرغن کھانے کھلائے گا۔ اور کسی سے جھگڑا ہو جائے تو اُسے طنز اور مزاح کا شکار بنا کر اس کی بے عزتی بھی کرے گا ـــــــ ایک بار ایک شاعر نے ساحر سے بڑی بیباکی سے کہا۔ "ساحر صاحب، فلمی دنیا میں واقعی آپ کا مقام قابلِ رشک ہے اور فلموں میں آپ نے اول درجے کے گیت لکھے ہیں۔ جو مواد کے لحاظ سے انقلابی اور غیر فانی بھی ہیں مگر ادب کے میدان میں آپ دوسرے درجے کے شاعر ہیں۔" ساحر یہ چوٹ کب سہنے والا تھا۔ فوراً بولے۔ "جناب، ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو ادب کے میدان میں مجھے اول درجے کا شاعر سمجھتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے۔ میں آپ کی بات مانوں یا دوسروں کی۔ آپ مجھے اول درجے کا شاعر نہیں سمجھتے تو میں کیا کروں۔ برائے کرم آپ اسی وقت مکان سے تشریف لے جائیے۔ ورنہ مجھے کوئی اور طریقہ استعمال کرنا پڑے گا، آپ کو یہاں سے نکالنے کے لئے۔" وہ صاحب چپکے سے چلے گئے۔

ساحر نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے اب کرے گا بھی نہیں۔ مگر ساحر معاشقوں میں دلچسپی رکھتا ہے اور کبھی افواہیں بھی اڑا دیتا ہے کہ ساحر فلاں لڑکی سے عشق فرما رہا ہے۔ اور یوں تو میں نے لڑکیوں کو ساحر کے پیچھے بھاگتے دیکھا ہے۔ اور ساحر لڑکیوں سے دور بھاگتا ہے۔ کسی لڑکی کو دیکھ کر شرما جائے گا نئی نویلی دلہن کی طرح۔ گال سرخ ہو جائیں گے۔ آنکھیں نیچی کر کے کمرے سے نکل جائے گا۔

ایک بار ساحر کی ماں نے مجھ سے کہا ۔ " بیٹا ۔ ساحر کے لئے کوئی لڑکی ڈھونڈو ۔ اب تو اسے شادی کر لینی چاہیے، گھر میں کس بات کی کمی ہے ۔ میرا کیا ہے ۔ کب سانس اکھڑ جائے ۔ کم سے کم بہو کا چہرہ تو دیکھ لوں ۔ میں نے ساحر سے کہا " بھئی ۔ اب شادی کر لو ۔ لڑکیاں تمہارے آگے پیچھے گھومتی ہیں ۔ ایسا موقعہ پھر کبھی نہیں آئے گا ۔"

ساحر نے برجستہ جواب دیا ۔ " مہندر ۔ میرا شادی کرنے کا موقعہ نکل گیا ۔ اب اگر کوئی لڑکی مجھ سے شادی کرے گی تو وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گی بلکہ میرے بنک بیلنس سے شادی کرے گی ۔ میرے اس بڑے فلیٹ سے شادی کرے گی ۔ میری شہرت کو دیکھ کر شادی کرے گی ۔ اس چیچک زدہ اور لمبی ناک والے ساحر سے کون شادی کرے گا ۔ ساحر اپنی بدصورتی کے بارے میں بے حد حساس ہے ۔ حالانکہ وہ اتنا بدصورت نہیں جتنا کہ وہ سمجھتا ہے ۔ میں ساحر کے اس جواب کو کبھی نہیں بھول سکتا ۔ جو شخص اپنی ذات کے لئے اتنا بے رحم اور قاتل ہو سکتا ہے وہ دوسروں کی کم ظرفی اور بدمذاقی کو کیوں معاف کرے گا ۔

ساحر نے فلمی دنیا سے کافی روپیہ کمایا ۔ ایک شاندار فلیٹ بھی بنوالیا ۔ دو کاریں لے لیں ۔ بنک بیلنس بھی ہوگا ۔ ساحر عوام میں بے حد مقبول ہے ۔ اس مقبولیت کا ذکر ایک بار کرشن جی نے مجھ سے کیا ۔ کرشن جی اور ساحر ۔ بہار کے قحط کے سلسلے میں دورے پر گئے ۔ جگہ جگہ شب افسانہ اور مشاعرے منعقد ہوئے ۔ ان مشاعروں میں ساحر بھی شامل ہوئے اور دوسرے شعرا بھی ۔ مگر کرشن جی کے کہنے کے مطابق جو خراج تحسین ساحر کو ملتا تھا وہ کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ ہوا ۔" کرشن جی نے کہا کہ ساحر کی اس مقبولیت کو دیکھ کر میں بھی سوچ میں پڑ گیا کہ ساحر عوام میں اتنا مقبول کیوں ہے ۔"

اگر ساحر کی مقبولیت کے راز کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ساحر کا انداز بیان نہ تو خطیبانہ ہے اور نہ ہی جوشیلا اس کی شاعری کے لہجے میں ایک مدھم مدھم سی آنچ ہے ۔ گو ساحر ایک اشتراکی شاعر ہے اور ساحر نے اشتراکی فلسفے کو فنی انداز سے اپنی شاعری میں سمویا ہے ۔ ساحر اشتراکی نظام کا ڈھنڈورچی نہیں ہے بلکہ اس کی شاعری میں ایک نغمگی ہے، شگفتگی ہے، لفظوں کی نشست ہے ان کے انتخاب میں جمالیاتی حس کا کافی دخل ہے ۔ پُرشکوہ اور ولولہ انگیز لفظوں کا استعمال کرنے سے ساحر گریز کرتا ہے ۔ نہایت ہی سلیس، شستہ، آسان ۔ مگر خوبصورت لفظوں کا انتخاب کر کے اپنی شاعری کا گھروندا بناتا ہے ۔ اشتراکی فلسفے کے علاوہ اس کی شاعری میں جنسی محرومیوں کا بڑا پرکشش تذکرہ ہے ۔ ساحر روایتی عشق اور محبت کا منکر نہیں ، زلف اور رخسار کے تذکرے ضرور ہیں ۔ مگر محبت کا انجام خودکشی نہیں بلکہ اس سے بچنے کے لئے حسین موڑ نکالتا ہے ۔ ساحر کی شاعری میں درد ہے، کسک ہے ، ہلکی سی ٹیس اور چبھن ہے جو نوجوان لڑکے لڑکیوں کو بے حد مرغوب ہے ۔ ساحر ۔ نوجوانوں میں بیحد مقبول ہے اور وہ اس مقبولیت سے شرمسار نہیں ۔

عظیم شاعری صرف فلسفے اور سنجیدگی کی شاعری نہیں ہوتی ۔ درد ، دکھ ، کرب ، محرومی ، ناکامی کی شاعری بھی عظیم ہو سکتی ہے ۔ شدت احساس ، فنکارانہ انداز بیان ، اشتراکی نقطۂ نظر کے علاوہ بات یوں کہی جائے کہ دل میں اتر جائے ۔ تو سمجھیے کہ آپ اچھے شاعر ہیں ۔ عوامی مقبولیت عظیم شاعری کی نشان دہی کرتی ہے ۔ غالب کے کتنے ہی اشعار ہیں جنہیں عوام بار بار پڑھتے ہیں محفلوں میں

سننے نہیں، اوڑھتے، بچھاتے ہیں۔ ساحر کی شاعری میں ابہام نہیں ہے۔ جو بات ساحر کہتا ہے سمجھ میں آتی ہے۔ ساحر جدیدیت سے دور بھاگتا ہے۔ اگر شاعری صرف گورکھ دھندا اور معمہ بن کر رہ جائے، تو ایسی شاعری کو دور سے سلام۔

جب سے ساحر نے ایک شاندار فلیٹ بنوایا ہے، لوگ اس سے بہت ناخوش ہیں۔ یوں اچھی زندگی صرف ساحر ہی نہیں گزار رہا ہے اور بھی کتنے اشتراکی اور غیر اشتراکی شاعر اور ادیب ہیں جن کے پاس کاریں ہیں، اپنے شاندار فلیٹ ہیں اور وہ ٹھاٹھ سے رہتے ہیں مگر ترقی پسند شاعر اور افسانہ نگار نئی نسل کی نگاہوں میں بُری طرح کھٹکتے ہیں۔ نئی نسل کہتی ہے کہ یہ ترقی پسند شاعر اشتراکی قدروں کا پرچار کرتے ہیں اور خود شاندار فلیٹوں میں رہتے ہیں، کیوں — یہ تضاد انہیں بری طرح کھٹکتا ہے۔ اگر اس تضاد کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترقی پسندوں کو ہدف ملامت بنانا نئی نسل کی فرسٹریشن کا اظہار ہے۔ اگر سارے ترقی پسند ادیب اپنے فلیٹوں سے نکل کر جھونپڑوں میں رہنا شروع کر دیں تو کیا ہندوستان میں انقلاب آجائے گا۔ اگر کوئی شخص اس بات کی گارنٹی دے کہ ایسا کرنے سے واقعی ہندوستان میں اشتراکی نظام آجائے گا تو میں ان تمام ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کو کچھ عرصے کے لئے جھونپڑوں میں منتقل کر دوں گا۔ مگر اس طرح سے سوچنا بے وقوفی ہے۔ انقلاب، چند نظموں، چند غزلوں، چند افسانوں کے کہنے یا سننے سے نہیں آتا۔ انقلاب لانے کے لئے ایک منظم پارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے لیڈروں اور کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے جو سوشلزم پر یقین رکھتے ہوئے اپنی زندگیاں وطن کے لئے قربان کر دیں۔ عوام کو اس جدوجہد کے لئے تیار کرنا پڑے گا۔ اس کو ساتھ لینا ہوگا۔ اگر عوام آپ کے ساتھ ہیں تبھی جاکر بھارت میں انقلاب آسکتا ہے۔ یہ خاموش انقلاب، جس کی گونج سنائی دے رہی ہے جس کی قیادت شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھ میں ہے۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ جس کے دل میں واقعی غریبوں کی بہتری کے لئے شمع روشن ہے عوام اسی کو گدی پر بٹھائیں گے۔

کوئی ذہین ادیب یا شاعر زیادہ دولت حاصل کر کے خوش نہیں رہ سکتا۔ زیادہ دولت بھی ایک لعنت ہے۔ "خود" زیادہ کمانا، اور زیادہ کھانا پاپ ہے۔" ظاہری نمائش سے انسان کی اندرونی کیفیت کا کسی کو کیا علم ہو سکتا ہے۔ کسی کو کیا معلوم کہ دل کے اندر کتنی شمعیں بجھ چکی ہیں، کتنے ارمان پورے نہ ہوئے کتنے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ یہ بات تو کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ ساحر صرف اپنا دیوان "تلخیاں" لے کر بمبئی آیا تھا۔ زمانے کی چیرہ دستیاں، مشکلات، بے عزتیاں، بھوک، بیکاری اور بے وقت کی راگنی، نامساعد حالات سے مقابلہ کرنا بدمذاقی برداشت کرنا، اپنے فن کی بے حرمتی کرانا۔ اور اس قسم کے دیگر ظلم اور استبداد کا سہنا زہر پینے کے مترادف ہے۔ ساحر نے اس زہر کو پیا ہے۔ کبھی کبھی تلملایا ہوگا۔ کبھی رویا ہوگا، کبھی ہنسا ہوگا۔ دراصل انسان کی شخصیت سیدھی سادھی نہیں ہوتی، بڑی پیچیدہ ہوتی ہے۔ راہ میں بڑی کھائیاں ہوتی ہیں، بڑے شگاف ہوتے ہیں اور جن کو عبور کر کے شاعر ایک اچھی نظم کہتا ہے۔

ساحر۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے، مجموعۂ اضداد ہے۔ اچھا بھی ہے اور برا بھی۔ شہرت یافتہ بھی ہے اور بدنام بھی۔ اچھائیوں کا خالق ہے اور برائیوں کا بلندہ بھی۔ دراصل ہر شخص، نیک و بد کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انسان کے اندر روشنی اور تاریکی کا سنگم ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص میں صرف اچھائیاں ہی اچھائیاں ہوں۔ تو وہ انسان نہیں وہ تو فرشتہ ہوگا۔ اور فرشتوں کا اس زمین پر کیا کام۔ انہیں تو آکاش پر رہنا چاہئے۔ ساحر ایک پرخلوص اور نیک انسان ہے۔ اشتراکی نظم و نسق میں یقین رکھتا ہے۔ کبھی کرب اور درد سے بلبلا

ضروری

مجموعۂ اضداد
ضروری

اٹھتا ہے اور اپنا غصہ دوسروں پر نکالتا ہے۔ اُس وقت ساحر کے سامنے جو بھی آتا ہے اس کی طنز و تضحیک کا نشانہ بن جاتا ہے۔ بھلا وہ بھی کیا کرے۔ شاید اس تضحیک کے پیچھے اس کا انقلابی ذہن اس بات کی امید کرتا ہے کہ تم خاموش کیوں ہو بولتے کیوں نہیں۔ اس ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتے۔

جب میں ساحر کی اچھائیوں اور برائیوں کو ترازو میں تولنے لگتا ہوں تو اچھائیوں کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے ــــ اور شاید یہی اچھائیاں اور نیکیاں اس کی شخصیت اور شاعری کی عظمت کی نشان دہی کرتی ہے ٭

یادوں کے لمس

امرتا پریتم

جس چہرے کی روشنی میں سب سے پہلے دل کی تہوں میں درد جاگتے دیکھا وہ اس مذہب کا تھا جس مذہب کے ماننے والوں کے لئے گھر میں برتن بھی الگ رکھے جاتے تھے۔

یہی وہ چہرہ تھا جس نے میرے اندر انسانیت کی وہ جوت جگائی کہ ملک کی تقسیم کے وقت، تقسیم کے ہاتھوں تباہی سے دوچار ہوکر بھی جب میں نے اس حادثے کے بارے میں قلم اٹھایا تو دونوں گروہوں کی زیادتیاں بغیر کسی رعایت یا ریزرویشن کے قلمبند کر سکی۔ یہ چہرہ نہ دیکھا ہوتا تو میرے ناول "پنجر" کی تقدیر نہ جانے کیا ہوتی۔

بیس اکیس برس کی تھی جب اپنے خوابوں میں بسا ہوا یہ چہرہ اس دھرتی پر دیکھا اور زبان پر بےساختہ کسی کا یہ شعر آگیا ؎

تمہاری جیسی شباہت کو ڈھونڈتا تھا دل
تمہاری شکل نہ دیکھی تھی جس زمانے میں

کافی برس بعد اس سے پہلی ملاقات کی تفصیل میں نے آخری خط میں بیان کی تھی اس کے بعد ایک آگ کا دریا تھا جس سے میں دن رات گزرتی رہی ___ یہاں تک کہ ۱۹۵۶ء میں جب مجھے ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملا تو فون پر یہ خبر ملتے ہی میں سر سے پاؤں تک تپنے لگی ۔ خدایا یہ "سنہڑے" میں نے کسی انعام کے لئے تو نہیں لکھے تھے۔ جس کے لئے لکھے تھے اس نے تو انھیں پڑھا ہی نہیں اب ساری دنیا بھی پڑھے تو مجھے کیا۔

اس شام ایک پریس رپورٹر آیا فوٹو گرافر ساتھ تھا۔ وہ میری تصویر لینا چاہتا تھا۔ جس میں میں نظم لکھتی ہوئی نظر آؤں۔ میں نے سامنے میز پر کاغذ رکھا اور قلم ہاتھ میں لے کر کاغذ پر کوئی نظم لکھنے کے بجائے کسی ارادے کے بغیر اس کا نام لکھنے لگی جس کے لئے میں نے "سنہڑے" لکھے تھے۔ ساحر، ساحر، ساحر، ساحر، سارا کاغذ بھر گیا۔

پریس کے لوگ چلے گئے تو اکیلے بیٹھے ہوئے مجھے خیال آیا۔ صبح اخباروں میں یہ تصویر چھپے گی تو میز پر پھیلے ہوئے

کاغذ پر ساحر کے نام کی گردان نظر آئے گی ....اوہ خدایا !
مجنوں کے لیلیٰ لیلیٰ پکارنے والی کیفیت کا تجربہ ہوا مجھے اس روز۔ لیکن کیمرے کا فوکس میرے ہاتھ پر تھا، کاغذ پر نہیں۔
اس لئے دوسرے دن کے اخباروں میں کاغذ پر کچھ بھی نہیں پڑھا جا سکتا تھا۔ ۔ یہ تسلی ہونے کے
بعد ایک کسک ایک چبھن اس میں شامل ہو گئی۔ کاغذ خالی نظر آ رہا تھا۔ مگر خدا شاہد ہے کہ وہ خالی نہیں تھا۔

ساحر کی میں نے تھوڑی سی اپنے ناول "اشرو" میں تصویر کشی کی ہے۔ پھر ایک تھی انیتا' میں اور "چھروتی کی گلیاں" میں ساگر کے روپ میں۔

نظمیں بہت سی لکھی ہیں۔ سنہڑے سب سے لمبی نظم اور دوسری کئی نظمیں اور آخر میں نظم آج کی بات لکھ کر محسوس ہوا کہ اب چودہ برس کا بن واس پورا کر کے آزادی کی طرف لوٹ آئی ہوں۔

لیکن بیتے ہوئے ماہ و سال بدن کے لباس کی طرح نہیں ہوتے۔ یہ داغوں کے نشان کی طرح ہوتے ہیں۔ کہتے کچھ نہیں لیکن جسم سے الگ نہیں ہوتے۔ کئی برس بعد۔ بلغاریہ کے جنوب میں وائسنا کے ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی جہاں ایک طرف سمندر تھا، دوسری طرف جنگل اور تیسری جانب پہاڑ۔ وہاں ایک رات ایسا محسوس ہوا جیسے سمندر کی طرف سے ایک ناؤ آئی ہے اور اس میں سے اتر کر کوئی کھڑکی کی راہ سے میرے کمرے میں آ گیا ہے۔

خواب اور حقیقت ایک ہو گئے تھے۔ اس رات ایک نظم لکھی "تیری یادیں"۔ بہت دنوں پہلے ساحر سے میری اور امروز (مصنفہ کے لئے آئیڈیل) کی ایک ساتھ ملاقات ہو چکی ہے۔ پہلی بار وہ اداس تھا۔ ہم تینوں نے ایک ہی میز پر بیٹھ کر جو کچھ پیا تھا اس کے خالی گلاس میرے اور امروز کے وہاں سے اٹھ کر چلے آنے کے بعد بھی ساحر کی میز پر پڑے رہے۔ اس رات اس نے ایک نظم لکھی تھی۔

میرے ساتھی خالی جام
تم آباد گھروں کے باسی

اور یہ نظم اس نے مجھے اس رات کوئی گیارہ بجے فون پر سنائی اور بتایا کہ وہ باری باری تینوں گلاسوں میں وہسکی ڈال کر پی رہا ہے۔ لیکن بمبئی میں جب دوبارہ ہماری ملاقات ہوئی تو اس وقت امروز کو بخار چڑھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً اپنے ڈاکٹر کو فون کیا اور امروز کو دوا دلوائی۔ یوں تو میرے اندر کی عورت ہمیشہ میرے اندر کی فنکارہ سے پیچھے رہی ہے دوسرے نمبر پر۔ خود اپنے کو دھیان دلایا ہے صرف فنکارہ کا روپ ہمیشہ اتنا روشن رہا کہ میری اپنی آنکھوں کو بھی میری پہچان اسی میں ملتی ہے۔

زندگی میں تین وقت ایسے آئے ہیں جب میں نے اپنے اندر کی صرف عورت کو جی بھر کر دیکھا ہے۔ اس کا روپ اتنا ابھرا تھا کہ میرے اندر کی "فنکارہ" کا وجود میرے لئے محو ہو گیا وہاں کوئی خلا نہیں تھا۔ جو اس کی یاد دلاتا۔ یہ یاد صرف

اب کر سکتی ہوں۔ کئی برس کی دوری پر کھڑی ہو کر۔

پہلی بار اپنے اندر کی عورت کو میں نے اس وقت دیکھا تھا جب میری عمر ۲۵ برس ہو گئی تھی۔ اور میری گود بچے سے خالی تھی تقریباً ہر رات مجھے ایک بچے کا خواب آتا۔ ایک ننھا منّا چہرہ ترشے ہوئے نین نقش ٹکر ٹکر میری طرف دیکھتا ہوا۔ اور بار بار خواب دیکھتے دیکھتے مجھے اس بچے کے چہرے کی پکی پہچان ہو گئی۔ خواب میں وہ مجھ سے باتیں بھی کرتا تھا۔ روزانہ ایک سی باتیں۔ میں اس کی آواز بھی پہچاننے لگی تھی۔ خواب میں میں پودوں کو پانی دے رہی ہوتی تھی اور اچانک ایک گملے میں پھول کی جگہ ایک بچے کا چہرہ کھل اُٹھتا تھا۔

میں چونک کر پوچھتی تھی۔ تو کہاں تھا؟ میں تجھے ڈھونڈتی رہی! اور وہ معصوم چہرہ ہنس پڑتا تھا۔ میں یہاں چھپا ہوا تھا۔ ــــ اور میں جلدی سے گملے میں سے بچے کو اٹھا لیتی تھی۔ لیکن جاگنے پر میں ویسی کی ویسی ہی ہوتی ــــ سونی ویران اور اکیلی ــــ صرف ایک عورت، جو اگر ماں نہیں بن سکتی تھی تو جینا بھی نہیں چاہتی تھی۔

دوسری بار یہ مشاہدہ میں نے تب کیا جب ایک دن ساحر آیا تھا! اور اسے ہلکا سا بخار تھا۔ اس کے گلے میں درد بھی تھا۔ اور سانس میں کھنچاؤ کی سی کیفیت تھی۔ اُس دن اس کے گلے اور چھاتی پر میں نے وِکس ملی تھی۔ کتنی دیر ملتی رہی تھی! اور تب محسوس ہوا تھا۔ اسی طرح پیروں پر کھڑے کھڑے پوروں سے انگلیوں سے اور ہتھیلیوں سے اس کی چھاتی کو ہولے ہولے ملتے ہوئے میں اپنی پوری عمر گزار سکتی ہوں۔ میرے اندر کی عورت کو اس وقت دنیا کے کسی کاغذ قلم کی ضرورت نہیں تھی۔

اور تیسری بار یہ "عورت" میں نے تب دیکھی تھی جب اپنے اسٹوڈیو میں بیٹھے ہوئے امروز نے اپنا پتلا سا برش اپنے کینوس کے اوپر سے اٹھا کر اسے ایک بار لال رنگ میں ڈبویا تھا اور پھر اس برش سے میرے ماتھے پر بندی لگا دی تھی . . . . .

تقسیم ملک سے پہلے میرے پاس ایک چیز تھی جسے میں سنبھال کر رکھتی تھی۔ یہ ساحر کی نظم "تاج محل" تھی جو اس نے فریم کر کے مجھے دی تھی۔ آج تقسیم کی بربادی کے برسوں بعد اپنی الماری کا اندرونی خانہ ٹٹولنے لگی تو کسی دبے ہوئے خزانے کی طرح کچھ ظاہر ہو رہا ہے۔

ایک پتّہ ہے جو میں ٹالسٹائی کی قبر پر سے اٹھا لائی تھی اور ایک کاغذ کا گول ٹکڑا ہے جس کے ایک طرف چھپا ہوا ہے ایشین رائٹرز کانفرنس اور دوسری طرف ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ "ساحر لدھیانوی" یہ وہ بیج ہے جو کانفرنس کے موقع پر تمام مندوبین کو دیا گیا تھا۔ میرے نام کا بیج میرے اپنے کوٹ پر لگا ہوا تھا اور ساحر کا کے نام کا ساحر کے کوٹ پر لگا تھا۔ ساحر نے اپنا بیج اتار کر میرے کوٹ پر لگا دیا اور میرا بیج اتار کر اپنے کوٹ پر لگا لیا۔ اور آج کاغذ کا یہ ٹکڑا ٹالسٹائی کی قبر سے اٹھائے ہوئے پتّے کے پاس پڑا ہوا مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ بھی میں نے ایک پتّے کی طرح اپنے ہاتھ سے خود اپنی قبر پر سے اٹھایا ہے۔

پاس ہی ویت نام کی بنی ہوئی ایک ایش ٹرے ہے جو آذر بائیجان کی راجدھانی باکو میں وہاں کی شاعرہ مینارد خانم نے مجھے دی تھی یہ کہتے ہوئے کہ جب جب تمہارے الہام کا دھواں تمہارے سگریٹ کے دھوئیں سے مل جائے مجھے یاد کر لینا۔

برسوں اس دھوئیں میں چہرے ابھرتے مٹتے رہے ہیں۔ صرف اوروں کے لئے نہیں اپنا چہرہ بھی اپنی آنکھوں کے

سامنے اپنا چہرہ بھی ۔ پگھلتا اور کانپتا ہوا ۔ حقیقت میں تبھی دیکھا ہے جب کوئی نظم لکھی ہے ۔

کے اس کاگذ تے عشق ترے انگوٹھا لایا ۔ کون حساب چکائے گا ۔ اس نظم کی شان نزول یہ تھی کہ ایک بار ایک اردو مشاعرے کے موقع پر لوگ ساحر سے آٹو گراف لے رہے تھے ۔ لوگ کچھ ادھر اُدھر ہوئے تو میں نے ہنس کر اپنی ہتھیلی اس کے آگے کردی اور کہا آٹو گراف ۔ ساحر نے ہاتھ میں لئے ہوئے قلم کی سیاہی اپنے انگوٹھے پر لگا کر انگوٹھا میری ہتھیلی پر رکھ دیا ۔ جیسے میری ہتھیلی جس پر اپنے دستخط کئے اس پر کیا لکھا ہوا تھا ۔ یہ سب ہواؤں کے حوالے ہے اس پر کیا لکھا ہوا تھا اسے نہ خود اس نے کبھی پڑھا نہ زندگی نے ۔ اس لئے میں کہہ سکتی ہوں ساحر ایک خیال تھا ۔ ہوا میں چلتا ہوا ۔ شاید میرے اپنے ہی خیالوں کا ایک ساحرانہ عکس ۔ لیکن امروز کے ساتھ بتائی ہوئی زندگی ، شروع کے کچھ برسوں کو چھوڑ کر ایک بےخودی کے عالم تک پہنچ گئی ہے ۔

اور امروز جانتا ہے کہ میں نے ساحر سے محبت کی تھی ۔ لیکن یہ جانکاری اپنی جگہ کوئی بڑی بات نہیں ہے ۔ اس سے آگے جا کر امروز کی بڑائی یہ ہے کہ اس محبت میں میری ناکامی کو امروز اپنی ناکامی سمجھتا ہے ۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میرا بیٹا میرے جسم کی آس بنا تھا ۔ ۱۹۴۶ء کے آخری دنوں کی بات ۔

اخباروں اور کتابوں میں کئی بار پڑھا تھا کہ ہونے والی ماں کے کمرے میں جس طرح کی تصویریں سجی ہوں یا اس کے خیالوں میں جو چہرہ بسا رہے بچے کی صورت اسی پر جاتی ہے اور میرے دل نے جیسے دنیا سے چھپ کر سرگوشی میں مجھ سے کہا ۔۔۔ اگر میں ساحر کے چہرے کو ہر لمحے اپنے خیالوں میں رکھوں تو میرے بچے کی شکل میں اس کی شباہت آجائے گی ۔۔۔ جسے زندگی میں نہیں پا سکی تھی ۔ اسے خوابوں میں پالینے کی ایک کرشمہ ساز کوشش ، خدا کی طرح صورت آفرینی کی خلاقانہ کوشش ۔۔۔ جسم کا ایک آزادانہ عمل ۔

صرف روایت ہی سے آزادی نہیں خون اور نسل کی گرفت سے بھی رہائی ۔

دیوانگی کے اس عالم میں جب ۳ جولائی ۱۹۴۷ء کو بچے کا جنم ہوا اور پہلی بار اس کی شکل دیکھی تو اپنی خلاقی پر یقین آگیا اور بچے کے واضح ہوتے ہوئے خدوخال کے ساتھ اپنا تصور واقعی متشکل ہوتا نظر پڑا ۔ میرے بیٹے کی صورت سچ مچ ساحر سے ملتی ہے ۔

خیر دیوانگی کی آخری چوٹی پر پاؤں رکھ کر ہمیشہ کھڑا نہیں رہا جا سکتا ۔ پاؤں ٹکانے کے لئے زمین کا کوئی ٹکڑا چاہیے اس لئے آئندہ برسوں میں اس واقعے کا ذکر میں اس طرح کرنے لگی جیسے پریوں کے دیس کی کوئی کہانی ہو ۔

ایک بار میں نے یہ بات ساحر سے بھی کہی ۔ اپنے آپ پر ہنستے ہوئے اس پر کیا ردعمل ہوا ، مجھے علم نہیں ۔ بس اتنا دیکھا کہ ساحر ہنسنے لگا اور بولا " ویری پور ٹیسٹ "

ساحر کی زندگی کا ایک بڑا بلکہ میں یہ کہوں گی سب سے بڑا کمپلیکس یہ ہے کہ وہ اپنی نظر میں خوبصورت نہیں ہے اس لئے اس نے یہ بات کہی ۔

ایک اور واقعہ یاد آیا ۔ ایک دن اس نے میری لڑکی کو اپنی گود میں بٹھا کر کہا تھا " تمہیں ایک کہانی سناؤں " اور جب میری

لڑکی کہانی سننے کے لئے تیار ہوئی تو ساحر کہنے لگا ــــ ایک لکڑہارا تھا۔ وہ دن رات جنگل میں لکڑیاں کاٹا کرتا تھا۔ پھر ایک دن اس نے جنگل میں ایک راج کماری کو دیکھا، بہت خوب صورت۔ لکڑہارے کا جی چاہا کہ وہ راجکماری کو لے کر بھاگ جائے۔

پھر؟ میری لڑکی کی عمر ابھی کہانیوں کے ہنکارے بھرنے کی تھی، اس لئے وہ بڑے دھیان سے کہانی سن رہی تھی۔

میں پاس بیٹھی صرف ہنس رہی تھی۔ کہانی میں دخل نہیں دے رہی تھی۔

ساحر کہہ رہا تھا " مگر وہ تھا تو لکڑہارا۔ وہ راجکماری کو صرف دیکھتا رہا ــــ دور ہی سے کھڑے کھڑے۔ اور پھر لکڑیاں کاٹنے لگا۔ سچی کہانی ہے نا۔

ہاں میں نے دیکھا تھا۔ بچی نے نہ جانے یہ کیوں کہا ــــ ساحر ہنستے ہوئے میری طرف دیکھنے لگا۔ دیکھ لو یہ بھی جانتی ہے اور بچی سے اس نے پوچھا۔ تم وہاں تھیں جنگل میں ؟

بچی نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

ساحر نے پھر گود میں بیٹھی ہوئی بچی سے پوچھا۔ تم نے اس لکڑہارے کو بھی دیکھا تھا نا ؟ وہ کون تھا ؟

بچی کو شاید اس وقت الہام ہو رہا تھا۔ بولی "آپ"۔

ساحر نے پھر پوچھا اور وہ راجکماری کون تھی ؟"

" ماما " بچی ہنسنے لگی۔

ساحر مجھ سے کہنے لگا۔ دیکھا۔ بچے سب کچھ جانتے ہیں ــــ پھر کئی برس گزر گئے۔ ۱۹۶۰ء میں جب میں بمبئی گئی تو ــــ راجندر سنگھ بیدی بڑے مہربان دوست تھے۔ اکثر ملتے تھے۔ ایک شام بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک انہوں نے پوچھا۔ پرکاش پنڈت کی زبانی ایک بار سنا تھا کہ نوراج (مصنفہ کا بیٹا) ساحر کا بیٹا ہے ......؟

اس شام میں نے بیدی صاحب کو اپنی دیوانگی کا وہ قصہ سنایا اور کہا یہ تصوراتی سچائی ہے واقعاتی نہیں۔

انہی دنوں ایک دن نوراج نے بھی پوچھا۔ اس وقت اس کی عمر کوئی تیرہ برس کی تھی۔ " ماما " ایک بات پوچھوں سچ سچ بتاؤ گی ؟"

" پوچھو۔ "

" کیا میں ساحر انکل کا بیٹا ہوں ؟" " نہیں۔ "

لیکن اگر ہوں تو بتا دو۔ مجھے ساحر انکل اچھے لگتے ہیں۔ "

ہاں ــ بیٹا! مجھے بھی وہ اچھے لگتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو میں نے تمہیں ضرور بتا دیا ہوتا۔

سچائی کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ لہٰذا میرے بچے کو میری بات پر یقین آ گیا

سوچتی ہوں ــــ خیال کا سچ چھوٹا نہیں تھا۔ لیکن وہ صرف میرے لئے تھا اتنا ذاتی کہ ساحر بھی اس میں شریک نہیں تھا۔

لاہور میں جب کبھی ساحر ملنے کے لئے آتا تھا تو میری ہی خاموشی میں کا ایک ٹکڑا سا کرسی پر بیٹھا لگتا۔ کچھ دیر بیٹھ کر چلا جاتا تھا۔ وہ چپ چاپ میٹھا صرف سگریٹ پیتا رہتا تھا۔ لگ بھگ آدھا سگریٹ پی کر راکھ دان میں بجھا دیتا تھا۔ پھر نیا سگریٹ۔ سگریٹوں کے بڑے بڑے ٹکڑے کمرے میں رہ جاتے تھے۔ کبھی کبھی بس ایک بار اس کے ہاتھ کو چھونا چاہتی تھی۔ لیکن میرے سامنے رواجوں کی ایک دوری تھی جو طے نہیں ہو پاتی تھی۔

تب بھی تصور کا سہارا لیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس کے چھوڑے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑوں کو سنبھال کر الماری میں رکھ لیتی اور پھر ایک ایک ٹکڑے کو اکیلی بیٹھ کر جلاتی تھی اور جب انگلیوں میں اسے پکڑتی تھی تو محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا ہاتھ چھو رہی ہوں ــــــ سگریٹ پینے کی عادت مجھے تبھی پہلی بار پڑی تھی۔ ہر سگریٹ کو سلگاتے ہوئے لگتا تھا کہ وہ پاس ہے۔ سگریٹ کے دھوئیں میں وہ جیسے جن کی طرح نمودار ہو جاتا ہے۔ ....

پھر برسوں بعد اپنے اس تجربے کو میں نے اپنے ناول "ایک تھی انیتا" میں کاغذ پر اتارا۔ لیکن ساحر شاید ابھی تک میری سگریٹ نوشی کی اس تاریخ سے ناواقف ہے۔

سوچتی ہوں ــــــ خیال کی یہ دنیا صرف اس کی ہوتی ہے جو اس کی تخلیق کرتا ہے۔ خدا جیسا خلاق بھی اکیلا ہی ہے۔ آخر جس مٹی سے یہ جسم بنا ہے اس مٹی کی تاریخ میرے لہو کی گرمی میں شامل ہے۔ تخلیق کے آغاز میں جو آگ کا ایک گولا سا ..... ہزاروں برس پانی میں تیرتا رہا تھا۔ اس میں سے ہر گناہ کو بھسم کر کے جو جاندار باہر نکلا تھا وہ اکیلا تھا۔ اُسے نہ اکیلے پن کا خوف تھا نہ اکیلے پن کی خوشی۔ پھر اس نے اپنے ہی بدن کو چیر کر آدھے کو مرد بنا دیا آدھے کو عورت، اور اسی سے اس نے دنیا کی تخلیق کی۔

دنیا کا یہ تصور محض دیومالا نہیں ہے نہ صرف زمانۂ قدیم کی تاریخ ہے۔ یہ ہر دور کی تاریخ ہے خواہ چھوٹے چھوٹے انسانوں کی چھوٹی چھوٹی سی تاریخ ہی سہی .....

میری بھی ....

ہمارے ملک کا مقبول ترین شاعر

خواجہ احمد عباس

کوئی شاعر تعارف کا محتاج ہو سکتا ہے لیکن اس کی شاعری کسی تعارف کی محتاج نہیں ہوتی، چاہے وہ شاعری دوسری زبان میں ترجمہ شدہ ہی کیوں نہ ہو۔

ساحر لدھیانوی پینتس برس کی عمر میں ہی اردو زبان کے مقبول ترین شاعروں میں شمار ہونے لگے ہیں یہ وہ زبان ہے جو شمالی ہند کی سادہ اور شیریں بولیوں کی بنیاد پر بنی اور مغلوں کی کلاسیکی فارسی کے زیر اثر پروان چڑھی۔ یہ زبان شاعرانہ پیرایۂ اظہار کے لئے مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ پرانے استادوں کے شعر آج بھی ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں باشندے پڑھتے، گنگناتے اور گاتے ہیں۔ اور آج کل ان کے شعری انتخاب ملک کی دوسری زبانوں اور دوسرے رسم الخطوں میں چھپ رہے ہیں۔ اردو میں شاعری کی روایت کتابوں تک محدود نہیں یہ ان کروڑں انسانوں کے روزمرہ کا جزو ہے جن میں سے کئی ایک پڑھنا لکھنا بھی نہیں جانتے اردو شاعروں کا مشاعرہ ایک لاکھ تک مجمع کر سکتا ہے، جو کھلے میدانوں میں تاروں کی چھاؤں تلے بیٹھ کر یکے بعد دیگرے لاؤڈ اسپیکر کے سامنے آنے والے شاعروں کو رات بھر سنتا ہے۔ اردو کے کسی مقبول شاعر کے لئے اتنے ہی پرستار آٹو گراف لینے کے لئے جمع ہو سکتے ہیں جتنے کہ کسی فلم اسٹار کیلئے۔

چنانچہ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ساحر ہمارے ملک کے تین مقبول ترین زندہ اردو شاعروں میں سے ایک ہیں تو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ساحر کا فن شعر پر عبور، اس کا انداز تحریر، اس کا لفظوں کا انتخاب تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا سلیقہ اتنا مکمل اور جامع ہے، جو دوسرے شعرا کی دسترس سے باہر ہے، بزرگ شعرا بھی اسے حقیقی شاعر تسلیم کرتے ہیں اور ان کی تنقید کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔

ساحر کو بہ حیثیت شاعر جو چیز ممتاز درجہ عطا کرتی ہے وہ ہیئت سے زیادہ مواد ہے، اس کے طرز نگارش میں نغمگی بھی ہے، پیغام بیداری بھی، وہ نہ تو فراریت پسند ہے نہ خود نگر اور نہ ہی اردو فارسی کے بیشتر شاعروں کی طرح بلبلوں اور پھولوں کے گیت گاتا ہے اس کی شاعری میں، میں ابہام پسندی اور تصوف پرستی نام کا کوئی عنصر نہیں۔ اپنی پود کے بعض دوسرے

شاعروں کی طرح جو جد وجہد اور کھچاؤ سے بھرے ہوئے دو عالمگیر جنگوں کے وقفہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ ساحر آج کے گیت گاتا ہے اور دھرتی کے گیت گاتا ہے۔ اس کا نقطہ نظر ایک تشکیک پسند نوجوان کی انتشار پسندی سے ترقی کر کے ایک ایسی پختہ مقصدیت تک پہنچا ہے جو نہ صرف اپنے ملک کی بلکہ پوری دنیا کی سماجی طاقتوں کے صحیح شعور پر مبنی ہے۔ آج سے دس برس پہلے اس نے اپنی سب سے مشہور اور سب سے متنازعہ فیہ نظم "تاج محل" سے اپنے بزرگوں کی پوری نسل کو چونکا دیا تھا۔ اس نظم میں اس نے شاہجہاں اور اس کے شاہانہ شکوہ کے گیت نہیں گاتے بلکہ ان سیکڑوں ہزاروں گمنام کاریگروں اور مزدوروں کی بات کی جنکی محنت اور قابلیت نے اک خواب مرمریں کو جنم دیا۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر

ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مزاق

یہ ایک نئی آواز تھی ایک بے خوف اور نامانوس آواز۔ لیکن اس آواز میں لاکھوں نوجوان لڑکے لڑکیوں کو اپنے دل کی دھڑکن کی صدائے بازگشت سنائی دی اپنی اس روایت کو ساحر نے اپنی دوسری نظموں میں جن میں سب سے زیادہ مشہور (یا بدنام) نظم "چکلے" ہے برقرار رکھا۔ یہ نظم ایک آئینہ ہے جس میں سماج کے نام نہاد باعزت طبقے کو اس کے جسم کے رستے ہوئے ناسور دکھائے گئے ہیں ساحر نے اپنی نشتر زنی کو اپنی شاعری میں ہی محدود نہیں رکھا بلکہ ان فلمی گانوں میں بھی ڈال دیا ہے جو پہلے صرف دلکش اور شیریں کہلاتے تھے۔

اگرچہ ساحر کو ہمیشہ یہ موقع نہیں ملا کہ وہ فلموں میں من پسند گیت لکھ سکے۔ پھر بھی اس نے ایسے بہت کم گانے لکھے ہیں جو عام اصطلاح میں فلمی گانے کہلاتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی اسے موقع ملا۔ اس نے ایسی گیت لکھنے کی کوشش کی جو اس کی پود کی تمناؤں، ناکامیوں، شکوک اور تیقن کی نمائندگی کر سکیں۔

اور اب پرچھائیاں، میں۔ جس کا لفظی ترجمہ صرف "سائے" ہے۔ اس نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو عالمگیر بھی ہے اور ابدی بھی اور جو آج بین الاقوامی سطح پر اخباروں کی سب سے اہم اور نمایاں سرخی بن گیا ہے آج جب کہ لبنان کے ساحلوں پر آب دوز کشتیاں اور جاڑوں کی سرزمین پر پیراشوٹ اتر رہے ہیں اور جب کی ایک بار پھر جنگی مشینوں کو حرکت دی جا رہی ہے اور ایٹمی بادل افق کو تیرہ کئے ہوئے ہے اور یہ بہت ضروری ہے کہ شاعر امن کے حق میں آواز اٹھائے اور سلامتی کا ترانہ گائے۔

ساحر کی پرچھائیاں کوئی سیاسی منشور نہیں ہے یہ شدید طور پر ذاتی دلوں پر اثر انداز ہونے والی انسانی دستاویز ہے جس میں حقیقت اور شاعرانہ تخیل گھل مل گئے ہیں۔ آج کی حقیقت اور کل کی پرچھائیں نمایاں ہیں۔ ایک ناقابل فراموش تاثر آفرینی کرتی ہیں۔ اس نظم کے ذریعہ ساحر ساری دنیا سے مخاطب ہوا ہے۔ لیکن اس کے تخاطب کا لہجہ اور تصور آفرینی کا انداز ایسا ہے جس کی جڑیں اس کے محبوب ہندوستان کی دھرتی میں پیوست ہیں۔

(انگریزی سے ترجمہ)

۲۲ جولائی ۱۹۵۸ء

ساحر کا شاعرانہ مزاج

سردار جعفری

جس کسی نے ساحر لدھیانوی کو یہ کہہ کر کمتر درجے کا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ Teen Agers یعنی نوعمر لڑکے لڑکیوں کا شاعر ہے۔ اس نے دراصل ساحر کی شاعری کی صحیح قدر و قیمت بیان کی ہے۔ نوعمر لڑکے اور لڑکیوں کے لئے شاعری کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ان کے دل میں تر و تازہ امنگیں ہوتی ہیں، آلودگی سے پاک آرزوئیں ہوتی ہیں۔ زندگی کے خوبصورت خواب ہوتے ہیں اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ ان جذبات اور کیفیات کو ساحر نے جس طرح شاعرانہ روپ دیا ہے وہ اس کے کسی ہم عصر شاعر نے نہیں دیا۔ اس سے پہلے کے شاعروں سے اس بات کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ساحر نوعمر لڑکوں اور خاص طور سے لڑکیوں میں صرف اپنے شعر کی وجہ سے مقبول تھا۔

ہر شاعر بہت سے واقعات اور حوادث سے دو چار ہوتا ہے۔ جو زندگی میں اس کی شہرت یا بدنامی میں اضافہ کرتے ہیں۔ آج کا عہد سیاسی عہد بن گیا ہے اس لئے قید و بند کی صعوبتیں بھی شاعر کی شخصیت کے گرد ایک رومانی ہالہ بنا دیتی ہیں۔ بلکوں کے کردار بھی کچھ حق ادا کرتے ہیں۔ ایک ملک سے باہر چلا جانا نیک کام سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے ملک سے باہر چلا جانا قابلِ مذمت سمجھا جاتا ہے۔ ساحر کی زندگی میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں ملے گی۔ پھر بھی نوجوانوں میں اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی غیر معمولی اور قابلِ رشک تھی۔ لڑکیاں پہلے ساحر کی شاعری کی گرویدہ ہوتی تھیں، پھر ساحر سے اظہارِ عشق کرتی تھیں۔ "عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود" کی سچائی یہاں ثابت ہوتی تھی۔ اور کچھ دن ساحر ان کی ناز برداریاں کرتا تھا، پھر کج ادائی دکھاتا تھا اور آخر میں تلخ کلامی بھی کر لیتا تھا۔ لیکن اس سے اس کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ساحر نے عشق سے بدنامیوں کا سامان کرنا اپنا شیوہ بنا لیا تھا۔ دراصل یہ سب جادو اس کی شاعری کا تھا۔ اور اس شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت شدتِ احساس اور سبک اندازِ بیان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوانوں میں مقبول یہ شاعری عمر رسیدہ لوگوں کو بھی پسند آتی ہے ایسے لوگ بھی ہیں جن کو ساحر کا پورا کلام زبانی یاد ہے اور انہوں نے اس کلام سے اتنی محبت کی ہے کہ ساحر کی تند اور تلخ زبان بھی

نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کی ہے۔

یہ ساحر کی شخصیت کا بڑا عجیب اور دلچسپ رخ ہے۔ خاندانی حالات کچھ ایسے تھے کہ ساحر کی پرورش اس کی والدہ نے تنہا کی تھی اور وہ ہمیشہ مرکز توجہ رہا۔ عشق میں بھی وہ محبوب زیادہ رہا ہے اور عاشق کم۔ اس لئے اس کی اپنی ذات اور اپنی شاعری، اس کا سب سے زیادہ محبوب موضوع سخن تھا۔ یہ چیز اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی جس کو فلمی کامیابی نے اور بھی چمکا دیا۔ یہیں سے ساحر کی شاعری میں واسوخت کے انداز سخن کا سراغ ملتا ہے جس کو اس نے ایک ترقی پسند زاویہ عطا کر دیا۔ پرانے زمانے کے واسوخت لکھنے والے شعراء محبوب کو اس کی بے وفائی کا طعنہ دیتے تھے اور اس کے حسن اور جوانی کے زوال کا خوف اس کے دل میں پیدا کرتے تھے۔ ساحر نے اس میں ایک طبقاتی پہلو شامل کر دیا۔ اور شاعر کی امیر معشوقہ کو غریب شاعر کے طنز کا شکار بننا پڑا۔ یہ چیز نوجوانوں کو اچھی لگتی تھی۔

حافظ کی غزل کے دو شعر ہیں:

صبح دم مرغ چمن باگل نو خاستہ گفت
ناز کم کن کہ دریں باغ بسی چوں تو شگفت
گل بخندید کہ از راست نرنجیم ولے
ہیچ عاشق سخن سخت بہ معشوق نگفت

(ترجمہ: ایک صبح بلبل نے باغ میں کھلنے والے نئے پھول سے کہا کہ ذرا ناز کم کرنا کیونکہ تیری طرح کے بہت سے پھول اس باغ میں کھل چکے ہیں اور مرجھا گئے ہیں۔ گل نے ہنس کر جواب دیا کہ سچی بات سے مجھے تکلیف تو نہیں ہوئی لیکن آج تک کسی عاشق نے اپنے معشوق سے ایسی سخت بات نہیں کہی تھی)

لیکن ساحر نے اس سخت بات کو ہمیشہ کہا اور بڑی شاعرانہ حلاوت کے ساتھ کہا۔ اسی کا ایک انداز دوسرے طریقے سے اس کی نہایت مقبول نظم تاج محل میں ملتا ہے۔ اس نظم میں ساحر کا موضوع سخن غریب شاعر اور امیر محبوبہ یا امیروں کے آغوش میں چلی جانے والی محبوبہ نہیں ہے۔ بلکہ امیر اور غریب کی عاشقی کا تقابل ہے۔ اس نظم کا سارا نچوڑ آخری شعر میں ہے ؎

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

لطف یہ ہے کہ ساحر نے تاج محل دیکھا نہیں تھا۔ اگر دیکھ لیا ہوتا تو ایسی نظم نہیں لکھ سکتا تھا۔ اس نظم میں غلطی یہ ہے کہ تاج محل شاہجہاں کا کارنامہ نہیں ہے۔ ہندوستانی اور ایرانی صناعوں اور کاریگروں کے ہاتھوں کا جادو ہے۔ لیکن شاعری جو جذبے کی لہروں پر مچلتی ہے منطق کے قابو میں نہیں آتی۔

ساحر لدھیانوی کا یہ طبقاتی احساس حسن و عشق تک محدود نہیں ہے اس کی کارفرمائی اس کی ہر تخلیق میں ملے گی۔ اس کی شاعرانہ ذہانت میں تلوار کی دھار تھی۔ اور طنز کا ایک پہلو بھی رکھتی تھی۔ اس کے ساتھ ساحر بیباک بھی تھا اور اپنی بیباکی کا اظہار

سیاست سے لے کر امارت تک ہر محفل میں کرتا تھا۔ اس کی شاعری اپنی تمام تر لے باکی کے ساتھ زندہ اور تابندہ رہے گی۔

بعض اوقات سطحی نظر سے دیکھنے والے ساحر کی شاعری کو فیض کی شاعری کا چربہ سمجھ لیتے ہیں۔ یہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ دونوں کی شاعری کا محور رومان اور احتجاج ہے۔ لیکن فیض کے یہاں محبوبہ کا وہ تصور نہیں ہے جو ساحر کے یہاں ہے۔ مخدوم اور مجاز کی شاعری کا محور بھی رومان اور احتجاج رہا ہے مگر ان چاروں ہم عصر شعراء کے مزاج الگ الگ ہیں۔ مجاز کے یہاں سر فروشانہ سرشاری ہے، فیض کے یہاں معشوق نواز حسن پرستی اور ساحر کے یہاں عاشقانہ انانیت۔ اس انانیت کی جھلک غالب کے یہاں ملتی ہے ؎

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

آج کے عہد میں یہ انانیت صرف ساحر کے حصے میں آئی۔

رومان اور احتجاج کی اس شاعری میں انقلابی شعور کی کمی نہیں تھی لیکن رومان کی نمناک ہواؤں نے اس شعور کو شعلے میں تبدیل نہیں ہونے دیا جو شعلہ اقبال، نرودا، لوئی آراگون اور ناظم حکمت کی شاعری کی روح ہے۔

☆

"آسماں چُپ ہے"

واجدہ تبسّم

کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ ایک انسان، جسے آپ دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں، وہ آپ کے بیچ موجود نہیں اور آپ سے کہا جائے کہ اُس کی یاد میں کچھ لکھیں ـــــ!

جب ساحر صاحب زندہ تھے ـــــ (کیا واقعی وہ مر چکے ہیں ؟) تو میں اُن سے ہمیشہ کہا کرتی تھی " ساحر صاحب آپ اتنی پیاری باتیں کرتے ہیں کہ "میں آپ پر صرف ایک مضمون نہیں، ایک پوری کتاب لکھنا چاہتی ہوں ـــــ جس میں خاص طور سے آپ کی مزاحیہ باتیں شامل کروں جو ایک طرح سے لطیفوں میں شمار کی جا سکتی ہیں ـــــ"

ساحر صاحب صرف ہنس دیا کرتے ـــــ انکار انھوں نے کبھی نہیں کیا کیوں کہ اپنی گفتگو کے سحر سے وہ خود بھی واقف تھے ـــــ ساحر صاحب بولتے تو بولتے ہی چلے جاتے ـــــ پھول ہی پھول بکھیرتے چلے جاتے ـ پھر ان کے آگے کسی کا چراغ روشن نہ رہ پاتا ـــــ

تین سال پہلے، ہندوستان سے آٹھ شعراء کو امریکہ اور کنیڈا، مشاعروں کے لئے 'آنے جانے کی ٹکٹوں کے ساتھ، مدعو کیا گیا تھا ـــــ مجھے شاعری شروع کئے اُن دنوں چند ہی دن گذرے ہونگے ـ پتہ نہیں کیسے اتنی دور شہرت جا پہونچی، بہر حال ہم سبھوں نے وہاں خوب مشاعرے اٹینڈ کئے ـــــ بیحد دھوم مچائی ـــــ واپسی میں سبھی شاداں و فرحاں تھے کہ ایک رات پتہ چلا کہ ساحر صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے ـ وہ سوگوار شام مجھے بھلائے نہیں بھولتی ـ فیض احمد فیض بھی ہمارے ساتھ تھے ـــــ اُسی شام ایک تعزیتی میٹنگ کی گئی ـــــ ہر شاعر اور ادیب نے ساحر کو یاد کیا ـ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ـ ان کے ذاتی محاسن بیان کئے ـــــ میں نے کچھ نہیں کہا ـــــ کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی ـــــ جب آنسوؤں سے آنکھیں بھری ہوں، دل رو رہا ہو تو زبان یوں بھی خاموش ہو جاتی ہے ـــــ اس ساتھ امریکہ کی ٹھنڈی، برفیلی رات کو جب ہم ساحر صاحب کا غم لے کر اپنے اپنے گھروں کو پہونچے تو اوروں کی تو خبر نہیں، لیکن میں رات بھر روتی رہی، جاگتی رہی ـــــ جاگتی رہی، روتی رہی ـــــ

کیا اب میں ساحر صاحب کو کبھی نہیں دیکھ پاؤں گی ـــــ؟ کیا اب میں اس عظیم انسان کی پیاری پیاری باتیں کبھی

نہیں سُن پاؤں گی ۔۔۔ "عجیب اتفاق ہے کہ میں نے امریکہ سے اپنے میاں کو ایک خط میں لکھا تھا کہ" ہندوستان پہونچنے کے بعد اب میں ساحر کے گھر بہت جایا کروں گی، کیوں کہ مجھے اپنی کتاب شروع کرنی ہے ۔" ساحر صاحب کی زندگی ہی ختم ہوگئی اب وہ کتاب کبھی شروع نہیں ہوگی کیوں کہ وہ کتاب میں جس پیاری شخصیت کو اپنے ہاتھوں پر زنٹ کرنا چاہتی تھی وہی نہیں رہی ۔ ! ساحر صاحب جانتے تھے کہ میں اُن کی شاعری کی دیوانی ہوں ۔۔۔ "تلخیاں" کا نیا ایڈیشن آیا تو انہوں نے پہلی کاپی مجھے تحفہ دی ۔ " واجدہ کے لئے ۔ خلوص اور محبت کے ساتھ ۔ پہلی کاپی ۔" ساحر

میرے میاں نے محبت بھرا اعتراض کیا ۔" ارے واہ ساحر صاحب، ہم کیا آپ کے کم دیوانے ہیں ۔۔۔ یہ تو آپ نے ظلم کردیا ۔" ساحر صاحب نے فوراً میرے ہاتھ سے کتاب لی اور آگے جملہ بڑھا دیا ۔۔۔ " واجدہ اور اشفاق دونوں کے لئے ۔ آدھی کتاب ۔۔۔ ! وہ میرے میاں کو بھی بے حد چاہتے تھے ۔ اُن دنوں اشو کو اُن کی پوری کتاب "تلخیاں" زبانی یاد تھی کئی سالوں بعد اُن کی کتاب کا ایسا ہی واقعہ ہوا ۔ ذہانت کا یہ عالم کہ نئی کتاب پر زنٹ کی تو لکھا ۔" اشفاق اور واجدہ کے لئے ایک بار پھر آدھی آدھی کتاب ۔" خلوص سے ساحر (حالانکہ دونوں کتابوں کو پر زنٹ کرنے میں کوئی دس بارہ سال کا وقفہ تھا)

ساحر صاحب سے پہلی ملاقات حیدرآباد دکن میں ہوئی ۔۔۔ اُن دنوں اختر بھائی (جاں نثار اختر) سے میری خط و کتابت شروع ہوئی تھی اور میرے گھر میں ہنگاموں کا باعث بنی ہوئی تھی میں ایک برس کی تھی تبھی امی کا انتقال ہو گیا تھا ۔ تین برس کی ہوئی تو بھیا بھی ختم ہو گئے ۔۔۔ ہم چار بہنوں اور چار بھائیوں کو نانی اماں نے پالا ۔۔۔ نانی اماں کچھ بھی پڑھی لکھی نہیں تھیں بڑی مشکلوں سے انہوں نے زمینات کے کاغذات پر، کورٹ کچہری کے مرحلوں کے لئے، صرف اپنا نام اردو میں لکھنا سیکھا تھا، لیکن ہم سب بہن بھائیوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بے حد غربت کے باوجود دلوائی کہ تعلیم کی اہمیت سے بخوبی واقف تھیں ، لیکن حد درجہ پرانے خیالات کی تھیں ۔۔۔ پردہ خود بھی کرتی تھیں ہم بہنوں کو بھی لازم تھا اُن دنوں ہنگاموں کی وجہ میری ذات اور اختر بھائی سے خط و کتابت تھی ۔۔۔ کیوں کہ جب حیدرآباد میں مشاعرے کا اعلان ہوا اور ساتھ ہی اختر بھائی کی آمد کا بھی ۔ تو میں نے بھی گھر میں اعلان کر دیا کہ " میں اختر بھائی سے ملوں گی ، چاہے جو بھی حشر ہو ۔۔۔ "

بہر حال وہ ایک الگ داستان ہے ۔۔۔ لیکن میں ساحر صاحب سے اختر بھائی کے ساتھ ہی ملی ۔۔۔ جب کسی نے میرا تعارف کروایا تو ساحر صاجب نے سر سے پیر تک مجھے ذرا حیرت سے دیکھا اور کہا ۔ " آپ تو بالکل بچی سی لگتی ہیں ۔ اتنی بچی کہ " آپ " کہتے بھی جھجک محسوس ہوتی ہے ۔۔۔ "

یہ بات آج سے کوئی ۲۵ ، ۲۶ سالوں پہلے کی ہے اور اس وقت میں اتنی دبلی تھی کہ کوئی بھی نیا ملنے والا مجھے ہائی اسکول میں پڑھنے والی بچی ہی سمجھتا ۔۔۔ جبکہ کہانیاں بقول شخصے " ایسی پکی پکی اور فن میں جدت پیدا کرنے والی " لکھ چکی تھی کہ لوگ بڈھی نہیں تو ادھیڑ ضرور سمجھتے ۔۔۔ اُن دنوں میں اپنے ایم اے کے اگزام کی تیاری کر رہی تھی

" تو پھر آپ ۔۔۔ تم ہی کہئے نا ۔" میں نے ہنس کر جواب دیا ۔ بھئی ادیب ہو تو مخاطب تو عزت سے ہی کرنا چاہئے نا ۔۔۔ " انہوں نے بے حد اپنائیت سے کہا ۔۔۔ (لیکن بعد میں ہمیشہ بے حد شفقت سے چھوٹی سمجھ کر تم ہی کہا)

اُس کے بعد میں ساحر صاحب سے بمبئی میں اپنی شادی کے بعد اپنے شوہر اشفاق کے ساتھ ہی ملی اور بے حساب بار ملی۔

— مجھے اور اشو کو ذرا وقت ملتا ہم سیدھے ساحر صاحب کے یہاں پہونچ جاتے — ساحر صاحب کے ہاں بے حساب دعوتیں ہوا کرتیں — فلمی لوگوں میں بڑی سے بڑی شخصیت اُن کے ہاں موجود — میں ان پارٹیز میں بہت کم جاتی — خدیجہ آپا (بیگم جاں نثار اختر) ہنس ہنس کر جوک سناتیں —

"ارے واجدہ تم کو پتہ ہے ساحر صاحب مہمانوں کی لسٹ بنوا رہے تھے — واجدہ تبسم کا نام لکھوا کر کہنے لگے — آگے قوسین میں یہ بھی لکھ دو کہ "آنہ پائے گی — یا تو بچہ ہونے والا ہوگا — یا ہو چکا ہوگا —" اِس میں کچھ حقیقت بھی تھی — اتنی جلدی جلدی ۵ بچے اللہ کی مہربانی سے ہوگئے کہ واقعی کہیں جانے آنے کا وقت ہی نہ ملتا — ساحر صاحب اس بات پر میرا بیحد مذاق بناتے — میرا بڑا بچہ ۴ ـ ۶ مہینے کا ہوا تو میں اُسے ساحر صاحب کے ہاں لے گئی — جاتے ہی میں نے اُسے ساحر صاحب کی گود میں ڈال دیا اور کہا —

"ساحر صاحب اب یہ زندگی بھر فخر کرے گا کہ کس بے پناہ شاعر نے اُسے گود کھلایا ہے —"

اور واقعی وہ — (سراج الدولہ) فخار آج بھی ذکر آئے تو بیحد خوش ہوتا ہے اور فخر محسوس کرتا ہے —

جب تک دو ہی بچے تھے تو میں کبھی کبھار دونوں کو ساحر صاحب کے ہاں لے کر چلی جاتی تھی — میرے بچے بچپن میں شریر نہیں تھے — دوسرے والے کا نام ٹیپو سلطان ہے — وہ دونوں صوفوں پر بڑے مودّب بن کر بیٹھ جاتے تو ساحر صاحب ان کے ناموں کی رعایت سے (سراج الدولہ ـ ٹیپو سلطان ـ) مذاق کرتے — "بھئی یہ انقلابی اور باغی حکمراں اسقدر چپ چاپ کیوں بیٹھے ہیں —"

کھانا کھلانے کا ساحر صاحب کو شوق ہی نہیں بلکہ "ہوکا" تھا — میں نے اتنی دریا دلی اور خلوص سے خاطر تواضع کرتے اپنی زندگی میں کسی کو بھی نہیں دیکھا — کئی بار ایسا ہوتا کہ جب میں اور میرے میاں ساحر صاحب کے ہاں پہونچے ہیں تو اُس وقت صرف انور ـ ماں جی اور ساحر صاحب ہیں — رفتہ رفتہ لوگ آنے شروع ہوئے — ایک حد یہ آجاتی کہ لگتا کسی فنکشن کے تیس تیس چالیس چالیس لوگ جمع ہوگئے — انور شامی کباب تل تل کر بھجواتی جا رہی ہے — اعلیٰ سے اعلیٰ شراب کی بوتلیں کھل رہی ہیں — دوسرے کئی اقسام کے Snacks بھی سرو کئے جا رہے ہیں ساحر صاحب خود کم پی رہے ہیں، دوسروں کو خوب پلا رہے ہیں — بیچ بیچ میں نوکر سے کہہ کر مزید شراب اور لوازمات منگا رہے ہیں اور ہنس ہنس کر کہہ رہے ہیں —

"اے بھئی اشو او کم کیوں — تم مسلمان کم سے کم کوک ہی پی لو —" پھر کبابوں کی پلیٹ سامنے کھسکا کر کہتے — "ارے بھئی کھاؤ — یہ تو حرام نہیں ہے نا — کھاؤ ناں جی کتنی بھی کھاؤ —" بیچ بیچ میں پنجابی بولنے کا موڈ اُن پر سوار ہو جاتا۔

رات کے گیارہ بارہ بجے تک تو مے نوشی ہی جاری رہتی — اس کے بعد پکڑ پکڑ کر ایک ایک کو زبردستی

کھانا کھلاتے۔ شعراء کے بارے میں عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ شاعری سنانے پر اُتاؤلے ہوتے ہیں۔ مرے جاتے ہیں کہ کوئی ہمیں سنے ــــ ساحر صاحب کے ہاں جب کبھی ادبی قسم کی محفل سج جاتی اور شعرا، مجبور ہوتے تو وہ ہر ایک سے بیحد فرمائشیں کر کر کے اُن کا کلام سنتے ــــ بیحد داد دیتے ــــ خود کبھی نہ سناتے۔ اگر حاضرین بیحد ہی اصرار کرتے تو ایک آدھ غزل سنا دیتے ــــ محفل میں جتنے بھی لوگ موجود ہوتے سب سے اصرار کرتے کہ کچھ نہ کچھ سنائیں ترنم نہ سہی تو تحت ہی میں سہی ــــ میرے میاں ماشاءاللہ خاصے بے سُرے ہیں، ترنم کی اُن کو چھوٹ مل جاتی، لیکن تحت میں کچھ نہ کچھ سنانا ہی پڑتا ــــ مجھ سے فرمائش کرنے سے پہلے ہمیشہ نئے مہمانوں سے مجھے یوں متعارف کرواتے ــــ

"آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ ادیبہ ہے اور صرف کہانیاں اچھی لکھتی ہے، جی نہیں ــــ ہماری یہ ادیبہ بیحد اچھی گلوکارہ بھی ہے۔"

جب میں شادی ہو کر پہلی بار بمبئی آئی تو سبھی شاعروں اور ادیبوں نے ہماری دعوتیں کیں ــــ ساحر صاحب نے بھی کی اور حسب عادت محفل سجی تو یہاں کے تمام شعرا، نے اُن کی فرمائش پر اپنا اپنا کلام سنایا ــــ شاید یہ ساحر صاحب کی ہمیشہ سے ہی عادت رہی ہوگی کہ سبھی سے کچھ نہ کچھ گانے یا اشعار سنانے کی فرمائش کرتے ہوں گے ــــ بہر حال اس دن اُنہوں نے مجھ سے بہت کہا ــــ

"بھئی اب واجدہ گائے گی ــــ یا کچھ اشعار سنائے گی ــــ" میں نے ساحر صاحب کا ہی ایک بے حد خوبصورت گیت ؎

چاند مدّھم ہے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

اُسی ٹیون میں سنایا جیسے "ریلوے پلیٹ فارم" فلم کے لئے یہ ٹیون کیا گیا تھا۔ (پتہ نہیں اتنا خوبصورت گیت کیوں اُس فلم سے کاٹ دیا گیا تھا۔) میں نے یہ گیت سنایا اور تالیوں کا بے پناہ شور اُٹھا ــــ ساحر صاحب حیران سے ہو کر کہنے لگے

"واجدہ تم فلموں میں پلے بیک دینا شروع کر دو ــــ! میں تمہیں چانس دلواؤں گا ــــ بھئی بڑا ہی اچھا گاتی ہو یہ بات میں نے بطورِ خاص اس لئے لکھی ہے کہ اکثر لوگوں کو ساحر صاحب سے یہ شکایت رہی کہ وہ کسی کو آگے بڑھنے نہیں دینا چاہتے تھے نہ کسی قسم کی ہلپ نہیں کرتے تھے۔ میں کتنے میوزک ڈائرکٹروں کے نام گنواؤں جو صرف ساحر صاحب کی وجہ سے آج TOP پر ہیں!) جب میں شادی ہو کر بمبئی جیسی فلم نگری آرہی تھی تو میرے بھائیوں نے جو میری آواز سے پہلے ہی خوف زدہ تھے، مجھے بتا دیا تھا کہ "اگر تم نے بمبئی جا کر فلموں میں گانے وغیرہ گائے تو سمجھ لینا کہ تم ہمارے لئے مر گئیں اور ہم تمہارے لئے ــــ"

تو ظاہر ہے مجھے فلموں میں پلے بیک وغیرہ تو کیا دینا تھا لیکن اُس دن کے بعد سے یہ ضرور ہوا کہ ساحر صاحب کے یہاں کی کوئی بھی محفل میری آواز کے بغیر ادھوری ہی مانی جاتی ــــ اور حد ہے میری "ساحر پرستی" کی کہ میں نے زندگی

میں ساحر صاحب کے یہاں اس گیت کے علاوہ کبھی اور کوئی گیت نہیں گایا۔ یا پھر ساحر صاحب کی ہی کوئی غزل سنائی تو سنائی — اس گیت سے متعلق ایک بے حد مزے دار لطیفہ بھی ہوا — دہلی میں ہی ایک مشاعرہ غالباً ۱۹۶۱ء میں ہوا — ہم بھی گئے تھے — ساحر جب ڈائس پر آئے تو لوگوں کا یہ شور فرمائش لئے اٹھا

چاند مدّھم ہے —

چاند مدّھم ہے —

ساحر صاحب نے بحد سنجیدگی اور متانت سے عوام کو بتایا — "جملہ حقوق واجدہ تبسم محفوظ ہیں"۔

اور پھر واقعی سنایا بھی نہیں۔

بہر حال میں ذکر کر رہی تھی اُن کے کھلانے پلانے کے شوق کا — اتنا کھلاتے کہ حد باقی نہ رکھتے — مجھے شامی کباب بے حد پسند ہیں — ہمیشہ اپنی کرسی سے اُٹھ کر میری کرسی کے پاس آکر اپنے ہاتھ سے میری پلیٹ میں کباب ڈالتے — میں کہتی ساحر صاحب کھڑے رہنے کا بھی دم نہیں اب تو"

کہتے — "تو یہیں سو جاؤ" — یہ عجیب بات ہے کہ میرے اور اشفاق کے کتنے رشتے دار بمبئی میں ہیں۔ ہم کبھی اپنے گھر کے علاوہ کسی کے گھر کبھی نہیں سوئے، لیکن ساحر صاحب کے یہاں دو تین بار سوئے — ہوتا یوں کہ ایک ایک کرکے سارے مہمان چلے جاتے، ساحر صاحب ہمیں روکتے جاتے — "ارے بھئی جو ہو سے سانتا کروز کون سا دور ہے — اتنا قریب ہے — جلدی کیا ہے" — پھر ہنس کر کہتے — "کیوں اشفاق صاحب"—؟؟

اس قریب قریب کے چکّر میں تین چار بج جاتے — پھر اندر کو آوازیں لگانے لگتے۔

"بھئی اِن اشّو اور دَبّو کے لئے کمبل، چادریں اور تکیوں کا بندوبست کردو" — اور خود بڑے مزے میں اپنے کمرے میں جا کر سو جاتے — انور مسکراتی ہوئی، نیند کے باوجود مستعدی سے ہمارے سونے کا انتظام کرتی، صبح بھی ناشتے کے بعد ہی آنے دیتے —

میں کہتی "ساحر صاحب قسم سے ایسا لگتا ہے کہ رگوں میں خون کے بجائے آپ کا نمک دوڑ رہا ہے"۔ تو ذرا بدمزہ ہو جاتے، تعریف سے دنیا میں ہر انسان خوش ہوتا ہے، خود خدا بھی خوش ہوتا ہے۔ ساحر صاحب بھی انسان ہی تھے، لیکن، کھلانے پلانے کے بارے میں میری تعریف کے اس انداز سے وہ خوش نہیں ہوتے تھے — ہمیشہ کہتے تھے۔

"ارے بھئی کوئی انسان آئے۔ دو گھڑی بیٹھے۔ باتوں میں وقت نکلتا ہی چلا جائے تو کیا بھوکا ہی جانے دیں"۔ میں نے ساحر صاحب کے دسترخوان (بائبل) سے ایسے ایسے نمک حلالوں کو بھی کھاتے دیکھا ہے جو ان کے فلیٹ کے دروازے سے باہر ہوتے ہی اُن کی بُرائیاں شروع کر دیتے — لیکن ساحر صاحب انھیں بھی اتنے ہی خلوص اور محبت سے کھلاتے جتنا اپنے کسی عزیز ترین دوست کو — (انھیں پتہ تھا کون کون ان کی غیبت کرتے ہیں —)

ہمدردی

ساحر صاحب نماز نہیں پڑھتے تھے۔ روزہ رکھتے بھی میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ قرآن شریف کیا پڑھتے ہونگے لیکن پھر بھی میں کہوں گی کہ وہ جنتی تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نورِ مجسّم کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھا ۔ "یا رسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان ۔ اسلام کیا ہے ۔" ؟

آپ نے فرمایا ۔ "میٹھی بات کرنا اور بھوکوں کو کھانا کھلانا ۔" ساحر صاحب میٹھی بات بھی کرتے تھے اور بھوکوں کو کھانا بھی کھلاتے تھے ۔ (چاہے وہ امیر ہوں یا غریب ۔) یعنی اسلام پر پوری طرح عمل پیرا تھے ۔

بعض لوگوں کو یہ شکایت تھی کہ ساحر صاحب میٹھی بات نہیں کرتے تھے ۔ ان کی باتوں میں تلخی ہوتی تھی ۔ کڑوا پن ہوتا تھا ۔ ممکن ہے جن لوگوں کو یہ شکایت رہی ہو وہ خود انہیں تلخ اور بد مزہ کر دیتے ہوں، لیکن میں نے انہیں کبھی تلخ یا بد مزہ گفتگو کرتے نہیں پایا ۔ اُن کی گفتگو کی ایک بڑی خاص خوبی یہ تھی کہ پھلجھڑیاں سی کھلاتے ہوئے چلتے تھے ۔ اکثر لوگ موضوعات کی کمی کی وجہ سے ایک ہی بات یا قصّے کو بار بار ریپیٹ کرتے ہیں، ساحر صاحب ہمیشہ نئی سے نئی بات کرتے ۔ محفل کو زعفران زار بنائے رکھتے ۔

مجھے ان لوگوں سے سخت نفرت محسوس ہوتی ہے جو محفل میں گندی گندی گالیاں بکتے ہیں ۔ خواتین کی موجودگی کا بھی لحاظ اور پاس نہیں رکھتے ۔ میں نے کئی تعلیم یافتہ اور معزز مردوں کو گالیاں بکتے سنا ہے، لیکن صرف ایک بار ۔ کیوں کہ دوسری بار پھر میں ایسے لوگوں کی محفل میں بیٹھی ہی نہیں اور میرے میاں کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ گالیوں سے مجھے بیحد چڑ ہے تو وہ بھی مجھے ایسی محفل میں لے جاتے ہی نہیں ۔ ساحر صاحب نے یہ بات میرے منہ سے سُن لی تھی ۔ کم سے کم میرے سامنے انہوں نے کبھی گالی نہیں بکی ۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ گالیاں دیتے تھے ۔ دیتے ہوں گے، میں نے کبھی نہیں سُنیں ۔ عورتوں کا وہ بے حد احترام کرتے تھے ۔ اُن کے ہاں سجنے والی محفلوں میں نہ کبھی کسی خاتون پر آوازے کسے گئے نہ شراب کے نشے میں آدابِ محفل بھولے گئے ۔ ویسے بھی یہ بات تھی کہ اُن کے غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود گھر میں "گھرپن" تھا ۔ انور اور ماں جی کی وجہ سے ایک گھریلو فضا بنی رہتی تھی ۔ شاعروں ادیبوں کی محفل میں انور بہت کم آکر بیٹھتی تھی، صرف کھلانے پلانے کے انتظام میں ہی لگی رہتی تھی، لیکن گھر میں ماں بہن ہونے سے کسی بھی آنے والی خاتون کو اجنبیت یا ڈر کا احساس نہیں ہوتا تھا ۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ مردوں کی محفل ایک طرف بیچ جاتی اور عورتیں ایک طرف ہو جاتیں ۔ اُن میں ماں جی بھی کبھی کبھار آکر بیٹھ جاتیں ۔ تھوڑی دیر کے لئے انور بھی آکے بیٹھتی لیکن پھر کسی نہ کسی کام سے اُٹھ اُٹھ کر جاتی رہتی ۔ ساحر صاحب بھی عورتوں کی محفل کی طرف پھیرے لگاتے رہتے اور مخصوص انداز سے مذاق کرتے رہتے

ساحر صاحب کے اللہ میاں سے ذرا "غیر دوستانہ" مراسم تھے ۔ میں کہیں بھی جاؤں نماز کا وقت ہو جائے فوراً پڑھ لیتی ہوں ۔ ایک بار اُن کے یہاں صاف فرش دیکھ کر یوں ہی کونے میں بغیر جانماز کے پڑھنے لگی کھڑے فرش پر مجھے نماز پڑھتا دیکھ کر بہت بھنّائے ۔ اس کے بعد سے ہمیشہ انور سے کہہ کے صاف چادر نکلوا کے دیتے تھے ۔ لیکن اللہ میاں سے کھٹ پٹ چلتی رہتی تھی ۔ ایک بار ان کے یہاں بہت بڑا ادبی فنکشن تھا ۔ بیحد لوگ ۔ لائٹ چلی گئی ۔ اتفاق سے میں اسی وقت نماز کے لئے چادر بچھا رہی تھی ۔ میں نے ساحر صاحب سے کہا ۔ دیکھئے نماز کی برکت ۔ میں

دعا کروں گی تو اُجالا ہونے گا انشاء اللہ" خدا کا کرنا، میں نے نماز ختم کی، واقعی لائٹ آنے کے لئے دعا کی اور لائٹ آگئی — میں نے ساحر صاحب کو ہنس کر مخاطب کیا —

" دیکھیے ساحر صاحب میں نے جا نماز تہہ کی اور لائٹ آگئی " ساحر صاحب برجستہ بولے — "تم نے جا نماز تہہ کی "تب" لائٹ آئی "

ٹیپو بچپن میں بے حد بیمار رہتا تھا — ساحر صاحب ہمیشہ اس کی خیریت پوچھتے تھے —

" اب اللہ کے فضل سے بہت اچھا ہے "

" اور بیمار کس کے فضل سے ہوا تھا "؟ وہ ہنس کر پوچھتے —

ساحر صاحب کے یہاں سبھی لوگ بے گنتی بار جاتے — وہ خود بہت کم کسی کے گھر جاتے — ایک بار میرے گھر آئے تو خوب سارے بچے ماشاء اللہ میرے آس پاس بکھرے ہوئے تھے —

" کیسی ہو بھئی — " انہوں نے ہنس کر پوچھا

" اللہ کا فضل ہے ساحر صاحب

انہوں نے بچوں پر نظریں گھمائیں اور زور سے ہنس کر بولے " اللہ کا فضل تو میں ضرورت سے زیادہ ہی دیکھ رہا ہوں "

مجھے ان کے آنے پر سخت حیرت تھی — بولے " بھئی بچے تو پیدا کر لئے — اب ایک آدھ فلمی کہانی پیدا کرو " پھر تفصیل سنانے لگے کہ " ایک پروڈیوسر ہیں وہ خالص مسلم سوشل فلم بنانا چاہتے ہیں — ممبئی کی زبان میں کوئی دھانسو کہانی لکھو جس میں قوالیوں غزلوں اور میوزک کی خوب گنجائش ہو — کہانی تمہاری ہوگی۔ ظاہر ہے گیت، غزلیں قوالیاں ساحر کی — " اختر بھائی بھی اُس دن ساتھ تھے — بہر حال میری بد نصیبی کہ ساحر صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ نہ مل سکا — بقول ساحر صاحب کے، " اللہ کے فضل " کی زیادتی کی وجہ سے فلموں میں آج تک بھی انٹری نہ ہو پائی — اب چاہے کبھی بھی ہو، وہ بات ہی اور ہوتی کہانی واجدہ تبسم، مکالمے واجدہ تبسم — گیت ساحر لدھیانوی —

ایسا پیارا شاعر، ایسا عظیم گیت کار، ایسا فی البدیہہ اور IMPROMPTU ذہن —

ساحر صاحب کے ہاں فراق گورکھپوری آئے ہوئے تھے — فراق صاحب مجھ سے بیحد محبت کرتے تھے — کبھی آتے، کہیں ٹھہرتے، بھلے ساحر صاحب کے یہاں — یا نگم صاحب کے یہاں — مجھے ضرور اطلاع دلواتے — بُلاتے — کھانا پینا — (پینا زیادہ) زوروں پر چل رہا تھا — سب بڑی ترنگ میں تھے — میں نے فراق صاحب سے کہا — " فراق صاحب پڑھتی بہت ہوں، تجربہ کبھی نہیں ہوا سننے کا، کہ شاعر لوگ فی البدیہہ شعر بھی کہہ سکتے ہیں — میں تو تب مانوں کہ آپ مجھ پر کوئی شعر ابھی اور اسی وقت کہیں —

ابھی میری بات میرے منہ میں ہی تھی کہ فراق صاحب نے فوراً کہا —

تبسّم سے حماقت ہو گئی ہے ___

ساحر صاحب نے دوسرے لمحے مصرعٔ لگایا ؎

اُسے جس پر ندامت ہو گئی ہے!

کھانا لگا تو میں نے سب سے پہلے چاول لئے ___

عصمت آپا مجھ موٹاپے پر ہمیشہ ٹوکتی رہتی ہیں لیکن سلطانہ آپا دو قدم آگے ہی ہیں ___ مجھے چاول مت کھایا کر۔ زیادہ موٹی ہو گئی تو اشفاق گھر سے نکال پھینکے گا "

میں ہنس کر بولی ___ " آپا چاول تو میں کبھی نہیں چھوڑنے والی ___ میں اپنے ہر انٹرویو میں پسندیدہ چیزوں میں چار ہی چیزیں تو لکھواتی ہوں ___ اشو۔ بچّے۔ لپ اسٹک اور چاول ___ اور یہ دیکھئے میری پسند جو چاول ہے نا تو کیسی نادر اور بے مثال ہے کہ یہاں فراق صاحب، ساحر صاحب۔ سردار بھائی۔ اختر بھائی۔ کیفی صاحب جیسے شعرا موجود ہیں، کوئی بھی مجھے چاول کا قافیہ بتا دے تو میں مانوں "

اب سب، اور سب سے زیادہ فراق صاحب اور ساحر صاحب چاول کا قافیہ ڈھونڈ رہے ہیں ___ ہراول۔ رساول۔ حد یہ کہ بھساول تک سوچا گیا۔ مگر خود ہی رد کرتے گئے۔ اس کے بعد جب کبھی ساحر صاحب سے ملاقات ہوتی تو یہ بات ضرور نکالتے اور ہنس کر کہتے ___

" ارے بھئی واجدہ ___ ہم اور فراق صاحب کوشش میں لگے ہوئے ہیں تمہارے چاول گلانے کی ___ "

یہ اعلیٰ ظرفی تھی ___

کسرِ نفسی میں بھی ان کا ثانی کوئی نہ تھا۔

شراب پی کر ترنگ میں تو سبھی لوگ ہو جاتے ہیں۔ قے کریں گے غلاظت کریں گے وہ الگ ___ زبانی اول فول کا تو حساب ہی نہیں ___ ہم گنہ گار میاں بی بی کو ایسے پارساؤں کی محفلوں میں جانے کے ہزاروں موقعے ملے ساحر صاحب کی ہی نہیں، اور بھی کئی محفلوں میں ___ لیکن میں اپنی زندگی میں ساحر صاحب کو آؤٹ ہوتے نہیں دیکھا ___ کتنے بھی پیگ پی لیتے وہ کبھی نہ بہکتے ___ ہاں باتوں کی رفتار میں تیزی اور بہتات ضرور آجاتی۔ قصہ پر قصہ سناتے چلے جاتے ___ لیکن محفل میں موجود خواتین سے کبھی بدتمیزی یا بے ہودگی نہیں کی ___ ایکبار شعراء کی پینے کی محفل اتنی دیر چلی کہ وہ سب لوگ اکتا گئے جو شراب نہیں پیتے تھے، بھوک سے بے حال ہونے لگے ___ انور سخت پریشان کہ بھائی جان کہیں تو کھانا لگاؤں ___ میں نے انور سے کہا " انور تو کھانا لگا دے، ساحر صاحب کے ہاتھ سے گلاس میں رکھوا دوں گی "

انور ڈر کے بولی ___ " نہیں آپا۔ بھائی جان غصہ ہو جائیں گے، آپ کو کچھ کہہ دیں گے تو مجھے بھی بُرا لگے گا ___ "

میں ساحر صاحب کے پاس گئی ــــ وہ گلاس اٹھا کر منہ تک لے جا رہے تھے ــــ میں نے کہا " ساحر صاحب شراب کا پینا تو حرام ہے ہی، چھونا بھی حرام ہے، ورنہ ابھی آپ کے ہاتھ سے یہ گلاس خود لے کر پھینک دیتی ــ آپ کا یہ چھٹواں گلاس چل رہا ہے۔ آخر اور کتنی پئیں گے ــ آخر ہمیں بھی تو بھوک لگی ہے ــ"

ساحر صاحب نے بہت غور سے مجھے دیکھا۔ گلاس میز پر واپس رکھ دیا۔ جھومتے ہوئے اٹھے اور بولے ــ ٹھیک کہتی ہے ــ روٹی بھی تو کھانا ہے انّوا ــ تین ــ چلو کھانا کھا لو ــ'

جب گھر میں مرد زیادہ ہوتے اور صرف میں۔ انّو اور ساں جی ہوتیں تو ساحر صاحب ہم تینوں کو ہمیشہ خوا ــ تین کہتے اور خود ہی بیحد انجوائے کرتے ــ اپنے بعض جوکس وہ دوسروں سے زیادہ خود انجوائے کرتے ــ ایک بار پاکستان سے ایک مشہور شاعر آکے ساحر صاحب کے مہمان ہوئے۔ کافی دن ٹھہرے ــ سبھی کی دعوتیں کرتے تھے وہ، پاکستانی شاعر کی تو بہت ہی خاطریں ہوئیں ــ ان کے اعزاز میں جو ایک شاندار دعوت کی تو بمبئی کے ادیبوں شاعروں کے علاوہ بہت سارے فلمی لوگ، بزنس مین وغیرہ بھی آئے ــ مہمان شاعر نے خوب شراب پی۔ خوب قے کی، بے حد غلاظت کی، خوب کھانا کھایا۔ اور سب سے آخیر میں بے حد شاعری سنائے جا رہے ہیں۔ غزل پیچھے غزل، غزل پیچھے غزل، سارے مقامی مہمان چلے گئے، بس صرف میں انّو اور گھر والے رہ گئے۔ اس دن بھی ساحر صاحب نے ہمیں گھر واپس نہیں آنے دیا۔ مہمان شاعر ذرا سا چھٹکارا پا کر ہمارے کمرے میں آئے اور بیحد مزے لے کر ہنس ہنس کہہ رہے ہیں۔

"کم بختوں کو اپنے گھر ٹھہراؤ، شراب پلاؤ، کھانا کھلاؤ غلاظت سمیٹو۔ اوپر سے شاعری سنو"!!

ہر انسان میں خامیاں ہوتی ہیں ــــ بے عیب ذات اُس پاک پروردگار کی ہے، ساحر صاحب میں بھی خامیاں رہی ہوں گی لیکن وہ مجھے کبھی نظر نہیں آئیں اور اس لئے نظر نہیں آئیں کہ انہوں نے اتنی محبت اور شفقت مجھے دی کہ اس میں نفرت کو کھوجنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا ــــ ورنہ ساحر صاحب سے میری کبھی ذرا تو کھٹ پٹ ہوتی ــــ ماشاءاللہ سے بمبئی میں آج جتنے بھی ادیب شاعر ہیں تقریباً سب سے میں جھگڑ چکی رہ اور بات ہے کہ مل بھی چکی ــ) لیکن جب میں یہ کہتی ہوں کہ میں لڑ چکی تو مطلب یہ کہ جوابی کارروائی بھی تو ہوئی ہی ہوگی ــ چلئے یہ بھی مانا کہ زیادتی میری طرف سے ہوتی ہوگی، تب بھی دوسری پارٹی بھی تو تھوڑی بہت جنگجو رہی ہوگی ــ! یہ عجیب و غریب بات ہے کہ ۲۳ سال بمبئی میں رہنے کو پورے ہوئے بفضلِ خدا چوبیسواں لگ جائے گا ــــ بیس سالوں میں ساحر صاحب سے ایک دفعہ بھی خرابی نہیں ہوئی ــ لڑائی تو دور کی بات ہے ــ

جو بھی لوگ ساحر صاحب کو ان کی زندگی میں بُرا کہتے رہے اور خاص طور سے میرے سامنے بُرا کہتے رہے، میں نے ان سے یہی بات کہی ــ

"ایک شخص جس نے نہ شادی کی، نہ بیوی کی قربت میسر آئی نہ ازدواجی زندگی کا سکھ دیکھا، نہ بچوں کی جنت کے مزے لوٹے، اس کی محرومیوں کے بارے میں بھی تو سوچو ــــ اگر یہ شخص اپنی ہی تقدیر لکھنے پر قادر ہوتا ــــ

اپنا کاتب تقدیر آپ ہوتا تو ہر مرد، ہر عورت، ہر انسان، اپنے آپ کو بے حد خوبصورت بناتا بیحد تعلیم یافتہ بناتا، بیحد امیر بناتا۔ بیحد اچھا جیون ساتھی چُنتا، خوب اولاد، خاص طور سے بیٹے اپنے لئے چُنتا، لیکن ہم سب کسی اور کے قلم کا لکھا پورا کر رہے ہیں۔ اچھے سے کر رہے ہیں یا بُرے سے کر رہے ہیں بہر حال زندگی کو گذار رہے ہیں تو کتنے عظیم ہیں وہ لوگ جو اپنی محرومیوں کے باوجود دوسروں کے لئے جیئں۔"

ساحر صاحب اپنے لئے کیا جیے۔۔۔؟ وہ تو ہمیں لوگوں کے لئے جیئے۔ عوام کے لئے جیئے۔ سب کے لئے جیئے۔ اپنے دل کا خون قلم کی نب میں سیاہی کی جگہ لگا کر، ہم لوگوں کے لئے ہی لکھتے رہے۔ آج بھی ان کے گیت، ان کی غزلیں ان کے نغمے احساس دلاتے ہیں کہ وہ ہمارے تھے، ہمارے ہی رہیں گے۔

تین سال پہلے ساؤتھ امریکہ کی اس خون رلا دینے والی، ٹھنڈی، برفیلی اور بے رحم رات کے پچھلے پہر تک میں روتی رہی۔

وہ صاف ستھرا انسان، جو انتہائی اعلیٰ نفیس اور صاف لباس زیبِ تن کرتا تھا، آج منوں مٹی اور دھول کے انبار تلے دبا پڑا ہوگا۔ جسکے محل نما فلیٹ میں فانوس جلتے تھے آج اس کی قبر پہ کسی نے ایک چراغ بھی روشن کیا ہوگا؟ وہ ہمیشہ لوگوں کے ہجوم میں گھرا رہتا تھا، کیا آج اکیلا ہی سویا پڑا ہوگا۔۔۔؟

کھڑکی کے شیشے سے میں نے جھانک کر دیکھا

آسماں چُپ تھا۔۔۔ چاند تھا ہی نہیں۔۔۔ چاند کو ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔۔۔ آج وہ جگمگاتا چاند منوں مٹی کے نیچے ڈوب گیا تھا جو برسوں سے دلوں کے تاریک آسمانوں پر اپنی کرنوں سے اُجالے بکھیرے ہوئے تھا۔۔۔

انارکلی سے پرچھائیاں تک

سی۔ ایل۔ کاوش

لاہور میں انارکلی کے باہر نگینہ بیکری تھی۔ اور موچی دروازے کے باہر منزل ہوٹل تھا۔ ساحر لدھیانوی سے پہلی ملاقات نگینہ بیکری میں ہوئی یا منزل ہوٹل میں یاد نہیں رہا لیکن اتنا یاد ہے کہ شورش کاشمیری نے مجھے ساحر سے ملاتے ہوئے کہا تھا "کاوش اِن سے ملو یہ ساحر ہیں"۔ میں نے دیکھا، ایک لمبا، چھریرا غلافی آنکھوں والا خوبصورت لڑکا میرے سامنے کھڑا تھا ہم نے ہاتھ ملا کر ایک دوسرے کو تولا کہ شاعری کا وزن کتنا ہے۔ وہ لڑکا مجھے شاعر سے زیادہ شرمیلا جان پڑا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ میری طرح منجھولے قد کا نہیں لمبے قد کا ہے۔ پھر غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس کی ناک بھی لمبی ہے۔ اُس وقت فیصلہ نہیں کر سکا کہ ساحر کا قد لمبا ہے یا اس کی ناک لمبی ہے۔

تھوڑے دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ ساحر کے قد سے اس کی ناک زیادہ لمبی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ جن کی ناک لمبی ہوتی ہے وہ ٹوٹ تو سکتے ہیں لچک نہیں سکتے۔

لمبی ناک اکثر دوسروں سے ٹکرا جاتی ہے۔ ساحر کی ناک سب سے پہلے اپنے گھر میں ٹکرا گئی۔ ساحر جاگیردارانہ خاندان کا فرزندِ ارجمند ہے۔ اور جاگیرداروں کی ناک اپنے مزارعوں کے سامنے تو ان دنوں بہت لمبی رہتی تھی لیکن انگریزوں کی چوکھٹ پر گھستے گھستے انگریزوں کے رنگ کی ہو چکی تھی۔ ساحر کا باپ اس کی ماں پر گیارہ سوتیں لا چکا تھا۔ ساحر کی ناک پہلے پہل اپنے باپ سے ٹکرائی! اور ساحر نے اس روایت کو ٹھکرا دیا کہ بیٹا باپ کی جاگیر کا وارث ہوتا ہے۔ اس نے صرف اِس روایت کو قبول کیا کہ ماں کے پاؤں میں جنت ہوتی ہے اور اس روایت پر وہ آج تک قائم ہے۔ وہ ساری دنیا کی مخالفت کر سکتا ہے۔ اس کی ناک ہر جگہ اونچی رہ سکتی ہے لیکن ماں کے سامنے ساحر کی ناک ہمیشہ ہی کچھ چھوٹی جان پڑتی ہے۔

دوسری بار ساحر کی ناک لدھیانہ گورنمنٹ کالج کے اربابِ بست و کشاد سے ٹکرا گئی اور ٹکراتی کیسے نہیں

انگریزوں کا زمانہ لیڈروں کی بھرمار، چاروں طرف انقلاب زندہ باد کے نعرے دلوں میں آزادی کی تڑپ، دماغوں میں جلیان والا باغ کا حادثہ محفوظ اور زبانوں پر یہ گیت "نہیں رکھڑیں، نہیں رکھڑیں، اے ظالم سرکار نہیں رکھڑیں۔" — واقعہ یوں ہوا — کہ

کرتار سنگھ سرابہ ایک انقلابی شہید تھا۔ نوجوانوں نے اس کا شہیدی دن منایا۔ اس کے گاؤں سرابہ ضلع لدھیانہ میں جوان پہنچے۔ ساحر بھی گئے۔ انہوں نے نظم پڑھی۔ کالج والوں نے ساحر کو کالج سے نکال باہر کیا۔ ٹوڈیوں نے سمجھا کہ ساحر کی ناک نیچی ہوگئی۔ لیکن آزادی کے پرستار شاعروں نے ساحر کی ناک پر قصیدے کہے — اور لدھیانہ گورنمنٹ کالج کی ناک دیال سنگھ کالج لاہور کے اربابِ اقتدار نے ساحر کو کالج میں داخل کر کے یکسر کاٹ ڈالی۔

شری پربودھ چندر اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے پریذیڈنٹ تھے۔ کرشن چندر، مہندر ناتھ، اندر گجرال سب ان کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ سیاسیات ان طلبا کا شغل ہوتا تھا۔ پربودھ مشہور کانگریسی لالہ پنڈی داس کے داماد تھے۔ میکلوڈ روڈ پر دیرا ہوٹل انہی کا تھا۔ پربودھ چندر دیکھنے میں بھولے بھالے معصوم سے نظر آتے تھے مگر انگریزی سرکار کے لئے بھڑ کا چھتہ تھے۔ لاہور کی پولس جہاں پربودھ کو چھیڑتی تو لاہور کے سب کالجوں کے لڑکے بھڑوں کی طرح حملہ کر دیتے اور انگریزی سرکار کی ناک سوج کر رہ جاتی۔ پربودھ کانگریسی نہیں تھے، ترقی پسند تھے۔ اور ان کے ساتھ کام کرنے والے سب ترقی پسند تھے۔ پربودھ کی دوستی تھی شورش کاشمیری سے۔ شورش کاشمیری لاہور کی ہر سیاسی تحریک کی ناک تھے بال بھارت سبھا سے لے کر نوجوان بھارت سبھا تک میں ان کی ٹانگ رہتی تھی۔ وہ ہر اُس جماعت کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے جو انگریز کے خلاف کام کرتی ہو۔ وہ اخبار نویسی میں مولانا ظفر علی خاں کے، خطابت میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری و مولانا ابوالکلام آزاد اور اردو ادب میں مولانا تاجور نجیب آبادی کے شاگرد تھے۔ ہر نوجوان اس کو پیار کرتا تھا۔ وہ شاعر تھے، ادیب تھے اور مقرر تھے۔ جس طرح لاہور کے ہندو، مسلمان اور سکھ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سننے جاتے تھے ویسے ہی شورش کی تقریر بھی سب کو پیاری تھی۔ ادبی پرچوں سے لے کر سیاسی اخبارات تک ان کے کلام کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر چھاپتے تھے۔ پربودھ کے توسط سے ساحر کی ملاقات شورش سے ہوگئی۔ شورش کے گھر چونکہ آئے دن پولس تلاشی کے وارنٹ لئے کھڑی رہتی تھی اس لئے انہوں نے انار کلی کے پیچھے پیسہ اخبار اسٹریٹ میں ایک کمرہ قانونی طور پر اپنے نام لے رکھا تھا تاکہ گھر تلاشی سے بچ جائے۔ اُسی کمرے میں ہم لوگوں کا جمگھٹ رہتا تھا یا کوئی سیاسی لیڈر باہر سے آکر وہاں ٹکتا تھا۔ ساحر کا ڈیرا بھی اسی کمرے میں لگ گیا — پیسہ اخبار اسٹریٹ کے پیچھے لاء کالج ہوسٹل تھا۔

رام پرکاش اشک لاہور میں قانون پڑھتے تھے اور لاء کالج ہوسٹل میں رہتے تھے۔ انھیں بھی شعر و شاعری کا شوق تھا۔ انہوں نے ایک نظم لکھی اور اپنے کسی دوست کے توسط سے اصلاح کے لئے ساحر کے پاس بھجوائی اور پھر ساحر اور اشک کے تعلقات استوار ہو گئے۔ اشک راولپنڈی کے کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا۔ ساحر کی دوستی اشک کے ساتھ لاہور سے لے کر بمبئی کے شمشان گھاٹ تک قائم رہی۔

انار کلی لاہور کا سب سے خوبصورت بازار تھا۔ امیروں کے لڑکے شام کو اس بازار میں گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ اور لاہور کی ماڈرن لڑکیاں بھی شام کو شاپنگ کے لئے اس بازار میں آتی جاتی رہتی تھیں۔ امرتا پریتم کے سسرال کی دُکان انار کلی بازار میں تھی۔ امرتا پریتم پنجابی زبان کی بلند پایہ شاعرہ اور ایک شعلہ جوالا تھی۔ جب کبھی وہ انار کلی میں آتی لوگوں کو سلیم کی انار کلی یاد آ جاتی اور کالج کے لڑکے گنگنانے لگتے:۔

" چیتے نوں چڑھ آئی جوانی "

اب ساحر لدھیانوی کا ایک پرانا گیت ہے۔

" پینگ بڑھائی دوشیزہ ترے آویزے لہرائیں"

امرتا پریتم کا گیت ہے:

پینگ چٹیندی مٹیارے
تیرے جھمکے ہلارے

دونوں گیتوں کا مخزن پنجاب کا دل ہے۔

ایک نے اردو میں کہا ہے ایک نے پنجابی میں۔ ایک مرد ہے ایک عورت۔

امرتا پریتم سنگِ مرمر کی تراشی ہوئی مورت تھی۔ اگر کسی سنگ تراش کی نظر پڑ جاتی اور وہ اس زمانہ کی اس مورتی کو مجسم کرکے رکھ دیتا تو آج رادھا کے نام سے مندروں میں پوجی جاتی۔ ساحر مورتی کار نہیں تھا شاعر تھا اور وہ بھی لمبی ناک والا۔ اس نے شاعری کی حدود کو کبھی پھلانگا نہیں۔ وہ کنوارا تھا۔ کنوارا ہے اور کنوارا ہی رہے گا۔

جس نظم سے ساحر مقبول ہوا وہ تاج محل ہے۔ میں نے یہ نظم پہلی بار لاہور کے بادامی باغ سے پرے جہانگیر کے مقبرے میں سنی تھی۔ مولا بخش مسجد شہید گنج کے ڈکٹیٹر کی شادی پر لال دین دفتری نے وہاں سب کو دعوت دی تھی۔ کھانے پینے کے بعد لوگ جہانگیر اور نورجہاں کے عشق کی داستان دُہرا رہے تھے۔

نورجہاں کا مزار بھی قریب ہی تھا جس پر تلوک چند محروم کی نظم ہے جس میں وہ کہتے ہیں:۔

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہے مگر یوں سیہ صحرا نہیں ہوتی

تب ساحر کی آواز گونجی۔

"میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے"
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

میں یہ نظم سن کر بھونچکا رہ گیا۔ جس طرح ساحر نے تاج محل کو دیکھا دنیا کے کسی انسان نے نہیں دیکھا۔ تاج محل میں نے اب تک نہیں دیکھا ہے اور ایمانداری کی بات یہ ہے کہ اس نظم کو سننے کے بعد دیکھنے کی خواہش بھی نہیں رہی۔ ساحر نے جب یہ بند پڑھا:

یہ عمارات و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستون
دامن دہر پہ اس رنگ کی گلکاری ہے
جس میں شامل ہے ترے اور مرے اجداد کا خون

سب سر دھننے لگے۔ تب مجھے جہانگیر کا مقبرہ، لاہور کی شاہی مسجد، حضوری باغ، شالا مار گارڈن جنہیں بادشاہوں نے تعمیر کرایا اور اپنی یادگار قائم کر گئے۔ مجھے اِن یادگاروں پر اپنے اجداد کے خون کے چھینٹے دکھائی دینے لگے۔

اس نظم کے بعد اگر ساحر کچھ بھی نہ لکھتا تو بھی اردو ادب کی تاریخ میں زندہ جاوید رہتا اور اس کی ناک سب شاعروں سے لمبی رہتی۔ لیکن استادانِ فن نے اس نظم کو سراہا نہیں۔ ترقی پسندی اور دقیانوسیت میں یہی فرق ہے۔ پرانی روایات کو بنا سوچے سمجھے پکڑے رہنا اور ناک سے آگے نہ دیکھنا مرے ہوئے لوگوں کا شیوہ ہے۔ یہ چلتی پھرتی لاشیں ہیں جو پرانے رستوں پر ماضی کی انگلی پکڑے ڈھینچوں ڈھینچوں چلی ...... جا رہی ہیں۔

قدامت پرستی راکھ ہے، مٹی ہے۔ وہ آپ کی مٹھی میں آجاتی ہے۔ آپ کو کچھ نظر آتا ہے تو مٹی یا راکھ لیکن ترقی پسند سورج اور چاند کی کرنیں ہیں۔ ان کو مٹھی میں کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ ترقی پسندی ہوا کی طرح محسوس کی جاتی ہے لیکن اس کا کوئی روپ نہیں ہے۔ ترقی پسندی ہر لمحے کو نیا پاتی ہے اور پھر جب وہ گزر جاتا ہے تو آگ سے اڑی ہوئی چنگاری سمجھ کر اس کا پیچھا نہیں کرتی۔

ساحر کا سارا کلام آپ پڑھ جائیے۔ آپ کو اس کے ہاں ایک خیال دوبارہ پڑھنے کو نہیں ملے گا۔ وہ بھاری پپوٹوں والی آنکھوں سے ہر چیز کو دیکھتا رہتا ہے۔ ظاہری ہیئت اسے متاثر نہیں کرتی۔ اسے حق کی تلاش رہتی ہے۔ جب وہ بات کو سمجھ لیتا ہے تب کہتا ہے اور پھر اس کے لئے ویسے ہی الفاظ تلاش کرتا ہے۔ ساحر عموماً پرانے شاعروں کی تشبیہات استعمال نہیں کرتا اور موقع کے مطابق ہو تو اس سے گریز بھی نہیں کرتا۔ بنگال پر جب پاکستان کے ظلم بڑھے تو اس نے کہا:

فوج حق کو کچل نہیں سکتی
فوج چاہے کسی یزید کی ہو
لاش اٹھتی ہے پھر علم بن کر
لاش چاہے کسی شہید کی ہو

اِس میں جو اسلامی اشارے ہیں وہ بنگال کی مظلومیت اور اس کی سچائی کے ساتھ کربلا کے حادثے کی یاد دلا دیتے ہیں۔
ساحر نے دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں جب بنگال میں قحط پڑا تھا اور لاکھوں لوگ بھوکے مر گئے تھے اس وقت

وہ لاہور میں تھا۔ اور اس نے نظم لکھی :۔

جہانِ کہنہ کے مفلوک فلسفہ دانو !
نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں

اس زمانے میں کرشن چندر نے ایک کہانی لکھی 'ان داتا'۔ ان داتا دنیا کے لٹریچر میں ایک عظیم کہانی تھی اس کا تاثر آج تک قائم ہے اور ساحر کی نظم کا تاثر بھی اسی طرح قائم ہے۔ انہی دنوں جگر مراد آبادی نے بھی بنگال پر ایک غزل کہی :۔

بنگال کے شام و سحر دیکھ رہا ہوں
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں
اِک ہائے پسِ پردۂ در دیکھ رہا ہوں
غیروں کی سیاست کا اثر دیکھ رہا ہوں

یہ نظم ساحر نے ہمارے سامنے کہی۔ "شاہکار" مولانا تاجور کا ادبی جریدہ تھا اور اردو ادب کی ناک سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں شورش کاشمیری شاہکار کے ایڈیٹر تھے۔ آخری کاپی پریس میں جارہی تھی ساحر نظم کہہ رہا تھا۔ ایک شعر باقی رہ گیا تھا۔ شورش نے ایک شعر کی جگہ دو لکیریں ڈال کر نظم کی کاپی بھی پریس میں بھجوادی۔ پرچہ چھپ کر باہر آیا تو دھوم مچ گئی۔ ساحر کی نظم اور ساحر۔

شام کو ہم لوگ احرار کے دفتر میں گئے تو شاہ جی (سید عطاء اللہ شاہ بخاری) نے کہا سنا بھئی وہ نظم سنا دو جو تم نے تازہ لکھی ہے۔ ساحر نے نظم شروع کی :

یہ شاہ راہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے

ساحر نے کہا۔ یہاں ایک شعر نہیں ہو سکا اور کہا۔ لکھو ساحر! شعر ہو گیا۔

چمن کو اس لئے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

شورش اچھل گیا ــــ ساحر نے اپنی گہری آنکھوں سے شاہ جی کی طرف دیکھا اور پھر اس شعر کو تبرک سمجھ کر اپنے کلام میں شامل کر لیا۔ میں سمجھتا ہوں اگر کوئی اور ہوتا تو اس کی انا کو چوٹ لگتی اور اس کی ناک کٹ جاتی۔ لیکن ساحر ترقی پسند ہے اس نے اس شعر کو من و عن اپنے دیوان میں شاہ جی کے حوالے سے شامل کر کے اپنی ناک اور لمبی کر لی۔

ساحر لاہور میں 'ادب لطیف' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ وہ ایک ایسا ادبی ماہنامہ تھا جس کا مدیر ہونا ادب کی معراج سمجھی جاتی تھی۔ ساحر جب اس پرچے کو ایڈٹ کرنے لگا تو بڑے بڑے ترقی پسند اس کے گرد چکر کاٹنے لگے۔ اور رام پرکاش اشک کو بھی ایڈیٹری کا شوق چرایا۔ اور اس نے شورش کاشمیری، جو ان دنوں شاہکار کو مرتب کرتے تھے ساحر کی دوستی کو استعمال کر کے

ادارۂ تحریر میں اپنا نام بھی شامل کرالیا۔ اور اپنی ناک ساحر کی ناک سے ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ شورش کچھ دنوں کے لئے لاہور سے باہر گئے، تو مضمون مولانا تاجور کے خلاف بھی لکھواکر کاتب کے حوالے کر دیا گیا ــــ وجہ اتنی ہوئی۔ مولینا نے شاید شورش کاشمیری سے کہا تھا کہ میاں شاہکار کے ادارۂ تحریر میں ادیب ہونے چاہئیں اور یہ دوست تو ادیب نہیں ہوتا۔ شورش نے اشک سے کہہ دیا کہ میں نے مولانا کو بڑی مشکل سے راضی کیا ہے۔

مولینا کا نام اس زمانے میں شاہکار کے سرورق پر نگراں کی حیثیت سے چھپتا تھا ــ جب شاہکار بازار میں آیا تو مولانا کو فوراً ان کے کسی دوست نے بتایا۔ مولانا ناراض مجھ پر ہوئے اور شاہکار سے اپنا نام ہٹالیا۔ اس زمانے میں شاہکار کے مالک حکیم شفاء الملک کے بیٹے انصاری تھے جو اردو کی معمولی شُد بُد رکھتے تھے۔ شورش اور اشک کا نام بھی حذف ہوگیا۔ بعد میں کسی نے کہا اس مضمون کے پیچھے ساحر کی ناک کام کر رہی تھی۔ ساحر جو اس زمانے میں ادب لطیف کے ایڈیٹر تھے ــــ لاہور میں ایسی ہنگامہ آرائیاں بہت ہوتی تھیں۔ حلقۂ ارباب ذوق تھا، حلقۂ ارباب علم تھا۔ اردو سبھا تھی۔ مولینا کہا کرتے تھے ان کے پاس ذوق کی کمی ہے۔ ان کے پاس علم کی کمی ہے۔ اردو سبھا میں سب لوگ شامل تھے۔ ترقی پسند اور استادانِ فن بھی ــــ ساحر چونکہ ترقی پسند کہلاتے تھے اس لئے کبھی کبھار حلقۂ ارباب ذوق میں شامل ہوتے تھے۔ آخری دنوں میں وہاں شاعر ابہام سے گزر کر اہمال تک جا پہنچے تھے۔ ساحر کی شاعری میں ابہام نہیں تھا وہ جو کچھ کہتا تھا صاف ستھرا کہتا تھا۔ دوسرے ترقی پسندوں کی طرح اس کا کلام پڑھتے ہوئے ذہن اور زبان کو کہیں ٹھوکر نہیں لگتی تھی۔ اندازِ بیان تو اچھا تھا ہی روانی بھی خوب تھی۔ لیکن پھر بھی استادانِ فن ادبی خامیاں پکڑتے رہتے تھے۔ مگر شاعروں میں ساحر کی ناک اونچی رہتی تھی۔ .... فیض احمد فیض اس زمانے میں پروفیسر تھے۔ مشاعرے والے فیض سے زیادہ نوجوان ساحر کو پسند کرتے۔

ساحر سیاسی داؤ پیچ بھی جانتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی پبلسٹی اسٹنٹ کے طور پر کوئی ایسی بات کر دیتے کہ ادبی حلقوں میں کنٹروورسی شروع ہو جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ساحر لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو پاتے تھے۔ اور ان کی ناک اور لمبی ہو جاتی تھی۔

۱۹۴۹ء میں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہوئی۔ ساحر بھی اس میں بلائے گئے۔ کانفرنس کا افتتاح سروجنی نائیڈو نے کیا تھا۔ وہاں سے واپس ہوتے تو بمبئی میں ٹک گئے۔ یہاں اُن کے ایک کلاس فیلو فلم بنا رہے تھے۔ "آزادی کی راہ پر" انہوں نے گانے لکھنے کی پیش کش کی اور ساحر مان گئے۔ اس فلم کا ایک گانا ساحر نے لکھا ــ "جاگ اٹھا ہندوستان" پھر چھابڑہ نے فلم شروع کی "دو راہا" اس کے گانے پریم دھون لکھ رہے تھے۔ ایک گانا ساحر نے لکھا ــ انل بسواس ان کے سنگیت کار تھے۔ ساحر کے بول تھے۔

"محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے"

فلمی دنیا میں تگ و دو اور کش مکش بہت ہے۔ ساحر نازک مزاج آدمی اس کش مکش کا عادی نہیں تھا لیکن لمبی ناک کو لے کر بھاگ جاتے تو ناک بچتی کیسے۔

اڑ گئے۔ کر کے جائیں گے یا مر کے جائیں گے۔

چیتن آنند "افسر" نام کی فلم بنا رہے تھے۔ نریندر شرما ان کے گانے لکھ رہے تھے۔ نریندر شرما نے چیتن آنند سے ساحر کے گانے کی سفارش کی۔ لیکن ساحر اس فلم سے اپنی ناک بچا کر نکل گئے۔

مجاز بھی بمبئی میں تھے اور ساحر، مجاز دونوں کورلاج ورسوا میں رہتے تھے۔ دونوں اونچے درجے کے شاعر تھے۔ مگر فلم میں کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ آخر مجاز بمبئی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ساحر نے شکست نہیں مانی۔

'افسر' کے زمانے میں ایس ڈی برمن سے ملاقات ہو چکی تھی۔ ایس ڈی برمن نے کاردار کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ فلم کے نوجوان ڈائرکٹر تھے۔ منیش کول۔ کمپنی نے اور سنگیت کار نے طے کیا کہ کسی ایک گیت کار سے سارے گیت نہیں لکھوائے جائیں گے بلکہ جس گیت کار کا گانا پسند آئے گا وہ لے لیا جائے گا۔ ساحر اس مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ برمن دادا نے ساحر کو سچویشن بھی دیں اور وقت بھی دیا۔ ساحر نے تین گانے لکھے، اور تینوں پسند کئے گئے۔ اس فلم کا ایک گانا تھا۔

"ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں"

اُس فلم میں ایک کیرتن بھی تھا۔ برمن کا خیال تھا اردو کا شاعر کیرتن کیا لکھ سکے گا۔ لیکن جن کو سچوایشن دی گئیں وہ گانے لکھ کر لائے تو پسند نہیں آئے۔ منیش کول جی نے کہا کہ ساحر نے تین گانے لکھے تینوں اچھے ہیں۔ اب کیرتن بھی اسی سے لکھوایئے۔ ساحر نے کیرتن لکھا۔

"کنجن میں دیکھو آئی ملن کی بیلا"

منیش کول جی نے ساحر کو سینے سے لگا لیا۔ اور ساحر کی ناک فلم میں بھی اونچی ہو گئی۔ کیونکہ ان دنوں منیش کول جی فلمی دنیا میں اتنی لمبی ناک رکھتے تھے کہ باقی سب ان کی ناک کی پوجا کرنا دھرم مانتے تھے۔ لیکن جس فلم سے ساحر کا فلمی کیریر شروع ہوا وہ گورودت کی فلم "بازی" تھی۔

بازی ایک کرائم فلم تھی اور اس کے بعد ساحر کو جتنی فلمیں ملیں وہ سب کرائم تھیں۔ ساحر کی پیاس پروڈیوسروں کے مجرمانہ اقدام سے بجھتی نہیں تھی۔ وہ فلم میں کچھ کہنا چاہتا تھا اور کہہ نہیں پاتا تھا۔ کیونکہ فلم والے سمجھتے تھے ادب فلم کی چیز نہیں ہے۔ اور ساحر مانتا تھا کہ فلم مجموعۂ فنون ہے اس میں سب آرٹ مل کر ایک معجزہ پیدا کر دیتے ہیں۔ فلم والے اس بات پر متفق تھے۔ لیکن ادب کو فلم میں داخل نہیں کرتے تھے۔ ساحر کہتا تھا سچائی بکتی ہے۔ سچائی کی فلم بنایئے۔ مگر اس نقار خانے میں ساحر کی آواز صدائے صحرا بن کر رہ جاتی تھی۔

گورودت اچھا فنکار تھا۔ لیکن اس کے ساتھی اسے "بازی" کے ڈھرے سے نکلنے نہیں دیتے تھے۔ جو فارمولا جس ڈائرکٹر کا ہٹ ہو جاتا ہے اس پر اس فارمولے کی چھاپ لگ جاتی ہے۔ ڈسٹری بیوٹر وغیرہ سب اس سے اسی ڈھرے کی فلم بنانے کی مانگ کرتے ہیں۔ ساحر اس مجرمانہ ماحول سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔

گورودت نے شرت کار جو ایس۔ ڈی برمن کے میوزک اسسٹنٹ تھے ان سے اس ڈھرے کی ایک کہانی خریدی۔ شرت کار کہانی لکھتے نہیں تھے سنا کر بیچ لیتے تھے۔ ایسے ادیب اپنی فلم انڈسٹری میں بہت ہیں۔ پروڈیوسر بھی رائٹر ہیں اور آفس بوائے بھی۔

گورودت شرت کار کی کہانی پر کام کر رہے تھے۔ ساحر بھی کہانی سننے کے لئے بیٹھے۔ انہوں نے کہانی سن کر کہا۔ آپ کوئی سچی کہانی بنایئے جس میں کچھ کہنے کی بات ہو۔

اور پھر پیاسا فلم بنی۔ فلم ہٹ بھی ہوئی۔ اور وہ قابل قدر بھی تھی۔ اس فلم سے ساحر کی ناک فلمی دنیا میں ایسی لمبی ہوئی ایسی لمبی ہوئی کہ فلم والوں کے دل میں چبھنے لگی۔ پھر ساحر نے فلم میں سب کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ طلسمات کی رات۔ تک انہوں نے مصرعہ میں استعمال کیا۔ اور گانا ہٹ ہوگیا۔ اس زمانہ میں وودھ بھارتی سے جو گانے نشر کئے جاتے تھے اس میں شاعر کا نام حذف کر دیا جاتا تھا صرف میوزک ڈائرکٹر کا نام لیا جاتا تھا۔ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن نے اس بات کے خلاف آواز اٹھائی۔ ساحر اس کمیٹی کے کنوینر بنے اور بمبئی سے لے کر دلی تک دوڑتے پھرے اور آل انڈیا ریڈیو نے فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کی بات مان لی اور فلمی دھن بنانے والے کے ساتھ شاعر کا نام بھی نشر ہونے لگا۔

ساحر نے فلم کو ادب دیا ہے تو اس نے فلم کی تکنیک میں سیکھا ہے۔ فلم تصویروں کا میڈیم ہے۔ "پیاسا" کے بعد ساحر کی نظمیں اٹھا کر دیکھئے اُس میں آپ کو تصویریں نظر آئیں گی۔ کٹ۔ سیکس ڈیزالو۔ فلیش بیک اور راپ سب آپ کو ڈھونڈنے لگیں گے۔ پرچھائیاں ساحر کی ایک نظم ہے جو اس نے جنگ کے خلاف لکھی ہے۔ اس نظم پر ایک دن میں ایک بہت بڑے ہدایت کار کے ساتھ بحث کر رہا تھا۔ انہوں نے پوری نظم سُن کر کہا کہ یہ پوری فلم کی کہانی ہے۔ پس منظر میں اگر اس نظم کو گایا جائے۔ اور اس کی تصویریں پردے پر ہو بہو پیش کر دی جائیں۔ تو جنگ کے خلاف اس سے بہتر فلم نہ بنی ہوگی۔ ہندوستان انٹرنیشنل مارکیٹ میں اس فلم کو رکھ کر اپنا سر اونچا کر سکتا ہے۔ میں نے بارہا کوشش کی۔ لیکن کوئی پروڈیوسر فلم بنانے کے لئے تیار نہ ہوا۔

ساحر نے بمبئی میں اس نظم کے عنوان پر اب ایک بلڈنگ کھڑی کی ہے۔ میں جب کل ساحر کی پرچھائیاں سے نکل رہا تھا تو مجھے یاد آیا۔ ساحر اپنی لمبی ناک کے ساتھ بمبئی میں کس طرح کام کی تلاش میں گھومتا تھا۔ اور پھر ایک دن بمبئی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

لوگوں کا خیال ہے وہ مایوس ہو کر چلا گیا تھا مگر یہ غلط ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان کا بٹوارہ ہوا۔ اس وقت ساحر کی ماں لدھیانہ میں تھیں اور وہ لاہور چلی گئیں۔ ساحر بمبئی سے لدھیانہ گیا تو معلوم ہوا ـــ وہ لاہور میں ہیں۔ وہاں اس نے ادب لطیف کی پھر ایڈیٹری شروع کر دی۔ کیونکہ پاکستان سے اس کا نکلنا مشکل تھا۔ ساحر کے گھر والے لاہور میں شورش کاشمیری کے مہمان تھے۔ ساحر نے پھر کسی طرح اپنے گھر والوں کے ساتھ ہندوستان کا رخ کیا۔ اور بمبئی آگیا ـــ جب وہ آیا تو مہاجر تھا ـــ ایک شرنارتھی تھا کیونکہ اسے پاکستان کی مذہبی حکومت قبول نہیں تھی۔ ہندوستان میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن یہاں کی حکومت اسے پسند تھی۔ دوستوں نے اس کا ساتھ دیا۔ اور پھر آج وہ سمندر کے کنارے پر پرچھائیاں کا مالک ہے۔ یہ بڑی بلڈنگ جو سامنے کھڑی ہے۔

جہاں قطرے کو شرمایا گیا تھا
وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

آج اس کی ناک سرمایہ داروں میں بھی لمبی ہے۔ وہ جب بڑے بڑے استادوں کے جھمگٹ میں جاتا ہے تو ایک بڑی بڑی موٹر سے اترتا ہے اور اس طرح اداکاروں میں وہ فلمی شاعروں کی ناک لمبی کر کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی ناک کہہ رہی ہوتی ہے۔ روپے کا کیا ہے صاحب۔ وہ شاعر بھی چاہے تو کما سکتا ہے۔ فلمی دنیا میں ادیب آکر ادبی کام ترک کر دیتا ہے۔ لیکن ساحر یہاں بھی لٹریری کام کرتا رہتا ہے۔ اس نے سوہنیا نظم لکھی۔ فلمی دنیا میں جہاں تک میرا خیال ہے۔ سوہنیا

پرصرف دو فلمی ادیبوں نے کچھ لکھا۔ ایک ساحر کی نظم "خون پھر خون ہے" اور دوسرے مہندر ناتھ کی کہانی ہے "کالا ہیرا" دونوں میں اردو لٹریچر کی ناک بن گئی ہے۔

تحت الشعور سے حقیقتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ آنے والے واقعات کو بھی شاعر دیکھتا ہے۔ ساحر نے جواہر لال نہرو پر ایک نظم کہی۔ وہ شاید چھبیس ۲۶ جنوری کو اس نے کہی تھی۔

ہم یہ دیکھیں گے نہرو کی جوتی جلے اس ترنگے تلے
باپ کا خواب بیٹی کے ہاتھوں پلے اس ترنگے تلے

تری مورتی جہاں پنڈت جی رہتے تھے وہاں پر ایک اکھنڈ جیوتی جل رہی ہے۔ ساحر نے وہ جیوتی نہیں دیکھی تھی لیکن اس کا تحت الشعور سب دیکھ لیتا ہے۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ بڑے باپ کی بیٹی اندرا گاندھی ایک دن دیش کی پردھان منتری ہوگی اور پنڈت جی کے ادھورے خوابوں کو پورا کرے گی۔ لیکن اس کے تحت الشعور نے یہ سب پہلے سے دیکھ لیا تھا۔ اسی لئے ساحر نے کہا ہے۔

نغمہ جو ہے تو روح میں ہے، لے میں کچھ نہیں
گر تجھ میں کچھ نہیں، تو کسی شے میں کچھ نہیں
تیرے لہو کی آنچ سے گرمی ہے جسم کی
مے کے ہزار وصف سہی مے میں کچھ نہیں
جس میں خلوص فکر نہ ہو، وہ سخن فضول
جس میں نہ دل شریک ہو، اُس لَے میں کچھ نہیں

ساحر کی وہ نظم جو اس نے پنڈت نہرو کے سوگ کے پندرہ دن بعد لکھی تھی وہ چودہ زبانوں کے مشاعرے میں اردو کی امتیازی نظم میں شامل ہوگئی۔

ساحر نازک مزاج ضرور ہے کیونکہ اس کی رگوں میں جاگیر دارانہ خون ہے وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرسکتا۔ پچھلے دنوں وہ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا پریذیڈنٹ تھا۔ ایگزیکٹو کمیٹی کے فیصلے پر بضد رہا۔ ایگزیکٹو اپنے فیصلے پر اڑی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فلم رائٹرز کو اپنا سالانہ فنکشن کرنا مشکل ہوگیا۔ ساحر کی ناک ایسی اڑی کہ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کو کافی خسارا اٹھانا پڑا۔ اب اسے ساحر کی کمزوری کہہ لیجئے یا اس کی خوبی کہ وہ اڑ جائے تو اسے کوئی پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔ کبھی کبھار تو وہ نہایت معمولی بازی پر بھی اڑ جاتا ہے۔ ویسے ساحر دوستوں کا بہترین دوست ہے۔ رام پرکاش اشک بیمار ہوئے تو ایک اچھے فزیشن کے ساتھ ساحر نے انہیں اپنے خرچ پر علاج کرانے کے لئے امریکہ بھیجا اور میرا خیال ہے تیس چالیس ہزار روپے خرچ کئے۔ یہ مثال فلمی دنیا میں پہلی ہے اور شاید آخری بھی۔

یوں تو ساحر کے دوست بہت ہیں۔ لیکن وہ صرف چند ایک کا دوست ہے۔ اور ان چند ایک میں سب سے اول ہیں ڈاکٹر

آر۔ پی۔ کپور ــــ ! ساحر اُن کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا۔ اور شاید زندگی بھر نہیں ٹال سکے گا۔" ساحر چونکہ شاعر ہے اس لئے وہ ادبی گالی بھی برداشت کرسکتا ہے لیکن اگر آپ نے ساحر کو بے وزن دعا بھی دی ہے تو اس کو کھل جائے گی۔" اس کا حافظہ بہت تیز ہے۔ اُسے جہاں استادوں کے شعر یاد ہیں وہاں اُسے دوستوں کے کرم بھی یاد ہیں اور وہ ان کرموں کا بدلہ چکانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔

ساحر کو آپ نے کبھی ہنستے نہیں دیکھا ہوگا۔ میں نے بھی نہیں دیکھا۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ ہنسنے میں ان کی ناک لمبی نہ رہ کر پھیل جائے گی اور پھیلی ہوئی ناک ہندوستان میں خوبصورت نہیں مانی جاتی۔

ساحر کی شاعری میں رچاؤ ہے، معانی ہیں، سچائی ہے اسی سچائی سے وہ نئے زاویے پیدا کرتا ہے اس لئے اُسے ترقی پسند شاعر مانا جاتا ہے۔

پرچھائیاں نظم کہہ کر وہ انٹرنیشنل شاعروں کی صف میں کھڑا ہو گیا ہے۔ لیکن پرچھائیاں نام کی بلڈنگ بنا کر وہ دوستوں کی صف سے باہر نکل گیا ہے۔ شاعری فقیری مانگتی ہے اور شاعر اصل میں دنیاوی دولت کو گھٹیا مانتا ہے۔ پتہ نہیں شاعر دنیا کے عیش و آرام میں کھو گیا ہے یا اندر سے ابھی تک فقیر ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وقت آنے پر وہ پرچھائیاں بلڈنگ سے اُٹھ کر سڑک کے کنارے کسی درخت کے نیچے بھی ڈیرا ڈال سکتا ہے اور اسے کمتری کا احساس نہیں ہوگا۔ مگر اس وقت تو اس کی شاعری اس بلڈنگ کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہے۔ آرٹ کے لئے سیکورٹی زہر بن جاتی ہے اور ساحر اس وقت ہر طرح سیکور ہے۔

فقیر منش شاعروں کو اس وجہ سے ساحر کی ناک اب چھوٹی نظر آنے لگی ہے حالانکہ سرکار نے اُسے پدم شری کا خطاب دے کر اس کی ناک زیادہ لمبی کر دی ہے۔

ساحر لدھیانوی ـــ میرا دوست

قمر اجنالوی
لاہور (پاکستان)

پاکستان میں ساحر لدھیانوی کا قیام صبح کے جھونکے کی صورت اگرچہ بہت مختصر تھا، لیکن جس طرح بادِ صبا کی دھیمی دھیمی آہٹ سے کلیاں چٹکتی اور غنچے پھول بنتے ہیں۔ اسی طرح ساحر کے گیتوں، نظموں اور غزلوں نے پاکستانی عوام کے دلوں پر دستک دی اور انہوں نے ساحر کے لئے اپنے غم کدوں کے کواڑ کھول دیئے۔ وہ اُس نسل کا شاعر تھا جو برِّ صغیر کی آزادی کے دوران خون کے ساحلوں پر بٹ گئی۔ ان لوگوں کا نمائندہ تھا جنھیں ہندوستان کی خود مختاری میں مجبوری اور مفلسی کی سوغات ملی۔ ان غریبوں کا ترجمان تھا جنہیں پاکستان کی آزادی میں غمِ حیات کے سوا دوسرا کوئی تحفہ نصیب نہ ہوا۔

وہ خواص کا نہیں عوام کا شاعر تھا اور شاعری میں ایک نظریے، ایک فلسفے کا نقیب بھی۔ اُس نے اپنے نظریے کو چھپایا نہیں۔ اپنے دل کی بات مصلحت کے ریشم میں لپیٹنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ جو سوچا، جو کہا، اُسے ڈنکے کی چوٹ پر عوام تک پہنچایا۔ لوگوں کے دکھ درد کی باتیں اُس کے دل سے نکلیں اور سننے والوں کے دلوں میں جا اُتریں۔ اُس نے گل و بلبل کے روایتی قصے اور شمع و پروانہ کے نمائشی افسانے نہیں لکھے، بلکہ تجربے کی باتیں کیں۔ لوگوں کے دلوں میں جھانک کر دیکھا۔ اُن کے چہروں کی زردی دیکھی۔ اُن کی آنکھوں سے جھانکتے ہوئے غمِ حیات کی فریاد سُنی اور انسانیت کے اسی غم کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ وہ خود اعلان کرتا ہے کہ ؎

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

عوام کے افلاس اور آلام و مصائب کے ہجوم دیکھنے کے باوجود وہ مایوسی اور قنوطیت کا شکار نہیں ہوا بلکہ ایک ترقی پسند شاعر کی حیثیت میں مجبوری کی زنجیروں کے ٹوٹنے کی جھنکار، تڑپتے دلوں کی پکار اور محنت کش عوام کی للکار بن گیا جسے سن کر بڑے لوگوں کی جبینیں شکن آلود ہو جاتی تھیں۔ بعض حلقوں کو اُس کے نظریے سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ اُس کے

فلسفۂ حیات سے بھی کوئی دلچسپی نہ ہوگی جس کا اُس نے پرچار کیا۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی بڑے سے بڑا مخالف اور معترض بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اُس نے اپنے نظریے کے اظہار اور غمِ حیات کے بیان کی خاطر جو اسلوب اختیار کیا وہ اتنا جدید، اتنا مؤثر اور عوام کے جذبات واحساسات سے اتنا قریب تھا کہ اس کے مخالفین بھی سُن کر تڑپ جاتے تھے۔ اظہارِ بیان کے علاوہ اُس کے اشعار میں مشاہدے کی اتنی گہرائی اور جذبات کی اتنی صداقت ہوتی تھی کہ سُننے اور پڑھنے والے جھوم اٹھتے تھے۔ وہ عصرِ حاضر کے مایوس انسانوں کے لئے امید اور روشنی کا ایک پیامبر تھا جس نے نوجوان نسل کو شدید طور پر متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ تیس پینتیس سال کے عرصے میں وہ نوجوان نسل کا مقبول ترین اور محبوب ترین شاعر رہا ہے۔

آج ساحر ہم میں موجود نہیں، لیکن موجود ہے۔ ظاہری طور پر ۱۹۴۹ء سے وہ پاکستان میں نہیں رہا۔ کیونکہ جون ۱۹۴۹ء ہی میں وہ یہاں سے چلا گیا تھا۔ لیکن چلے جانے کے بعد بھی وہ یہیں رہا۔ ہمارے دلوں میں، ہماری کتابوں میں، ہمارے رسالوں میں۔ کوئی ادبی رسالہ، شعروسخن کا کوئی معیاری انتخاب اُس کے کلام کے بغیر مکمل ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے دور ہونے کے باوجود وہ ہمارے آس پاس ہی پھرتا رہا۔ جہاں تک اس کی شاعری کا تعلق ہے میں خود کو اس کی شاعرانہ عظمت پر کوئی رائے دینے کا اہل نہیں پاتا، اس لئے ساحر کی شاعری پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ ادب کے نقاد مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ اردو شاعری میں اُس کا مقام کیا ہے؟ البتہ میں اس حقیقت کا اظہار ضرور مناسب سمجھتا ہوں کہ ساحر لدھیانوی صرف برصغیر پاکستان و ہند کے کروڑوں عوام کا شاعر نہیں تھا، بلکہ اس کی نظموں اور غزلوں کے برصغیر کی بعض مقامی زبانوں کے علاوہ انگریزی، روسی اور پولش زبانوں میں بھی ترجمے شائع ہوئے اور پسندیدگی کی سند پا چکے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ انٹرنیشنل فیم کا شاعر تھا جس پر آنے والی نسلیں یقیناً ناز کرینگی۔

میں تو آپ کو اُس ساحر لدھیانوی کے بارے میں بتاؤں گا جسے میں جانتا ہوں اور جس کے ساتھ میں نے زندگی کے کچھ لمحے گزارے۔ ساحر کے دوستوں میں حمید اختر، ابن انشا، قتیل شفائی، سعادت حسن منٹو، شورش کاشمیری، ظہیر کاشمیری، عبداللہ ملک، عارف عبدالمتین، احمد راہی اور دوسرے بہت سے شاعر، ادیب، صحافی حضرات شامل ہیں اور وہ اپنے اپنے تعلق کی بنا پر ساحر سے زیادہ قریب بھی رہے ہیں بالخصوص قتیل شفائی تو کئی بار ہندوستان بھی گئے اور ساحر کے مہمان رہے ہیں۔ ساحر لدھیانوی کے ساتھ میرے تعلق کا زمانہ اس کے پاکستان میں قیام کی طرح مختصر ہے لیکن وہی مختصر عرصہ آج صدیوں پر پھیلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اپنے حوالے سے کسی مرحوم دوست کی باتیں کرنا یا اس کے حوالے سے اپنی کہانی بیان کرنا جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل بھی۔ لیکن ساحر کی شخصیت اتنی پیاری ہے کہ اس کی بات کسی حوالے سے کی جائے سننے والے کو مزہ دیتی ہے۔

میں نے ساحر لدھیانوی کے جن دوستوں کا ذکر کیا ہے! اُن میں احمد ندیم قاسمی کا معاملہ ذرا مختلف ہے، کیونکہ ندیم صاحب کے ساتھ دوستانہ تعلق میں احترام کا جذبہ بھی شامل تھا۔ انھوں نے ساحر کے پہلے مجموعۂ کلام "تلخیاں" کا دیباچہ لکھا تھا۔ ساحر بھی شاعروں کا احترام کرتا تھا۔ اُن میں حضرت اختر شیرانی کا نام سرِفہرست سمجھتا ہوں۔

میری اور ساحر لدھیانوی کی ملاقات ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ صحیح تاریخ تو یاد نہیں، البتہ اتنا ضرور یاد ہے کچھ دوست انارکلی چوک میں مکتبۂ جدید کے سامنے کھڑے تھے، میں وہاں کسی کام سے پہنچا تو عارف عبدالمتین نے جو اُن دنوں "ادب لطیف"

کے ایڈیٹر تھے۔ ایک دبلے پتلے نوجوان سے میرا تعارف کرایا۔ میری ہی طرح منحنی سا جسم، لمبی ناک، سانولا گندمی رنگ اور آنکھوں میں خلوص کی چمک ـــــ وہ نوجوان ساحر لدھیانوی تھا۔ بعد میں معلوم ہوا جسمانی مناسبت کے علاوہ ہمارا سال پیدائش بھی ایک ہی ہے یعنی ۱۹۲۱ء۔ گویا ہم دونوں ہم فکر ہی نہیں ہم عمر بھی تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی رکنیت ہماری فکری یگانگت کا ذریعہ تھی۔ غائبانہ طور پر ہم دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے۔ مگر ساحر سے ملاقات کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے ہمیں بہت پہلے ملنا چاہئے تھا۔ ساحر محبت، خلوص اور ایثار کا پیکر تھا۔ اب اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ میں نے بتایا ہے۔ ساحر اختر شیرانی کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اُس کی وجہ بھی سُن لیجئے:۔

کچھ عرصہ قبل ماہنامہ "ساغر" میں میری ایک نظم "اختر کے نام" شائع ہوئی تھی۔ نظم میں اختر نام کی ایک لڑکی سے تخاطب تھا۔ ساحر نے مجھے بتایا کہ تمہاری وہ نظم پڑھ کر اختر شیرانی کی سلمیٰ یاد آگئی۔ پھر وہ بڑے عجیب سے لہجے میں کہنے لگا۔

"اختر شیرانی بڑا گریٹ شاعر ہے۔ اُس نے اُردو شاعری کو عورت بخشی ہے۔"

ساحر کا یہ فقرہ اس کے دل کی پہنائیوں سے نکلا تھا۔ میں شدید طور پر متاثر ہوا۔ میرے دل میں اختر شیرانی کی پہلے ہی بڑی عزّت تھی۔ جب کبھی اُن سے ملاقات ہوئی۔ ان کی ادبی خدمات۔ شاعرانہ حیثیت اور بزرگی کا خیال ہمیشہ مدنظر رہا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اختر شیرانی کی عظمت اور اعلیٰ مرتبے کا صحیح احساس مجھے ساحر لدھیانوی نے دلایا اور اس کا فقرہ مجھے اردو شاعری کے اُن خیابانوں اور شبستانوں میں لے جاتا رہا جہاں اختر شیرانی اپنی سلمیٰ سے محو رازو نیاز ہوتے۔

فارسی کی طرح پہلے اُردو شاعری کا محبوب بھی مذکر ہوتا تھا۔ اگرچہ اس محبوب کی زلفیں شبِ دیجور کی طرح سیاہ اور شبِ ہجر کی مانند لمبی ہوا کرتی تھیں۔ ہونٹ بھی غنچوں کی مثال شگفتہ اور گلابوں کی طرح سُرخ تھے۔ رخسار بہار کی مانند حسین و رنگین تھے۔ محبوب کی گردن تو ہمیشہ صراحی دار ہوتی تھی اور کمر اتنی نازک اور پتلی تھی کہ بعض اوقات بے چارے شاعر کو بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ محبوب کے سر پر دوپٹہ بھی ہوتا تھا۔ شاعر اس دوپٹہ کے آنچل سے کھیلتا بھی تھا، پھر محبوب کی زبان سے "اوئی اللہ" کے پھول بھی جھڑتے تھے۔ لیکن ان تمام نسوانی صفات کے باوجود وہ کم بخت مذکر ہی رہتا تھا۔ اور شاعر حضرات اُس کے لئے صیغۂ تذکیر ہی استعمال کرتے تھے۔ جگر اور جوش تک محبوب کو مذکر باندھتے رہے مگر اختر شیرانی نے اردو شاعری میں سلمیٰ سے براہ راست خطاب کر کے تکلفات، حجابات اور مصلحت کی تمام دیواریں گرا دیں اور اس طرح اردو شاعری میں محبوبہ اپنی اصلی صورت میں داخل ہوئی۔ یہی اختر شیرانی کا کمال تھا۔

اب ایک مشاعرے کا حال سنیے، جس کی صدارت اختر شیرانی کے حصے میں آئی۔ ۱۹۴۶ء میں ساحر لدھیانوی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے "یوم اقبال" منانے کا اعلان کیا۔ ساحر کو ہنگاموں اور دھماکوں کا بڑا شوق تھا۔ وہ سرکاری یوم اقبال کے مقابلے میں بھی دھماکہ کرنا چاہتا تھا۔ جس کا اہتمام پاکستان و ہند کی سطح پر کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی کو دعوت نامے بھیج دیئے گئے۔ "یوم اقبال" کے مشاعرے کے لئے جوش ملیح آبادی کا نام حجازی سائز کے پوسٹروں میں شائع ہوگیا۔ اس پہلے کل پاک و ہند مشاعرے کا بڑا چرچا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا اگر جوش صاحب نہ

آسکے تو مشاعرے کی صدارت کون کرے گا؟ ساحر نے جواب دیا اختر شیرانی موجود ہیں۔

اختر لاہور پہنچ چکے تھے۔ مگر اندیشہ تھا کہ عین مشاعرے کے دن کسی اور طرف نہ نکل جائیں، اگرچہ اس کا امکان نہیں تھا، پھر بھی انھیں پابند کرنے کے لیے قمر تسکین کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ انہیں لاہور سے باہر نہ جانے دیں۔ دوسرے روز وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی لاہور پہنچ گئے۔ لیکن جوش ملیح آبادی جہاز مس کر گئے اور پاکستان نہ آسکے۔ انجمن کے زیر اہتمام "یوم اقبال" پنجاب یونیورسٹی کے ہال میں منایا جا رہا تھا جو سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شاعر، ادیب، دانشور اخبار نویس، اساتذہ، طلبہ، قانون دان سبھی موجود تھے۔ پاکستان میں ایسا نمائندہ اجتماع پھر دیکھنے میں نہیں آیا۔ پروگرام کے مطابق اختر شیرانی کو کرسیٔ صدارت تک لایا گیا۔ وہ "مستِ الست" ہو رہے تھے۔ اسٹیج سکریٹری کے فرائض ساحر نے سنبھالے اور اپنی ہی نظم "آج" سے مشاعرہ کا آغاز کیا ؎

"ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لیے
چاند، تاروں، بہاروں کے سپنے بُنے
حسن اور عشق کے گیت گاتا رہا
آرزوؤں کے ایوان سجاتا رہا
میں تمہارا مغنّی، تمہارے لیے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہا

مشاعرے کا آغاز بڑا ہنگامہ خیز اور پُر وقار تھا مگر ساحر کے بعد "ہوٹنگ" کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ایک گروہ آیا ہی اسی لئے تھا کہ مشاعرے کو درہم برہم کیا جائے۔ دوسرے صاحبِ صدر بھی اس صورتِ حال کا ایک ذریعہ بنے۔ وہ کرسیٔ صدارت سے بعض شاعروں کے تلفظ کی اصلاح کرنے لگے۔ اگر کسی شاعر نے "فِضائیں" پڑھ دیا تو اختر شیرانی نے فوراً اصلاح کی کہ "صاحبزادے! لفظ "فِضائیں" نہیں "فَضائیں" ف پر زبر کے ساتھ ہے۔ اس طرح "ہوٹنگ" کا سلسلہ طویل تر ہوتا چلا گیا۔ کم و بیش انیس بیس شاعر اس سخن شناسی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اسٹیج پر سعادت حسن منٹو میرے قریب بیٹھے "بور" ہو رہے تھے۔ مجھ سے بولے "مشاعرہ خراب ہو گیا ہے۔ آؤ چلیں"۔

صورتِ حال ایسی مایوس کُن تھی کہ میں بھی کھسک لینے پر تیار ہو گیا۔ ہم دونوں اُٹھے۔ منٹو اسٹیج سے اتر گئے۔ میں اُتر رہا تھا کہ ساحر لدھیانوی نے دیکھ لیا۔ اور فوراً میرا نام اناؤنس کر دیا۔ میرے قدم وہیں رک گئے۔ شش و پنج میں تھا کہ کیا پڑھوں، آخر ذہن نے فوراً رہنمائی کی کہ نظم یا غزل پڑھنے کا موقع نہیں اپنی باری نمٹانے کے لئے ایک قطعہ ہی کافی ہوگا۔ میں نے مائیک پر آکر قطعہ پڑھ دیا ؎

کبھی دشتِ وطن کو بھی چمن کر — ذرا تبدیلیٔ رسمِ کہن کر
رہی ہے مسند آرا نسلِ شاہی — کسی انساں کو صدرِ انجمن کر

یہ قطعہ ہال میں بم کی طرح پھٹا اور داد و تحسین کا وہ شور اٹھا کہ خدا کی پناہ ۔ بعض لوگوں نے بدقسمتی سے آخری مصرع صاحبِ صدر پر چسپاں کر دیا اور ہال میں آوازیں گونجنے لگیں ۔ "کسی انساں کو صدرِ انجمن کر" ۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ اختر شیرانی خود مائیکروفون پر آکر تشریح کرنے لگے کہ قمر صاحب نے یہ قطعہ مجھ پر نہیں کہا اِس کا مطلب یوں ہے ، مگر مطلب سنتا کون ہے ؟ ۔ بڑا ہنگامہ ہوا آخر اختر شیرانی کو بہ حفاظت ہال سے باہر بھیج دیا گیا اور ساحر کی فرمائش پر شورش کاشمیری اسٹیج پر آئے جنہوں نے اپنی سحر بیانی سے ہنگامے پر قابو پایا ۔ فضا درست ہوئی تو نئے صدر کا مسئلہ سامنے آیا ، مگر ایم ڈی تاثیر اور مولانا عبدالمجید سالک تک نے صدارت سے انکار کر دیا ۔ آخر جناب احمد ندیم قاسمی نے کرسیٔ صدارت سنبھالی اور مشاعرہ دوبارہ مجھ سے شروع ہوا پھر تمام شعرا کو بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنا گیا ۔

دوسرے روز میں ہفت روزہ "اداکار" کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ساحر لدھیانوی بڑی گھبراہٹ کے عالم میں داخل ہوا اور مجھ سے کہا ۔ "اختر شیرانی میرے پیچھے پیچھے آرہے ہیں ۔ وہ تم سے ناراض ہیں کہیں اِدھر اُدھر ہو جاؤ ۔"

پہلے تو میں اسے مذاق سمجھا لیکن ساحر کی سنجیدگی دیکھ کر اُس کے مشورے پر عمل کرنا پڑا ۔ تھوڑی دیر میں اختر شیرانی بھی آگئے اور ساحر نے انہیں بتایا ۔ "قمر صاحب تو آج دفتر ہی نہیں آئے ۔ چھٹی پر ہیں ۔" منیجر نے ساحر کے بیان کی تصدیق کر دی ۔ پھر اختر شیرانی نے میرے نام ایک مختصر سا رقعہ چھوڑا اور ساحر کے ساتھ واپس چلے گئے ۔ تیسرے روز اتفاقاً اکبری دروازے کے باہر ایک بنک میں ان سے آمنا سامنا ہو گیا ۔ میں بنک سے نکل رہا تھا ، اختر شیرانی داخل ہو رہے تھے ۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اُنہی قدموں پر رک گئے پھر اختر شیرانی مسکرا کر آگے بڑھے اور مجھے گلے لگا لیا ، بولے ۔ "پرسوں ساحر کے ساتھ تمہیں کامیاب مشاعرہ پڑھنے پر مبارک باد دینے تمہارے دفتر گیا تھا مگر تم رخصت پر تھے ۔" پھر کہنے لگے ۔ "جانا نہیں یہیں ٹھہرو آج میرے پاس بڑا مال ہے کہیں بیٹھیں گے ۔"

چیک کیش کرانے کے بعد وہ کسی میخانہ کا رخ کرنا چاہتے تھے ۔ میں انہیں "عرب ہوٹل" میں لے گیا جہاں چائے نوشی کے درمیان شعر و ادب پر گفتگو ہوتی رہی ۔ دوسرے دن میں نے ساحر کو اختر شیرانی سے اتفاقیہ ملاقات کا واقعہ سنایا تو اس نے ہنس کر کہا ۔ "شکر کرو میں نے تمہیں پہلے دن کی ملاقات سے بچا لیا تھا اُس روز مل جاتے تو خیر نہیں تھی ۔"

اس واقعے کے تین چار ماہ بعد ہی اختر شیرانی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے ۔ وہ اسی روز فوت ہوئے تھے جس دن قائد اعظم کا انتقال ہوا تھا ۔

جب "سویرا" دفتر جوگیتا بھون بلڈنگ میکلوڈ روڈ پر منتقل ہو گیا تو ساحر سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی بڑھ گیا ۔ اول تو "اداکار" کا دفتر بھی قریب تھا ، دوسرے میں ماہنامہ "فلم لائٹ" کے دفتر میں بیٹھا تھا جو گیتا بھون کی بلڈنگ ہی میں نسبت روڈ کی جانب واقع تھا ۔ میں فارغ ہوتا تو بالکونی سے ہوتا ہوا جو گیتا بھون بلڈنگ کے چاروں جانب واقع ہے "سویرا" کے دفتر میں پہنچ جاتا اور ساحر سے گپ شپ ہوتی تھی ۔

ایک روز سعادت حسن منٹو "سویرا" کے دفتر میں آئے ۔ چودھری نذیر موجود نہیں تھے جن سے انہیں کچھ بقایا حساب

لینا تھا۔ منٹو صاحب پر اُن دنوں کڑکی کا عالم تھا۔ پیسوں کی ضرورت تھی۔ انہوں نے غصّے میں "سویرا" کی کتابت شدہ کاپیاں بغل میں دبائیں اور ساحر کو یہ پیغام دے کر چلے گئے، کہ چودھری نذیر آئے تو کہہ دینا میرا بقایا دے جائے اور کاپیاں لے آئے۔

منٹو صاحب کو ساحر کی موجودگی میں اصولاً ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ چودھری نذیر ہوتے تو بے شک سارا دفتر اٹھا کر لے جاتے، مگر وہ منٹو صاحب تھے "سویرا" کی کاپیاں ہی لے کر چلتے بنے۔ ساحر نے انہیں روکا نہیں۔ کچھ دیر دفتر میں چپ چاپ بیٹھا رہا، پھر پریشان سا ہو کر میرے پاس "فلم لائٹ" کے دفتر میں آگیا اور کہا۔

"اب میں چودھری نذیر کو کیا جواب دوں گا تم چودھری کی عادت سے واقف ہو۔"

ہم دونوں "فلم لائٹ" کے دفتر سے نکل کر "سویرا" کے دفتر میں جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر کے بعد چودھری نذیر بھی آگئے۔ جب پتہ چلا کہ پرچے کی کاپیاں منٹو صاحب لے گئے ہیں تو بہت بگڑے اور ساحر سے کہنے لگے۔ "تم نے منٹو کو کاپیاں کیوں لے جانے دیں۔؟"

ساحر نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ "میں "سویرا" کا ایڈیٹر ہوں۔ دفتر کا چوکیدار نہیں کہ سامان کی حفاظت کرنا بھی میرے فرائض میں شامل ہو۔" یہ جواب سُن کر چودھری نذیر خاموش ہو گئے۔ لیکن ان کا موڈ بدستور بگڑا رہا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ "اس شخص کا دفتر میں بیٹھنے کا کیا فائدہ ہے۔ کوئی بھی شخص آکر جو چیز چاہے اُٹھا کر لے جائے۔ کم از کم اسے روکنا تو چاہیئے تھا۔"

میں نے چودھری نذیر کو سمجھایا کہ ساحر نے صاف بات کہہ دی ہے۔ وہ دفتر کا چوکیدار نہیں۔ اگر منٹو صاحب سے لین دین صاف ہوتا تو یہ واقعہ ہی کیوں پیش آتا۔ چودھری صاحب روپے پیسے کے معاملے میں بڑے "کاروباری" واقع ہوئے تھے اور ادیبوں کو معاوضہ ادا کرتے ہوئے بڑے "ناز نخرے" دکھایا کرتے تھے مگر منٹو کے سامنے وہ بھی حساب بھول جاتے اور بھیگی بلی بن جاتے تھے۔ آخر ہم لوگ منٹو صاحب کے فلیٹ (لکشمی مینشن) میں پہنچے۔ چودھری صاحب نے غالباً پچاس روپے ادا کئے اور منٹو صاحب نے "سویرا" کی کاپیاں اُن کے حوالے کر دیں۔ اس موقع پر فریقین میں جن "مرصّع فقروں" کا تبادلہ ہوا اُن کے جملہ حقوق محفوظ رکھتا ہوں۔"

اس قسم کے چھوٹے چھوٹے متعدد واقعات ہیں کس کس کا ذکر کروں۔ ساحر کو علم تھا میں اسلامی تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ ایک بار راولپنڈی کے کسی پبلیشر کو لے کر میرے پاس آئے اور کہا۔ "یہ صاحب اسلامی تاریخی ناول چھاپنا چاہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں تم ان کے لئے ناول لکھو۔"

میں ان دنوں بعض گھریلو پریشانیوں میں مبتلا تھا یہ بات تو ساحر بھی جانتا تھا کہ میری بیوی سخت بیمار ہے اور دفتر کا کام بھی مجبوری کی حالت میں کرتا ہوں، میں نے کہا۔ "ان حالات میں ناول تو کیا میں ایک افسانہ بھی نہیں لکھ سکتا۔" یہ سُن کر ساحر ناولوں کے ذکر سے یوں لاتعلق ہو گیا جیسے وہ اس کام کے لئے آیا ہی نہیں تھا۔ میری موجودگی میں اپنے پبلیشر دوست سے معذرت کر دی اور مجھے مشورہ دینے لگا کہ بھابی کو فلاں ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ وہ دوستوں کی پریشانی کا ذکر سن کر خود بھی پریشان ہو جاتا تھا۔

نشاط سینما ایبٹ آباد کے سامنے والی بلڈنگ آج بھی مجھے عزیز ہے کیونکہ اسی بلڈنگ میں ساحر لدھیانوی اپنی والدہ کے ساتھ رہتا تھا۔ پڑوس میں ابن انشا کا مکان تھا۔ ہم لوگ کبھی کبھی شام کے وقت ساحر کے مکان میں آکر بیٹھ جاتے اور شعر و ادب پر گفتگو ہوتی تھی۔ جون ۱۹۴۹ء کو ساحر لاہور سے چلا گیا۔ پاکستان سے چلا گیا۔ لیکن ہمارے دلوں سے نہیں گیا۔ اُسے شروع ہی سے تھیٹر اور فلم کے

ساتھ جنوں کی حد تک لگاؤ تھا۔ اُس کی انتہائی خواہش تھی کہ فلموں کے لئے گیت لکھے۔ ہندوستان میں اُس کی یہ خواہش نہ صرف پوری ہوئی، بلکہ شیکسپیئر کی زبان میں ۔ "وہ آیا۔ اس نے دیکھا اور چھا گیا ۔"

بمبئی کی فلمی دنیا میں اُس نے اپنی شاعری کا سکہ جمایا ہی نہیں بلکہ اپنا سکہ چلایا بھی۔ اس کے گیت فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے ۔

"گاتا جائے بنجارہ"، کے نام سے اس کے فلمی گیت کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان گیتوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ فلم کا ساحر نہیں، بلکہ ترقی پسند تحریک کا ساحر اپنے تمام شعری محاسن ۔ مخصوص الفاظ و تراکیب اور نظریے کی لگن کے ساتھ ان میں رچا بسا ہوا ہے ۔ فلمی دنیا میں اسے جو عروج ملا شاید ہی کسی شاعر کو نصیب ہو سکے ۔ بڑے بڑے پروڈیوسر، ڈائرکٹر اُس کے پیچھے پیچھے پھرتے، خوشامدیں کرتے اور اس کی خوشنودی کے طالب رہتے تھے ۔ مگر وہ گیت اپنی مرضی سے لکھتا اور معاوضہ ٹھوک بجا کر لیتا تھا۔ ایک فلم کے گیتوں کا ایک لاکھ روپے معاوضہ ساحر ہی کے حصے میں آیا ۔

کئی سال پہلے کی بات ہے ۔ ایک فلمساز و ہدایتکار جو بمبئی میں فلم بنا رہے تھے لاہور آئے ۔ وہ میرے بھی دوست تھے ۔ کہنے لگے :۔

"اگر ساحر لدھیانوی میری فلم کے گیت لکھ دے تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا ۔"

میں نے کہا۔ آپ ساحر سے کہیں، وہ آپ کی فلم کے لئے بھی گیت لکھ دے گا۔ مگر فلمساز دوست نے بتایا :۔

"بہت کوشش کر چکا ہوں، کامیابی نہیں ہوئی ۔ ساحر چھوٹے پروڈیوسروں اور ڈائرکٹروں کو گھاس ہی نہیں ڈالتا ۔ وہ آپ کا دوست ہے اگر آپ میری سفارش کر دیں تو شاید مجھے کامیابی نصیب ہو ۔"

ساحر سے بچھڑے عرصہ ہو گیا تھا۔ پھر میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ فلمی دنیا میں اس نے کیا اصول اپنا رکھے ہیں۔ اس لئے سفارش سے اجتناب کرتا رہا۔ لیکن جب فلم ساز و ہدایتکار دوست نے بہت زیادہ اصرار کیا تو میں نے ساحر کے نام چند جملے لکھ دیئے ۔ کئی ماہ بعد وہ صاحب بمبئی سے دوبارہ لاہور آئے تو میں نے پوچھا :۔

"آپ کو ساحر کے نام ایک رقعہ دیا تھا، کیا اُس سے ملاقات ہوئی ؟"

انھوں نے بتایا۔ جب آپ کا رقعہ ساحر صاحب کو پہنچایا گیا تو دوسرے روز وہ خود ہمارے دفتر میں تشریف لائے، اور کہنے لگے ۔ میں آپ کی فلم کے گیت لکھوں گا۔ مجھے سیچوایشنز بتا دیں ۔ اُن کے نزدیک ساحر کا خود چل کر کسی پروڈیوسر کے دفتر میں پہنچنا بہت بڑا اعزاز تھا! اور میرے چند جملوں کی وجہ سے انہیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔ جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے ۔ اُن صاحب کے بقول ۔ "جب ساحر صاحب خود ہمارے دفتر میں آئے تو ہم لوگ خوشی سے بوکھلا گئے ۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ جس شخص کو ملنے کے لئے بڑے بڑے پروڈیوسر ڈائرکٹر اس کے گھر قطار باندھے بیٹھے رہتے ہیں وہ پاکستان سے آئے ہوئے ایک رقعہ کو اتنی اہمیت دے گا کہ خود ہمارے پاس چلا آئے گا ۔"

اس واقعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی فلمی دنیا میں ساحر کا کیا مقام تھا۔ اور اتنا عروج

حاصل کرنے کے باوجود وہ اپنے پاکستانی دوستوں کو بھولا نہ تھا۔

غالباً ۱۹۵۶ء کا ذکر ہے میں نے اپنے دور کے ممتاز فلم ساز و ہدایت کار جناب انور کمال پاشا کے لئے فلم "سولہ آنے" لکھی تھی۔ اس فلم میں ایک سچوایشن ایسی تھی کہ میرے ذہن میں ساحر لدھیانوی کی نظم "فنکار" گونج اٹھی ؎

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج اُن گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں

فلم "سولہ آنے" میں اس نظم کو استعمال کرنے کے لئے میں نے ساحر کو بمبئی کے پتے پر خط لکھا اور دریافت کیا کہ معاوضے اور ادائیگی کی صورت کیا ہوگی؟ ساحر خط کا جواب دینے میں انتہائی غیر ذمہ دار واقع ہوا تھا۔ اس لئے قتیل شفائی سے بھی خط لکھوایا تاکہ نظم کا معاملہ طے ہو جائے۔ ساحر کا جواب آگیا۔ لکھا تھا: "نظم استعمال کر لو، بھلا پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا معاوضہ جو تم مناسب سمجھو میری طرف سے احمد ریاض کی بیوہ کو پہنچا دینا"۔

میں نے انور کمال پاشا سے نظم کا معاوضہ دو ہزار روپے طے کر لیا۔ یہ نظم عنایت حسین بھٹی کی آواز میں ریکارڈ کی گئی۔ انہی دنوں احمد ریاض کی یاد میں فیصل آباد میں ایک مشاعرہ ہوا جس کی صدارت احمد ندیم قاسمی نے کی۔ میں نے مشاعرہ میں اعلان کر دیا کہ ساحر لدھیانوی کی جو نظم "سولہ آنے" میں استعمال کی جا رہی ہے۔ ساحر کی طرف سے اس کا معاوضہ مبلغ دو ہزار روپے احمد ریاض کی بیوہ کو پہنچا دیا جائے گا۔ مگر بڑے افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میری یاد دہانیوں کے باوجود وہ روپیہ احمد ریاض کی بیوہ تک نہ پہنچ سکا۔ البتہ ساحر کی نیت اور اُس کا خلوص ضرور پہنچا۔

رومان اور انقلاب کا شاعر

حافظ لدھیانوی
لاہور (پاکستان)

یہ پچھلے سال کی بات ہے۔ ساحر لدھیانوی پر یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ ان کی وفات کی خبر آئی۔ قلم رک گیا، آنکھیں بند کر کے ساحر لدھیانوی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کالج کی زندگی سے لے کر تقسیم پاک و ہند تک کے سینکڑوں واقعات نظروں کے سامنے فلم کی طرح آ گئے۔ رفاقت کا ایک ایک لمحہ افق ذہن پر بے شمار یادوں کو لے کر طلوع ہوا۔ یادوں نے ماضی کے سینکڑوں چراغ روشن کر دیئے جنہوں نے رفاقتوں کی منزلوں کو تاباں کر دیا۔ لوگ بچھڑ جاتے ہیں مگر زندگی کی راہوں پر اپنے سفر کے ایسے ایسے نقوش اور ایسے ایسے سنگ میل جوڑ جاتے ہیں جن سے ان کی داستان زندگی مرتب کی جا سکتی ہے۔ ان کے افعال و کردار ان کے ماضی و حال، ان کی زندگی کے مختلف ادوار انکے کارناموں، ان کی دلچسپیوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ بے ثبات زندگی میں مشہور و معرف شخصیتوں نے ایسے کارہائے نمایاں کیے جنہوں نے ان کو ایک مستقل حیات بخش دی۔ وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ مگر ان کی تحریریں ان کی زبان بن گئیں۔ جن کے واسطے سے وہ آنے والی نسلوں سے ہمیشہ ہمکلام رہیں گے۔ لوگ یہ بے صورت آوازیں سنتے رہیں گے اور ان آوازوں کے سحر سے زندگی کے ان گنت گوشوں میں رہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔

ساحر لدھیانوی کا گھرانا علمی و ادبی نہ تھا، نہ اسے شاعری ورثے میں ملی نہ ہی اس کی آنکھ کسی خوبصورت، پاکیزہ ماحول میں کھلی جہاں چاروں طرف علمی اور ادبی مہکار پھیلی ہوئی ہو۔ ماحول نے اسے بے اطمینانی اور بے کیفی دی وہ اس ماحول میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔ معاشرے کا زہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اس نے اس زہر کا تریاق شاعری میں ڈھونڈا۔ اپنے نفرت کے جذبے کو تسکین دینے کے لئے، معاشرے کے کوڑھ کو دوسروں کو دکھانے کے لئے اس نے شاعری کا سہارا لیا جو اس کو قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی تھی۔ مگر یہ فریضہ چند لمحوں کا نہ تھا اس کے لئے عمر درکار تھی۔

ساحر مبلغ تھا نہ مصلح مگر اس کے اندر نماحول کے خلاف بغاوت کا جذبہ موجود تھا۔ وہ تو شاعری کے ذریعے اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کرتا تھا۔ اس کی نظم ”خدایان تقدیس مشرق کہاں ہیں“، اس کے جذبات کی عکاس اس کے مشاہدے کی غماز گھناؤنے

ماحول کے تجزیے کی بہترین مثال ہے۔ اس نظم کا ایک ایک مصرعہ طنز کا زہریلا اور تیز نشتر ہے۔ اس نظم میں احساسات و جذبات کی ایک دنیا آباد ہے۔ یہ نظم زندگی کے چہرے پر بدنما داغوں کو نمایاں کرتی ہے۔ اس نظم کا عنوان چکلے ہے نظم کے ایک دو بند دیکھئے۔

یہ اٹھتی نگاہیں حسینوں کی جانب　　لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب　　خدایان تقدیس مشرق کہاں ہیں

مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی　　یشودھاں کی ہم جنس رادھاں کی بیٹی
پیمبر کی اُمت زلیخا کی بیٹی　　خدایان تقدیس مشرق کہاں ہیں

بلاؤ خدایان دیں کو بلاؤ　　یہ کوچے یہ گلیاں یہ منظر دکھاؤ
خدایانِ تقدیس مشرق کو لاؤ　　خدایانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں

یہ ساحر کا اپنے ماحول کے خلاف فکری اور ذہنی احتجاج تھا جس نے اس نظم میں چیخ کی صورت اختیار کرلی۔ اس نظم کا ایک ایک بند معاشرے کی گھناونی تصویر سے پردہ اٹھاتا معلوم ہوتا ہے۔ اسی نفرت کے جذبے نے ساحر کو معاشرے کے خلاف شعر کہنے پر اکسایا اس کی شاعری کا دائرہ غیر ملکی تسلط کے خلاف، غلامانہ زندگی سے بیزاری اور ماحول سے بغاوت تک پہونچ گیا۔ اس نے سامراج کے مظالم کے خلاف اپنی نحیف آواز بلند مینار پر کھڑے ہوکر بلند کرنا چاہی۔ اس کی شاعری کا آغاز انقلاب کے نعرے سے ہوا۔ اس کی ابتدائی شاعری میں شاعری کم تھی اور نعرہ زیادہ شعر میں وہ پختگی، بات کرنے کا ڈھنگ، زبان و بیان کا آہنگ نامانوس تھا۔ آج بھی مجھے اس دور کے چند اشعار یاد ہیں۔ جن سے اس کی شاعری کے آغاز کا پتہ چلتا ہے۔

مرا کیا ہے مجھے تو کھانسنے میں خون آتا ہے　　چراغ زندگی بجھنے کو ہے اب ٹمٹماتا ہے
مرنے سے دن گزار و اور بہاریں نوجوانی کی　　بھلا میعاد ہی کیا ہے جہاں میں حسن فانی ہے

مجھکو جانے دو میرا منتظر ہے انقلاب　　دیکھ ابھرا چاہتا ہے عصر نو کا آفتاب

ساحر فطرتاً کمزور طبیعت کا انسان تھا۔ لہجے کی درشتی الفاظ کی بلند آہنگی، صوتی طنطنے کے باوجود وہ بہادر انسان نہ تھا وہ دیوار کے پیچھے چیخ و پکار کرسکتا تھا۔ مگر میدان میں ایثار و قربانی کا متحمل نہ ہوسکتا تھا۔ جس جذبے کی شدت سے وہ ماحول کے خلاف آواز بلند کرتا تھا محبت میں بھی وہ انتہائی شدت پسند واقع ہوا تھا۔ کالج کی زندگی میں اس نے کئی معاشقے کئے۔ مگر جذباتی ہونے کی وجہ سے ہر رومان چند دنوں کا کھیل ثابت ہوتا۔ محبت کے آغاز میں ہم نے ہمیشہ محسوس کیا کہ وہ ساحر کا آخری معرکۂ محبت ہے شاید اس معاشقے کے ناکام ہونے کی صورت میں وہ زندہ نہ رہے گا۔ اس کی پرستی آنکھیں، اس کی بے خوابی، اس کا اضطراب، اس کی بے کلی سے ہم نے ہمیشہ یہ سمجھا کہ ساحر نے اس معاشقے میں خود کو جذب کردیا ہے۔ اس زندگی کا ایک ایک لمحہ معاشقے کا شاید

اثر لئے ہوتا۔ مگر ہر بار ہمارا اندازہ غلط ثابت ہوتا۔

میں بی اے کا طالب علم تھا ساحر سے شب و روز کی رفاقت تھی۔ اس لئے ساحر کو قریب سے دیکھنے، اس کی افتادِ طبع کا مشاہدہ کرنے۔ اس کے معاشقوں کو سمجھنے اس کے مزاج کے تلوّن کو محسوس کرنے کے بے شمار مواقع میسر آئے جن کی اگر تفصیل بیان کروں تو دفتر درکار ہے۔

لدھیانہ کے سرکردہ اور سر آوردہ لیڈر رام راج تھے۔ وکالت پیشہ تھا مگر کانگریس کے ایک باوقار اور معزز لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی لڑکی مہندر چوہدری کالج کی طالبہ اور میری ہم جماعت تھی۔ گھریلو ماحول کی وجہ سے اس کے دل میں بھی سامراج کے خلاف نفرت کا جذبہ موجود تھا۔ مگر وہ کھل کر اس جذبے کے اظہار کی قدرت نہ رکھتی تھی۔ اس شرکتِ احساس اور نظریے کی ہم آہنگی نے اسے ساحر کے قریب کر دیا تھا۔ ساحر کی شاعری اور شخصیت سے بے حد متاثر تھی۔ وہ تو ساحر کے اشعار اس کی سوچ، اس کے فکر کی پرستار تھی۔

مہندر چوہدری کوئی سرو قامت اور خوبصورت لڑکی نہ تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک ایسی کشش اور جاذبیت تھی جو اور کسی میں نظر نہ آتی تھی۔ اس کی آنکھیں ہمکلام ہوتیں اور زندگی کی تہوں میں جھانکتی نظر آتی تھیں اس کی آنکھوں کو کنول سے تشبیہ دینا واقعی بے ذوقی کی دلیل تھی۔ اس کی آنکھیں کنول سے زیادہ روشن، جھیل کے پانی سے زیادہ گہری تھیں۔ اس کی خوبصورت آنکھیں ایک سحر آلود نغمہ تھا، ایک آواز تھی، محبت کا پیغام، زندگی کا حسن اور جاذبیت کا ایک عجیب و غریب مرقع تھیں۔

ساحر کی شاعری شعور کی سرحد کو چھو چکی تھی جہاں ادراک رہنمائی کرتا ہے اور فکر و خیال کو روشنی ملتی ہے۔ انہی دنوں کالج یونین کے اجلاس میں ساحر نے انقلابی نظمیں پڑھیں اور کالج کے طلباء میں انتہائی مقبول ہو گیا۔ اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ ماحول کی زنجیروں سے آزاد ہو چکا ہے۔ اس کو مافی الضمیر بیان کرنے کا موقع میسر آگیا ہے۔ وہ گھٹن جو اس نے برسوں محسوس کی ہے گھٹتی جا رہی ہے۔ اگر کسی فنکار کے فن کو سراہا جائے تو اس میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے جو اسے اپنی منزل کی طرف رواں دواں رکھتی ہے۔

مہندر چوہدری کے دل میں ساحر کا احترام پیدا ہو گیا۔ اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کے جذبات،، اس کے احساسات کو ساحر نے زبان دیدی ہے۔ اس کے خیالات و افکار کی ترجمانی کی ہے۔ یہی نظریاتی مطابقت اسے ساحر کے قریب لے آئی۔ اس کی خاموش داد نے کلام کی صورت اختیار کر لی۔ وہ دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ ساحر اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جذب ہو جاتا۔ اس کی روح کی تشنگی بڑھ گئی وہ دیر تک، ہر وقت، ہر جگہ مہندر کی رفاقت چاہتا تھا تاکہ انقلابی نغمے تخلیق کرے، وہ سہارا چاہتا تھا تاکہ جو بات کہنا چاہتا ہے کھل کر کہے۔ مگر یہ کب ممکن تھا۔ ساحر انتہائی شدت سے اسے چاہنے لگا۔

ایک روز ساحر نے مجھ سے کہا، میرے ساتھ چلو۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ہم چلتے چلتے کچہری کے ساتھ ریلوے پل پر پہنچ گئے۔ اس کے قریب مہندر کا گھر تھا۔ ساحر پل کے قریب ٹھہر گیا، اسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ منزل پر پہنچ گیا ہے۔ وہ دیر تک مہندر کے گھر کی طرف دیکھتا رہا۔ خدا جانے مہندر کس کام کے لئے مکان کی چھت پر آئی اور چند لمحے بعد واپس چلی گئی۔ ساحر کے لئے مہندر کی

ایک جھلک زندگی کی لہر تھی۔ ساحر خاموش میرے ساتھ چل رہا تھا۔ کافی دیر تک اس نے گفتگو نہ کی آخر اس نے مُہرِ سکوت توڑی اور کہا حافظ ایک قطعہ ہوا ہے۔ میں نے کہا سناؤ اس نے قطعہ سنایا۔ ؎

سامنے اک مکان کی چھت پر　　منتظر ہے کسی کی اک لڑکی
مجھ کو اس سے نہیں تعلق کچھ　　پھر بھی سینے میں آگ سی بھڑکی

میں نے ہنستے ہوئے کہا ساحر تو پاگل ہو گیا ہے۔

ایک روز کالج سے دیر سے لوٹا، سالانہ امتحانات کے دن قریب تھے۔ میں کالج کے خوبصورت لان میں سالانہ امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ شام ہونے کو آئی۔ میں سائیکل پر ساحر کے گھر پہنچا جو میرے گھر کے راستے میں پڑتا تھا۔ ساحر گھر پر تھا میں نے بے تکلفی سے چائے کی فرمائش کر دی۔ ساحر نے والدہ سے چائے تیار کرنے کے لئے کہا۔ پُر تکلف چائے آگئی۔ ساحر کے گھر میں کئی کئی دفعہ چائے کے دَور چلتے، دوست احباب ملنے آتے۔ چائے کا نیا دور شروع ہو جاتا۔ ساحر دوستوں کے لئے سراپا ایثار تھا۔ وہ دوستوں پر خرچ کر کے انتہائی خوش ہوتا۔ دوست اس کی زندگی کا سرمایہ تھے۔ وہ ان کی رفاقت میں سب کچھ بھول جاتا۔ اُسے اس طرح محسوس ہوتا کہ اس کے چشموں پر مرہم رکھ دیا گیا ہے۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ احباب کی راہ تکتیں تھیں، اس کی والدہ اس کے دوستوں سے ساحر جیسی محبت کرتی۔ ان کی خدمت کر کے خوش ہوتی۔ اس کے لئے یہ احساس ہی کافی تھا کہ ساحر اکیلا نہیں ہے ساحر کی دوست نوازی اس کی زندگی کا حسین و جمیل پہلو ہے۔ وہ دوستوں کے لئے سب کچھ کرنے کیلئے تیار تھا جو اس کے بس میں ہو۔ ساحر سے جو ایکبار ملتا اس کے خلوص اس کی محبت کا معترف ہو جاتا۔ اس میں اپنائیت کا بے پناہ جذبہ تھا اس کے نرم لہجے میں سحر تھا، اس کے چہرے کا تاثر اس کے خلوص کا آئینہ دار تھا۔

چائے آگئی، ساحر اس دن بہت اداس تھا۔ اس کے چہرے پر ایک کرب کی سی کیفیت تھی چہرے پر اداسی شکن در شکن نظر آرہی تھی۔ کسی گہرے رنج و غم کے نشانات تھے۔ اس کے اداس چہرے پر محرومی کے اثرات تو بارہا دیکھے تھے مگر شکستگی کے ایسے جذبات کبھی نظر نہ آئے تھے۔

چائے میز پر چُنی گئی۔ مٹھائی، پھل، گھر کی تیار کی ہوئی چیزیں۔ خوبصورت چائے کا سیٹ۔ میں نے چائے کی پیالی بنا کر رکھی ساحر نے مجھے دوسرے کمرے میں آنے کو کہا، چند اور دوست بھی تھے اس لئے ساحر مجھ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا، کمرے میں داخل ہوتے ہی ساحر کے صبر کا پیمانہ ٹوٹ گیا۔ وہ بند جسے وہ بصد مشکل روکے ہوئے تھا ٹوٹ گیا۔ ساحر کی آنکھوں سے اس طرح اشک برسنے لگے جیسے تیز بارش کے قطرے گرتے ہیں۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے آبشار جاری ہو گئے۔ آنسوؤں کی قطاریں اس کے چہرے پر اداسی کی لکیریں بناتے ہوئے ٹوٹ جاتیں۔ ساحر نے بھرائی ہوئی شکستہ آواز میں کہا مہندر چوہدری کا فوت ہو گئی۔

میں یہ غیر متوقع خبر سن کر حیران ہو گیا۔ مہندر میری ہم جماعت تھی، مودّب، با اخلاق، ہنس مکھ لڑکی۔ ہر ایک سے احترام سے ملتی، انتہائی ذہین لڑکی تھی۔ کالج میں چلتے چلتے ایسا خوب صورت فقرہ کہہ جاتی کہ سننے والا منہ تکتا رہ جاتا۔ ایسے معلوم ہوا کہ اس کا پیکر زندہ ہو کر میرے سامنے آگیا ہے۔ شگفتہ مزاجی، نرم لہجہ، خوبصورت آنکھیں، میں سوچ رہا تھا کہ واقعی وہ مر گئی،

کیا واقعی مہندر چوہدری مر گئی۔ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ ایسے محسوس ہوا کہ بہار کے پہلے پھول کو بے دردی سے شاخ سے جدا کر دیا گیا ہے۔

مہندر کچھ مدت سے بیمار تھی۔ رفتہ رفتہ بیماری طول پکڑ گئی۔ اسے تپِ دق ہو گئی تھی، باوجود علاج کے اور انتہائی احتیاط کے وہ موت کے چنگل سے نہ نکل سکی۔ آخر وہ چلتا پھرتا، ہنستا بولتا پیکر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا وہ آنکھیں جو شاعر کو نئے نئے عنوان دیتی تھیں بند ہو گئیں۔ کچھ دیر ساحر خاموش کھڑا رہا۔ میں جب تصورات کی دنیا سے باہر نکلا تو ساحر کو تسلی دی۔ چائے دھری کی دھری رہ گئی۔

ساحر نے انتہائی عاجزی سے کہا کہ مجھے مہندر چوہدری کی تصویر مہیا کردو، میں تمام عمر تمہارا احسان مند رہوں گا۔ ہم اپنی ایک ہم جماعت شیلا کے گھر کی طرف چل پڑے کیونکہ یہ کام وہی کر سکتی تھی۔ ساحر خشک پتے کی طرح تھا۔ شیلا کو آواز دی وہ آواز سنتے ہی باہر آ گئی۔ اس نے پہلی بات مہندر کی وفات کے بارے میں کی۔ وہ مہندر کے گھر جا رہی تھی ہم بھی ساتھ ہو گئے۔ راستے میں میں شیلا سے تصویر لانے کے لئے کہا۔ وہ ساحر کو دیکھنے لگی جو سراپا التجا تھا۔ اسکو ساحر کی حالت پر ترس آ گیا اس نے تصویر لانے کی حامی بھری۔ ہم مہندر کے مکان کے سامنے لان میں بیٹھ گئے۔ شام کے سائے کسی سوگوار کے غم کی طرح دراز ہو گئے۔ سورج اپنی آخری کرنیں بکھیرتا ہوا غروب ہو گیا۔ آخر شیلا غمزدہ، اُداس، مہندر کی لاش کو دیکھ کر باہر آئی۔ وہ غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔ اس نے بغیر بات کئے مہندر کی تصویر ساحر کو دیدی اور خاموش گھر کو روانہ ہو گئی۔ ساحر نے اپنا مقصد پا کر شکر گذاری کے انداز میں مجھے دیکھا۔ ساحر کو ایسا محسوس ہوا جیسے مہندر اس سے پھر ہمکلام ہو گئی ہو۔ میں افسردہ و پریشان گھر لوٹ آیا۔

دوسرے روز ساحر سے ملاقات ہوئی۔ ساحر لاہور جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا لاہور کیا کام ہے کہا مہندر کی تصویر کو بڑی کراؤں گا۔ یہاں فوٹوگرافر اسے خوبصورت طریقے سے بڑا نہ کر سکیں گے۔ اسے اپنے ڈرائنگ روم میں لگاؤں گا۔ مہندر ہر وقت میرے ساتھ رہے گی۔ میں اس سے باتیں کرونگا۔ ساحر خدا جانے کیا کچھ کہتا رہا میں خاموش اُسے دیکھتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ جذبہ وقتی ہے میں ساحر کی افتادِ طبع سے واقف تھا۔ کئی مرحلوں پر مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ مجھے اس کے اس پاگل پن پر ہنسی آ گئی۔ شام کو ساحر سے پھر ملاقات ہوئی وہ لاہور نہیں گیا چند دن اور گذر گئے۔ مہندر کا تصور ساحر کے دل و دماغ سے محو ہو گیا۔

اس رومانس نے ساحر کے دیوان میں ایک نظم کا اضافہ کیا ساحر شمسان پر گیا۔ مہندر کو چتا میں جلتے دیکھا۔ وہ خوبصورت آنکھیں جو خاموش رہ کر بھی ہمکلام رہتی تھیں شعلوں کی نذر ہو گئیں۔ وہ پیکر،، وہ ہنستا بولتا مسکراتا پیکر راکھ بن چکا تھا۔ ساحر نے "مرگھٹ کی سرزمین" ایک نظم لکھی اس میں جذبے کی شدت تھی۔ ؎

کو ثر ہیں وہ ڈھلی ہوئی بانہیں بھی جل گئیں
جو دیکھتی تھیں مجھ کو نگاہیں بھی جل گئیں

مہندر کا تصور ساحر کے کسی گوشے میں بھی موجود نہ تھا۔ جیسے فلم کا ایک سین ختم ہو جائے تو لوگ دوسرے سین میں ایسے محو ہو جاتے ہیں کہ پہلا سین بھول جاتا ہے۔

میں نے ابتدا میں تحریر کیا ہے کہ ساحر جذباتی انسان تھا اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ نہ تھا۔ اس کے جذبات اس کے احساسات وقتی ہوتے تھے۔ وہ اتنی شدت سے کسی واقعے سے متاثر ہوتا تھا کہ اس کے ساتھی حیران رہ جاتے مگر ساحر اس واقعے کو منظوم کر کے شاید یہ سمجھتا تھا کہ وہ اپنے مقصد کی تکمیل کر چکا ہے۔ ساحر کے دیوان کی ہر نظم کسی نہ کسی حادثے، رومانس یا واقعہ کا نتیجہ ہے۔ مجھے ساحر کی ہر نظم کا پس منظر معلوم ہے۔ ان نظموں میں ساحر کے معاشقے، شاعر کے نظریات، شاعر کی ماحول سے بغاوت اور ساحر کی محرومیاں، ساحر کے جذباتی ہونے کے نقوش ہیں۔ ساحر کی زندگی پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے مگر طوالت کے خوف سے اس کی زندگی کی پرچھائیاں ہی پیش کر رہا ہوں۔

ساحر کا باپ جاگیر دار تھا۔ لامیانہ کے مضافات میں اس کی زمینیں تھیں۔ ساحر کی والدہ سے اس کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ چکی تھی۔ ان حالات کے باوجود ساحر نے غربت و افلاس نہ دیکھا تھا۔ اس کی ہر آرزو پوری ہوتی تھی۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس وہ اب بھی جاگیر دار کے بیٹے کی طرح ہی رہتا تھا۔ آسودہ زندگی تھی اس کو اپنے ذاتی اخراجات میں کبھی تنگی نہیں ہوئی۔

ساحر کا قد لمبا۔ منہ پر چیچک کے خفیف نشانات تھے، ناک لمبی، آنکھیں بہت خوبصورت جن پر دراز پلکیں غزل کے حروف کی طرح باتیں کرتی معلوم ہوتی تھیں۔ باریک باریک دانت اور لمبے لمبے بال تھے۔ جنھیں وہ ہاتھوں سے درست کرتا رہتا تھا۔ مخروطی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھی، نرم گفتگو، لہجے میں محبت اور پیار کی خوشبو، جس سے کوئی شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ اس سے ایک بار مل کر دوبارہ ملنے کو جی چاہتا تھا۔

ساحر کی رہائش بالاخانے پر تھی، نیچے ایک کمرہ تھا، دو کمرے بالائی منزل پر تھے۔ مکان کے سامنے چھوٹے چھوٹے کمروں میں کوئلہ چننے والیاں اور مزدوری کرنے والے لوگ رہتے تھے۔ کوئلہ چننے والیاں سارا دن ریلوے لائن پر بکھرے ہوئے کوئلے اکٹھا کرتیں اور میلے بدبودار کپڑے میں انہیں باندھ کر دکانداروں کے ہاتھ بیچتیں۔ ان کا چھٹا لباس تھا، ان کے جسموں پر جابجا کوئلے کی سیاہی پھیلی ہوئی ہوتی۔ یہ سب غربت کے نشانات، افلاس کی تصویریں، مظلومیت کے پیکر شب و روز ساحر کے سامنے رہتے۔ یہ ساحر کی شاعری کے موضوع بنے

"سال نو" نظم میں ساحر تاریکی کے گناہ کو روز روشن میں عوام کو دکھانا چاہتا تھا۔ وہی ایک وقتی جذبہ تھا۔ ساحر کو ان سے کبھی ہمدردی پیدا نہ ہوئی۔ "جشن مناؤ سال نو کے" یہ نظم اسی احساس کی تصویر ہے۔ یہ نظم اس کی شاعری کا موضوع بنی، اس کے دیوان میں ایک اور نظم کا اضافہ ہو گیا۔

ساحر کی ایک اور نظم "کسی کو اداس دیکھ کر" اس کے مجموعۂ تلخیاں میں شامل ہے۔ اس نظم کا محرک بھی ایک رومان ہے جو کالج کے زمانے میں واقع ہوا۔ اس نظم کے پس منظر میں بھی ساحر کا معاشقہ جھانک رہا ہے۔ بریندر کور دبلی پتلی تیکھے نقوش والی لڑکی تھی۔ خد و خال کے اعتبار سے نقش چغتائی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی نیم باز آنکھیں اس کے چہرے کے خطوط اس کا نرم و نازک پیکر چغتائی کی مصوری کی جیتی جاگتی تصویر تھی جو چلتے پھرتے وجود میں جلوہ گر تھی بریندر ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی، اس کی کیفیت اس کا مزاج، اس کے انداز دوسری

لڑکیوں سے یکسر مختلف تھے۔

برِیندر کور ہوسٹل میں رہتی تھی۔ کالج کا ہوسٹل کالج کے قریب ہی تھا۔ لڑکیاں پیدل بآسانی کالج آسکتی تھیں۔ ساحر کالج کی دیوار کے ساتھ لگ کر برِیندر کور کو دیکھتا رہتا۔ برِیندر لڑکیوں کے درمیان چلتی تاکہ ساحر کی نظر اس پر نہ پڑ سکے۔ مگر برِیندر تو ساحر کی شاعری کا موضوع، اس کے احساسات کا پیکر تھی۔ وہ اسے نغمے کی لہر معلوم ہوتی تھی جس کی آواز وہ بن سکتا تھا۔

ساحر کالج کی یونین سوسائٹی کا صدر تھا۔ اس کے ذہن سے پرانے معاشقے گرد کی طرح جھڑ چکے تھے۔ اس نے ایک روز برِیندر کو یونین کے جلسے میں شرکت کے لئے کہا۔ اس غیر متوقع سوال پر برِیندر پر عجیب و غریب کیفیت طاری ہوئی۔ وہ جو خود سے شرمائی رہتی تھی اتنے لڑکے اور لڑکیوں کے سامنے کیسے کچھ کہہ سکتی تھی۔ اس نے ساحر سے کہا کہ وہ کچھ نہیں جانتی۔ ساحر نے بات کو طول دینے کی غرض سے کہا کہ قومی گیت ہی سنا دینا۔ ساحر کو معلوم تھا کہ ہوسٹل میں چند لڑکیاں رات کی تنہائیوں میں گیت گاتی تھیں۔ ان میں برِیندر بھی تھی۔ ساحر نے گیت سنانے کی فرمائش کی اور گفتگو کرتا رہا وہ زمین پر نظریں گاڑے ساحر کی باتیں سنتی رہی۔ ہوسٹل کی لڑکیوں نے برِیندر کو ساحر سے گفتگو کرتے دیکھا۔ ان کو ساحر کے پرانے معاشقوں کا علم تھا۔ ہوسٹل میں بات کو پَر لگ جاتے ہیں۔ چند دن ہوسٹل میں گفتگو کا موضوع ساحر کا نیا معاشقہ رہا۔

چند روز بعد ساحر نے پھر برِیندر سے مطالبہ کیا، اس میں شک نہیں کہ برِیندر کی آواز بہت خوبصورت تھی۔ ہندو لڑکیاں کہا کرتی تھیں کہ تمہارے گلے میں بھگوان بول رہا ہے مگر برِیندر نے کسی جلسے میں حصّہ نہ لیا۔ وہ تو تنہائی میں اپنی آواز کے جادو سے اپنی ہی دنیا آباد کرنا جانتی تھی۔ اس نے ساحر سے معذرت چاہی، مگر ساحر کے پاگل پن نے اسے یونین میں حصّہ لینے پر مجبور کر دیا۔ ساحر خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ ساحر کی گفتگو سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اس کی باتوں میں عجیب کشش تھی وقتی طور پر ہی سہی مگر وہ ٹوٹ کر محبت کرتا تھا۔ یقین نہ آتا تھا کہ محبت کا یہ طلسم جلدی ٹوٹ جائے گا۔ برِیندر سے ملاقاتیں طول پکڑ گئیں، برِیندر کے دل میں محبت کا پہلا بیج بویا جا چکا تھا۔ اس کے دل کے ورقِ سادہ پر محبت کا پہلا نقش تھا۔ ساحر کے اردگرد نغموں کی دنیا آباد ہو گئی۔ اب ہر طالب علم کی زبان پر ساحر کے معاشقے کی داستان تھی۔ ہر کوئی برِیندر کو معنی خیز نظروں سے دیکھتا تھا۔ ہوسٹل میں تو لڑکیاں ہر وقت برِیندر کو تنگ کرتیں، طرح طرح کی باتیں بناتیں، برِیندر خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی۔ رفتہ رفتہ اس کے معاشقے کا ذکر کالج کے حدود سے باہر تک پھیل گیا۔ برِیندر کور کو بدنامی کا خوف پیدا ہوا۔ طرح طرح کے خیال اس کے ذہن میں الجھے ہوئے تاروں کی طرح ابھرتے ہیں، انہیں سلجھا نہ سکتی۔ وہ رات گئے تک سوچتی کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ آخر ایک دن اس نے ساحر سے نہ ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ساحر سے کہا کہ آئندہ وہ اس سے نہ مل سکے گی۔ یہ فیصلہ برِیندر کے لئے بہت بڑا فیصلہ تھا۔ وہ کھوئی کھوئی اداس رہنے لگی، وہ لڑکیوں سے الگ کمرہ بند کر کے پہروں روتی۔ ساحر کو اس اچانک فیصلے سے انتہائی صدمہ ہوا۔ آخر اس نے "کسی کو اداس دیکھ کر" نظم لکھی اور برِیندر کی زندگی کو احساسات کا لبادہ پہنایا۔ اس نظم کا پس منظر کالج کا ہر لڑکا اور لڑکی جانتی تھی اس نظم نے اس معاشقے کو اور بھی اچھالا۔

کالج میں چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ ہوسٹل میں چند لڑکیاں تھیں۔ ساحر نے خدا جانے کس طرح برِیندر کو کالج سے بلوایا کالج خالی تھا۔ برآمدے میں ملاقات ہوئی۔ ساحر، برِیندر کو دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس خفیہ ملاقات کا پرنسپل صاحب کو علم ہو گیا۔ برِیندر کو کالج سے نکال دیا گیا۔ برِیندر کے والدین کو جب اس کا علم ہوا تو اس کی کڑی نگرانی کرنے لگے۔

برینیدر لدھیانہ کے قریب ایک گاؤں میں رہتی تھی، ساحر فراق میں سلگتا رہا۔ اس کی بے خواب آنکھیں ہجر کی راتوں اور ساحر کے اضطراب کی شاہد تھیں۔ ایک دن ساحر علاؤالدین اختر کے گھر آیا۔ ساحر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جیسے بچے اچانک کھلونا ٹوٹ جانے سے بے ساختہ رونے لگتے ہیں۔ اس نے ملتجی نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور کہا کہ وہ اسے برینیدر سے ملوادیں۔ ہم نے ساحر کو سمجھانے کی انتہائی کوشش کی کہ سارا سکھوں کا گاؤں ہے۔ ان کی اگر تم پر نظر پڑ گئی تو وہ تمہیں ایسا غائب کریں گے جیسے کبھی تمہارا وجود تک نہ تھا۔ مگر ساحر تو پاگل ہو رہا تھا۔ ہوش کی باتوں کو سوچنے اور سمجھنے کا اُسے ہوش کہاں تھا۔ غلام مرتضےٰ، علاؤالدین اختر راقم الحروف اور ساحر سائیکلوں پر برینیدر کی گاؤں، کی طرف روانہ ہوگئے۔ ساحر کو گاؤں تک پہنچا کے ہم واپس آگئے۔ ہمارا خیال تھا کہ ساحر زندہ نہ بچ سکے گا۔ خدا جانے ساحر رات کہاں رہا کیسے برینیدر سے ملاقات کی دوسرے دن ساحر کو زندہ سلامت دیکھ کر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔

چند دنوں بعد ساحر کو لاہور منتقل ہونا پڑا۔ لدھیانہ کالج کی زندگی کا باب ختم ہوگیا۔ اس کالج کی زندگی نے اسے شاعری کا ایک خوبصورت مجموعہ "تلخیاں" دیا جس کی تقریباً تمام نظمیں کالج کے ماحول کی ترجمان اور عکاس ہیں۔ اس کے باغیانہ گیت اس کی رومان پرور نظمیں، اس کے معاشقے، اس کی جذباتی شاعری اس کی ہنگامی نظمیں، کالج کی فضا کی مرہون ہیں۔ اس کی داستانیں کالج کے ماحول کا ایک حصہ بن گئیں۔ اس نے بی۔ اے نہ کیا مگر اس ماحول نے اسے ایک خوبصورت رومانی اور انقلابی شاعر بنا دیا۔

ساحر کو فلمی دنیا سے بچپن ہی سے دلچسپی تھی۔ اس کی دلچسپی جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے بہت سی فلموں کی تصویریں ایک بڑی سی کاپی میں چسپاں کر رکھی تھیں، جب اس کے دوست اسے ملنے جاتے تو وہ اکڑوں بیٹھ کر اس کاپی کے ورق الٹتا جاتا اور بتاتا کہ اس ایکٹر نے فلاں فلم میں کام کیا ہے۔ اس ایکٹرس نے فلاں فلم میں کام کیا ہے۔ یہ ضخیم کاپی تھی، ہم تنگ آکر کاپی اس کے ہاتھ سے چھین لیتے، اس کو کردار، کرداروں کے ڈائیلاگ، ہر فلم کی کہانی، فلم پروڈیوسر کا نام، ہیرو کا نام تک یاد تھا۔ وہ زبردستی دوستوں کو فلم دکھانے لے جاتا۔ اس کاپی کو ہم چھین لیتے تو ماسٹر رحمت کا دیوان کھول لیتا۔ ماسٹر رحمت ان دنوں فلموں کے گانے لکھنے کے لئے مشہور تھا۔ کالے خاں کا مشہور تھیٹر تھا ان دنوں تھیٹر کا بہت رواج تھا۔ لوگ اسٹیج پر اداکاری دیکھ کر خوش ہوتے، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، یہودی کی لڑکی وغیرہ فلمیں بہت مشہور تھیں، ماسٹر رحمت ہر موقع کے لئے گانے کہتا گانے کیا تھے، سطحی جذبات کو بے ہنگم شاعری کی شکل دی گئی۔ ساحر مزے لے لے کر اس کے اشعار پڑھتا، مثال کے طور پر اس طرح کے شعر ہوتے ؎

خود ہی وہ پوچھتے ہیں دل میں سوراخ کیوں ہے
تیر نظر کو میرے سینے کے پار کر کے

غرضیکہ اسی قسم کی خرافات ہوتی مگر ساحر ہمیں ماسٹر رحمت کے اشعار ضرور سناتا۔ اس کی شاعری اور بے تکے اشعار پڑھ کر انتہائی محظوظ ہوتا۔ اسے کیا خبر تھی کہ فلم اس کی زندگی سے وابستہ ہو جائے گی اور وہ فلمی گیت میں ادبی کارنامہ سر انجام دے گا۔

ساحر نے کئی دفعہ بمبئی جانے کا ارادہ کیا، مگر اکیلے جانے کا حوصلہ نہ تھا۔ ساحر کی شاعری بلوغت کو پہنچ چکی تھی۔ اس نے ایک نظم "تاج محل"، تحریر کی، یہ نظم مغل بادشاہ کی عظیم تعمیر کا مذاق تھا۔ مگر نوجوانوں کے لئے یہ جذباتی نظم تھی یہ نظم دہلی کے مشہور جریدے "آج کل"

میں شائع ہوئی اس کا مقدمہ احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا۔ ساحر کی شاعری اور شہرت میں یہ نظم سنگِ میل ثابت ہوئی۔ اس نظم سے ساحر سارے ہندوستان میں مشہور ہوگیا۔ ؎

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

اس نظم کا پس منظر وہی احساس کمتری تھا جس کا ساحر شروع ہی سے شکار تھا شاعری کا حسن اور الفاظ کا دروبست بہت خوبصورت تھا۔

اس کا پہلا مجموعہ "تلخیاں"، جذباتی، رومانی اور انقلابی شاعری کا دلکش امتزاج تھا۔ اس مجموعے کی اشاعت سے ساحر کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ ساحر نے لدھیانہ کے ممتاز شعراء سے اکتسابِ فیض کیا ان میں خاں اصغر حسین خاں نظیر فاخر ہریانوی، حسن لطیفی، آغا اعجاز اکرم یوسفی اور دوسرے بزرگ شعراء شامل تھے۔ لدھیانہ کے ادبی ماحول نے ساحر کو بہت کچھ دیا۔ اس نے ان بزرگوں سے استفادہ کیا وہ گھنٹوں ان اساتذہ کی خدمت میں لگاتار اکتسابِ ہنر کرتا۔

ساحر مذہب سے بالکل بے گانہ تھا۔ ملحدانہ خیالات باغیانہ افکار اور انقلابی ذہن نے اسے مذہب سے بغاوت پر آمادہ کیا۔ ؎

خدا اک وہم ہے مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

مذہب سے نفرت میں اس کے خاندانی حالات اور ماحول کا بھی دخل تھا۔ اس کے اردگرد کا ماحول تاریک تھا اسے ایسی سوسائٹی میسر نہ آئی جو اس کے دل کی تاریکی دور کرسکتی۔ وہ ابتدائی دور میں فیض احمد فیض اور جوش سے بہت متاثر ہوا۔ فیض احمد فیض کی آواز نئی آواز تھی۔ اس کی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"، نے نوجوان شعراء کے افکار کا رخ انقلابی شاعری کی طرف پھیر دیا۔

ساحر اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوگیا، زمانے میں گوپال متل، عبدالمجید بھٹی، دیوندر ستیارتھی، کرشن چندر، ہری چند اختر، حفیظ ہوشیارپوری نوجوان ادیب تھے۔ حفیظ جالندھری، عابد علی عابد، احسان دانش، تاثیر، صوفی تبسم بزرگوار میں سے تھے۔

ساحر نے کالج کی زندگی کو تعلیمی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہ بنایا۔ شاعری ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اس پر اشتراکیت کا غلبہ تھا۔ یہ اشتراکیت کا جذبہ اس کی ذہنی آسودگی اور اظہارِ خیال کا ایک ذریعہ تھا۔ اس کی کم ہمتی عملی اقدام میں مانع تھی۔ وہ الفاظ کا خوبصورت جال بن سکتا تھا۔ وہ صرف نظموں کے ذریعے مفلس و نادار اور رعلما اور ادبا، و نکبت کے مارے ہوئے مظالم کے لتاڑے عوام کا رونا رو سکتا تھا۔ اس کو توجیل کے تصور سے بھی خوف آتا تھا۔ یہ نظریہ بھی اس کا اپنا نہ تھا کمیونسٹ دوستوں کی محبت کی وجہ سے اس نے یہ نظریہ وضع کیا۔ دوسرے کمیونسٹوں کی طرح انقلاب کا نعرہ اس کے حلق سے نیچے نہ اترا تھا۔ اس کا رہن سہن اس کا لباس اس کی طرزِ زندگی اس کے نظریے بالکل مختلف تھے

ساحر نے جلد ہی اسلامیہ کالج کو خیر باد کہہ دیا لا کالج میں ہمارا ایک ہم جماعت غلام مرتضیٰ زیر تعلیم تھا۔ شام کو اُن کے کمرے میں شعراء اکٹھا ہوتے۔ ساحر گوپال متل، دیوندر ستیارتھی وغیرہ مرتضیٰ کے کمرے میں شام ہوتے ہی پہنچ جاتے۔ ان میں سے زیادہ تر کمیونسٹ شاعر تھے۔ انہی دنوں ان دوستوں کی کوشش سے ساحر "ادب لطیف" کا ایڈیٹر ہوگیا۔ ادب لطیف کا مدیر ہونا بہت بڑا اعزاز تھا۔ چند مقبول ترین جریدوں میں ایک ادب لطیف تھا۔ ساحر کو اپنے جذبات کے اظہار کا ایک موثر ذریعہ ہاتھ آگیا۔ اب ساحر کو سوائے شاعری کے کوئی کام نہ تھا۔ انقلابی شاعری کا رجحان تھا۔ انقلابی نظمیں اس رسالے میں شائع ہوتی تھیں ترقی پسند مصنفین کی تحریک زوروں پر تھی ساحر اس تحریک سے وابستہ تھا۔ احمد ندیم قاسمی، الطاف مشہدی، گوپال متل کرشن چندر، عارف عبدالمتین، احمد راہی، عصمت چغتائی وغیرہ اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ یہ سب ادیب ایک مکتبۂ فکر کے تھے اس ماحول نے ساحر کے نظریات و افکار کو جلا بخشی۔

ساحر لدھیانوی امرتا پریتم کی شاعری اور شخصیت سے بے حد متاثر ہوا۔ جیسا کہ اوپر تحریر کر چکا ہوں کہ ساحر کسی کی شخصیت کسی کے فن کسی کے کمال سے فوری طور پر متاثر ہوجاتا تھا اور شدید طور پر اس کا ردعمل کرتا اس نے امرتا پریتم کی پنجابی نظموں کا اردو نظم میں ترجمہ کرکے ادب لطیف میں شائع کی۔ امرتا پریتم بہت خوبصورت با وقار شخصیت تھی۔ ظاہری میں اسے وافر حصہ ملا تھا۔ اس نے ایک دن ساحر سے اس کے دوستوں کے بارے میں کہا کہ تمہارے دوست غلط ہوتے ہیں اور یہ مفلس دوست تمہاری دوستی کے لائق نہیں ساحر کے روح کو جیسے تازیانہ لگا، اسے ایسے محسوس ہوا کہ اس کے خلوص کے محل کو گرا دیا گیا ہے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ ساحر دوستوں کے لئے سراپا ایثار تھا۔ دوست اس کا سرمایہ تھے۔ ساحر نے ایک نظم لکھی جس کا عنوان تھا "مادام"، نظم کچھ ایسے تھی۔

آپ کہتی تھیں تو ٹھیک ہی کہتی ہوں گی

میرے ماحول میں انسان نہ رہتے ہونگے

امرتا پریتم اور ساحر کی محبت کی داستان عام ہوگئی ادیبوں میں ان کے چرچے ہوئے ساحر جب لدھیانہ آتا تو لاہور کی داستانیں، بعض احباب کی منافقت، اپنے نئے نئے عشق کی کہانی مزے لے لے کر سناتا۔ اس کو ان تجربات کے بعد ادیبوں کی نفسیات سمجھنے کا فن آگیا تھا۔ جس سے اس نے بہت فائدہ اٹھایا۔ ساحر پر مضمون لکھے گئے۔ اس کی شاعری کو سراہا گیا۔ نوجوان طبقہ اس کی جذباتی شاعری کا سے بے حد موثر ہوا۔

تقسیم پاک و ہند کے بعد ساحر کچھ مدت لاہور ٹھہرا اس نے اپنی والدہ کے ساتھ میکلوڈ روڈ پر سکونت اختیار کرلی۔ لاہور میں ایک دوبار سرسری ملاقات ہوئی۔ پریشانی کا عالم تھا اس لئے اس سے تفصیلی ملاقات کا موقعہ ہی نہ ملا۔ اس کے بعد وہ بمبئی چلا گیا۔ بمبئی وہ ایک بار پہلے بھی گیا۔ اس کا دیوان تلخیاں بہت مقبول ہو چکا تھا۔ بمبئی کے قیام میں ایک سیٹھ نے فلم کے گانے لکھنے کے لئے اسے بلایا۔ سیٹھ نے ساحر کی عمر اور چہرے مہرے کو دیکھ کر دریافت کیا آپ ساحر لدھیانوی ہیں۔

جی ہاں میں ساحر ہوں۔

اس نے دراز کھولا اور حیرت سے ساحر کے چہرے کی طرف تکتے ہوئے تلخیاں نکال کر پوچھا کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے؟

جی ہاں

سیٹھ نے دوبارہ ساحر کو دیکھتے ہوئے کہا، نہیں، نہیں، تم ساحر نہیں ہوسکتے وہ تو عظیم شاعر ہے تم ابھی بچے ہو، یہ کہہ کر ساحر کو رخصت کر دیا۔

تقسیم پاک و ہند کے بعد ساحر نے فلمی دنیا میں نام پیدا کیا۔ اس کی شاعرانہ حس نے فلمی دنیا کو ادب سکھایا، گیت کو نیا آہنگ اور نیا رنگ دیا۔ اس کے گیت پاک و ہند میں بہت مقبول ہوئے۔

ساحر نے گھریلو زندگی میں جس چیز کی خواہش کی اُسے ملی۔ دولت، شہرت، نگینہ شراب۔ مگر اسے گھریلو زندگی کی آسودگی نصیب نہ ہوسکی۔ اسے وہ سکون میسر نہ آسکا جس کی وہ زندگی بھر جستجو کرتا رہا۔ زندگی گذارنے کے ساتھ ساتھ اس کی تلخیاں بڑھتی گئیں۔ اس تلخی کو وقتی طور پر بھلانے کے لئے اس نے شراب میں خود کو غرق کرنا چاہا۔ مگر شراب بھی اسے ابدی سکون نہ دے سکی۔ اس کی زندگی کا ایک ہی سہارا اُسکی والدہ تھی۔ وہ ہمیشہ ساحر کے ساتھ رہی۔ والدہ کو دیکھ کر اسے اپنی تنہائی کا احساس نہ رہتا۔ اور اس کی شفقت بھری نظروں میں تمام غم بھول جاتا، چلچلاتی دھوپ میں وہی ایک سایہ تھا۔ آخر یہ سہارا، یہ سایہ بھی اٹھ گیا۔

اب اسے تنہائی کا زہر شدت سے محسوس ہوا۔ حمید اختر اس سے ملنے گئے، انھوں نے بتایا کہ وہ سارا دن خاموش لیٹا رہتا ہے۔ اس کا مزاج چڑچڑا ہو گیا ہے۔ اس کی قوت برداشت جواب دے چکی ہے۔ اس کو دل کا عارضہ ہو گیا تھا۔ شراب نے اس کے جسم کو کھوکھلا کر دیا آخر وہ دن آگیا جب البیلا شاعر فلمی دنیا کا مقبول ترین گیت لکھنے والا، نوجوانوں کا محبوب شاعر، شہرت کی منزل پر پہنچنے والا، دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا، محرومیوں کا مجسمہ، ادب کے اُفق پر غروب ہو گیا۔

☆

کٹّی کا شاعر

یوسف ناظم

کئی سال ہوئے ساحر لدھیانوی کے مکان جسے دولت خانہ ہی کہنا چاہیئے پرچھائیاں میں ایک بہت بڑی دعوت تھی ۔ مہمانوں کی فہرست ساحر کی ناک کی طرح لمبی تھی ۔ بمبئی کے سبھی لوگ موجود تھے ۔ ادیب شاعر فن کار موسیقار فلم ساز فلم بین وزرا عہدہ دار ۔ چیف گیسٹ سجاد ظہیر مرحوم اور اندر کمار گجرال تھے ۔ اندر کمار گجرال اس وقت روس میں سفیر ہند تھے ۔ معلوم نہیں مجھے کس طرح دعوت مل گئی تھی ۔ کسی اور کے ہاں تو لوگ شاید دعوت کے بغیر چلے جاتے ہوں گے لیکن ساحر کے یہاں اپنا دعوت نامہ ساتھ لے جاتے تھے ۔ شاید ساحر پوچھ بیٹھیں ۔ جہاں تک دعوت کا تعلق ہے اچھے خاصے ولیمے کی دعوت معلوم ہو رہی تھی ۔ قوالی تک کا اہتمام تھا ۔ لیکن وہ ولیمہ کیسے ہو سکتا تھا ۔ ساحر نے تو شادی ہی نہیں کی تھی ۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ساحر کو شروع ہی سے کسی بھی رنگ بہار کا اثبات نظر نہیں آیا ۔ ہر رسم ، ہر رواج ، اور ہر جشن اور نظام ہی سے نہیں ساحر کو ہر چیز سے کد تھی ۔ ہر شخص سے کٹّی ۔ بات بات پر کٹّی ۔ ساحر کٹّی کے معاملے میں بہت فرماں بردار تھے ۔ ان کی جھنگلی بس کٹّی ہی کے کام میں مصروف رہی ۔

ساحر لدھیانوی کی پہلی کٹّی اپنے والد سے ہوئی ۔ یہ اس وقت بچے رہے ہوں گے کوئی ۷ سال کے لیکن یہ یوں والی کٹّی نہیں سچ مچ کی کٹّی تھی ۔ مستقل اور مستحکم ۔ ان کی زندگی میں انحراف ، انکار ، احتجاج نے اسی کچی عمر میں سر ابھارا اور حالات نے اس طرز عمل کو پختہ کر دیا ۔ لوگ عدالت ضرور جاتے ہیں لیکن عموماً بالغ ہونے کے بعد ۔ ساحر سات سال کی عمر میں عدالت کے دروازے پر پہنچ گئے ۔ معاملہ بالکل گھریلو تھا ان کے والد اور والدہ نے ایک دوسرے سے الگ الگ رہنا طے کیا تھا اور سوال تھا کہ ساحر کس کے ساتھ رہیں ۔ عدالتیں صرف بالغوں کے لئے کی نہیں ہوتیں ۔ ان میں اڈلٹ فرنچائز (Adult Franchise) کی بھی قید نہیں ہے ۔ عدالت نے ساحر سے پوچھا ۔ لڑکے تم اپنا ووٹ کسے دو گے ؟ ۔ ڈئیلاگ یہ نہیں کچھ اور تھے لیکن مطلب یہی تھا ۔ ساحر نے اس امیدوار کو ووٹ دیا جس کی ساری امیدیں ان سے وابستہ تھیں ساحر عمر بھر اپنی والدہ کا سہارا اور آنکھ کا تارا بنے رہے ساحر صرف ماں کے آگے جھکے اور دبے ورنہ ہر جگہ ان کی ناک اور ٹانگ اونچی رہی ساحر کے والد لدھیانہ کے بڑے اور مقتدر زمیندار تھے اور بڑی شاہانہ زندگی گذارتے تھے لیکن ساحر کا جب ان سے

خلاصہ ہو گیا تو ظاہر ہے ساحر کی پرورش اور تعلیم کی ذمہ داری والدہ اور ماموں کے سر رہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ساحر نے دل لگا کر پڑھا اور لدھیانہ کے خالصہ کالج سے انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہیں کے گورنمنٹ کالج میں انہوں نے داخلہ بھی لے لیا لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی سرگرمیاں جن میں گرمی ذرا زیادہ ہی تھی جاری رکھیں۔ جب وہ بی اے کے آخری سال میں پہنچے تو ان کے انگریز دشمن ہونے کی شہرت اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ کالج سے انہیں نکال دیئے جانے کی نوبت آ گئی۔ ان دنوں انگریز دشمنی اپنے آپ سے دشمنی تھی اور انہیں بآسانی رسٹی کیٹ کیا جا سکتا تھا کیونکہ کالجوں میں سر پھرے اور دل جلے طالب علموں کے ساتھ یہی اٹھٹی کیٹ برتا جاتا تھا۔ ساحر کو جب یہ خبر ملی کہ انہیں کالج بدر کیا جانے والا ہے تو خود انہوں نے پیش قدمی کی اور کٹی لے لی۔ یہ ان کی دوسری اہم کٹی تھی۔ پہلی کٹی کی وجہ سے وہ والد کی دولت کے حصہ دار نہیں بن سکے اور دوسری کٹی نے انہیں بی اے کی ڈگری سے محروم رکھا۔ بیچلر آف آرٹس کی ڈگری نہ پانے کا انتظام انہوں نے یوں کیا کہ عمر بھر بیچلر رہے۔ یہ بھی کوئی معمولی آرٹ نہیں۔ ساحر نے گورنمنٹ کالج ہی نہیں چھوڑا۔ لدھیانہ ہی چھوڑ دیا اور لاہور چلے آئے۔ چھوٹی کٹی کے وہ قائل تھے ہی نہیں۔

ساحر کی تیسری اہم اور یادگار کٹی شاہ جہاں سے ہوئی حالانکہ شاہ جہاں کو وفات پائے ہوئے صدیاں ہو چکی تھیں لیکن ساحر جب کٹی پر تُل جاتے تھے تو یہ تھوڑے ہی دیکھتے تھے کہ جس سے وہ کٹی لے رہے ہیں وہ زندہ ہے بھی یا نہیں۔ شاہجہاں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر ان کا کچھ بگاڑا بھی نہیں تھا۔ وہ تو بیچارا خود زخم خوردہ تھا۔ آگرے کے قلعے کے روزن سے اس عمارت کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھا رہتا تھا جس میں اس کی رفیقہ حیات دفن تھی۔ ساحر کو یہ عمارت بالکل پسند نہیں آئی اور کیوں پسند نہیں آئی اس کی وجہ سارا ہندوستان جانتا ہے۔ ساحر جگہ جگہ جاتے اور سب کو اپنی ناپسندیدگی کی وجہ خود بتاتے تھے اور بعد میں لوگ فرمائش کر کے ان سے اس کٹی کی وجہ سنا کرتے تھے۔

تاج میرے لئے ایک مظہر الفت ہی سہی　　تجھ کو اس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے　　بزم شاہی میں غریبوں کا گذر کیا معنی
ثبت جس راہ میں ہوں سطوت شاہی کے نشاں　　اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی

اور بھی بہت سی بڑی بڑی باتیں کہی ہیں لیکن یہ دو شعر تو غضب کے ہیں

یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارا یہ محل　　یہ منقش در و دیوار یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر　　ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

بے چارا شہاب الدین شاہ جہاں۔

ساحر نے اپنی نظم تاج محل کچھ نہیں　　تو کم سے کم دو ہزار مرتبہ تو ضرور پڑھی ہوگی۔ وہ جب بھی کسی مشاعرے میں جاتے شاہ جہاں سے کٹی والی نظم ضرور سناتے یعنی انہیں سنانی ہی پڑتی۔ اس نظم کے جواب میں بھی نظمیں کہی گئیں اور ایک مشاعرے میں اچھا خاصا سنگلز کا مقابلہ ہو گیا۔ سرینگر کے مشاعرے میں ساحر سے ان کی یہ نظم فرمائش کر کے سنی گئی اور اس کے فوراً بعد شمسی مینائی سے ان کی نظم تاج محل سنی گئی جو اب کے جواب میں کہی گئی تھی۔ اس کی بھی فرمائش ہی کی گئی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے کیا ہوا۔ اِن دو تین جملوں کا عنوان جملۂ معترضہ ہے

ساحر نے لاہور میں ادب لطیف،　　　اور سویرا کی ادارت کے بھی فرائض انجام دیئے۔ پرکاش پنڈت یہیں ان کے

دوست بنے اور ایسے دوست کہ جب انہوں نے ساحر کا کلام چھاپا تو اس کے انتساب میں لکھا " ساحر کی اَنّی کے نام۔ جو میری بھی اَنّی ہیں"
لاہور میں تو ساحر کے دوستوں اور پرستاروں کی کمی نہیں تھی۔ جگن ناتھ آزاد بھی ان کے عاشقوں میں تھے۔ جاں نثار اختر کا ذکر کرتے ہوئے
جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے " اس کے چند برس بعد جاں نثار اختر سے گیا کے ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی۔ ساحر لدھیانوی بھی ساتھ تھے
ہم تینوں کا قیام سرکٹ ہاؤس میں تھا۔ ساحر کے ساتھ تو میرا دل و جان کا تعلق ایک مدت سے چلا آرہا تھا۔" لیکن ساحر کو لاہور سے بھی
کٹی لینی پڑی۔ اس میں ان کی عادت کو کم اور ضرورت کو زیادہ دخل تھا چکر تھا تلاش معاش کا۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں بمبئی آگئے اور یہیں انہوں نے
زندگی سے کٹی لی۔

ساحر نے شاعری کے معاملے میں ہمیشہ نفی سے کام لیا اور اسی نفی سے نفع کمایا۔ اپنی نظم چکلے میں تو وہ صرف اہل وطن یا صرف برّاعظم
ایشیا کے لوگوں سے نہیں۔ سارے اہل مشرق سے آمادہ بہ کٹی ہیں سنیے۔

یہ پرپیچ گلیاں　　　یہ بے خواب بازار
یہ گمنام راہی　　　یہ سکّوں کی جھنکار
یہ عظمت کے سودے یہ سودوں پہ تکرار　　　ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

ان کی ہر نظم کا یہی لب و لہجہ ہے۔ کٹی کا جذبہ ہر جگہ نمایاں ہے۔ جاگیر میں دیکھیے۔

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں　　　ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
کس میں جرأت ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے　　　سب کے لب پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے

اور کٹی کا یہ شاعر، نورجہاں کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے نہیں جاتا یہ کہنے جاتا ہے۔

کیسے مغرور شہنشاہوں کی تسکیں کے لیے　　　سالہا سال حسیناؤں کے بازار لگے
کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیّش کے لیے　　　سرخ محلوں میں جواں جسموں کے انبار لگے

اب نورجہاں کی قبر پر جا کر ساحر صاحب کو جہانگیر کی یاد کیوں آئی لیکن وہ اپنی جھنجھلاہٹ کو یہاں بھی قابو میں نہیں رکھ سکے تاج
محل، نورجہاں کی قبر پہ جا کر یہ تو خیر ایک لحاظ سے ٹھیک نظمیں ہیں اور شاعر آزاد ہے کہ ان کے بارے میں جو چاہے کہے لیکن ساحر نے اپنے ایک
دوست کی شادی کی تقریب پر یہ شعر کہا۔

یہ شادی خانہ آبادی ہو میرے محترم بھائی　　　" مبارک" کہہ نہیں سکتا مرا دل کانپ جاتا ہے

کٹی کا یہ کون سا موقعہ تھا۔

اور جب غالب صدی منائی گئی تو ساحر نے غالب صدی کا اہتمام کرنے والے اربابِ اقتدار سے ان الفاظ میں کٹی لی۔ یہ
الفاظ درشت بھی تھے اور درست بھی۔

جن شہروں میں گونجی تھی غالب کی نوا برسوں　　　ان شہروں سے اردو اب بے نام و نشاں ٹھہری
آزادیِ کامل کا اعلان ہوا جس دن　　　معتوب زباں ٹھہری، غدّار زباں ٹھہری

جس عہد سیاست نے یہ زندہ زباں کچلی　　اس عہد سیاست کو مرحوموں کا غم کیوں ہے

غالب جسے کہتے ہیں اُردو ہی کا شاعر تھا　　اُردو پہ ستم ڈھا کر غالب پہ کرم کیوں ہے

اسی نظم میں وہ شعر بھی ہے۔

اُردو کے تعلق سے یہ بھید نہیں کھلتا　　یہ جشن یہ ہنگامہ خدمت ہے کہ سازش ہے

اور یہ شعر بھی ہے

گاندھی ہو کہ غالب ہو، انصاف کی نظروں میں　　ہم دونوں کے قاتل ہیں دونوں کے پجاری ہیں

ساحر ڈنکے کی چوٹ پر کٹّی لینے کے شوقین تھے۔ محفلوں میں بھی انہیں اس کے بغیر لطف نہیں آتا تھا شیام کشن نگم کے گھر کی ایک محفل میں انہوں نے کسی کو کھانے نہیں دیا جب تک سب نے یہ نہیں کہہ دیا کہ اردو اسکولوں میں ذریعہ تعلیم اُردو ہونا چاہیے۔ ساحر کی موجودگی میں کوئی شخص رسم الخط کی فی مخالفت میں منہ نہیں کھول سکتا تھا۔ وہ اس معاملے میں اپنے پورے قد سے کٹّی پر آمادہ نہیں مُصر ہو جاتے تھے۔

لیکن ساحر اس معاملے میں بڑے فنکار تھے۔ انہیں بڑے سلیقے سے نہایت نفاست اور شرافت کے ساتھ بھی کٹّی لینا آتا تھا۔ ایک موقعہ پر انہوں نے بہت زیادہ اخلاق حمیدہ کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ کٹّی انہوں نے عالم طیش میں نہیں لی۔ عجلت میں نہیں لی۔ اس کا ایک پلان بنایا اور اپنے اس منصوبے میں اسے بھی شریک کیا جس سے انہیں کٹّی لینی مقصود تھی۔ یہ کٹّی بھی شاہ جہاں والی کٹّی کی طرح مشہور ہوئی۔ دیکھیے

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دلنوازی کی

نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے

نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں میں

نہ ظاہر ہو تمہاری کشمکش کا راز نظروں سے

تعارف روگ ہو جائے تو اس کو بھولنا بہتر

تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا بہتر

وہ افسانہ جسے تکمیل تک لانا نہ ہو ممکن

اسے اک خوبصورت موڑ دیکر چھوڑنا بہتر

کٹّی میں یہ ساجھے داری اور سلیقہ۔ واقعی ساحر اس فن کے ماہر تھے۔

ساحر کی زندگی کٹّی سے شروع ہوئی اور کٹّی ہی پر ختم ہوئی۔ ان کی آخری کٹّی اُن کے اپنے رفیقِ دیرینہ اختر بھائی (جاں نثار اختر) سے ہوئی۔ شہر بمبئی میں ان دونوں کی دوستی کی اتنی ہی شہرت تھی جتنی ان کی شاعری کی تھی۔ اختر بھائی کا تین چوتھائی یا کم سے کم دو تہائی وقت

ساحر کے ساتھ گذرتا تھا اور اس کا تحریری ثبوت وہ رباعیاں ہیں جو گھر آنگن میں شامل ہیں۔ مثلاً

آہٹ مرے قدموں کی جو سن پاتی ہے — اک بجلی سی تن بدن میں لہراتی ہے
دوڑی ہے ہر اک بات کی سُدھ بسرا کے — روٹی جلتی، توے پہ چھوڑ آئی ہے

یہ تو اس وقت کی بات ہے جب اختر بھائی گھر لوٹ آئے تھے ورنہ یوں بھی ہوا ہے۔

سونے سے اٹھی کہ گرم کھانا کر دے — لوکا جو لگا جھلس گئی سب کایا
آیا ہے جوش، پوچھتی ہے ان سے — بتلایئے سچ آپ نے کھانا کھایا؟

لیکن معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ ساحر اور اختر بھائی میں کٹی ہو گئی ساحر سے پوچھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن اختر بھائی سے ہم لوگوں میں سے کسی نے نہیں پوچھا کہ بات کیا ہوئی اور نہ کبھی انہوں نے ذکر کیا لیکن محسوس ہوتا تھا کہ ایک نشتر سا رگ جاں کے قریب رکھا ہوا ہے اور یہ بات کھل کر اس وقت سامنے آئی جب ساحر اپنے عزیز دوست اور ساتھی کے آخری دیدار کے لئے اُن کے گھر آئے۔ انتقال جاں نثار کا ہوا تھا اور موت کی پرچھائیاں، ساحر کے چہرے پر تھیں۔ ساحر اپنی اولین کٹی کو ماں کی محبت میں بھول بھال گئے تھے لیکن اپنی آخری کٹی کو بھول نہیں سکے۔ کوئی بھی آدمی لوہے کا بنا ہوا نہیں ہوتا۔

اور یہ بھی سچ ہے کہ ساحر ان میں سے تھے جن کے بارے میں فیض نے کہا ہے

ہمیں سے سنّتِ منصور و قیس زندہ ہے — ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

ذوقِ کج کلہی کو متوازن کرنے کے لئے شوقِ گل دامنی ضروری ہے۔ ساحر یہ نکتہ جانتے تھے۔ ڈر یہ تھا کہ آدمی نے جب چاند پر اپنا قدم رکھا تو ساحر کہیں اس مسافر سے بھی کٹی نہ لیں لیکن ساحر کا شوقِ گل دامنی یہاں دامن گیر ہو گیا ورنہ وہ یہ نہ کہتے ؎

وہ بلند بام تارے وہ فلک مقام تارے
جو ہماری قسمتوں پر رہے حکمراں ہمیشہ
جنھیں کم سِنوں نے چاہا کہ لپک کے پیار کرلیں
جنہیں مہ وشوں نے مانگا کہ گلے کا ہار کرلیں
جنہیں عاشقوں نے چاہا کہ فلک سے توڑ لائیں
کسی راہ میں بچھائیں کسی سیج پر سجائیں
جنہیں مطربوں نے چاہا کہ صداؤں میں پرولیں
جنہیں شاعروں نے چاہا کہ خیالوں میں سمولیں
جو ہماری دسترس سے رہے دور دور اب تک — ہمیں دیکھتے رہے ہیں جو بصد غرور اب تک
مرے عہد کے حسینو! وہ نظر نواز تارے — مرا دورِ عشق پرور تمہیں نذر دے رہا ہے

بیچارا اگگارین!

ساحر میرا بچپن کا دوست

حمید اختر
لاہور (پاکستان)

ساحر اب ہم میں نہیں ہے۔ اس کا سفر اس وقت شروع ہوا تھا جب اس کے جاگیردار باپ نے تین چار برس کی عمر میں اسے والدہ کے ہمراہ گھر سے نکال دیا تھا۔ یہ سفر لدھیانہ کے جگراؤں پل کی بغل میں ریلوے لائن کے ساتھ ملے ہوئے ایک چوبارے سے شروع ہوا اور ساحلِ بمبئی کے مقام جوہو کے ایک تین منزلہ فلیٹ کی سب سے اوپر والی منزل میں ختم ہوگیا۔

اب وہ خوب رو، خوش لباس، خوش گفتار اور انقلاب کے گیت گانے والا شاعر ہم میں نہیں ہے صرف اس کی باتیں اور یادیں رہ گئی ہیں۔ اس کے دوست اور اس کے لاکھوں پڑھنے والے مدت تک اس کو یاد رکھیں گے۔ اس لئے کہ دوستوں کا دوست اور اپنے پڑھنے والوں کے دلوں کو گرمانے والا شاعر تھا۔ اور انہی کی باتیں کرتا تھا انہی کے بارے میں سوچتا تھا۔ اس کی ذاتی زندگی میں بڑے بڑے انقلابات آئے لیکن فن کی حد تک وہ کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اپنے مسلک سے ادھر اُدھر نہیں ہوا۔

اس کا باپ ایک روایتی زمیندار تھا۔ جو اپنی زمینوں کے قطعات بیچ بیچ کر شادیاں کرتا تھا۔ مقدمہ بازی اس کی زندگی کا لازمی حصہ تھا۔ جب ساحر پیدا ہوا تو فضل ذیلدار (ساحر کے والد صاحب) اور ان کے پڑوسی میاں عبدالغنی (جو بعد میں مغربی پنجاب کے وزیر تعلیم بنے) کے درمیان مقدمہ بازی زوروں پر تھی۔ اس والد نے ساحر کا نام عبدالحی رکھا اور اس کی پیدائش کے بعد اس کا یہ معمول تھا کہ شام کو گلی میں کرسی بچھا کر نوکروں اور پڑوسیوں کی موجودگی میں عبدالحی کو باآواز بلند گندی اور فحش گالیاں دیتا تھا۔ میاں عبدالحیٔ اور ان کے حواری جو پڑوسی تھے اعتراض کرتے تو بڑے اطمنان سے جواب دیتا۔ میں تو اپنے لاڈلے اکلوتے بیٹے سے پیار کی باتیں کر رہا ہوں۔ اور اس طرح چند ماہ کے اندر اس نے میاں عبدالحی کی زندگی اجیرن بنا دی۔

عمر اور شعور کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس نظام سے اس کی نفرت بڑھتی گئی۔ لہٰذا اس کی ماں نے اُسے بڑے ناز و نعم سے پالا۔ اس کے ماموؤں نے جن میں سے ایک الٰہ آباد اور دوسرا کٹک (اڑیسہ) میں رہتا تھا ان کی کفالت کی لیکن ایک حساس نوجوان کی حیثیت سے اسے یہ سب کچھ پسند نہیں تھا۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے لئے ایک واضح منزل متعین کرنے میں مصروف رہا۔

اس سے میری دوستی کی ابتدا، ۴۲-۱۹۴۱ء میں ہوئی۔ اس وقت تک اس نے بطور شاعر خاصی شہرت حاصل کر لی تھی اور لدھیانہ جیسے چھوٹے سے ادب نواز شہر میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔

۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہم ایک ساتھ رہے، کوئی دن ایسا نہیں گزرا جو ہم نے اکٹھے نہ گذارا ہو کوئی رات ایسی نہیں تھی جس میں ہم نے نئی اور بہتر زندگی کے نقشے نہ بنائے ہوں۔ کتنی ہی چاندراتیں ہم نے اس شہر کے گلی کوچوں میں گشت کرتے ہوئے گزار دیں۔ عنفوانِ شباب کی وہ مستی جو نوجوانوں کو ہر غلط راستوں اور حسن و عشق کی وادیوں میں بہالے جاتی ہے ہمارے ساتھ ساتھ رہی مگر ایک ہی جنون ایک ہی رشتہ سب سے زیادہ مضبوط تھا وہ تھا ملک کو آزاد کرنے اور اس دنیا کو بہتر بنانے کا، غربت، افلاس، جہالت اور جنگوں سے نجات حاصل کرنے کا۔ اس کی عظیم ماں نے اس کی ان سرگرمیوں میں کبھی دخل نہیں دیا۔ اس کا حلقۂ احباب وسیع ہوا تو وقت بے وقت بے شمار مہمانوں کو کھانا کھلانا، دن میں دس دس بار چائے تیار کرنا اور نہ صرف بیٹے کی بلکہ سب دوستوں کی فرمائش پوری کرنا اُس کا کام تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ برسوں پر پھیلی ہوئی اس مدت میں اس نے کبھی ایک بار بھی کام یا خرچ کی زیادتی کی شکایت کی ہو۔ وہ تو اس کے لئے جی رہی تھی۔ دنیا میں اس کے لئے اور کیا رکھا تھا۔

اس پُر امن زندگی میں طوفان اس وقت آیا جب اسے لدھیانہ گورنمنٹ کالج سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ غالباً تھرڈ ائر میں تھا اور اس کا معاشقہ بڑے زوروں سے اپنی ایک کلاس فیلو سے چل رہا تھا۔ چند دوستوں نے اس پر الزام لگایا اور اس کی شکایت پرنسپل سے کر دی، چنانچہ کالج کے حکام نے اسے اور اس کی معشوقہ ایشر کور کو کالج سے نکال دیا۔

اس واقعہ کے بعد تین چار برس تک اس کا یہ معمول رہا کہ رات کو آٹھ نو بجے دوستوں کو ہمراہ لے کر وہ کالج کی اس دیوار پر جا بیٹھتا جہاں وہ اپنی محبوبہ سے ملتا رہا تھا۔ وہ دیوار اسی کی نہیں ہم سب کی زندگیوں کی علامت بن گئی تھی۔ اس کے گھر سے کالج کا فاصلہ ڈیڑھ میل کے قریب تھا۔ سردی گرمی بارش آندھی طوفان کچھ ہی کیوں نہ ہو اس دیوار تک پہنچنا ضروری تھا۔ یہاں اس کی بہت سی نظموں کی بنیاد پڑی۔ کئی تاروں بھری راتوں میں جب ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی گزرتی اور خاموشی اپنی زبان کھولتی ہم پہروں اس دیوار پر بیٹھے رہتے۔ ہر شخص اپنے خیالات میں گم ہوتا مگر ساحر ہفتے دو ہفتے میں کسی نظم کا خیال یہیں سے لے کر اٹھتا۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اس کی زندگی میں یہ دیوار نہ آتی تو شاید وہ اتنی حسین نظمیں نہ لکھ سکتا تھا۔

کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے ایشر کور کی نہیں صرف اس دیوار کی ضرورت تھی۔

بچپن کے حالات، اس کے والد کا رویہ، گھر کی مجبوریاں اور متعدد وجوہ کی بنا پر اس میں عدم تحفظ کا احساس بہت زیادہ تھا اور یہ آخر تک قائم رہا۔ چنانچہ وہ اکیلا سفر نہیں کرتا تھا، کہیں بھی جانا ہو ایک آدمی اس کے ساتھ ضرور ہونا چاہئے وہ اس کی خوشامدیں کرتا۔ اس کا ٹکٹ خرچ کرتا ہر طرح سے اس کی مدارت کرتا مگر اکیلا جانے کو کبھی تیار نہ ہوتا۔ جب اس نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا تو دوستوں کی شامت آگئی ——— لاہور اور لدھیانہ کے درمیان مسلسل سفر جاری رہا اور کسی نہ کسی کو ساتھ لینا ضروری تھا۔

لاہور اس وقت اتنا بڑا شہر نہیں تھا یہ ایک جینٹن شہر تھا جس میں علمی ادبی اور تہذیبی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ ہم دونوں نے شہر میں بہت وقت گزارا۔ یہ سارا سفر پیدل طے ہوتا تھا یعنی سرکلر روڈ پر ادب لطیف کے دفتر سے لے کر چیئرنگ کراس تک، نسبت روڈ پر کرسٹل کی چائے پیتے کبھی دولنگا یا لارینگ میں شام گذارتے، رات ہو جاتی۔ رات اس کے لئے بے چینیوں کا پیغام لاتی پھر سفر شروع ہوجاتا پھر آوارہ گردی کا دورہ پڑتا اور اس طرح بیشتر راتیں آنکھوں میں گذر جاتیں۔ مگر اس وقت لہو گرم تھا رات خنک پیاری اور درد آشنا معلوم ہوتی تھی۔ کئی راتیں ہمارے ساتھ چلیں، سروں پر سایہ کئے ٹھنڈی ہوا دیتی ہوتی یہ نمناک راتیں پھر نہیں آئیں۔ آئیں تو زمانے نے ہمارے ان کے درمیان دیوار کھڑی کر دی۔

شام کو کافی ہاؤس یا نگینہ بیکری میں محفلیں جمتیں۔ دنیا بھر کے موضوعات پر بحث ہوتی، ادب سیاست، جنگ، فاسزم کونسا موضوع تھا جو یاروں کی دستبرد سے محفوظ ہوتا۔ باری علیگ عبداللہ بٹ، گوپال متّل، عبدالحمید بھٹی، رام پرکاش اشک اور بہت سے دوسرے ان محفلوں کی رونق ہوتے۔ یہاں انقلاب کے نقشے بنتے ادبی محاذ کے معرکے سر ہوتے اور ہر شام چائے کی پیالیوں میں طوفان اٹھتے مگر کسی نے کبھی چھوٹے پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اختلافات بھی ظاہر ہوتے لیکن سر پھٹول تک نوبت کم ہی آتی۔

ساحر ایسی محفلوں میں کم ہی بولتا مگر فقرے چُست کرنے سے کبھی نہیں چوکتا تھا۔ ایک دن کسی شریکِ محفل نے ایک اخبار میں شائع ہونے والی خبر پر اعتراض کیا۔ خبر یہ تھی کہ ایک تقریب میں جیل سے رہا ہونے والے ایک ترقی پسند سیاسی کارکن کے گلے میں ایک حسین دوشیزہ نے پھولوں کا ہار پہنایا۔ بزرگ معترض اس بے راہ روی پر جزبز ہو رہے تھے۔ ان کی بدقسمتی کہ انہوں نے اس بارے میں ساحر کی رائے بھی پوچھی اس نے فوراً کہا "جی ہاں! اس سالے کے گلے میں تو پھانسی کا پھندہ ہونا چاہیے۔"

دوستوں کی محفل میں وہ خوب چہکتا، فقرے بازی بلا کی کرتا تھا۔ اور نوجوان دوستوں کو اپنا ہمنوا بنانے میں اسے ملکہ حاصل تھا۔ اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

کالج سے نکالے جانے کے بعد ایک شام اس نے اعلان کیا کہ وہ اگلی صبح بدروال ایشر کور سے ملنے اور

بات کرنے جا رہا ہے اور بشرطِ ضرورت اس کے باپ سے بھی کھری کھری باتیں کرے گا۔ بدووال لدھیانہ سے فیروز پور جانے والی لائن پر پہلا اسٹیشن تھا یہ جگہ لدھیانہ سے پانچ ایک میل دور تھی مگر ایشر کور کا والد ایک خونخوار قسم کا زمیندار تھا۔ دوست اسے ساری شام اس خطرناک ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ بالآخر بارہ بجے کے قریب اُس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا مگر ہمیں اس کا اعتبار نہیں تھا۔ چنانچہ ہم نے ایک دوست کو اس کے گھر چھوڑا کہ وہ نگرانی رکھے اور صبح اسے بدووال نہ جانے دے۔

ہمارے جانے کے بعد ساحر نے اس دوست کو لیکچر دیا جس میں عشق و محبت کی مزہ کاریوں کا ذکر تھا، تاریخی قوتوں کے شعور اور دوستوں کے فرائض وغیرہ پر سیر حاصل بحث تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صبح وہ دوست گاڑی پر بیٹھا اور ساحر کا پیغام محبت لیکر نہ صرف بدووال پہنچا بلکہ محبوبہ دلنواز کے چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو گیا دروازہ کھٹکھٹایا تو خاتون نے خود دروازہ کھولا اور پیشتر اس کے کہ یہ دوست حرفِ مطلب زبان پر لاتے اس نے کہا "میرا باپ گھر پر نہیں ہے اگر وہ آگیا تو تمہارے چار پانچ ٹکڑے کر کے اسی صحن میں دفن کر دے گا اور تمہارے اگلے پچھلوں کو خبر تک نہ ہو گی"۔

اس دوست کا کہنا ہے کہ اس محبوبہ دلنواز کے شیریں لبوں سے یہ کلمات حق سنتے ہی وہ ہوش میں آگیا اور وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

بچپن میں اسکا ایک ہی شوق تھا، روشنی کے میلے دسہرے یا کسی بھی موقعہ پر تھیٹر کمپنی شہر میں آئے تو روزانہ تھیٹر دیکھے بغیر وہ سو نہیں سکتا تھا جوانی کے ابتدائی دنوں میں اُسے آغا حشر کے اسٹیج ہونے والے ڈرامے پورے کے پورے یاد تھے۔ لیلیٰ مجنوں میں ماسٹر نثار سلیپنگ سوٹ پہن کر صحرا میں کیا مکالمے بولتا تھا وہ اسے ازبر تھے۔ شیریں فرہاد میں فرہاد کو کس طرح دربار میں طلب کیا گیا اور بادشاہ نے اس سے کیسے یہ پوچھا کہ ع

کس لئے تو ننگے سر ہے

اور فرہاد نے کیسے کہا کہ ع

شاہا خارِ جنوں میرے سر پر ہے

اس قسم کے چٹکلے وہ برسوں دوستوں کو مزے لے لے کر سناتا رہا۔

مجبوریوں اور محرومیوں کے اس دور میں اس نے کبھی ذاتی مشکلات دور کرنے یا اپنی زندگی بنانے پر توجہ نہیں دی۔ البتہ اس کی ایک آرزو کسی سے مخفی نہیں تھی، فلمی گانے لکھنے اور اس طرح اس میدان میں جھنڈے گاڑنے کی آرزو۔ لدھیانہ اور لاہور میں بمبئی اس کے خیالوں اور خوابوں کا مرکز رہا۔ بمبئی جانے سے دو تین برس پہلے وہ ہر وقت اس دھن میں رہتا۔ اس لحاظ سے ساحر ان انتہائی خوش قسمت لوگوں میں سے تھا جس نے جو چاہا اور جس طرح چاہا وہ اسے مل گیا۔ اور ایک برس بعد دوبارہ بمبئی پہنچ گیا۔ پہلی دفعہ اُسے جنوری ۱۹۴۷ء میں بمبئی سے ایک فلم کے گانے لکھنے کی پیش کش ہوئی۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی مگر حسب معمول وہ اکیلا جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کی شرط

تھی میں بھی اس کے ساتھ چلوں۔ دو تین ہفتے تک انتظار کرنے اور میرے لئے بطور مکالمہ نویس اپائنٹ منٹ لیٹر حاصل کرنے کے بعد بالآخر اس نے میری نوکری چھڑوا دی اور ہم ایک ساتھ بمبئی آگئے۔

بمبئی اس وقت ترقی پسند تحریک کا مرکز تھا۔ سید سجاد ظہیر، سبط حسن، کرشن چندر، منٹو، مہدی علی خاں سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، میراجی، صفدر میر، حاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ممتاز مفتی، وشوامتر عادل، احمد بشیر، پریم ناتھ، سرلا دیوی اور پتہ نہیں اور کتنے ادیب اس وقت بمبئی میں جمع تھے۔ آزادی کی تحریک زوروں پر تھی، ترقی پسند مصنفین بھی آزادی کی اس لہر کا حصہ تھے۔ قوم کی ایک متعین منزل تھی، اس لئے ادیبوں کی منزل بھی واضح تھی۔ ہم نے اس زمانے میں بمبئی، حیدر آباد دکن، سورت ہراتے پور کئی جگہ کانفرنسیں کیں۔ ساحر نے ابراہیم جلیس کو حیدر آباد سے بلا لیا تھا۔ حاجرہ مسرور بھی اسی کمپنی میں مکالمہ نویس کے طور آگئیں۔ ترقی پسند مصنفین کے معرکتہ الارا ہفتہ وار اجلاس ہوتے، بیشتر ادیب فلمی صنعت سے متعلق تھے اس لئے اکثر فلمی شخصیات بھی ادیبوں کے اجتماعات میں شامل ہوتیں۔ ساحر اس زمانے میں شاعروں کا اسٹار تھا۔ ایک بڑا شاعر جنم لے رہا تھا مگر زندگی کے ابتدائی دور کی محرومیوں نے ان کے ذہن میں خوف اور دہشت مسلّط کر دیا تھا جس سے آخر دم تک چھٹکارا نہ پاسکا۔

دوسرے دور میں جب وہ لاہور سے ہوتا ہوا بمبئی پہنچا تو اسے اتنی بڑی کامیابیاں نصیب ہوئیں جو شاید اس کے وہم و گمان میں نہ تھیں۔ تھیٹر کے مکالمے اور ماسٹر رحمت کی غزلیں جو اسے ازبر یاد تھیں اس کے بہت کام آئیں۔ اس نے بے انتہا دولت، شہرت اور عزت پائی مگر وہ اپنے اندر کی تنہائی اور ارد گرد کی زندگی کے خوف سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ اور شادی نہ کرنے کی وجہ سے اس میں چڑچڑاپن آگیا۔ اس کے لاشعور میں کہیں انتقام کا جذبہ چھپا ہوا تھا چنانچہ اپنے عروج کے دور میں وہ سرِ شام محفل سجاتا اور دوستوں کو بہترین شراب پلاتا، بہترین کھانا کھلاتا اس کے بعد ان کی بےعزتی کرتا، دوست گریز کرنے لگے وہ اور بھی تنہا ہوتا گیا۔ تین چار برس قبل والدہ کی وفات کے بعد وہ بالکل ٹوٹ گیا۔

میں گذشتہ برس جنوری میں تیس برس کی جد وجہد کے بعد اپنی بیوی کے ہمراہ اس کے گھر پہنچا تو وہ ایک شکستہ انسان تھا۔ اتنی کامیابی، اتنی عزت شہرت اور دولت حاصل کر لینے کے بعد شاید اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہا تھا۔ وہ ہفتوں گھر سے نہیں نکلتا تھا۔ دوست اس سے اس حد تک دور ہوگئے تھے کہ بمبئی پہنچنے سے قبل ایک ہفتہ کے لئے دہلی رُکا تو کئی دوستوں کے پیغام ملے کہ میں بمبئی میں ساحر کے گھر قیام نہ کروں، ورنہ مجھے پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ دوستوں کی محبت تھی مگر میں تو بمبئی جا ہی رہا تھا اس سے ملنے کے لئے ڈرتا بھی تھا کہ کہیں واقعی میرا یار اتنا بد دماغ نہ ہوگیا ہو کہ میری بےعزتی ہی کر دے۔ اس صورت میں میری بیوی جس نے ہماری دوستی کے قصے ہی سنے تھے اور ساحر سے پہلی بار مل رہی تھی مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ان اندیشوں کے باوجود ہم دو ہفتے اس کے ساتھ

اس کے گھر پر رہے۔ وہ بالکل ویسا ہی تھا۔ وہی باتیں وہی چٹکلے وہی قصے کہانیاں، مگر اندر سے کوئی چیز، کوئی انمول سرمایہ کہیں غائب ہو گیا تھا۔ دل کے دورہ کی وجہ سے ڈاکٹروں نے اس کی شراب بند کر دی تھی اور یوں فرار کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ بیماری کو اپنے اوپر اس نے طاری کر لیا تھا۔ پندرہ روز تک میں نے اُسے اس کے خول سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ اُسے لاہور آنے کی دعوت دی اس کے چاہنے والوں کا ذکر کیا اور کہا ایک بار آجاؤ۔ مگر نہیں اب وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے وعدہ تو کیا مگر میں جانتا تھا یہ صرف میرا اصرار ختم کرنے کے لئے ہے۔

شام کو سعدیہ میری بیوی ہیں، انور، اس کی بہن میز پر بیٹھ جاتے اور بیتے دنوں کی یادیں گمشدہ دوستوں کے قصے اور مرنے والوں کے تذکرے کرتے رہتے۔ مگر اکتیس برس کا فاصلہ درمیان میں حائل ہو جاتا اور وہ اپنی موٹی موٹی آنکھیں کھول کر خلاء میں تکتا رہتا جیسے اسے کسی گم شدہ کڑی کی تلاش ہو۔ میں اکثر سوچتا کامیابی اپنے ساتھ کیا کچھ لے کر آتی ہے۔ لاکھوں افراد زندگی بھر جد و جہد کرتے ہیں بھاگتے ہیں محنت کرتے ہیں مگر گوہر مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ یہ آدمی جس نے جو چاہا حاصل کر لیا ہے اب کیوں گم ہے کیوں اس کے دل و دماغ پر بوجھ پڑا ہوا ہے۔ یہ وہ کیوں نہیں ہے جو کالج کی دیوار پر بیٹھ کر تسخیر کائنات کے منصوبے بنایا کرتا تھا۔ جو بھوک فاقے اور مجبوری میں ہنستا تھا، آج یہ کس خوف میں مبتلا ہے؟

لیکن ذاتی زندگی کے اس تمام نشیب و فراز میں ایک چیز اس سے کوئی نہیں چھین سکا، وہ ہے اپنے فن سے اس کا خلوص۔ اس نے صاف سیدھی زبان میں ملک کے کروڑوں عوام سے جو مکالمہ اٹھارہ برس کی عمر میں شروع کیا وہ ساٹھ برس کی عمر تک اسی زبان میں جاری رہا۔ وہ لکھتا رہا۔ لوگوں کے لئے، بہتر مستقبل کے لئے امن اور خوشحالی کے لئے۔ اس نے فلمی شاعری کو ایک نیا حسن اور نئی جہت دی اس سے اس کو دولت اور شہرت ملی مگر وہ اپنے اصل کام تخلیق کے عمل کو نہیں بھولا اور اس نے محبت اور مسرت کے گیت گانے بند نہیں کئے۔ وہ لکھتا رہا اپنے لاکھوں پڑھنے والوں کے لئے ان کے دلوں کو گرمانے اور انہیں نیا ولولہ دینے کے لئے اور اس عمل میں اس نے اس راستے سے سر موانحراف نہیں کیا جسے اس نے اوائل عمر میں اپنایا تھا۔ یہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

حال ہی میں ایک مشاعرے میں ساحر نے کہا تھا میں پل دو پل کا شاعر ہوں اور مجھ سے بہتر کہنے اور تم سے بہتر سننے والے ابھی بہت آئیں گے۔۔۔۔۔!

اسے اب میں کیسے اور کہاں اطلاع دوں کہ تم سے بہتر کہنے والے اور ہم سے بہتر سننے والے اب کبھی نہیں آئیں گے کیونکہ وہ دور واپس نہیں آئے گا۔

ساحر کی یاد میں

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

بمبئی شہر کے ابلتے ہوئے بازاروں میں، ساحلوں پر، سستے ہوٹلوں میں تین لمبے لمبے جوان، بال بڑھائے، گریبان کھولے فکرِ فردا میں نقرے کستے، خالی جیبوں میں سکّے بجاتے گھومتے پھرتے تھے۔ دو شمال سے آئے تھے، ایک جنوب سے۔ اس امید میں کہ وہ دن دور نہیں جب خود ان کی تقدیر کے ساتھ فلمی نگار خانوں کے پھاٹک کھلیں گے اور فلمی صنعت میں ادب کا ستارہ چمکے گا۔

ہندوستان کی تقسیم سے کوئی سال بھر پہلے اور تین چار سال بعد تک سلولائڈ کی دنیا پر اداسی چھائی رہی۔ ہر طرف خلفشار اور آپادھاپی۔ وہ دن طلوع ہونے میں ابھی دیر تھی آخر ابراہیم جلیس، حمید اختر اور ساحر لدھیانوی تینوں یکے بعد دیگرے پاکستان سدھار گئے اور تینوں نے آگے چل کر اپنی بساط بھر نام کمایا۔

مگر ساحر کی روانگی سے چند روز پہلے کا ایک منظر جو مجھے ہزاروں بار یاد آچکا ہے:

والکیشور روڈ پر سجاد ظہیر کا مکان (جسے کمیونسٹ خیال کے بے گھروں نے دھرم شالہ بنا رکھا تھا) ملک میں فسادات کی ہولناک خبروں پر رائے زنی کرتے کرتے ہم لوگ رات ڈھلے سوگئے۔ ہم میں سے ایک بندہ تھا جو نہیں سویا۔ بیقرار رہا۔ صبح آنکھ کھلی تو دیکھتے ہیں کہ وہ الجھے گھنے بالوں میں بار بار کنگھا پھیر رہا ہے اور آپ ہی آپ بڑبڑا رہا ہے۔

میرے پنجاب میں آگ لگی تو آسانی سے نہیں بجھے گی، بڑی بربادی ہوگی

یہ ساحر لدھیانوی تھا۔ اس کی آنکھیں پنجاب میں فساد کی آگ کے تصور سے لال تھیں اور نیند اس آگ کے اخباری شعلوں میں جل چکی تھی۔

یہ شخص ۲۴، ۲۵ برس کا یہ لمبا تڑنگا، بے ڈول جوان تب بھی جلوتوں اور خلوتوں میں مقبول تھا۔ اس کا خلوص، احساس کی شدت، بے غرضی، بے نیازی، شرمیلا پن اور پاک بازی ایک خوش انجام آرٹسٹ اور ناکام عاشق کا سا تاثر چھوڑتے تھے۔ بالآخر ساحر اپنے آتش فشاں پنجاب کی طرف چل دیا۔

ایک بار بمبئی کی طرف عارضی واپسی ہوئی، پھر لدھیانہ اور وہاں سے لاہور ۔ وہیں اس نے پوچھا:

چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے ــــ لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گزری

ساحر کو مملکتِ خداداد میں حکومت نے سیاسی طور پر ناپسندیدہ بلکہ مشتبہ قرار دیا، شاید وارنٹ گرفتاری جاری ہوا اور ساحر خاموشی سے دہلی سرک آئے ۔

دہلی آنے سے پہلے وہ تھوڑے دن "ادبِ لطیف" کے اڈیٹر بھی رہ چکے تھے ۔ ادبی صحافت میں انہوں نے دو ایک سال کے اندر ہی اپنا مقام بنا لیا تھا ۔ کیا نفاست، کیا سلیقہ، کیا رنگا رنگی اور کیا تازگی! ہر لحاظ سے "ادبِ لطیف" ایک ٹکسالی سکہ ہو گیا تھا جب نوجوان ساحر اس کے مدیر ہوئے ۔ دن میں پانچ سات روپے کی کمائی ۔ اور اتنا ہی مہمانوں کی تواضع میں چائے سگریٹ کا خرچ شام ہوتے ہوتے "ادبِ لطیف" کے دفتر میں نئے پرانے لکھنے والوں کی پالی اور اڈیٹر کی جیب خالی ۔ مگر اس حلقے کے قدرداں اچھے حالوں جیتے تھے اور اہلِ قلم کا بن کہے سُنے ایک کمیون (Commune) سا بن جاتا تھا ۔ جیسے تیسے شب و روز گزر رہے تھے ۔

ساحر دلی آئے تو وہ مشغلہ ساتھ لائے ۔ لکھ پڑھ کر جینا چاہتے تھے مگر اردو بازار میں خاک اُڑ رہی تھی ۔ باہر کی سیل سے منی آرڈر آ گئے تو مصنف اور پبلشر کو نانِ شبینہ میسّر ہو ۔ ساحر نے یہیں حالی پبلشنگ ہاؤس کے مالک (محمد یوسف اور بدر الحسن) سے مل کر "شاہراہ" دو ماہی کی بنیاد ڈالی ۔ ایسا عمدہ ترقی پسند رسالہ نکالا کہ اس سے پہلے کے سارے ماہنامے گرد ہو کر رہ گئے ۔

"ادبِ لطیف" لاہور کے بعد یہی "شاہراہ" تھا جو کم از کم ایک دہائی (۱۹۵۰ء ــــ ۶۰) نئی پود کے نعروں، ذہنی مذاکروں، تکراروں اور تحریروں کا مرکز بنا رہا ۔ ترقی پسند تحریک میں تنگ نظروں کی بادِ سموم نے اسے بھی اپنی لپیٹ میں لیا، لیکن ساحر کے اٹھ جانے کے بعد ۔ ساحر نے بڑی ہوشیاری دکھائی ۔ چند شماروں تک تیل کی دھار دیکھ لی تو "شاہراہ" میں اپنے ایک اسسٹنٹ اور نہایت محنتی اور دلنواز شخصیت ۔ پرکاش پنڈت کو جما کر وہ بمبئی چلے آئے ۔ بازاروں میں، دفتروں میں بھٹکنے کے لئے نہیں بلکہ فلمی ماحول کو اول اس کی شرط کے ساتھ قبول کرنے اور پھر اس سے اپنے آپ کو قبول کرانے کے لئے ۔ اُن دنوں کا ایک واقعہ خود ساحر کی زبان سے میں نے سنا تھا جو زمانے کے دِگرگوں اوضاع پر آج بھی ہنساتا ہے:

بمبئی آئے تو فلمی حلقوں میں جو اپنے تھے پہلے ان سے ملے کہ کچھ کام ملے، آگے کی راہ ملے، شاہد لطیف مرحوم (عصمت چغتائی کے شوہر) کے اچھے دن تھے ۔ میاں بیوی کی کمان چڑھی ہوئی تھی، بڑے خلیق، بڑے روشن دماغ اور دوست نواز ۔ ساحر کا حال جاننے کے بعد شاہد لطیف نے دلداری کی اور کہا: دیکھو بھئی ساحر، جب تک کہیں کچھ سیٹل نکلے، تم شام کا کھانا یہیں کھا لیا کرو ۔ لیکن گیت کا معاملہ یہ ہے کہ فلمی گیت لکھنا تمہارا کام نہیں ۔ میں اگر راضی بھی ہو جاؤں تو پروڈیوسر فائننسر کو کیسے راضی کروں گا ۔

یوں دربدر سوالوں کا جواب لیتے ہوئے آخر انہیں کالج کے زمانے کے تقسیم کے پہلے کے بعض (پنجابی) احباب مل گئے ۔ آغازِ شباب اور پنجاب ۔ یہ دو رشتے ایسے ہیں کہ جنگوں کے بعد بھی دلوں کے ملن کی خفیہ سرنگ بچھائے رکھتے ہیں ۔ چنانچہ وہ سرنگ کام آئی ۔ ساحر نے گھر درست کیا (کرشن چندر نے انہیں اپنے بنگلے کا اوپر کا حصہ کرائے پر دے دیا تھا) گھر پر لوگوں سے ملنے ملانے کا پروگرام درست کیا ۔

جلدی سے ایک کار خریدی (کہ اس کے بغیر پروڈیوسر فائنینسر کی نظر میں شاعر کی حیثیت "منشی لوگ" کی رہتی ہے) ایس ڈی برمن کا دل ہاتھ میں لیا۔ قیمتی سگریٹوں کا ڈبہ ہاتھ میں لیا، گاڑی کا اسٹیرنگ ہاتھ میں لیا اور گاڑی چل نکلی۔

ساحر آئے تھے اس ارادے سے کہ فلمی خزانے سے نام، کام اور دام کا بینک لوٹ کر راہ فرار اختیار کریں گے اور پھر اس مالِ غنیمت سے عمدہ سا ادبی رسالہ اور پبلیشنگ ہاؤس چلائیں گے۔ ان کے سیاسی شعور، تیز ذہانت اور دردمند دل تینوں کو روپے کا نہیں، کچھ کر دکھانے کا ارمان تھا۔ کچھ کر دکھانے کے ارمان میں گوردت اور مہیش کول جیسے ذہین اور بے قرار ہم خیال بھی مل گئے۔ کسی کو شروع میں گمان بھی نہیں گزرتا کہ جس زمین پر آدمی کا جوان لہو اور پسینہ ایک ہو، وہ زمین گیلی ہو جاتی ہے۔ پھر جب اس میں فصل آنے لگے تو اسے اور بھی سینچنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ زمین دلدل کی طرح پاؤں پکڑنے لگتی ہے۔ ساحر سے پہلے والوں کا بھی حشر یہی ہوا تھا۔ اور ساحر کے لہو پسینے سے جو بھری پُری فصل آئی اس میں وہ گھٹنوں گھٹنوں دھنس گئے۔ یہاں ان کی مستی نے ہوشیاری کی اور سادگی نے پُرکاری کی راہ اختیار کی، یوں کہئے کہ جبر کی چٹانوں میں سے انہوں نے اختیار کا درہ تلاش کر لیا۔ کاغذ کے ورق کے بجائے سلولائیڈ کے فیتے کو استعمال کیا اور یہاں بھی وہی لکھنا شروع کیا جو کاغذ پر لکھتے آئے تھے۔

۵۲-۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ ایک دن اتفاق سے فیمس اسٹوڈیو میں مل گئے۔ فکر مند تھے۔ فکر یا پریشانی ان کے چہرے پر کبھی دیکھی نہ تھی۔ تعجب ہوا۔ حسب معمول بولے، یار گیت کے کھڑے میں پھنسا ہوا ہوں۔ بات بن نہیں رہی۔

یہ رات، یہ چاندنی پھر کہاں
________ داستاں
________ آسماں

"بات بنانے" کے لئے میں بھی (کہ تب تک بے تکلف شعر کہہ لیا کرتا تھا) ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بات اور بگڑنے لگی تو ان کی طرف سے ہمت افزائی کے باوجود مکھڑے کے ساتھ تنہا چھوڑ کر چل دیا۔ پھر وہ گیت کیسا چلا، دنیا جانتی ہے۔

بس یہی پانچ سات سال تھے دروازوں پر اول دستک دینے اور پھر دروازے توڑنے اور اندر گھس کر صدر نشین بن جانے کے۔ ساحر کے نام کا سکہ ہو گیا، تمغہ بن گیا جس کے ایک طرف ساحر کا نام اور پورٹریٹ تھا اور دوسری طرف انکے گیت۔

برائی کی نیت سے نہیں کہتا، لیکن کھری بات ہے کہ ساحر نے ۴۸-۱۹۴۶ء تک جس وضع کی، جس درجے کی شاعری کی تھی، اس شاعری کو ایک سیڑھی نیچے اتار کر، موسیقی کے زیور سے بنا سجا کر، فلمی گیت کے اس رنگ منچ پر لانا آسان تھا جو رنگ منچ پچھلے کاسٹیوموں سے اکتایا ہوا تھا اور فٹ دو فٹ اونچا ہو کر بیک بنچرز کے روبرو اور ان سے مخاطب ہونا چاہتا تھا۔ ساحر نے ایک ساتھ دونوں کام کئے: "ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں" کو "جنہیں ناز تھا ہند پر وہ کہاں ہیں" تک اتارا۔ اور پھر اس نظم کی طنزیہ روح کو، اس کی کٹیلی دھار کو، اس کے لہجے کو سنبھالتے ہوئے عام تماشائی کے ذہن تک لاکر وہ فلمی نغمہ نگاری کی سطح ذرا اٹھانے میں اور اسے دور تک دیدنی شنیدنی بنانے میں لگے رہے۔ انھیں دونوں کوششوں میں کامیابی نصیب ہوئی۔ وقت، حالات اور ہم خیال احباب بھی سازگار ثابت ہوئے اور یوں فلمی نغموں میں طبقاتی شعور، سماجی طنز اور سامنے

کی بات نے مل ملا کر عام پسند بول چال کے انداز میں شاعرانہ دلکشی اختیار کرلی۔

اردو ادب کی محفل سے صرف تین ہستیاں ہیں جنہیں آنکھوں دیکھتے، فلمی نغمہ نگاری نے تھوڑے سے عرصے میں اپنایا، سر آنکھوں پر بٹھایا اور ان کا حکم مانا ہے۔ آرزو لکھنوی، مجروح سلطانپوری اور ساحر لدھیانوی ــــــ ساحر کو ان میں بھی فوقیت حاصل ہے۔

اول تو یہاں نیو تھیٹرز (کلکتہ) کے شائستہ، شستہ اور بامقصد کارناموں کا ماحول نہ تھا، دوسرے اردو کی سرد بازاری شروع ہو چکی تھی۔ ساحر نے اردو ترکیبوں پر اصرار کر کے اس سرد بازاری کا توڑ کیا۔ تیسرے یہ کہ ساحر نے اپنے مانوس لہجے میں پنجابی ٹچ کے تازہ دم لب و لہجے کے ساتھ نہ صرف مقبول خاص و عام گیت لکھے بلکہ فلمی گیت لکھنے کو سچے اور مستند شاعر کا کام منوالیا۔ شاعر کا مقام اتنا بلند کیا کہ وہ موسیقار یا میوزک ڈائرکٹر کی گرفت سے نکل گیا۔ کچھ ایسا بیج ڈالا کہ پچھلے پچاس برس کے دوران فلمی دنیا میں جتنی سُبکی شاعری کے فن شریف کی ہو چکی تھی، سب کا حساب بے باق ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ میوزک ڈائرکٹر دھن بناتے وقت ساحر کا منہ دیکھنے لگے۔

بتا تیری رضا کیا ہے؟

بلکہ بعضے بعضے تو اُن کے شرمندۂ احسان بھی ہوئے اور ان کے گیتوں کے ساتھ ہی چمکے۔ ان کے گھر آکر پوچھ پوچھ کر دھنیں بنانے لگے۔ امیر خسرو نے ایک فارسی قطعے میں کسی موسیقار کو جواب دیا تھا کہ میاں، مجھے موسیقی اختیار کرنے کا مشورہ کیا دیتے ہو، یہ موسیقی ہے جسے الفاظ کی حاجت ہے۔ شاعر کو موسیقی کی محتاجی نہیں۔ ساحر نے یہ ثابت کر دکھایا اور کروڑوں سننے والوں کے سامنے گویا شاعر اور شاعری سے خطاب کیا:

مسکرا اے زمین تیرہ و تار
سر اُٹھا اے دبی ہوئی مخلوق

خطاب بعد میں کیا ــــ پہلے اپنی سرفرازی اور سرکشی سے مثال قائم کردی۔

خیر، یہ وہ معاملات ہیں جن کی تفصیلات دوسرے ہم عصر اور ہم سفر بہتر سنا سکتے ہیں۔ سنا بھی چکے ہوں گے۔ ہمیں تو اس ضمن میں صرف دو ایک نکتے جتانے تھے۔

ایک تو یہی کہ فلمی موسیقی کو اردو شعر کی زبان دینے میں ساحر کا نام ہمیشہ سرِ فہرست رہے گا۔ بڑی وجہ اس کی وہی کہ انہیں فلمی گیت لکھنے کی خاطر اپنی شاعری سمیت بہت نیچے نہیں اترنا پڑا۔ وزن اتنا ہی تھا کہ وہ اسے سنبھالے ہوئے ایک آدھ سیڑھی نیچے قدم تول کر رکھیں اور ثابت قدم رہیں۔ فلم "پیاسا" سے یہ نکتہ اور بھی کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ فلمی تکنیک سے انہوں نے بیزاری کا سلوک نہیں کیا۔ اس سے سیکھا، اس کے امکانات اور رسائی کو ایک نعمت جانا اور اس نعمت سے اپنی بعد کی شاعری میں فیض اٹھایا۔ ان کی طویل نظم "پرچھائیاں" اسی دیدو شنید کی ترقی یافتہ ترکیب کی دین ہے اور حق یہ ہے کہ امنِ عالم کے موضوع پر نظمیں تو اس سے طویل تر بھی ہیں لیکن اتنی موثر کوئی نہیں۔ تاثیر کے علاوہ اس "مووی" نظم کی ایک خوبی یہ ہے کہ ایک نمونہ سامنے آگیا بیانیہ اور ڈرامائی نظموں کے لیے جو عہد حاضر کا منظر نامہ لکھنے میں کام آئے۔

جب ساحر قبول عام کی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان، اور فلمی صنعت تو قبول عام (یا باکس آفس) کی ہی پرستار ہے تو جیسی پرسوز، دردمند، خود کلام، کسک اور شدید طنز کی کیفیت ان کی ذاتی زندگی میں، ان کی خلوت میں رچی بسی تھی ــــ وہ مداحوں اور جی حضوریوں کے شبانہ روز مجمعوں اور محفلوں میں آکر بے سُری ہوگئی۔ طرح طرح کے لوگ انہیں گھیرنے لگے۔ شراب بندی کے برسوں میں ساحر کا فیض جاری رہتا تھا۔ سبیل لگی تھی، جو آئے، ادب سے بیٹھے، ساحر کی عظمت کا افسانہ سنائے اوروں کے اصلی یا فرضی عیب نکالے، للّو چپّو کرے، خورد و نوش سے لطف اندوز ہو اور اپنی راہ لگے۔

پیغمبر شاید خود کو بچا لے جاتے ہوں کسی فنکار کا یہاں ٹھوکر کھانا عین فطری ہے۔ اس شہر میں ساحر نے خاص طرح کے لوگوں میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔ بعضے تو بال بچوں سمیت ان کے ہاں رہ پڑے۔ بعض نے ساحر کی سی مُجرّد (چھڑے چھانٹ) زندگی اپنالی اور یہیں بس گئے، اور بعض رفیقوں نے ستم یہ کیا کہ اپنی فنی اور معاشی گاڑی ساحر کی نازک مزاج کار کے پیچھے باندھ لی۔ دھچکے تو لگنے تھے

حاضرین ماحضر سے نشے میں آتے اور ساحر اُن دونوں سے نشہ کرتے۔ حاشیہ نشین انہیں یکتائی کی شہ دیتے اور ساحر جھوجھ میں آکر اپنا آپا نہ سنبھال پاتے۔ کئی برسوں کی راتیں اسی سرشاری میں بسر ہوگئیں۔ یہاں تک کہ ان کی ذہانت اور علمی آگاہی کا دل دکھا اور وہ خود دل کے مریض ہوگئے۔

ساحر کو دنیا بھر سے بلاوے آتے تھے۔ ملک سے باہر وہ اس خوف سے نہ گئے کہ سفر ہوائی جہاز کا ہوتا۔ جہاں بھی ہوائی جہاز سے جانے کی بات آتی وہ وعدہ کر کے ٹال جاتے۔ جہاں جانا ضروری ہوتا وہاں ایئر کے بجائے کار استعمال کرتے۔ بہار کے قحط کے سلسلے میں تو انہوں نے ہم خیال اہل قلم کی ایک ٹیم کے ساتھ ہزاروں کلومیٹر کا دورہ ہی کار سے کیا۔ ہزاروں شیدائی جگہ جگہ انہیں گھیرتے تھے۔ کالج کے لڑکے لڑکیاں، جو دراصل ساحر کی ساحری کے صحیح مخاطب تھے۔ جن کے نیم پختہ اور میٹھے درد ساحر کے کلام میں اپنا اظہار پا چکے تھے، وہ ساحر کو دیکھتے ہی اوروں کو بھول جاتے تھے۔ ایک موقع پر مجھ سے کسی بات پر رنجش ہوگئی پیے ہوئے تھے۔ نشہ آور حاضرین بھی لطف لے رہے تھے کہ وہ بھڑک کر بولے: یہاں کیا، آپ ظ انصاری صاحب کسی بڑے مجمع میں دیکھئے کہ نوجوان کس سے آٹوگراف لیتے ہیں۔ آپ جیسوں سے یا مجھ سے۔

میری زبان سے نکلا: ساحر صاحب دعا کیجئے کہ ہندوستان کا تعلیمی اور ذہنی معیار یہیں ٹھیرا رہے۔

باہمی احترام اور قدر دانی نے کبھی آپ اور صاحب کو تم یا تو تک نہیں جانے دیا تھا۔ اس دن نجانے کیا بات تھی کہ وہ "تم" تک اتر آئے۔

شرافت نفس نے انہیں دوسرے دن ٹوکا ہوگا۔

اورنگ آباد (غالب ڈے جنوری ۱۹۶۹ء) ہم سبھی ہوائی جہاز سے گئے۔ میرا سرجیکل آپریشن ہوا تھا۔ مجھے تقریباً لٹا کر لے گئے۔ دن کو آرام کرنے لیٹے ہی تھے کہ ساحر مع میوزک ڈائرکٹر خیام کار سے آپہنچے۔ ان کے لئے پہلے سے کوئی معقول اہتمام نہیں تھا برہم ہوگئے۔ میں نے کہا۔ میں دن میں نہیں سوتا، آپ یہاں اس کمرے میں، اس بستر پر آجائیے۔ آ گئے۔ مگر برہم رہے۔

شام کے اجلاس میں مہمان بہت دیر سے پہنچے۔ اجلاس طول پکڑ گیا۔ کالج کے کرتا دھرتا تھے ڈاکٹر رفیق زکریا اور مہمان خصوصی ایس بی چوہان (جو بعد میں وزیر اعلا ہوئے اور مرکز میں پلاننگ منسٹر) دونوں اسٹیج سے دیکھ رہے تھے کہ مجمع ناراض ہے۔ اس کی قوتِ برداشت جواب دے رہی ہے۔ میرا نام پکار دیا۔ میں نے کچھ تحریر، کچھ تقریر سے حاضرین کو بہلا لیا۔ اُبلتا ہوا مجمع شانت ہو گیا۔

جلسے کے بعد جب ہمارے کمرے میں (پروفیسر عالم اور شام کشن نگم سمیت) کئی مہمان لب تر کر رہے تھے، ساحر آ پہنچے۔ آتے ہی اونچے سروں میں داد دی۔ کہا: یار، کسی میں کوئی کمال ہو تو چھپ نہیں سکتا۔ دیکھ لیا آج اور ہاں میں اس لئے آ گیا کہ نظم کہی تھی۔ تین چار مصرعے نہیں جم رہے ہیں۔ ذرا رائے تو دیجئے۔ ابھی پڑھنی ہے ـــ رائے والے تو کیا دینا تھی، اصل میں وہ اس پرانی وقتی رنجش کو دھو ڈالنا چاہتے تھے۔ یہی ہوا۔ جب نظم سنا کر بیٹھے تو میری طرف جھک کر بولے: آپ ہی کے مصرعوں پر زیادہ داد ملی ہے۔ اب تو خوش؟ میں اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ "مصرعوں" کو اپنا سمجھ کر پھول جاتا۔ وہ بھی ساحر کے ہی تھے۔ میں نے تو صرف دایہ کا کام کیا تھا۔ البتہ ساحر کے اس برتاؤ نے من موہ لیا۔

یہ من موہک جب دل اور گردوں کے مرض کا شکار ہوا تو اتنا بھی نہ گھبرایا جتنا ہوائی جہاز کی پرواز سے۔ دل ان کا بارہویں کلاس کے زمانے سے ہی مرض پکڑ چکا تھا (اور اس مرض کی تشخیص شاعرہ امرتا پریتم کر چکی ہیں۔ انہوں نے وہ لکھا جو شاید ہی کوئی ہندوستانی عورت لکھ سکے مگر نسخہ نہ لکھا۔ اچھا ہی کیا)

ساحر نے شاعری اور فیاضی کے علاوہ زندہ رہنے کے اور کون سے جتن کئے، معلوم نہیں، لیکن وہ موت سے خوفزدہ نہیں رہے۔ یہاں تک کہ موت نے بھی ان سے برابر کا بیوہار کیا۔ اچانک اٹھا لے گئی۔ اب وقت ہے کہ ان کا شاعری کا، ان کی دل کشی کا قبولِ عام کا، معاصر ادب میں ان کے مقام کا پورا جائزہ لیا جائے۔

گلی گلی اور گھر گھر ساحر کا نام اتنا گونجا ہوا ہے کہ یقین نہیں آتا، ساحر کو سدھارے تین سال ہو گئے۔

ساحر کو شاعری فطرت اور ماحول دونوں سے ملی تھی۔ فطرتاً وہ ایک زود رنج، حساس، ذہین اور موزوں طبع غنائی آدمی تھے۔ اسکول کے دنوں سے، لدھیانہ کے اہلِ ذوق کی صحبت میں انہیں ادب کا چسکا لگا۔ ان دنوں کا (سنہ ۳۹-۱۹۳۴ء) لدھیانہ پورے پنجاب میں لاہور کے بعد سب سے بڑا، متحرک اور حساس اردو مرکز تھا ـــ اور پھر گورنمنٹ کالج۔ ساحر کو لڑکپن میں ماں باپ کی شدید ناچاقی نے کچھ کم کچوکے نہ دئے ہوں گے، دنیاوی اسبابِ آسائش میں پل کر ان دکھوں اور دھچکوں کو سینے میں سمو لینے والا ڈنمارک کے شہزادے ("ہیملٹ") کی طرح مسلسل سوالیہ علامت سے ابھارتا ہے۔ ساحر خاص اس معنے میں اپنے ماحول کے ایک شہزادے تھے۔

شہزادگی انہیں کچھ فطرت اور ماحول نے دی، کچھ عادات نے، شرمیلی طبیعت، نفاست پسندی، درد کی پرورش، اوروں کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھنا۔ درد کے ہر منظر میں خود کو شریک یا ذمہ دار ماننا۔ یہ تبھی ہوتا ہے جب کوئی یہ سمجھے بیٹھا ہو کہ میں جن میں سے ہوں ان سے کچھ افضل ہوں، ان میں نمایاں ہوں اور ان کی ذمہ داری بھی مجھ پر آتی ہے۔

کالج پہنچتے پہنچتے عبدالحی ساکن لدھیانہ کو سوشلزم کی ہوا لگی اور جنگ چھڑتے وقت پنجاب میں جس طرح اندھا دھند بھرتی

ہوئی ہے اس کے خلاف قومی تحریکِ آزادی کا غم و غصہ بھی اس لڑکے کو ملا۔ چند مصرعوں کی نظم "لمحۂ غنیمت" (۱۹۴۱ء) اسی غصے کا اظہار ہے اس کی تاثیر کا اندازہ بھی پس منظر کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

کوئی تیری طرف نہیں نگراں
یہ گراں بار سرد زنجیریں
زنگ خوردہ ہیں، آہنی ہی سہی
آج موقع ہے، ٹوٹ سکتی ہیں
فرصتِ یک نفس غنیمت جان
سر اٹھالے دبی ہوئی مخلوق

Quit India movement

کوئی نہ بتائے تب بھی خیال جاتا ہے کہ ۴۲-۱۹۴۱ء کی نظم ہے بلکہ Quit India تحریک کی صدا سنائی دیتی ہے۔

پھر ۴۲ء کے بعد کا دور آیا۔ صرف کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو سامنے آکر سیاسی کام کرنے کا موقع ملا۔ سیام، برما اور ویت نام کی طرح یہاں بھی ایک تصور پروان چڑھ رہا تھا کہ برٹش امپریلزم کی پے در پے شکست کے بعد ہم اگر ہتھیار اٹھالیں تو اس "زنگ خوردہ آہنی زنجیر" کو توڑ کر آزاد اور سربلند ہو سکتے ہیں۔ مگر اس خیال کا واسطہ شاعر کی بصیرت سے اور ستم زدہ طبیعت سے ہوتا ہے تو وہ ہم وطنوں کی بے حسی اور بے بسی پر جھلّانے لگتا ہے۔ نظم "شہزادے" اسی جھلاہٹ کا اظہار ہے۔ ان دنوں ساحر اس گروہ میں چوری چھپے رائفل چلانے کی ٹریننگ بھی لیا کرتے تھے جو ملک کی آزادی کی خاطر ہر رنگ کے امپریلزم سے بزورِ بازو نجات چاہتا تھا۔ پھر سوویت فوجوں کی فتح اور فاشزم کی شکست کے ساتھ جنگ کے بادل چھٹتے ہیں تو ساحر کی آواز کھلتی ہے۔ اس نئی نوید کی کیفیت ہے۔ لہجہ بدل جاتا ہے۔ شاعر شہزادہ ٹوپی ہوا میں نہیں اچھالتا، صرف چہرے کی بشاشت اس کی شادمانی کا نشان دیتی ہے۔

آج بھی رِم جھم برکھا ہوگی، کل بھی بارش برسی تھی
آج بھی بادل چھائے ہیں
آج بھی بوندیں برسیں گی
اور کوئی اس سوچ میں ہے ....

ساحر کی شاعری رنگ پر آئی ہوئی شاعری تین دہائیوں پر پھیلی ہے۔ (۷۶-۱۹۴۶ء) اس میں حرفِ مکتوب کو دس برس سے زیادہ نہیں ملے۔ سیلولائڈ نے کوئی بیس بائیس برس لے لئے۔ لیکن لئے تو ضائع نہیں گئے۔ یہاں بھی انہوں نے اپنی تازہ دم صلاحیت کو، نیم شاعرانہ قدرتِ کلام کو، شعور کو، درد کو، اداسی کو، عام فہم زبان اور خاص پسند نرم اور پرسوز لہجے میں، اندرونی ڈرامائی تب و تاب میں ڈالا، آنچ دی، ادبی اور فلمی نغمہ نگاری کو ہم آہنگ کر دیا۔

ساحر کے یہاں شور پکار نہیں۔ احتجاج ہے، شان و شکوہ نہیں، ڈرامائی تناؤ ہے، طمطراق نہیں، ہر ایک مظہر اور منظر اپنی اذیت یا مسرت کا اظہار ہے وہ کسی سیاسی جلوس میں آگے آگے نعرہ لگاتے نہیں چلتے، البتہ نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

خوبی

ایسے شاعر کسی بھی درجے کے ہوں، جلوس گزر چکنے کے بعد تک آنکھوں اور یادوں میں بسے رہ جاتے ہیں۔ انہیں ترقی پسند شاعروں میں فیض، مجاز اور مخدوم (اس ترتیب کے ساتھ) ہی دل سے پسند تھے تو بے وجہ پسند نہیں تھے۔ اس پسند کا اظہار کرنے میں انہوں نے اپنے شاعرانہ رجحان کا بھی ثبوت دیدیا۔ غلط نہیں دیا۔ یہی ان کے کلام سے بھی نکلتا ہے وہ اسی مالا کا ایک موتی ہیں۔

مصرعے اُن کے ہاں اکھڑے ہوئے بھی ملتے ہیں۔ مرصّع نثر اور مسجّع نثر کی طرح کے مصرعے۔ مثلاً:

"ترانہ دہرائیں اور کفن لے آئیں" کو (نظم "احساس کامراں" میں) اور

"کردو" اور "کرلو" کو (نظم "یک سوئی" میں) کلاسیکی شاعری قافیے کا عیب شمار کرتی ہے۔

"یہ تم نے ٹھیک کہا ہے، تمہیں ملا نہ کروں
مگر مجھے یہ بتادو کہ کیوں اُداس ہو تم"

"یہ سبھی کیوں ہے، یہ کیا ہے؟ مجھے کچھ سوچنے دو"

"ٹکٹکی باندھ کے تکتا ہوا استادہ ہے"

"اس لئے اے شریف انسانو"

"کیوں کہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے"

خامی کلام

غیر شاعرانہ نظر آنے کے علاوہ نثر کے ایسے معمولی جملے معلوم ہوتے ہیں جن پر فنکار نے رندا نہیں پھیرا۔ جیسے زبان پر آگئے، ویسے ہی رکھ دیئے۔ پنجابی لب و لہجہ کہیں کہیں جذبے کی صداقت کا پتہ دینے کے بجائے نامناسب خود اعتمادی کا اعلان کرتا ہے۔ ایسی اور بھی مثالیں ساحر کے کلام میں ملتی ہیں۔ شعر کہتے وقت وہ جس پیچ و تاب سے گزرتے تھے (اور جس کے دو ایک واقعے اوپر مذکور ہوئے) وہ اپنی جگہ، لیکن ایک بار لکھ چکنے کے بعد وہ اس پر بار بار نظر نہیں ڈالتے تھے۔ یہ "تلخیاں" کے آگے پیچھے بندرہ بیس، یا خدا جانے کتنے اڈیشنوں کے تقابلی مطالعے سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ کسی اڈیشن میں بعد کی کوئی خاص ترمیم نظر نہیں آتی۔ جو خراش جہاں رہ گئی تھی وہیں چلی آرہی ہے۔ صف اول کے اساتذہ کا عمل اس کے برخلاف رہا ہے۔

صرف 8/9 غزلیں

اساتذہ کی زمین میں یا اپنے دور کے چلتے ہوئے موضوعات پر جہاں معاصرین کے مقابل ساحر نے نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں (غزلیں صرف آٹھ، نو ہیں) وہاں شاعر کی اصل خوبی اور خامی سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً

مذہب سے دوری

عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انسانی بستۂ اوہام ہے ساقی

شاعرانہ سقم
57-58، تلخ

یقین نہیں آتا کہ ساحر نے اس وضع کی غزلیں کہی ہوں گی۔ غزل اول تو یوں ہی مختصر، پھر ساحر کی طبیعت کی روانی اور خیال کی ترتیب اس میں نہیں سماتی ـــــ مگر ایک غزل ایسی ہے کہ اس فن کا جوہر شناس حیرت زدہ رہ جائے۔ وہ ہے:

جب کبھی اُن کی توجہ میں کمی پائی گئی

اسی میں یہ شعر ؎

ہم کریں ترکِ وفا، اچھا چلو، یوں ہی سہی
اور اگر ترکِ وفا سے بھی نہ رسوائی گئی ؟
اُن کا غم، ان کا تصور، ان کے شکوے، اب کہاں
اب تو یہ باتیں بھی اے دل، ہوگئیں آئی گئی

یہ غزل پورِ*نور غزل ہے، زبان کا لطف دیتی ہے۔ اہلِ زبان منجھے ہوئے استادوں کی سی شان رکھتی ہے۔ کلاسیکی رس لئے ہوئے ہے۔ ساحر کی باقی غزلیں اس کے سامنے جھونک کھاتی ہیں۔ نہ جانے کیا معاملہ ہے؟ اس غزل کا آخری شعر البتہ ساحر کی اس خود اعتمادانہ بے پروائی کا نمونہ بن گیا ہے

عرصۂ ہستی میں اب تیشہ زنوں کا دور ہے
رسمِ چنگیزی اٹھی، تو قیمہ دارائی گئی

تیشہ زن کا نام فرہاد تھا۔ پہلے نظامی گنجوی نے اور پھر باقی دنیا نے اس نیم تاریخی، نیم افسانوی واقعے پر طویل نظمیں (عموماً مثنویاں) لکھی ہیں۔ اس ڈرامے کا ہیرو فرہاد ـــ تیشہ زن اس کے بالمقابل ویلن بادشاہِ وقت خسرو پرویز۔ چنگیز و دارا کا اس سے کوئی ربط نہیں۔ دارا کو یوں قبول کیا جاسکتا ہے کہ وہ بھی ایران قدیم کا (سوا دو ہزار برس پہلے کا) بادشاہ ہے اور "دارائی" سے شہنشاہی مراد ہوتی ہے۔ لیکن ساحر نے نظرثانی نہ کی، ورنہ وہ "رسمِ پرویزی" لکھ سکتے تھے کہ عین مطابق حال تھا۔

یہی صورت ان کی نظموں میں بعض اور مقامات پر پیش آئی ہے۔

۴۸-۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ انہوں نے ایک تازہ نظم محفل میں سنائی "نور جہاں کے مزار پر"۔

پہلوئے شاہ میں یہ دخترِ جمہور کی قبر

نظم واقعی خوب ہے، بہت خوب ہے۔ اس میں "نور جہاں" کے حصول کی خاطر جہاں گیر کا "شیر افگن" کو دغا سے قتل کرا دینا (جو ثابت نہیں) شاعر کے پیش نظر ہے۔ تاریخی واقعے کے پس منظر میں "دخترِ جمہور" کی مجبوری (؟) ابھاری گئی ہے اور آخری

تو مری جاں، مجھے حیرت و حسرت سے نہ دیکھ
ہم میں کوئی بھی جہاں نور و جہاں گیر نہیں
تو مجھے چھوڑ کے، ٹھکرا کے بھی جاسکتی ہے۔
تیرے ہاتھوں میں مرے ہاتھ ہیں زنجیر نہیں

میں نے اعتراض کیا کہ "جہاں نور" کیوں؟ پورا نام تو بحر میں آتا ہے:
ہم کوئی نور جہاں اور جہاں گیر نہیں

ساحر نے اس اعتراض کو قبول نہیں کیا، ویسے ہی رہنے دیا۔ اب سوچتا ہوں تو مزاج ساحر کی شاعری کا یہی ہے۔ اور جو طنز اس بند میں ہے اور جو خوبی جہاں نور + جہاں گیر کے آمنے سامنے والے ناموں میں ہے ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے ساحر کا مصرعہ درست اور بہتر ہے۔ اعتراض ردّ۔

اسی طرح ایک اچھی نظم ہے "گریز"

وہ پھر کسانوں کے مجمع پہ گن مشینوں سے
حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی

اس بحر اور زمین میں "مشین گن" کا لفظ کھپتا ہے "حقوق یافتہ طبقہ" بھی انگریزی اصطلاح کا لفظی ترجمہ ہے، ساحر چاہتے تو اسے بدل سکتے تھے۔ پہلے میں نہیں تو بائیسویں[۲۲] یا پچیسویں[۲۵] اڈیشن کی اشاعت کے وقت ڈھائی منٹ خرچ کر کے۔ وہ ان دونوں مصرعوں کو اپنی پسندیدہ شعریت دے سکتے تھے۔ مگر نہیں۔ آدمی بڑے ضدی تھے ساحر اور زمانے نے ان کی ضد کو اتنا سر چڑھایا، اتنا پیار دلار دیا کہ کوئی ٹوکتا بھی تو خود خفت اٹھاتا۔

ساحر نے اپنے تیس[۳۰] برسوں کی مشق سخن کے دوران ملک و قوم کے اور بین اقوامی واقعات کے کئی سانحوں کو تاریخی ہنگاموں کو اچھی طرح دل و دماغ میں بسا کر، انہیں ایسی زبان میں پیش کیا کہ نوجوان کی سماعت اور ان کا حافظہ اسے اپنا لے، اسے اچھالے۔ "میں نہیں تو کیا"، "یہ کس کا لہو ہے؟" (فروری ۱۹۴۶) "میرے گیت تمہارے ہیں"۔ "نور جہاں کے مزار پر"۔ "جاگیر"، "مادام"، "لہو نذر دے رہی ہے حیات"، "آوازِ آدم"، "خوبصورت موڑ"، "لمحۂ غنیمت"، "قحط بنگال"، "غالب صدی پر ایک سوال" ان کی انتہائی مشہور و مقبول نظم "تاج محل" سے بھی بہتر اور کھری نظمیں ہیں۔ وہی ان کا شعری معیار مقرر کرتی ہیں۔ وہ اپنے وقت کے فرزند تھے نہ اس کے نقیب، نہ نوحہ خواں۔ وہ اپنے لدھیانہ واقع صوبہ پنجاب کے بہترین نغمہ خواں تھے۔ وہ اپنے دور کے نوجوانوں کے دل کی دھڑکن تھے اور ان کی شاعری میں آغاز شباب کے جذبوں کی سی تازگی اور بوباس ہے۔ اسی کا سا الہڑپن۔

اور جو بھی تھے ــــــ شاعر وہ سچے، کھرے اور دل نشین تھے۔ اپنی ایک ہی طویل نظم سے وہ اردو شاعری کی پرانی منڈیریں سرکا گئے۔ اور اپنے گیتوں سے اردو شاعری کے رس کو گھر گھر پہنچا گئے۔

مگر اُن کی زندگی میں اور اُن کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ساحر کے چاہنے والے، ان کے پسماندہ دوست احباب بھی اپنے وقتوں میں بڑی شاعری سے عظیم الشان تاریخی ڈراموں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے والی زندہ جاوید شاعری سے، بلند آہنگ شاعری سے محروم ہی گزر جائیں گے اور دستِ افسوس ملتے ہوئے جائیں گے۔

ساحر لدھیانوی ۔ ایک دفاع

جوگندر پال

میں اپنے پسندیدہ شاعر کو جذب توفوراً کرلیتا ہوں مگر اس کے اشعار مجھے یاد نہیں رہتے ، بس وہ اپنی رچ عطا کر کے میری ذہنی کیفیت میں ترمیم سی واقع کر جاتے ہیں ۔ میں نے سوچا تھا کہ دہلی کے پندرہ روزہ "چنگاری" نے ساحر لدھیانوی کی یاد میں ایک خصوصی ضمیمہ شائع کر رکھا ہے ۔ اُس ضمیمے میں ساحر کی شاعری کا انتخاب بھی شامل ہے ۔ یہ مضمون لکھنے سے پہلے اُس کی نمائندہ تخلیقات کو ایک بار پھر پڑھ لوں گا اور یوں میرے تاثر کے طبعزاد تلازمے آپ ہی آپ ایک قابل یقین تناسب میں جڑ آئیں گے ، مگر "چنگاری" کا وہ نمبر مجھے نہ مل پایا ۔ اِس سے پہلے تو مجھے کوفت ہوئی لیکن پھر میں سوچنے لگا ، ساحر کے تعلق سے اپنے جذبی اور کیفیاتی میزان میں سے ہی میں اُس کے مخصوص عناصر کی نشاندہی کیوں نہ کر پاؤں گا ۔ اِن عناصر پر اِس اعتبار سے زیادہ بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کسی فوری ردِ عمل سے معرض وجود میں آنے کی بجائے ڈھل ڈھل کر مقام کئے ہوتے ہیں ۔

کئی بیر سال پیشہ ور نقاد ناک منہ سکوڑ کر ساحر لدھیانوی کو انڈر گریجویٹوں کا شاعر کہہ کر ٹال جاتے ہیں ، مگر میری واردات یہ ہے کہ اُسے پڑھتے ہوئے کھائے پیئے بدن میں وہ ساری پرانی توانائیاں لوٹ آتی ہیں ، اٹکی ہوئی سانس ، ٹھہرا ہوا خون پہلے کے مانند رواں دواں ہو جاتا ہے اور یوں زندگی سے کنارہ کش ہونے کی خواہش دم توڑنے لگتی ہے اور جی چاہتا ہے جو ہو سو ہو ، ایک بار پھر کود جاؤں ، یعنی جس باعث نقاد حضرات ساحر کی شاعری کی نفی کرنے کے درپے ہوتے ہیں ، اُسی باعث مجھ پر اس کے مثبت پہلو روشن ہونے لگتے ہیں اِس سے بڑھ کر کسی شاعر کی دین کیا ہو سکتی ہے کہ اُسے پڑھ کر زندگی پر محض غور و خوض کئے جانے کی بجائے زندگی کرنے کی مری مری خواہش پھر سے جی پڑے ؟ ساحر کی ایک بڑی دین اُس کی یہی قوت ہے جس کی بدولت مرجھائے ہوئے ہاتھ پیر تن جاتے ہیں اور دلوں میں زندگی میں شریک ہو جانے کی ، کچھ کر گزرنے کی اور جی جی کر جینے کی خواہش پیدا ہونے لگتی ہے ۔

ہماری پاپولر تنقید کا ایک المناک پہلو یہ بھی ہے کہ کسی تخلیق کی پرکھ کے آلات اُسی روشنی میں وضع نہیں کئے جاتے، بلکہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ اسمگل شدہ مکتبی اصطلاحوں کی لاٹھی لئے میدان میں اتر آتے ہیں اور تخلیق انہیں جب اپنی اِن اصطلاحوں کے جبر سے انحراف کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے تو وہ اس کے قتل کے ارتکاب کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اب اِسے آپ تنقید کہہ لیجئے، یا غنڈہ گردی، کوئی جیتی جاگتی تخلیق ان نیم اندھوں کی دھاندلی سے مرنے سے بچ بھی گئی تو عمر بھر لنگڑاتی رہے گی۔

ہمارے بیشتر تنقیدی کارناموں میں آج ادب پاروں کی گہرائی کو اُن کی مجرد گہرائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ رویہ علوم میں بے محل نہیں، مگر فنون لطیفہ میں خیالات کو ان کی طبعزاد شکلوں اور صداؤں اور بوؤں میں رچائے بسائے بغیر بات نہیں بنتی۔ دراصل فنون لطیفہ خیالات کو اِسی طرح تخلیقنے کے جہد کے سبب ہی علوم کے بوجھل پن سے محفوظ رہتے ہیں اور یہی تخلیقی عمل اُنہیں وہ دھڑکیں عطا کرتا ہے جن کے باعث اُن پر ذی روح ہونے کا گمان ہو۔ ادب کا مقصد کسی خیال کو ادا کر دینے سے ہی پورا نہیں ہو جاتا، ادیب کو تو خیال کو برمحل تلازموں میں بسا بسا کر اس میں عصر کی روح پھونکنا ہوتی ہے، تاکہ اگر پڑھنے والے سے ہو پائے تو وہ کسی نظم یا افسانے میں ادیب سے بھی زیادہ گہرا اُتر جائے۔ ادب کی لطافت اِسی امر میں مضمر ہوتی ہے کہ لکھنے والے کے مانند پڑھنے والے کی تخلیقی شرکت کا سدِ باب نہ ہو۔ ایک نے جو کچھ اپنی توفیق کے مطابق لکھ دیا، دوسرا اُسے اپنی توفیق کے مطابق دریافت۔ میری رائے میں ساحر نے اپنے کلام میں یہ گنجائش بالکمال انکسار روا رکھی ہے اور اُس کی یہ خوبی پڑھنے والے کا دل موہ لیتی ہے۔

کسی صحافی کے لئے اپنا لوہا منوانے کے جتن میں پسینہ پسینہ ہونا اتنا معیوب معلوم نہیں ہوتا، لیکن تخلیق کار کو اپنی عظمت کے قیام کا سامان کرنے کی بجائے ارتکاب یا اعتراف کی صعوبت جھیل جھیل کر لکھنا ہوتا ہے۔ ٹینشن کی یہ صورت ہو تو لکھنے والے کو اپنی ذات کے منوانے کا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا، اس کا مسئلہ تو صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنے نہایت کھرے اظہار سے انسانی درد سانجھے پن کا سماں باندھ پائے۔ جن ادیبوں کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ وہ اپنی تاج پوشی کی رسم ادا کر رہے ہیں، انہیں ہم شاید کلیوَر تو تسلیم کر لیتے ہیں، تاہم ان کی تخلیقی شرکتیں ہمارے نزدیک مشکوک رہتی ہیں۔ تخلیقی شرکتیں اپنے نام کی خوبصورت کتابت کئے جانے کا احساس دلوانے سے ہی میسر نہیں آجاتیں اِس کے لئے تخلیق کار کو ارجنٹ اور کروشیل ہونا پڑتا ہے۔ ساحر اپنے لکھو کھا پڑھنے والوں کو اِسی لئے محبوب ہے کہ اُنہیں اپنی عظمتوں کا یقیں دلانا مقصود نہ تھا، بلکہ عوام کو لٹا پٹا پاکر وہ گویا اپنے ہی لٹ پٹ جانے کی واردات سے دوچار ہوتا تھا۔

بعض پارکھوں کو ساحر لدھیانوی کے یہاں اپنے پیچیدہ اور روحانی مفروضوں کی صدائے بازگشت سنائی نہیں دیتی، اس لئے وہ اسے ناقابل بخشش قرار دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اُس کا البیلا پن اپنی سادگی اور ارضیت سے ہی عبارت ہے۔ وہ سیدھے سیدھے آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر، کانوں سے سُن سُن کر، ہاتھوں سے چھو چھو کر اور اپنے منہ سے بول بول کر سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ وہ بے جا وضاحتوں سے بھی کام لیتا ہے تاہم عوام سے اُس کی فکری اور جذباتی رفاقت اور یہ خواہش کہ

کہیں بات اُن کے سروں کے اوپر سے نہ گزر جائے اتنی فطری اور فوری معلوم ہوتی ہے کہ وضاحتیں گراں نہیں گزرتیں۔ اِس کے علاوہ یہ بھی تو ہے کہ اس کی یہی ' خامی ' اُس کی خوبیوں کے اسباب بھی کرتی ہو۔ اُس کا سادہ اور ارضی لہجہ از خود تو نہیں بن گیا تھا۔ اُس کے پیارے لہجے میں اِن وضاحتوں کا بھی ہاتھ تھا، جو شاید بذات خود بے جا سی لگتی ہیں مگر جن کے تھماپن کے باعث اُس کی باتیں ان گنت سننے والوں کے دلوں میں ایک شعری بھروسہ اِنسپائر کرتی ہیں۔

ایک ساحر لدھیانوی ہی کیا، کوئی بھی لوک پریہ کلاکار جامد فنی معیاروں کے بے ذہن اطلاق کا متحمل نہیں ہو پاتا۔ ضمیر اور روح کے تقاضوں پر پورا اترنے کے لئے جذبے کی بے راہ روی سے بھی صحیح منزل کا نشان مل جاتا ہے ورنہ میکانکی کمال سے کوئی کتنی ہی خوبصورت مورت کیوں نہ گھڑ لے، اگر وہ ہے بے جان، تو دو قدم بھی کیونکر چل پائے گی؟ —— سو کسی فنکار کے ٹکڑے کر کے اُنہیں اس کی خوبیوں اور خامیوں کے الگ الگ خانوں میں سجا دینے سے نقد و نظر کا حق ادا نہیں ہو جاتا، اِس طرح کی مکتبی سہولتوں کو کام میں لانے سے کوئی تصویر فوکس میں آ ہی نہیں پاتی۔

اِس سے قطع نظر کہ ہمعصر زندگی میں کیوں کر بعض بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں اور نتیجتاً گزشتہ ربع صدی میں انسان کو اپنے جذباتی ربط و ضبط میں جن انقلابات میں سے گزرنا پڑا ہے، اُن سے اُسے گذشتہ کئی صدیوں کی قیام پذیر زندگی میں سابقہ نہیں پڑا، ہماری تنقید میں ابھی تک اُن ہی ابدی قدروں کی رَٹ ویسے ہی لگائی جا رہی ہے۔ زندگی جب لمحوں میں سمٹتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے تو پل دو پل کا آدمی کیوں نہ پل پل کی سوچے؟ اگر دو جہاں کی خاک چھان لینے کے بعد بھی وہ اُس روایتی ابدیت کا سراغ لانے سے معذور ہے جس کا ذکر ہماری قدیم کتابوں میں فراواں ہے تو کیا یہی صائب نہیں کہ وہ اپنے پلوں کو ہی بنا سنوار کر جی لے؟

ایمان کی بات ہے کہ ساحر لدھیانوی کا یہ سوال مستقبل میں اور اہمیت اختیار کر جائیگا۔

☆

" موجودہ شاعروں میں مجھے ساحر سب سے زیادہ پسند ہے۔"

علامہ جمیل مظہری (مرحوم)

تصوریں
لاکھوں
دیئے
جھلملائے
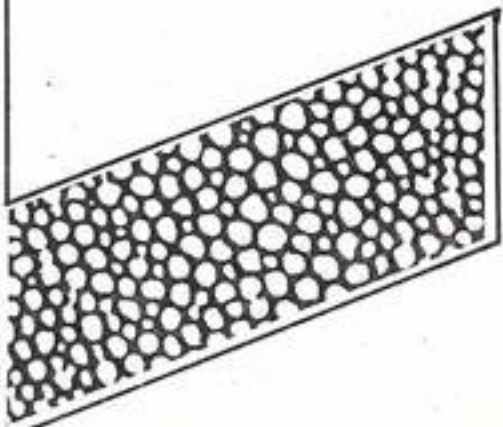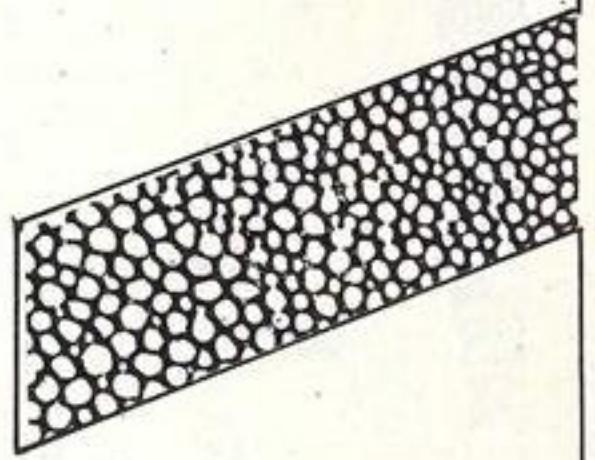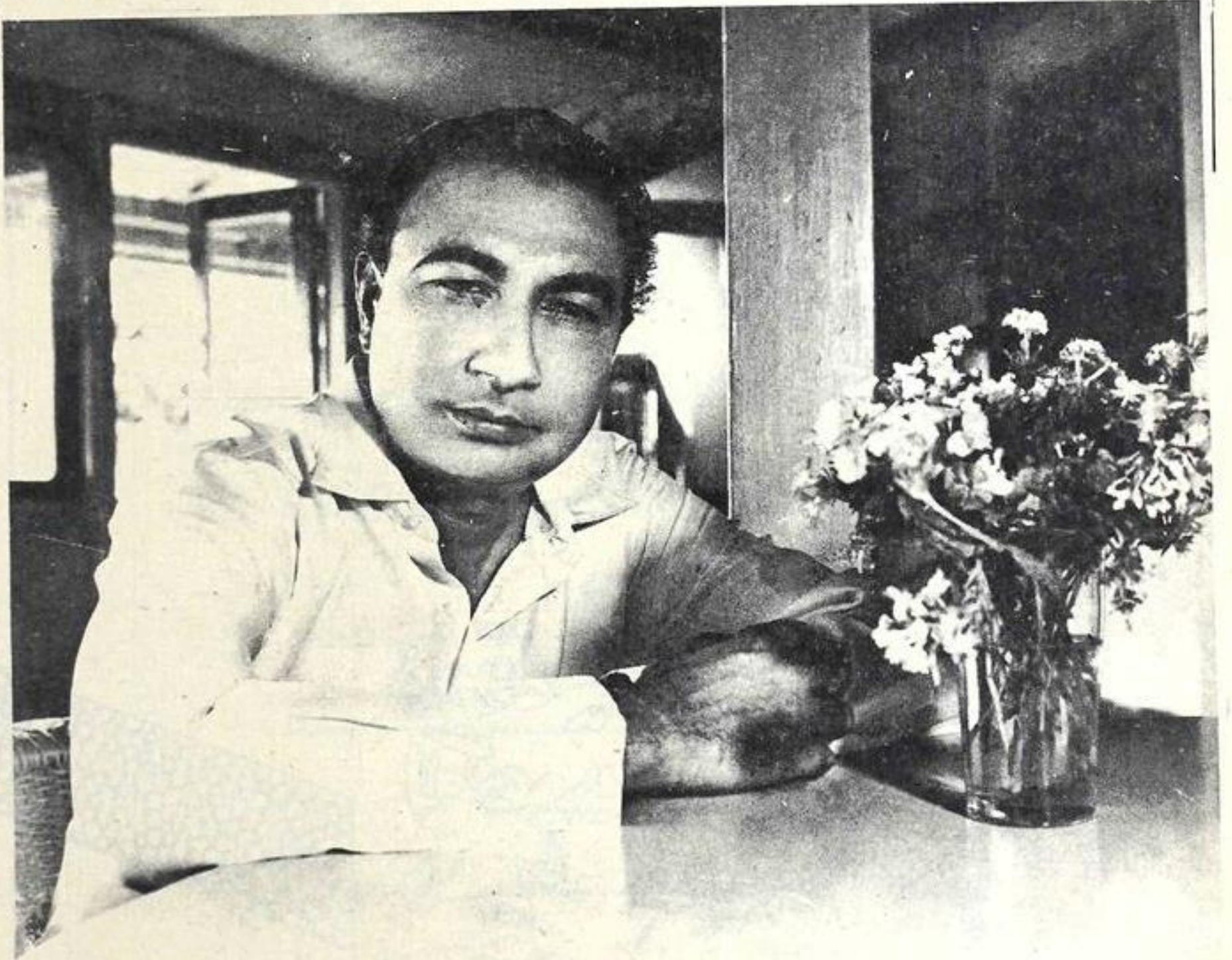
ساحر کی انفرادیت اور شدّتِ احساس

احمد ندیم قاسمی

انسان کی شدتِ احساس نے شاعری کو جنم دیا۔ تفکر کی گہرائی نے اسے پروان چڑھایا، صوتی آہنگ نے اسے شبابِ جاوداں بخشا۔ اور مشاہدے کی ہمہ گیری نیز ماحول کی اثرآفرینی نے اس میں رنگ بھرے۔ آپ زمانۂ حال سے صدیوں پیچھے چلے جائیں یا قرنوں آگے نکل جائیں آپ کو ہر زمانے کی شاعری میں یہی سلسلہ نمایاں نظر آئے گا۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو جملہ فنونِ لطیفہ اک مختصر سے سلسلے کی تخلیقات معلوم ہوتے ہیں۔ شاعری بھی نقادوں کی گڑھی ہوئی اصطلاحات کی محتاج نہیں رہی۔ ہیئت کے بےشمار نمونے رائج ہوئے اور ناپید ہو گئے لیکن اگر کوئی چیز قائم اور دائم رہی تو وہ شدتِ احساس، تفکر کی گہرائی، صوتی آہنگ، مشاہدے کی ہمہ گیری اور ماحول کی اثرآفرینی ہے۔

اس مختصر سی تمہید کا مقصد محض یہ ہے کہ ساحر کی شاعری میں جن خصوصیات نے مجھے سب زیادہ متاثر کیا، اُن میں احساس کی شدت بہت نمایاں ہے اور چونکہ ساحر کے فن کی بنیادیں صالح اور خلوص بھرے احساس پر استوار ہیں اس لئے اس کے ہر شعر تفکر، آہنگ، مشاہدے اور ماحول کے اثرات موجود ہیں۔ اور انہیں کے باعث وہ دورِ جدید کے نوجوان شعراء میں ایک ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔

اردو شاعری کے موجودہ دور کو اکثر نقادوں نے تجرباتی دور کہا ہے۔ تجربے کی افادیت سے مجھے انکار نہیں۔ کیونکہ بعض تجربات اٹل صداقتیں بن جاتے ہیں اور دنیا مدتوں ان کے سہارے چلتی رہتی ہے۔ حقیقت میں جدید تہذیب کا یہ عروج بھی مختلف قسم کے تجربات کی ایک کڑی ہے اور اگر ہر تجربے کو اپنایا جائے تو عین ممکن ہے کہ عروج کا یہ سلسلہ کہیں ختم ہی نہ ہو، اور امکانات کے دائرے وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے جائیں۔ دراصل اس ضمن میں سب سے خطرناک مسئلہ ناممکن تجربات کا تسلسل ہے یہ مسلّم حقیقت ہے کہ گزشتہ دس پندرہ برس میں بیشمار تجربات کئے گئے۔ نظم کی نئی نئی ہیئتیں نکالی گئیں۔ کسی نے ماضی کی روایات سے علی الاعلان بغاوت کر دی۔ کسی نے معمولی سی تبدیلی پر اکتفا کی، کوئی نظم کی پرانی صورتوں میں نیا مواد پیش کرنے میں کوشاں رہا۔

کسی نے نفسیاتی معموں کو معموں ہی میں نظم کر ڈالا کسی نے جنسی ترغیبات کے کھلم کھلا ذکر سے گھبرا کر انتہا درجہ کے مبہم استعاروں کی پناہ لی۔ الغرض بیشمار ہیئتیں بدلے گئے اور بدلے جارہے ہیں۔ لیکن کسی تجربے نے صداقت کی صورت اختیار نہ کی۔ بلکہ ہر تجربہ مزید تجربات کے بوجھ تلے لوٹا اور لوچ ہوتا گیا! در آج کل یہ حالت ہے کہ اردو شاعری کا ہیئتی نظام افراتفری کے عالم میں ہے۔ دورِ جدید کے چند ممتاز شعراء کا کلام دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ تمام حضرات ایک ہی مرکز سے وابستہ ہیں اور ان کی منزلیں بلکہ راہیں تک معین نہیں، نصب العین کا فقدان ہے اور وہ شاعری جس نے جمہور کی بیداری کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ابہام اور بے راہ روی کا ایک طومار بن کر رہ گئی ہے۔ جب تجربات کا یہ عالم ہو تو ضروری امر ہے کہ گزشتہ دور کی صورتوں میں حسب ضرورت تبدیلیوں کے بعد چند ہیئتیں معین کر لی جائیں، کیونکہ تعین ترقی کی کلید ہے اور ہر تعین مستقبل میں ایک نئے تجربے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

ساتھ ہی یہ امر بھی قابل غور ہے کہ نئی نئی ہیئتوں کے جنون میں کئی شعراء نے معنی کو پس پشت ڈال دیا ہے حالانکہ ادب میں ہر نوع کا اجتہاد سب سے اول معنی سے شروع ہونا چاہیئے۔ معنی یا مواد یا موضوع کے مقابلے میں ہیئت فروعی حیثیت رکھتی ہے اور اگر کہنے والے کا احساس پختہ اور تخیل صاف ستھرا اور بلند ہے تو معنی خود بخود اپنی پسند کی ہیئت میں جلوہ گر ہوتے رہیں گے۔

نظم کی جدید سے جدید تر صورتیں صرف اس لئے ایجاد کی جاتی ہیں کہ شاعر کی قوتِ بیان کسی قسم کی رکاوٹ محسوس نہ کرے! اور موضوع کے جو نشیب و فراز، تاثرات اور نتائج اس کے ذہن میں محفوظ ہیں وہ براہ راست پڑھنے والے کے دل میں اتر جائیں لیکن اردو شاعری میں ہیئتی انقلاب نے (گنتی کی مستثنیات کو چھوڑ کر) اکثر ایسے شاعر پیدا کئے ہیں جنہوں نے کسی سے فرائیڈ کے چند تجربات اور ان کی نفسیاتی تاویلوں کا ذکر سن لیا ہے! اور وہ اپنے ہر ذہنی بلبلے، اپنی ہر جسمانی امنگ، اپنی ہر جنسی بے قراری کو سنی سنائی نفسیات کے گورکھ دھندے میں پھنسا کر اسی پھنسی پھنسائی حالت میں عوام کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ ان شعراء کی انتہا درجہ کی مبہم نظموں نے جدید اردو شاعری میں ایسا طوفان بے تمیزی برپا کر رکھا ہے کہ اب شاعری بچوں کا کھیل سمجھی جانے لگی ہے مصرعوں کو کتر کر، توڑ موڑ کر، کھینچ تان کر، دبا کر، پھیلا کر یا قوافی سے چھٹکارا حاصل کر کے چند الفاظ میں ایک دور از کار موضوع پیش کیا جاتا ہے اس دعوے کے ساتھ کہ اگر ہماری شاعری مبہم ہے تو صرف اس لئے کہ ہمارا ماحول مبہم ہے، ہمارا مذہب، ہمارا قانون، ہمارا سماج، ہماری حکومت ـــــ سب کچھ ابہام ہی ابہام ہے۔ اور انسان چونکہ سماج اور مذہب سے ابھی تک پیچھا نہیں چھڑا سکا اور شاعر بھی انسان ہے، اس لئے شاعر کا مبہم ہونا حیرت انگیز نہیں ـــــ کم از کم میرے نزدیک جدید شاعری میں بیشتر نظموں کے ابہام کی یہ تاویل قطعی طور پر طفلانہ انداز کی ہے، اگر شاعر ابہام سے پیچھا نہیں چھڑا سکا، اگر اس کے اشعار پڑھنے سے قاری کو دقت محسوس ہوتی ہے تو وہ شاعری ہی کیوں کرتا ہے، اگر وہ سماجی اور قانونی ڈھکوسلوں میں اس حد تک کھو چکا ہے کہ محض اپنی مجبوریوں کے قصے کو موضوع شاعری بنانے پر تل گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی فنی قوتیں محدود ہیں۔

ان جملہ مفروضات کے علاوہ ایک اور "ادبی فیشن" نے اردو شاعری میں بہت عروج حاصل کیا ہے اور وہ ہنگامی شاعری ہے، جوش ملیح آبادی کی انقلابی نظموں کی اشاعت کے بعد اس صنف کی ابتدا ہوئی۔ اور تمام ہندوستان خاص کر صوبجات متحدہ میں اس گرجتی اور دھاڑتی ہوئی شاعری نے وہ عروج پکڑا کہ اچھے اچھے سخنور اس کی رَو میں بہہ گئے۔ آج بھی جب کہ

یہ سستی شاعری کافی حد تک زوال پذیر ہو چکی ہے۔ ہندوستان کے کسی نہ کسی گوشے سے اس "توڑ پھوڑ" کا نعرہ سنائی دے جاتا ہے لیکن جدید شعراء کے صاحب نظر طبقہ نے جس فکری شاعری کو رواج دیا ہے وہ اب ان دغدغوں اور غلغلوں کو بہت دیر تک زندہ نہیں رہنے دے گی۔ اگر یہ شاعری کسی ڈھب پر چلتی، افراط تفریط کے نازک خطوط کو دیکھ سکتی اور صرف جوش کی تقلید ہی کو کعبۂ مقصود نہ بناتی تو اسے برداشت کیا جاسکتا تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ ان شعراء نے صرف جوش کو دیکھا، وہ جوش کی انفرادیت، زورِ بیان اور شدتِ احساس کو نہ دیکھ سکے اور اس لئے چند قیمتی برس اس سطحی شاعری میں گنوا دئے۔

نئی تعلیم، نئے تجربے اور نئے زاوئے اگر ایک نئی اور شاداب زندگی کے حصول میں ہمارے ممد ثابت ہوں تو ان کی ترقی، ترویج اور عروج پر کون کافر مسرور نہ ہوگا، لیکن اگر ہر نیا تجربہ نئی بدعت اپنے ہمراہ لائے تو اسے ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اردو ادب کا جدید دور بیشمار خوبیوں اور بہت سی بدعتوں کا ایک مرکب ہے۔ لیکن مدتوں کی محکومی سے ہماری قوتیں اتنی شل ہو چکی ہیں کہ ہم خوبی اور بدعت میں امتیاز نہیں کرسکتے۔ اور اگر کوئی ننھا سا امتیاز محسوس بھی ہوتا ہے تو قانون یا پریس یا سماج کے خوف کے مارے ذہنوں میں ہی گھٹ کر نابود ہو جاتا ہے۔ عجیب و غریب استعاروں میں ناگفتہ بہ جنسی حرکات کی تفصیلیں، نہایت بھونڈی تمثیلوں میں جنگ پر اظہارِ خیال —— اور ابہام کی وہ شدت کہ اگر خود شاعر نظم کا مطلب نہ سمجھائے، تو پڑھنے والے ان بھول بھلیوں میں مرتے دم تک سر ٹپختے رہ جائیں۔ ساتھ ہی سطحی شاعری کا فروغ اردو زبان کی پاکیزگی سے علی الاعلان بے پروائی، یہ اور اس قسم کی ان گنت دوسری بدعتیں اردو شاعری میں فروغ پا چکی ہیں۔ لیکن مقام شکر ہے کہ چند شعراء جن کی انفرادیت زندہ ہے اور جو صرف اپنے دماغ سے سوچتے ہیں اردو شاعری کی ٹوٹی پھوٹی کشتی کو سہارا دیئے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان شعراء میں ہمارا نیا مگر پختہ کار شاعر ساحر بھی شامل ہے۔

ساحر نے ہیئت کے معاملے میں کسی قسم کا اجتہاد نہیں کیا، اس کی بیشتر نظمیں پابند ہیں اور اگر کوئی ایک آدھ نظم اس پابندی سے آزاد بھی ہے تو اس کے پڑھنے سے فوراً اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس نظم کا شاعر قافیہ اور ردیف کے حسن اور ترنم کا قائل ہے۔ ساحر نے ہیئت کے بجائے معنی اور موضوع اور سب سے زیادہ اندازِ بیان میں اجتہاد کیا ہے۔ جس طرح میں پہلے عرض کر چکا ہوں اس کی شاعری کی بنیاد شدتِ احساس پر ہے اور میرے خیال میں اس کے اسلوب کا حسن بھی شدید احساس ہی سے عبارت ہے۔ ساتھ ہی اسے ابہام سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ خود ایک جگہ کہتا ہے:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے، وہ لوٹا رہا ہوں میں

اور ذاتی تجربات اور حوادث کا ابہام سے کوئی تعلق نہیں۔ ابہام صرف وہیں پیدا ہوتا ہے جہاں ذاتی تجربات کا فقدان ہو اور کتابی علم موضوعِ شاعری ہو۔

ساحر کی شاعری آج کی شاعری ہے۔ اس کے تین ادوار مقرر کئے جاسکتے ہیں۔ رومان ـ حقیقت ـ اور رومان ـ! پہلا رومان ابتدائے شباب کا کوئی سانحہ معلوم ہوتا ہے، اس کے بعد حقیقت کا دور ہے جس پر مارکسی تعلیمات

کا اثر نمایاں ہے۔ تیسرا دور بھی کسی رومان ہی سے وابستہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں نئی قسم کی اٹھان ہے جو پہلے رومانی دور سے قطعی مختلف ہے۔ آخری دور کی یہ رومانی کیفیت ابھی عروج تک نہیں پہنچی اور ساحر حقیقت اور رومان کے دوراہے پر کھڑا زندگی کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی اقدار کا جائزہ لے رہا ہے اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وہ رومان کی راہ پر چلنے کا ارادہ کر چکا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ راہ کب اُس راہ سے جا کر مل جائے، جس نے اس کی شاعری کے دوسرے دور میں اس کے کلام میں تلخی اور تیزی سی بھر دی تھی۔ البتہ یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ دوسری راہ سے نفرت نہیں کرتا۔ بلکہ اس نے صرف ایک جذباتی افتاد کے زیر اثر رومانی راہ اختیار کر لی ہے۔ وہ چاہے بھی تو حقیقت سے دامن نہیں چھڑا سکتا وہ حقیقت جو اس نے مارکس اور اس کے عظیم المرتبت جانشینوں کی تعلیمات سے اخذ کی اور جس کو فن کے سانچے میں ڈھال کر واضح تر کر دینا اُس کا مقصدِ حیات ہے۔

دنیا کی ہر زبان کے ادبِ عالیہ کا موضوع عموماً محبت رہا ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف ادب ہی نہیں بلکہ ہماری زندگی کا نظام کسی نہ کسی محبت کا مرہونِ منت ہے اور جنسی محبت ان سب میں ممتاز اور نمایاں رہی ہے۔ ابتدائے محبت کی مدہوش کن رنگینیاں ہر سچے شاعر کے ابتدائی کلام میں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ساحر شروع ہی سے محبّت کی تلخیوں کا قصہ چھیڑ دیتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ بہت مدت تک رومان کے دھندلکوں میں نہیں رہا اور حقائق کے اُن کھلے میدانوں میں نکل آیا ہے جہاں قدم قدم پر خلافِ فطرت معاشرتی مفروضوں اور خود ساختہ اخلاقی معیاروں سے مڈبھیڑ ہوتی ہے اور اگر احساس زندہ ہو تو جنگ بھی ہوتی ہے اور سیاست، معاشرت اور مذہب کی کہنہ اقدار کے ملبے سے نئی جاندار اور پائندہ اقدار کا خمیر اٹھانا پڑتا ہے۔

جوانی اور محبت کے ابتدائی دور میں ہر شاعر عشق و محبت کی رنگینیوں اور سرشاریوں کے گیت گاتا ہے، یہ ناممکن ہے کہ ساحر ابتدا ہی سے محبّت کی انتہائی تلخیوں کی ترجمانی کرنے لگا ہو، لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ ہمارے نوجوان طبقہ کے "معمول" کے خلاف ساحر کی ذہانت بہت تیزی سے اُبھر آئی اور اُسے ایک ایسا شعر کہنا پڑا جو صرف ایک جہاندیدہ اور بہت تجربہ کار شاعر ہی کہہ سکتا تھا

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت، اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

اور ماحول کی ناسازگاری کا باعث سوائے موجودہ نوکر شاہی، سرمایہ داری اور اجنبی حکومت کے اور کیا ہو سکتا ہے ساحر کی محبت ایک سرکش کی محبت ہے، وہ محبت جو بورژوا طبقے کی بے شمار اور نفرت انگیز حد بندیوں کی وجہ سے پنپ نہ سکی اور وہ اپنی محبّت کی شدت اور اپنی محبوبہ کی بے لبسی سے متاثر ہو کر حقائقِ حیات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ میں اسے مجبوری ہی کہوں گا۔ کیونکہ انسانی جبلت میں فوری انقلاب ناممکن ہے، بشرطیکہ وہ کسی سخت مجبوری کا مرہونِ منت نہ ہو۔ اس کی ابتدائی نظموں میں بار بار مایوسیوں اور مجبوریوں کی تہوں کے نیچے سے تجدیدِ محبت کا ہنگامہ بلند ہوتا ہے لیکن تلخیوں نے اس کے ذہن کو اس شدت سے محصور کر رکھا ہے کہ وہ کسی سہارے پر بھروسہ نہیں کر سکتا اور پکارتا ہے۔

میری محبوب ، یہ ہنگامہ تجدید وفا — میری افسردہ جوانی کے لئے راس نہیں
میں نے جو پھول چنے تھے ترے قدموں کیلئے — ان کا دھندلا سا تصور بھی مرے پاس نہیں

اس نفسیاتی تسلسل کی دوسری کڑی ساحر کی فکری شاعری ہے، جب محبت کا انجام سوچ ہو تو ضروری امر ہے کہ محبت فروعی حیثیت اختیار کرکے پیچھے ہٹ جائے اور زندگی کے دیگر بے شمار بندھنوں سے سابقہ پڑے، دوسرے دور کی نظموں میں وہ اکثر کھویا کھویا اور سوچتا ہوا معلوم ہوتا ہے، سب سے اول وہ محبت کے متعلق سوچتا ہے، لیکن جب اپنے ذہنی انقلاب کی روشنی میں اسے پرکھتا ہے تو یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے۔

سوچتا ہوں کہ محبت ہے جنونِ رسوا
چند بیکار سے بے ہودہ خیالوں کا ہجوم

اگرچہ اسے اقرار ہے کہ :۔

وہی شعلے مرے سینے میں نہاں ہیں اب تک

لیکن ساحر کے تجربات نہایت تلخ ہیں۔ اس لئے وہ عشق و محبت کے پوشیدہ شعلوں کو بھڑکانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ یہ کہہ کر انہیں ایک حد تک بجھا دیتا ہے:

آہ اس کشمکشِ صبح و مسا کا انجام
میں بھی ناکام، مری سعیٔ عمل بھی ناکام

یہاں سے آگے ساحر کی نظموں میں عشق و محبت کا ذکر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کوندے کی طرح چمک کر غائب ہو جاتا ہے اور مارکس کے ایک مخلص مرید کی طرح "تمہارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے" کہہ کر ایک اور راہ اختیار کرلیتا ہے جہاں قدم قدم پر اسے بھوکے، بھکاری، افلاس، انسانیت کی آہ و بکا، کارخانوں میں لوہے کے شور، بے کفن لاشوں، زرد رو بچوں، بکتے ہوئے جواں چہروں، فاقوں کی گرفت، محکومی اور سب سے زیادہ جاگیردارانہ نظام کی غلط تقسیم سے نبٹنا پڑتا ہے اور چونکہ اس کا احساس پختہ اور صیقل ہے اس لئے اس کے مشاہدے میں گہرائی اور اس کے اسلوب میں توازن ہے۔

اس سے قبل ایک "ادبی فیشن" کے متعلق ذکر کیا جا چکا ہے۔ بھوک، مزدور، غلامی اس فیشن کے محور ہیں۔ چیخ دھاڑ اور واویلا اس فیشن کا طرۂ امتیاز ہے اور بیشمار نوجوان شعراء کے لئے یہ فیشن بہت مدت تک سستی شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ جدید ہندوستان میں شاعری کا موضوع صرف محبت نہیں رہا۔ صدیوں کی غلامی کے بعد سیاسی بیداری فنونِ لطیفہ کی ہر شاخ پر اثر انداز ہوئی ہے اور شاعر جسے حقیقت کی ترجمانی کا دعویٰ ہے اس خوش آئند تغیر سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے، لیکن ماحول کی عکاسی اور پروپیگنڈے میں بہت بڑا فرق ہے۔ ساحر کی دوسرے دور کی نظمیں پڑھتے چلے جایئے۔ آپ کو بہت کم مقامات ایسے ملیں گے جہاں اس نے فن کو جذباتیت پر قربان کر دیا ہو۔ اس کی ان نظموں میں بے پناہ خلوص ہے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے وہی کہتا ہے اور کچھ اس انداز سے کہتا ہے کہ اس کی ان نظموں کا تاثر پڑھنے والے کے احساسات میں

ایک کرب آمیز جھنجھناہٹ پیدا کرتا، اسے بہت دیر تک سوچتا چھوڑ جاتا ہے۔ ان نظموں میں ساحر کی انفرادیت اس قدر نمایاں ہے کہ ہمیں اس کے ایک ایک شعر سے ایک نئے دکھ، ایک نئے زاویے اور ایک نئی صبح کی جھلکیاں نظر آتی ہیں

تشکیک جو زمانہ حال کے ہر نوجوان کو ورثہ میں ملی ہے اور جس سے بالخصوص ہم ہندوستانیوں کو مفر نہیں، ساحر کی نظموں میں بھی موجود ہے۔ "سوچتا ہوں"، "ناکامی"، "مجھے سوچنے دو" اور "گریز" وغیرہ میں ساحر نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی ہولناک ظلمتوں سے نکل جانے کی بہت کوشش کی ہے۔ لیکن اس کی روح مضمحل ہے، اس کی قوتیں شل ہیں۔ اس کے حوصلے تذبذب ہیں۔ اور وہ جب اپنے وطن کی ذلت، مجبوری اور غلامی کو دیکھتا ہے تو نہایت اداس لہجے میں صرف اتنا کہتا ہے:۔

"یہ غم بہت ہیں میری زندگی مٹانے کو"

اور:۔

"مایوسیوں نے چھین لئے دل کے ولولے"

اور:۔

"میرے بے چین خیالوں کو سکوں مل نہ سکا"

اور:۔

"جو سچ کہو تو مجھے موت ناگوار نہیں"

"گریز" میں تذبذب اور تشکیک اپنے عروج پر ہیں۔ اس نظم کے ابتدائی حصے میں وہ اپنی محبت کی ناکامیوں کا فنکارانہ ذکر کرنے کے بعد جب یہ کہتا ہے:۔

"میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تری فسوں زائی"

تو اس کا تذبذب اسے یہاں بھی چین نہیں لینے دیتا۔ حقائق یہاں بھی اس کا تعاقب کرتے ہیں اور یہ شعر کتنا بے مثال اور مکمل ہے:

"ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات بند دریچوں سے بھی گزر آئی"

تو وہ گھبرا جاتا ہے اور غیض و غضب کے عالم میں فنی لطافتوں سے ایک حد تک گریز کرتا ہے۔

"وہ بھوکے کسانوں کے مجمع پہ گن مشینوں سے
حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی"

یہ شعر شاعر کے ذہنی خلفشار کی ایک مثال ہے۔

میری رائے میں "گریز" ساحر کی نظموں میں کئی لحاظ سے ممتاز ہے، یہ موجودہ دور کے ایک تعلیمیافتہ

نوجوان کے شکست خوردہ ارادوں اور پامال امنگوں کا ایک مرقع ہے اس میں بہت بلند درجہ کے اشعار بھی ہیں اور کم درجے کے بھی ۔ مختلف قسم کے خیالات کا ہجوم ہے ۔ جن میں تسلسل ہے بھی اور نہیں بھی ۔ آخری شعر ایک متشکک کے ذہن کا کتنا صاف آئینہ ہے :۔

مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا ۔ تیرا فسونِ زیبائی

دوسرے دور کی آخری نظموں میں ساحر بہت سی ذہنی پیچیدگیوں سے آزاد ہو گیا ہے ۔

" طرحِ نو "، " تاج محل "، " لمحۂ غنیمت "، " اجنبی محافظ "، " شعاعِ فردا " اور " شہزادے " اس دور کی بہترین نظمیں ہیں ۔ اب ساحر کا آدرش بالکل واضح ہے ۔ اس کا مقصد معیّن ہے اور اس کے اسلوب میں وسعت اور پختگی ہے ۔ داخلی الجھنوں کے بجائے اب وہ خارجی دنیا کی بیکرانی کو دیکھتا ہے اس کی تاریخی حِس بیدار ہوتی ہے ۔ مستقبل کی دھندلاہٹیں چھٹ جاتی ہیں اور وہ زمانۂ حال کی سیاسی سماجی اور اقتصادی کشمکش کا ایک علاج بھی سوچ لیتا ہے ۔ اس نفسیاتی آراستگی کے باعث تذبذب یکقلم ناپید ہو جاتا ہے ۔

فرصتِ یک نفس غنیمت جان

اٹھو اے مظلوم انسانو

ایک نیا سورج چمکا ہے ، ایک انوکھی ضوباری ہے

ان الفاظ میں یقین کی پختگی اور امید کی درخشی ہے ۔

ساحر کی شاعری کا آخری (یعنی موجودہ) دور نفسیاتی لحاظ سے بہت سی الجھنوں کا حامل ہے ۔ اس کی تازہ نظمیں " بنگال "، " فن کار "، " کل اور آج " آسانی سے دوسرے دور میں شامل کی جا سکتی ہیں ۔ لیکن " ہراس " اور " اسی دوراہے پر " کو الگ کیا جا سکتا ہے ۔ یہ نظمیں ایک سنبھلے ہوئے انسان کی ذہنیت کا مرقع ہیں ۔ جس نے محبت کے مدوجذر اور زندگی کے دیگر نشیب و فراز کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے ۔ ساحر کا یہ فکری پلٹا ایک حد تک حیرت انگیز سہی لیکن غیر فطری نہیں ۔ ایک نئے ماحول میں قدم دھرتے ہی اس نے اپنے آپ کو نئے رنگوں میں پیش کرنا شروع کر دیا ہے ۔ جہاں تک میرا خیال ہے ساحر کا یہ پلٹا وقتی اور اضافی ہے ۔ اور اس کے سیاسی ، تاریخی اور معاشرتی نظریئے اتنے صاف اور معین ہیں کہ وہ ان " فروعات " کی طرف کسی جذباتی افتاد کے زیر اثر مائل ہونے کے باوجود اپنے ذہنی مرکز سے کبھی جدا نہیں ہو سکے گا ۔

لیکن " ہراس " اور " اسی دوراہے پر " فنی لحاظ سے اتنی مکمل اور حسین نظمیں ہیں کہ جی چاہتا ہے ساحر کچھ عرصے کے لئے اسی راہ پر گامزن رہے ۔ اور اردو کی رومانی شاعری میں نت نئے اور خوبصورت اضافے کرتا جائے ۔ ان نظموں میں وہ جھجکتے اور رکتے ہوئے اظہارِ محبت کرتا ہے ۔ کیونکہ وہ موجودہ نظام میں محبت کی زبوں انجامی سے اچھی طرح آگاہ ہے ۔

میں سلگتے ہوئے رازوں کو عیاں تو کر دوں

لیکن اِن رازوں کی تشہیر سے جی ڈرتا ہے

اِس ڈر کی وجہ محض یہ ہے :۔

میں ترے شہر میں انجان ہوں، پردیسی ہوں

"اسی دوراہے پر" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود شاعر بھی اس ذہنی انقلاب سے باخبر ہے، وہ جانتا ہے کہ محبت کا پنپنا محال ہے لیکن ہائے انسان کی بے بسی :۔

تیری چپ چاپ نگاہوں کو سلگتے پاکر
میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

ساحر ایک منزل پر پہنچ چکا تھا۔ جہاں سے مستقبل کا افق دُرخشاں و تاباں نظر آرہا تھا۔ لیکن اسی منزل کے کسی چپ چاپ کنج کی مدہوش کن رنگینی نے اسے مسحور کرلیا ہے اور اگرچہ وہ اپنے عزم کو فراموش نہیں کرسکا کہ :۔

اب نہ اِن اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا

لیکن :۔

تیرے سانسوں کی تھکن، تیری نگاہوں کا سکوت

اور :۔

تیرے پیراہنِ رنگین کی جنوں خیز مہک

ان سحروں سے وہ چاہے بھی تو بیگانہ نہیں ہوسکتا اور میری تمنا ہے کہ یہ رومانی سرشاری اور وہ سیاسی بیداری اچھی طرح گھل مل جائیں تاکہ جب ساحر حقائقِ حیات کی تلخیوں کی طرف دوبارہ متوجہ ہو، تو صرف تلخیوں کا ترجمان نہ ہو بلکہ اُسے ان تلخیوں میں شیرینی کی ہلکی سی دھاری کا بھی عرفان ہو۔ وہ شیرینی جس نے "گرانبار سلاسل" تلے دب کر ساحر کا نظریۂ جمال ہی بدل دیا تھا۔

ریگ زاروں میں بگولوں کے سوا کچھ بھی نہیں!

جس طرح پہلے عرض کیا جاچکا ہے۔ ساحر نظم کے ہیئتی نظام میں کسی تبدیلی کا روادار معلوم نہیں ہوتا۔ ہیئت کے بجائے وہ معنی کی طرف متوجہ رہا ہے۔ اس نے اظہارِ خیال کے لئے چند صورتیں معین کرلی ہیں اور وہ ان صورتوں میں موضوع و خیال کی نئی نئی جنتیں آباد کرتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں ابہام کا شائبہ بھی نہیں۔ نہایت نرم و نازک اشاریت اس کے فن کی خصوصیت ہے جو پڑھنے والے کے ذہن میں ایک ارتعاش سا پیدا کرکے معانی کی ایک بے کراں دنیا پر سے نقاب اٹھا دیتی ہے۔ قانون، مذہب یا سماج کا ابہام دور کرنے کے لئے وہ ابہام ہی سے کام نہیں لیتا بلکہ نہایت صاف ستھرے انداز میں اس ابہام کی قلعی کھولتا ہے وہ قاری کو متاثر اور محظوظ کرتا ہے۔ دور از کار استعاروں اور اجنبی تشبیہوں سے اس کی طبیعت کو تکدر نہیں کرتا۔ کیونکہ تکدر شاعری کے لئے زہر ہے۔

ساحر کے فن کی خصوصیات میں احساس کی شدت سب سے ممیز اور نمایاں ہے اور چونکہ اس کا احساس زندہ اور بیدار ہے اس لئے اس کی انفرادیت کسی قسم کے بیرونی اثرات کی شرمندۂ احسان نہیں۔ اردو کے جدید تر شعراء میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اگر اس کے کلام کی پختگی، زبان کی پاکیزگی اور اسلوب کی بے پناہ جاذبیت کے مقابلے میں اس کی عمر کو دیکھا جائے تو تعجب ہوتا ہے۔ لیکن شاعری سن و سال کی محتاج نہیں۔ ساحر کی اٹھان اس کے درخشندہ مستقبل کی غمازی کر رہی ہے۔ اگر وہ افراط تفریط سے بچا رہا اور اپنے خلوص کو بے لوث اور اپنے احساس کو بے داغ رکھنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ بہت جلد ہندوستان کے ممتاز ترین شعراء کی صف میں شامل ہو جائے گا۔ میں اس نتیجے پر محض اس لئے پہنچا ہوں کہ جدید تر شعراء میں مجھے ساحر کی سی مکمل انفرادیت کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ انفرادیت جس نے "تاج محل" ایسی غیر فانی نظم کو جنم دیا۔ "تاج محل" کے متعلق آج تک ہر زبان میں بے شمار مضامین نثر و نظم لکھے گئے، لیکن جس زاویہ سے ساحر نے اس مرمریں روضہ کو دیکھا وہ اول و آخر ساحر ہی کا حصہ ہے۔ صرف مارکس کا ایک مخلص مقلد ہی اس نوع کے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔ ساحر کی "تاج محل" ہی میرے اس دعوے کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ معنی یا مواد یا موضوع کے مقابلے میں ہیئت فروعی حیثیت رکھتی ہے اور اگر کہنے والے کا احساس پختہ اور تخئیل صاف ستھرا اور بلند ہے تو معنی خود بخود اپنی پسند کی ہیئت میں جلوہ گر ہوتے رہیں گے۔

میں ساحر کے فن کی خصوصیات گنوا کر اور اس کی مثالیں پیش کر کے اس تحریر کو طول دینا نہیں چاہتا۔ اس مجموعہ کی کوئی نظم لے لیجئے، آپ کو اس میں شدت احساس، تفکر کی گہرائی، صوتی آہنگ، مشاہدے کی ہمہ گیری اور ماحول کی عکاسی کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ "چکلے" میں شاعر کی قوت مشاہدہ اپنے عروج پہ ہے لیکن اسی نظم میں آپ کو دیگر خصوصیات بھی پوری شدت سے جلوہ گر نظر آئیں گی۔ اس طرح "تاج محل"، "لمحۂ غنیمت"، "اجنبی محافظ"، "شعاع فردا"، "شہزادے"، "فنکار"، "کبھی کبھی"، "فرار"، "کل اور آج"، "ہراس"، "اور"، "اسی دوراہے پر" وغیرہ تمام نظمیں شدت تاثر، حسن بیان اور رعنائی خیال کے لحاظ سے اردو شاعری میں معرکے کے فن پارے ہیں جن کا شاعر، نہ پرانے شاعروں کے روایتی لاابالیانہ پن کا شکار ہے اور نہ نئے شاعروں کے جنون جدت پسندی کا۔ وہ ایک واضح اور معین پیغام کا حامل ہے۔ ایک ایسا پیغام جس میں کسی قسم کے تکلف اور تزئین کی ضرورت نہیں۔

دیکھو دور افق کی ضو سے جھانک رہا ہے سرخ سویرا!

(لاہور ——— ۱۹۴۵ء)

ساحر۔ تلخیاں، پرچھائیاں

پروفیسر عبد القوی دسنوی

ساحر لدھیانوی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سیدھی، سادی زبان، عام فہم الفاظ کے ذریعے اپنے سچے افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کو پیش کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہے ہیں۔ تلخیاں کی پہلی نظم "ردعمل" پڑھیے:

چند کلیاں نشاط کی چن کر　　مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی　　تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

دیکھی لے، آسان زبان، مانوس الفاظ میں یہ مختصر نظم سادگی کے ساتھ محبت بھرے دل کی کہانی سناتی ہے جس میں ناکامی کا شدید احساس ملتا ہے اور غمناک فضا اپنا اثر دکھاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ تقریباً یہی تاثر ان کی تمام تر نظموں کو پڑھنے سے ہوتا ہے۔ لیکن کچھ فرق کے ساتھ ان کا محبوب کبھی رنگ و روپ بدلتا ہے اور مختلف شکل و صورت اور حالت و کیفیت میں دکھائی دیتا ہے اور کبھی وہ شاعری کے پردے سے اوجھل ہو جاتا ہے تب ان کا غیر مطمئن ماحول، معاشرت کی تلخ و ترش باتیں، نرم و سخت حادثات اور پیچیدہ مسائل سر اٹھاتے اور ساحر کو جھنجھوڑنے لگتے ہیں اور مضطرب اور بے چین کر دیتے ہیں اور وہ محبوب کے نرم و نازک لمس کے احساس، سیاہ زلفوں کی ٹھنڈی چھاؤں، رنگ و رعنائی کی فضا سے نکل کر زلفِ گیتی کے سنوارنے کا عزم کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کو ہندوستان کے غریب کسانوں کی خستہ حالت پریشان کرتی ہے، مفلس اور کنگال کی بے کسی مضطرب کرتی ہے۔ محنت کش مزدوروں کی مجبوری اُکساتی ہے۔ ادھر پھر ان کی شاعری کی حدیں اور زیادہ وسیع ہوتی ہیں، پھیلتی ہیں اور غمِ دوراں کی کہانیاں سناتی ہیں۔ ایسی کہانیاں جو سننے والوں کو بھی غمناک بنا دیتی ہیں۔ معاشرے کے ان کمزور پہلوؤں کی طرف بھی نشان دہی کرتی ہیں جہاں عورت بہن نہیں رہتی، بیٹی کا احساس نہیں دلاتی، شریکِ حیات کا نام نہیں پاتی اور ماں کے مقدس مرتبے سے محروم ہو جاتی ہے۔ عورت کی مظلومی، مجبوری اور بے کسی و بے بسی کی اَنگنت تصویریں نگاہ کے سامنے سے گزر جاتی ہیں۔ اور ذہن میں کبھی اضطراب پیدا کرتی ہیں اور کبھی دلوں کو غموں سے بوجھل بنا جاتی ہیں۔ ان کی شاعری اسی ڈگر پر چلتی ہوئی عالمگیر مسائل کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے، پھر جنگ کی باتیں ہوتی ہیں، توپوں کے دہانے گرم اور دھواں دار دکھائی

دیتے ہیں، بارود کی بو پھیلتی ہے اور رنگ و نور کی دنیا کو بے رنگ کرتی ہے، بے نور کرتی اور آبادیوں کو متاثر کرتی، تباہی کے ناچ ناچتی نظر آتی ہے اور پھر قحط انگڑائی لیتی ہے، بھوک اور افلاس قہر آلود نگاہیں دکھاتی ہیں۔ انسانی مجبوری، بے کسی اور بے بسی کھسیانی ہنسی ہنستی ہیں۔

ساحر ان حالات کو دیکھتے ہیں ان کے رد عمل کے واقعات سنتے ہیں تو احساسات بے چین کرتے ہیں، جذبات مضطرب کرتے ہیں جنگ اور اس کے نتائج سے خود بھی خوف زدہ ہوتے ہیں اور ایک دنیا کو بھی خوف زدہ کرتے ہیں۔ نتیجے میں ان مصائب سے نجات کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔ اور امن پسندوں کی صف میں آکھڑے ہوتے ہیں! اور امن کے لئے ساز گار فضا تیار کرنے والوں کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت تک تو ساحر "تلخیاں" کے شعری تخلیقات کو زمانہ ماضی میں چھوڑتے ہوئے "پرچھائیاں" کی صبح و شام میں، سنجیدہ، باشعور، باوقار، فکر مند اور باوزن دکھائی دیتے ہیں، مگر "تلخیاں" کے ساحر تو کچھ اور تھے۔ ذرا پچھلے پانچویں دہے کے ابتدائی حصے میں داخل ہوئیے تو وہ پہلے ایک طالب علم کے روپ میں نظر آئیں گے، جذباتی، ناتجربہ کار، حسن پرست، پیکر عشق لیکن ناکام، نامراد، چنانچہ کبھی مسرور، کبھی مغموم اور کبھی جھلاہٹ کے شکار جذباتی نوجوان، الھڑ، محبوب کو محبت کا واسطہ دے کر بغاوت پر آمادہ کرتے ہوئے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کردو ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

اس طالب علمی کے زمانے میں ناتجربہ کار ساحر سے اس طرح کے اکھرے جذبات اور ناپختہ خیالات ہی کی امید کی جاسکتی تھی، لیکن اس کے بعد وہ سنبھل گئے، چنانچہ اپنے اس طرح کے کھردرے جذبات اور بلکہ خیالات کا پھر کبھی اظہار نہیں کیا بلکہ اُن کی شاعری بنتی، سنورتی اور رنت نئے تجربوں سے نکھرتی گئی، زبان کے لحاظ سے بھی، افکار کے معیار سے بھی، اظہار کے فن سے بھی، فکر و خیال کی پختگی سے بھی ـــ شعری آہنگ کے لحاظ سے بھی ان کی شاعری پروان چڑھتی گئی اور اپنے رنگ، لے، لب و لہجہ اور مسائل و مقاصد کی سمت بھی متعین کرتی گئی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنی شاعری کا سارا سرمایہ ابتدا ہی سے بالکل انمول، غیر مستعمل اور انوکھا لائے تھے۔ میں اس بحث میں بھی پڑنا نہیں چاہتا کہ ابتدا میں ان کی شاعری میں جذبات اور تجربات کس سے متاثر تھے اور وہ کہاں سے آئے تھے کون کس سے متاثر ہوا تھا، کس نے کس کا اثر قبول کیا تھا۔ یہ بات بحث طلب ہے لیکن لاحاصل۔

بات صرف یہ ہے کہ کالج کا طالب علمی کا زمانہ ہر نوجوان کے لئے تجربات سے زیادہ حسین خواب و خیال کا زمانہ ہوتا ہے وہ عام طور سے حقیقی دنیا کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کی رنگین اور حسین دنیا میں رہتا ہے اور فریب کو حقیقت سمجھتا ہے، ہمارے شاعر ساحر لدھیانوی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لدھیانہ گورنمنٹ کالج کی "سرزمین پاک" میں ساحر کے شب و روز بھی ویسے ہی گزرے جیسے بعض نوجوانوں کے گزرتے ہیں۔ لیکن ساحر شاعر بھی تھے اس لئے ان کا ماحول شعری فضا سے معمور رہا۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ لطیف جذبات و احساسات بھی رکھتے تھے اس لئے مضطرب بھی زیادہ ہوتے تھے اور لطف اندوز بھی زیادہ ہوتے تھے۔

کالج ان کے لئے وطنِ ثانی تحصیل تھا، اس سرزمین پاک میں "یارانِ نیک" کا ساتھ رہا۔ اس "جنتِ خیال" میں انہوں نے زندگی کے چار سال گزارے۔ جہاں کی "نشاط خیز فضا" میں انہیں "گلہائے رنگ و بو" کے حسین کارواں نظر آتے تھے۔ یہیں ہمارے شاعر نے پہلے پہل وفا کے راگ الاپے، نغماتِ* آتشیں بکھیرے، یہیں سے ان کے یہاں سیاسی شعور بیدار ہوا وہ

نئے نظام کی آمد کے لئے فکر مند ہوئے اور باغیانہ خیالات نے انہیں سرکشی پر مجبور کیا جس کا اعتراف ان کے کلام میں اس طرح ملتا ہے:

سرکش بنے ہیں، گیت بغاوت کے گائے ہیں ۔۔۔ برسوں نئے نظام کے نقشے بنائے ہیں

اور اس کے ساتھ اس کا علم بھی ہوتا ہے کہ:

نغمہ نشاط روح کا گایا ہے بارہا ۔۔۔ گیتوں میں آنسوؤں کو چھپایا ہے بارہا

یہ اشعار ۱۹۴۳ء کے ہیں۔ اس سے تقریباً چار سال پہلے یعنی ۱۹۳۹ء میں لدھیانہ گورنمنٹ کالج کا دروازہ ساحر کے لئے کھلا تھا۔ گویا ان کی انیس سال سے چوبیس سال کی عمر کالج کی تعلیم میں صرف ہوئی۔ اس عمر اور زمانے میں وہ "معصومیوں کے جرم میں بدنام بھی ہوئے" اور سیاسی شعور کے بیدار ہونے کی وجہ سے تیغ بے نیام بھی بنے، چنانچہ ان کی بیشتر شاعری ان کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے اور پھر جوں جوں عمر بڑھتی گئی، شعور جاگتا گیا، جذبات پختگی اختیار کرتے گئے ان کا سماجی اور سیاسی شعور بڑھتا گیا، مستحکم ہوتا گیا۔ اب انہیں ترکِ محبت کا خیال بھی آنے لگتا۔ لیکن محبت کا جذبہ غالب آجاتا اور وہ کچھ شرمندگی محسوس کرتے، چنانچہ اپنی ندامت کو اس طرح چھپانے کی کوشش کرتے:

میں اور تم سے ترک محبت کی آرزو ۔۔۔ دیوانہ کر دیا ہے غم روزگار نے

لیکن رفتہ رفتہ ایک دن ایسا آتا ہے جب ایّام محبت اوراق پارینہ بن جاتے ہیں اور وہ انہیں صرف یاد کر کے تسکین پا لیتے ہیں یا بے چین ہو جاتے ہیں:

آتے ہیں جس دم یاد اب ۔۔۔ کرتے ہیں دل ناشاد اب
گذری ہوئی رنگینیاں ۔۔۔ کھوئی ہوئی دلچسپیاں
پہروں رلاتی ہیں ہمیں ۔۔۔ اکثر ستاتی ہیں ہمیں
وہ زمزمے وہ چہچہے ۔۔۔ وہ روح افزا قہقہے
جب دل کو موت آئی نہ تھی ۔۔۔ یوں بے حسی چھائی نہ تھی
وہ نازنینانِ وطن ۔۔۔ زہرہ جبینانِ وطن
جن میں سے اک رنگیں قبا ۔۔۔ آتش نفس آتش نوا
کر کے محبت آشنا ۔۔۔ رنگ عقیدت آشنا
میرے دلِ ناکام کو ۔۔۔ خوں گشتۂ آلام کو
داغ جدائی دے گئی ۔۔۔ ساری خدائی لے گئی

اور ساحر:

اُن ساعتوں کی یاد میں ۔۔۔ اُن راحتوں کی یاد میں
مغموم سا رہتا ہوں میں ۔۔۔ غم کی کسک سہتا ہوں میں

یہ تو غالباً عشق کی پہلی شکست تھی لیکن ساحر کی شاعری کے مطالعے سے بارہا اس کا احساس ہوتا ہے کہ وہ بار بار وادیٔ محبت میں داخل ہوئے، لیکن بار بار ناکامی اور نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس طرح ان کی زندگی کی عمناکی بڑھتی گئی، پھیلتی گئی اور ایک حلقہ کو متاثر کرتی رہی لیکن جلد ہی زمانے کے جور و ستم نے انہیں مضطرب کرنا شروع کیا، وہ مفلسوں کی بے چارگی، مزدوروں کی بدحالی، کسانوں کی پریشانی اور عام انسانوں کی الجھنوں، رسوائیوں اور زیادتیوں سے مضطرب رہنے لگے، رنجیدہ ہونے لگے، چنانچہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے:

تمہارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے		نجات جن سے میں اک لحظہ پا نہیں سکتا

اب غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کا زور زیادہ ہوتا گیا۔ سماج کے کمزور پہلوؤں پر زیادہ نظر پڑنے لگتی ہے، اضطراب اور زیادہ بڑھتا ہے، احساس اور زیادہ شدید ہوتا ہے، غور و فکر کا مادہ بار بار کروٹیں لیتا ہے اور کبھی وہ یہ سوچ کر پریشان ہونے لگتے ہیں:

وہ گاؤں کی ہمجولیاں		مفلوک دہقاں زادیاں
جو دستِ فرطِ یاس سے		اور یورشِ افلاس سے
عصمت لٹا کر رہ گئیں		خود کو گنوا کر رہ گئیں
غمگیں جوانی بن گئیں		رسوا کہانی بن گئیں

کبھی وہ یہ دیکھ کر غم زدہ اور فکرمند ہو جاتے ہیں:

یہ اونچے اونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے		ہر ایک گام پہ بھوکے بھکاریوں کی صدا
ہر ایک گھر میں یہ افلاس اور بھوک کا شور		ہر ایک سمت یہ انسانیت کی آہ و بکا
یہ کارخانوں میں لوہے کا شور و غل جس میں		ہے دفن لاکھوں غریبوں کی روح کا نغمہ
یہ شاہراہوں پہ رنگین ساریوں کی جھلک		یہ جھونپڑوں میں غریبوں کے بے کفن لاشے
یہ مال روڈ پہ کاروں کی ریل پیل کا شور		یہ پٹریوں پہ غریبوں کے زرد رو بچے

اور ______

گلی گلی میں یہ بکتے ہوئے جواں چہرے		حسین آنکھوں میں افسردگی سی چھائی ہوئی
یہ جنگ اور یہ میرے وطن کے شوخ جواں		خریدی جاتی ہیں اٹھتی جوانیاں جن کی
یہ بات بات پہ قانون و ضابطے کی گرفت		یہ ذلتیں، یہ غلامی، یہ دورِ مجبوری
یہ غم بہت ہے مری زندگی مٹانے کو		اداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو

لیکن ایک دن وہ بھی آیا کہ حیات کے ماحول کی ناخوشگواری نے انہیں یہ کہنے پر مجبور کیا:

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب		ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

اور پھر دنیا کی ناآسودگی، ناانصافی، نابرابری، طرح طرح سے انسان کی انسان کے ساتھ دشمنی، حکمرانوں کے طریقہ حکمرانی اور عوام کی بے بسی، بے کسی، عام عورتوں کی زندگیوں کے ساتھ امراء، رؤساء اور حکمرانوں کے کھلواڑ، ساحر کو اپنی طرف زیادہ

متوجہ کرنے لگتے ہیں اور وہ اپنی شاعری میں ان کو زیادہ جگہ دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ "مجھے سوچنے دو" میں اپنے وطن کی خراب و خستہ حالت پر روشنی ڈالتے ہیں اور ہم وطنوں سے دلچسپی اور ہمدردی کا ذکر نہایت دردانگیز لہجہ کے ساتھ کرتے ہیں:

جلسہ گاہوں میں یہ دہشت زدہ سہمے انبوہ　　رہگذاروں میں فلاکت زدہ لوگوں کے گروہ
بھوک اور پیاس سے پژمردہ سیہ فام زمیں　　تیرہ و تار مکاں، مفلس و بیمار مکیں
نوع انساں میں یہ سرمایہ و محنت کا تضاد　　امن و تہذیب کے پرچم تلے قوموں کا فساد
ہر طرف آتش و آہن کا یہ سیلاب عظیم　　نت نئے طرز پہ ہوتی ہوئی دنیا تقسیم
لہلہاتے ہوئے کھیتوں پہ جوانی کا سماں　　اور دہقان کے چھپر میں نہ بتی نہ دھواں
یہ فلک بوس ملیں، دل کش و سیمیں بازار　　یہ غلاظت پہ جھپٹتے ہوئے بھوکے نادار

"صبح نوروز" میں بھوکے گداگر بچوں کے حال زار سے اس طرح آگاہ کرتے ہیں:

بھوکے، زرد، گداگر بچے
کار کے پیچھے بھاگ رہے ہیں　　وقت سے پہلے جاگ رہے ہیں
پیپ بھری آنکھیں سہلاتے　　سر کے پھوڑے کو کھجلاتے
وہ دیکھو! کچھ اور بھی نکلے
جشن منا و سالِ نو کے

اس کے بعد ساحر کبھی دنیا والوں کی غمناک زندگی سے الگ ہو کر اپنی محبت کی دنیا بسا نہ سکے اور انہوں نے اس کی کوشش بھی نہیں کی، بلکہ ہوا یہ کہ ماحول کی غمناکی نے انہیں غمناک کیا، رنجیدہ دلوں نے رنجیدہ بنایا۔ کرب سے بوجھل دنیا نے ان کے حصے میں کربناکی دی، اور وہ اداس ہو گئے، فکرمند ہو گئے، مضطرب اور بے چین ہو گئے اور فریب شوق کے رنگین طلسم ٹوٹ گئے، حسن و عشق اور محفل رنگ و نشاط سے کنارہ کشی پر مجبور ہو گئے اور اس غم زدہ اور پریشان دنیا کی پریشانیوں اور دکھ درد کو اپنے کاندھوں پر لاد کر دنیا کو اس سے نجات دلانے کی فکر کرنے لگے چنانچہ انہوں نے بہ آواز بلند محبوب کو مخاطب کر کے کہا:

تری نظر، ترے گیسو، تری جبیں، ترے لب　　مری اداس طبیعت ہے سب سے اکتائی
میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا　　کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تری فسوں زائی
مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے　　یہاں بھی مل نہ سکی جنتِ شکیبائی
ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے　　حیات، بند دریچوں سے بھی گزر آئی
مرے ہر ایک طرف ایک شور گونج اٹھا　　اور اس میں ڈوب گئی عشرتوں کی شہنائی
کہاں تلک کوئی زندہ حقیقتوں سے بچے　　کہاں تلک کرے چھپ چھپ کے نغمہ پیرائی
وہ دیکھ سامنے کے پرشکوہ ایواں سے　　کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ ٹکرائی

وہ پھر سماج نے دو پیار کرنے والوں کو   سزا کے طور پہ بخشی طویل تنہائی
پھر ایک تیرہ و تاریک جھونپڑی کے تلے   سسکتے بچے پہ بیوہ کی آنکھ بھر آئی
وہ پھر بکی کسی مجبور کی جواں بیٹی   وہ پھر جھکا کسی در پہ غرورِ برنائی
وہ پھر کسانوں کے مجمع پہ گن مشینوں سے   حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی
سکوتِ حلقۂ زنداں سے ایک گونج اٹھی   اور اس کے ساتھ مرے ساتھیوں کی یاد آئی
نہیں نہیں، مجھے ملتفت نظر سے نہ دیکھ   نہیں نہیں مجھے اب تابِ نغمہ پیرائی

چنانچہ وہ دنیا والوں کو ان مجبوروں، مظلوموں اور پریشان حالوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور ان سے متعلق "کچھ باتیں" کرنا چاہتے ہیں:

جابر و مظلوم کی باتیں کریں   اس کہن دستور کی باتیں کریں
تاج شاہی کے قصیدے ہو چکے   فاقہ کش جمہور کی باتیں کریں
کرنے والے قصے کی توصیف کیا   تیشۂ مزدور کی باتیں کریں

"کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ و پکار" نے ان کو بارہا تڑپایا، اور جب کبھی "کسی مجبور کی جواں بیٹی بکی" تو وہ تڑپ اٹھے اور دنیا کی ناانصافیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، لوگوں کو متوجہ کیا، للکارا۔ ان کی نظم "چکلے" اس کی بہترین مثال ہے۔ طنز کے زہر میں بوجھل اس نظم نے نہ جانے کتنے حساس دلوں کو مضطرب کیا، تڑپایا اور سڑے گلے معاشرے کے خلاف اکسایا ہے خاص طور سے اسکول اور کالج کے طلبہ پر اس کا جادو ایک زمانہ تک چلتا رہا ہے۔ جس نے نوجوانوں کے دلوں میں سماج کے اس گھنونی زندگی میں مبتلا افراد سے ہمدردی پیدا کی ہے اور اس کے علاج کے لئے انہیں فکر مند کیا ہے۔ اس موضوع پر ساحر سے پہلے بھی شعراء متوجہ ہوئے ہیں، کبھی ہمدردانہ رویّے کے ساتھ، کبھی بے رحمانہ انداز اختیار کر کے۔ لیکن ساحر کے احساسات اور اظہار کا انداز بالکل مختلف ہے انہوں نے اپنے تلخ احساسات اور مضطرب جذبات کے اظہار میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ہے۔
چنانچہ سچی تصویریں پیش کرنے میں اور عام انسانوں کے دلوں میں صالح جذبات بیدار کرنے میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ بڑی رواں دواں، بڑی پُر اثر اور تڑپانے والی یہ کارگر نظم، اردو نظم کے سرمائے میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ یہ مناظر کتنے حقیقت سے قریب اور دل آزار ہیں:

یہ پُرپیچ گلیاں، یہ بے خواب بازار   یہ گمنام راہی، یہ سکوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے یہ سودوں پہ تکرار   ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

وہ اجلے دریچوں میں پائل کی چھن چھن   تنفس کی الجھن پہ طبلے کی دھن دھن
یہ بے روح کمروں میں کھانسی کی ٹھن ٹھن   ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ پھولوں کے گجرے، پیکوں کے چھینٹے — یہ بیباک نظریں، یہ گستاخ فقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ مدقوق چہرے — ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں ؟

یہاں پیر بھی آچکے ہیں، جواں بھی — تنومند بیٹے بھی، ابّا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے، بہن بھی اور ماں بھی — ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں ؟

ذرا ملک کے رہبروں کو بلاؤ — یہ کوچے، یہ گلیاں، یہ منظر دکھاؤ
ثناخوان تقدیس مشرق کو لاؤ — ثناخوان تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

"طرح نو" میں مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش جاری دکھائی گئی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا تختہ الٹنے کو ہے۔ بھوکے مزدور انتقام لینا چاہتے ہیں:

فاقہ کشوں کے خون میں ہے جوشِ انتقام — سرمایہ کے فریبِ جہاں پروری کی خیر
طبقاتِ مبتذل میں ہے تنظیم کی نمود — شاہنشہوں کے ضابطۂ خودسری کی خیر

مزدور سے ہمدردی نے انہیں اشتراکیت کا ہمنوا بنا دیا تھا، طلوعِ اشتراکیت اس کی مثال ہے۔ یہ پہلی نظم ہے جس میں کھل کر اشتراکیت کو "نیا سورج" کا نام دیا گیا ہے۔ نظم اچھی ہے، بڑی رواں ہے، جوش و جذبات سے پُر ہے۔ اس میں مزدور طبقہ کی ترجمانی ملتی ہے، مظلوموں کو بیداری کا احساس دلا دیا گیا ہے۔ ایک نئے انقلاب کی آواز سنائی گئی ہے، کسان، مزدور مظلوم، طبقہ نسواں، بھوکے ننگے، گداگر سب اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور اپنا اپنا حق مانگ رہے ہیں اور پرانا نظام خوف زدہ ہے، کانپ رہا ہے:

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں اونچے ایواں کانپ رہے ہیں
مزدوروں کے بگڑے تیور، دیکھ کے سلطاں کانپ رہے ہیں
جاگے ہیں افلاس کے مارے، اٹھے ہیں بے بس دکھیارے
سینوں میں طوفاں کا تلاطم، آنکھوں میں بجلی کے شرارے

شاہی درباروں کے در سے فوجی پہرے ختم ہوئے ہیں
ذاتی جاگیروں کے حق اور مہمل دعوے ختم ہوئے ہیں
شور مچا ہے بازاروں میں ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دنیا، غصب شدہ حق انسانوں کے

رسوا بازاری خاتونیں، حقِ نسائی مانگ رہی ہیں
صدیوں کی خاموش زبانیں سحر نوائی مانگ رہی ہیں

جمع ہوئے ہیں چوراہوں پر آکر بھوکے اور گداگر
ایک لپکتی آندھی بن کر، ایک بھبھکتا شعلہ بن کر
کاندھوں پر سنگین کدالیں، ہونٹوں پر بیباک ترانے
دہقانوں کے دل نکلے ہیں، اپنی بگڑی آپ بنانے

ساحر کے شعری مجموعہ "تلخیاں" کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو "طلوعِ اشتراکیت" سے پہلے ایک مختصر نظم "لمحۂ غنیمت" ملتی ہے جو آدھے درجن اشعار پر مشتمل ہے اور مکمل طور سے سیاسی ہے جس میں بغاوت کرنے کی دعوت دی گئی ہے:

مسکرا اے زمینِ تیرہ و تار   سر اٹھا، اے دبی ہوئی مخلوق
دیکھ وہ مغربی افق کے قریب   آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پرانے قمار خانے میں   کہنہ شاعر بہم الجھنے لگے
کوئی تیری طرف نہیں نگراں   یہ گراں بار سرد زنجیریں
زنگ خوردہ ہیں، آہنی ہی سہی   آج موقع ہے ٹوٹ سکتی ہیں
فرصتِ یک نفس غنیمت جان
سر اٹھا اے دبی ہوئی مخلوق

یا پھر "طلوعِ اشتراکیت" سے پہلے بعض نظموں میں اس طرح کے اشعار پائے جاتے ہیں جن میں ساحر کے سیاسی شعور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں:

ہمیں سے رنگِ گلستاں، ہمیں سے رنگِ بہار   ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

یا "میرے گیت" میں:

مرے سرکش ترانے سن کے دنیا یہ سمجھتی ہے
کہ شاید مرے دل کو عشق کے نغموں سے نفرت ہے
مجھے ہنگامۂ جنگ و جدل میں کیف ملتا ہے
مری فطرت کو خوں ریزی کے افسانوں سے رغبت ہے
مری دنیا میں کچھ وقعت نہیں ہے رقص و نغمہ کی
مرا محبوب نغمہ شورِ آہنگِ بغاوت ہے

لیکن دنیا ساحر کے بارے میں جو کچھ سوچتی اور سمجھتی تھی حقیقت ویسی نہیں تھی بلکہ جیسا کہ وہ خود بتلاتے ہیں :

مرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے
کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
غریبوں، مفلسوں کو، بے کسوں کو، بے سہاروں کو
سسکتی نازنینوں کو، تڑپتے نوجوانوں کو
حکومت کے تشدد کو، امارت کے تکبّر کو
کسی کے چیتھڑوں کو، اور شہنشاہی خزانوں کو
تو دل تاب نشاط بزم عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب آور ترانے گا نہیں سکتا

ایک مختصر نظم "کچھ باتیں" کا ذکر آچکا ہے جس میں دیس کی ادبار کی باتیں بھی کی گئی ہیں اور اجنبی سرکار کی باتیں بھی دہرائی گئی ہیں، لیکن ہلکے پھلکے انداز میں۔ بس ایک نگاہ ڈالی گئی ہے اور اشارے کر دیئے گئے ہیں۔ البتہ "گرنے والے قصر" کی خوشخبری دی گئی ہے۔ لیکن "طلوع اشتراکیت" ان کی بھرپور سیاسی نظم ہے جو زبان و بیان کے لحاظ سے اس لئے اہم ہے کہ اس میں بڑا جوش اور ولولہ ہے۔ عزم اور حوصلہ ہے۔ عام فہم زبان ہونے کے باوجود اس میں بڑا اثر، بڑی روانی اور نغمگی ہے۔ اس نظم میں انہوں نے بغاوت کی اطلاع بھی دی ہے اور انقلاب کی خوشخبری بھی سنائی ہے! اور پہلی بار بتایا ہے کہ

چوک چوک پر گلی گلی میں سرخ پھریرے لہراتے ہیں

تیرہ اشعار پر مشتمل یہ نظم اس وقت کے شاعر کے جذبات و احساسات اور سیاسی شعور سے پوری طرح متعارف کراتی ہے۔ اور ساحر سے متعلق ادھورے نقوش میں رنگ بھرتی ہے۔ ان رنگوں میں سرخی کو بھی اہمیت حاصل ہوتی نظر آتی ہے۔

جنگ عظیم میں غیر ملکی فوجی خاص طور سے امریکیوں کا بڑا زور تھا۔ وہ جہاں ٹھہرتے، جن ہوٹلوں میں قیام کرتے تھے ہندوستانیوں کا وہاں ہجوم سا لگ جاتا تھا۔ ان میں اکثر مصائب کے شکار غریب ان کے سامنے دست سوال بن جاتے، اور وہ مغرور فوجی جوان احساس برتری کے تحت آڑے، ٹیڑھے، ترچھے محسوس ہوتے :

اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
اونچے ہوٹل کے در خاص پہ استادہ ہیں
اور نیچے مرے مجبور وطن کی گلیاں
جن میں آوارہ پھرا کرتے ہیں بھوکوں کے ہجوم
زرد چہروں پہ نقاہت کی نمود
خون میں سینکڑوں سالوں کی غلامی کا جمود

علم کے نور سے عاری محروم
فلک ھند کے افسردہ نجوم
جن کے تخیل کے پر
چھو نہیں سکتے ہیں اس اونچی پہاڑی کا سرا
جس پہ ہوٹل کے دریچوں میں کھڑے ہیں تن کر
اجنبی دیش کے مضبوط گرانڈیل جواں
منہ میں سگریٹ لئے ہاتھوں میں برانڈی کے گلاس
جیب میں نقرئی سکوں کی کھنک

....

کچھ اشعار کے بعد یہ نظم نہایت تلخ ہو جاتی ہے:

اجنبی دیس کے بے فکر جوانوں کا گروہ
کوئی سکہ، کوئی سگریٹ، کوئی کیک
یا ڈبل روٹی کے جھوٹے ٹکڑے
چھینا جھپٹی کے مناظر کا مزہ لینے کو
پالتو کتوں کے احساس پہ ہنس دینے کو
بھوکے مجبور غلاموں کا گروہ
ٹکٹکی باندھ کے تکتا ہوا استادہ ہے
کاش! یہ بے حس و بے وقعت و بیدل انساں
روم کے ظلم کی زندہ تصویر
اپنا ماحول بدل دینے کے قابل ہوتے

....

ساحر نے "شہزادے" میں ایک بار پھر فتح جمہور کی خبر دی ہے اور پھیلنے والی سرخ شعاعوں سے باخبر کیا ہے:

تیرگی ختم ہوئی سرخ شعاعیں پھیلیں

"شعاع فردا" بھی سیاسی خیالات کی ترجمان ہے جس میں ایک بہتر مستقبل کے لئے ساحر پرامید تھے۔ انہیں یقین تھا کہ کچھ دن بعد ہی انقلاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

تیرہ و تار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر

اور کچھ دیر اُجالے کے لئے ترسے گا
اور کچھ دیر اُٹھے گا دلِ گیتی سے دھواں
اور کچھ دیر فضاؤں سے لہو برسے گا
اور کچھ دیر بھٹک لے مرے درماندہ ندیم
اور کچھ دن ابھی زہراب کے ساغر پی لے
نور افشاں چلی آتی ہے عروسِ فردا
حال تاریک و سم افشاں سہی، لیکن جی لے

۱۹۴۴ء میں بنگال کے قحط نے انہیں بے حد مضطرب کیا، اسی اضطراب نے ان سے "قحط بنگال" جیسی پُراثر نظم لکھوائی۔ جس میں زورِ بیان بھی ہے اور جذبات کی فراوانی بھی:

یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسلِ آدم و حوّا بلک بلک کے مرے
ملیں اسی لئے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں
چمن کو اس لئے مالی نے خون سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

پھر "فنکار" میں ایک بار پھر اس جہد آزادی اور سیاسی گرما گرمی اور سماجی بہتری کی تلاش کے دوران میں محبوب سے مخاطب ہو گئے ہیں۔

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
اس لئے کہ: مفلسی، جنس بنانے پہ اتر آئی ہے
بھوک، تیرے رخِ رنگیں کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنائی ہے

"کبھی کبھی" میں بھی مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں:

عجب نہ تھا کہ میں بیگانہ الم ہو کر

ترے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا
ترا گداز بدن، تیری نیم باز آنکھیں
انہی حسین فسانوں میں محو ہو رہتا

لیکن:

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا چکا ہوں گلے
گذر رہا ہوں کچھ انجانی رہ گذاروں سے
مہیب سائے مری سمت بڑھتے آتے ہیں
حیات و موت کے پر ہول خارزاروں سے

"فرار" میں اپنے ماضی کو ذلت سے تعبیر کیا ہے۔ "کل اور آج" میں محنت کش کسانوں کے حال زار پر افسوس کیا ہے اور "ہراس" میں ساحر نے اپنے ایک نئے محبوب سے اپنے خدشات کا اظہار کیا ہے:

میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسّم وہ تکلّم، تری عادت ہی نہ ہو

"اسی دوراہے پر" ایک ایسی نظم ہے جس میں تجدید الفت کا اظہار کیا گیا ہے اور پھر پچھتاوا بھی ہے۔ "ایک تصویر رنگ" میں محبوب سے شکایت کرتے ہوئے ملاقات ہوتی ہے:

تو نے سرمائے کی چھاؤں میں پنپنے کے لئے
اپنے دل اپنی محبت کا لہو بیچا ہے
دل کے تزئینِ فسردہ کا اثاثہ لے کر
شوخ راتوں کی مسرت کا لہو بیچا ہے

"ایک شام" میں ماحول اور ارد گرد کے حالات سے آگاہ کیا گیا ہے:

چار جانب ارتعاشِ رنگ و بو
چار جانب اجنبی بانہوں کا جال
چار جانب خوں فشاں پرچم بلند
میں مری غیرت مرا دست سوال
زندگی شرما رہی ہے کیا کروں؟

"احساسِ کامراں" میں جیسا کہ حاشیہ پر درج ہے "دوسری جنگ عظیم میں نازی فوجوں کی شکست اور سوویت فوجوں کے جرمن سرحد عبور کرنے پر لکھی گئی ہے۔"

"میں نہیں تو کیا" خالص عشقیہ نظم ہے۔ جس میں محبوب جدا ہو کر کسی اور کا ہو گیا ہے لیکن سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود وہ غم زدہ اور غیر مطمئن نظر آتا ہے۔

"خود کشی سے پہلے" بھی عشقیہ نظم ہے جس میں ناکامی کا درد و کرب سمو دیا گیا ہے لیکن غم جاناں نے جلد ہی غم دوراں کا رخ کر لیا ہے اور انسانی مصائب، ظلم و ستم کی کرب ناک جھلکیاں نظم کی تہہ سے ابل پڑی ہیں:

ظلم سہتے ہوئے انسانوں کے اس مقتل میں
کوئی فردا کے تصور سے کہاں تک بہلے
عمر بھر رینگتے رہنے کی سزا ہے جینا
ایک دو دن کی اذیت ہو تو کوئی سہہ لے

وہی ظلمت ہے فضاؤں میں ابھی تک تازہ
جانے کب ختم ہو انساں کے لہو کی تقطیر

"یہ کس کا لہو ہے؟" ۱۹۴۶ء میں آزادی ہند کی خاطر جہازیوں کی بغاوت کی ترجمان ہے جو خالص سیاسی نظم ہے۔ اس بغاوت میں بے شمار فوجیوں کی جانیں وطن کے کام آ گئی تھیں جس کا ساحر کو شدید احساس تھا جس کی وجہ سے انہیں قومی رہنماؤں سے شکایت پیدا ہو گئی تھی، چنانچہ اس نظم میں ان رہبروں سے اس طرح کے سوالات کئے گئے ہیں:

اے رہبر ملک و قوم ذرا
آنکھیں تو اٹھا نظریں تو ملا
کچھ ہم بھی سنیں، ہم کو بھی بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟

اور آخر میں ساحر نے اپنے عزم کا اعلان اس طرح کیا ہے:

ہم ٹھان چکے ہیں اب جی میں، ہر ظالم سے ٹکرائیں گے
تم سمجھوتے کی آس رکھو، ہم آگے بڑھتے جائیں گے
ہر منزل آزادی کی قسم، ہر منزل پر دہرائیں گے

"میرے گیت تمہارے ہیں" میں کسانوں اور مزدوروں کا ساتھ دینے کا نیا عزم ہے۔ معلوم نہیں اس میں ہندی کے الفاظ زیادہ کیوں استعمال کئے گئے ہیں جس نے نظم کی روانی اور شیرینی چھین لی ہے۔ وہ اعلان کرتے ہیں:

آج سے اے مزدور کسانو! میرے راگ تمہارے ہیں
فاقہ کش انسانو! میرے جوگ بھاگ تمہارے ہیں

جب تک تم بھوکے ننگے ہو، یہ شعلے خاموش نہ ہوں گے
جب تک بے آرام ہو تم، یہ نغمے راحت کوش نہ ہوں گے

"جاگیر" میں طنزیہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے اس نظام کی قلعی کھلتی ہے اور دل میں اس کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام نے ملک کے جمہور کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ خاص طور سے مزدوروں اور کسانوں کو اس فرسودہ نظام کے تحت صدیوں سے کچلے اور دبائے رکھا گیا اور ان کا استحصال کیا گیا۔ ان کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی تھی، نہ ان کی محنت و مشقت، نہ پیداوار، کچھ بھی نہیں۔ سب آقاؤں کی باپ دادا سے ملی ہوئی جاگیریں ہوتی تھیں۔ یہ ان کی خوشیوں کے لئے زندہ رہتے تھے — ایک جاگیردار کا یقین ہوتا تھا:

اِن کی محنت بھی مری، حاصل محنت بھی مرا
ان کے بازو بھی مرے، قوتِ بازو بھی مری
میں خداوند ہوں، اس وسعتِ بے پایاں کا
موجِ عارض بھی مری، نکہت گیسو بھی مری

اور کسانوں کے حالت زار سے بھی اس طرح آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے:

خاک میں رینگنے والے یہ فسردہ ڈھانچے
ان کی نظریں کبھی تلوار بنی ہیں نہ بنیں
اُن کی غیرت پہ ہر ایک ہاتھ جھپٹ سکتا ہے
اُن کے ابرو کی کمانیں نہ تنی ہیں نہ تنیں

"مادام" ایک ایسی نظم ہے جس میں ہندوستان کی غربت اور افلاس کی وجہ سے جو برائیاں پیدا ہوئی ہیں انہیں کو تہذیب و آداب اور تعلیمی میدان میں ہندوستان کے پچھڑے رہنے کی وجہ قرار دی گئی ہے۔ یہ کہنا بہت حد تک درست ہے کہ:

مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
اور یہ بھی حق ہے کہ:　　بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

لیکن ساحر لدھیانوی کا یہ دعویٰ بھی بالکل سچ ہے کہ:

ہم نے ہر دور میں تذلیل سہی ہے لیکن
ہم نے ہر دور کے چہرے کو ضیا بخشی ہے
ہم نے ہر دور میں محنت کے ستم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دور کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جن حالات میں اور جس طرح ہندوستان آزاد ہوا۔ اس کو ساحر اور ان کے ہم خیال بہتوں نے

پسند کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور "مفاہمت" کا نام دیا۔ چنانچہ صاف صاف کہا:

یہ جشن جشنِ مسرت نہیں تماشہ ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنوں کا جلوس
ہزار شمعِ اخوت بجھا کے چمکے ہیں
یہ تیرگی کے ابھارے ہوئے حسین فانوس

"مفاہمت" ہی کا دوسرا حصہ ان کی طویل نظم "آج" ہے جو انہوں نے ۱۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے پیش کی تھی یہ نظم نہایت غمناک ہے آزادی حاصل کرنے کے بعد ہندوستان میں جو انسانوں کا خون بہایا گیا اور تباہیاں مچائی گئیں۔ اور ملک کے نام کو رسوا کیا گیا۔ اس نے ہمارے شاعر کو مغموم بھی کیا، مضطرب بھی بنایا۔ وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے:

ساتھیو! آج تم نے بھسم کر دیا ہے
اور میں ــــ اپنا ٹوٹا ہوا ساز تھامے
سرد لاشوں کے انبار کو تک رہا ہوں
میرے چاروں طرف موت کی وحشتیں ناچتی ہیں
اور انساں کی حیوانیت جاگ اٹھی ہے
بربریت کے خوں خوار عفریت
اپنے ناپاک جبڑوں کو کھولے
خون پی پی کے غرا رہے ہیں
بچے ماؤں کی گودوں میں سہمے ہوئے ہیں
عصمتیں سر برہنہ پریشاں ہیں
ہر طرف شورِ آہ و بکا ہے
اور میں اس تباہی کے طوفان میں
آگ اور خون کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہوں
مجھ کو امن اور انصاف کی بھیک دو

بروقت کہی گئی یہ نظم نہایت پُر تاثیر ہے اور وطن کے لئے، اہلِ وطن کے لئے، ماؤں کے لئے، بچوں کے لئے، محبت کا جذبہ

بیدار کرتی ہے۔ یہ سب کچھ اس نظم میں اس لئے ہے کہ خود ساحر کو وطن سے بے حد محبت تھی۔ جس نے ان حالات میں انہیں مضطرب کر دیا۔ لیکن ہوش کھونے کے بجائے ہوش پر قابو پانے میں وہ کامیاب ہو گئے۔

"نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کر دو" بھی سیاسی نظم ہے جس میں آزادی کے بعد یہ احساس دلایا گیا ہے کہ پرانے رہنماؤں کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ اس لئے کہ وہ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہی حصول مقصد میں ناکام ہو گئے اور سارے ملک میں تباہی مچ گئی۔ یہ نظم بھی "مفاہمت" اور "آج" کا حصہ ہے۔ آخری بند میں اہل وطن کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے:

سفر نصیب رفیقو! قدم بڑھائے چلو
پرانے راہنما لوٹ کر نہ دیکھیں گے
طلوع صبح سے تاروں کی موت ہوتی ہے
شبوں کے راج دلارے ادھر نہ دیکھیں گے

"لہو نذر دے رہی ہے حیات" سیاسی نظم ہے جس میں آزاد ہندوستان میں ایک خاص نظریہ کے ماننے والوں کو جب قید و بند اور جبر و تشدد کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا تو ساحر کو کہنا پڑا:

مگر مٹے ہیں کہیں جبر اور تشدد سے
وہ فلسفے کہ جلا دے گئے دماغوں کو

اور "اشتراکیت" کی مقبولیت کی طرف بھی یہ کہتے ہوئے اشارہ کرتے ہیں:

ابھر رہے ہیں فضاؤں میں احمریں پرچم
کنارے مشرق و مغرب کے ملنے والے ہیں

"متاع غیر" ایک عاشقانہ نظم ہے جس میں شاعر اپنے محبوب سے پوچھتا ہے کہ:

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گذر ہے کہ نہیں

پوری نظم اسی خیال کے تانے بانے سے مکمل ہوئی ہے اور ایک ہلکی سی کسک دل و دماغ پر چھوڑتی ہے۔ "آواز آدم" میں حکومت سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے:

مکافات عمل، تاریخ انساں کی روایت ہے
کرو گے کس طرح ناوک فراہم ہم بھی دیکھیں گے

کہاں تک ہے تمہارے ظلم میں دم ہم بھی دیکھیں گے

"بشرط استواری" میں شاعر نے جمہور سے وفادار رہنے کا اعلان "میں تمہارا ہوں لٹیروں کا وفادار نہیں" کہہ کر کیا ہے "خوب صورت موڑ" بھی ایک پیاری رومانی نظم ہے۔ جس میں محبوب سے اجنبی بننے کی خواہش ظاہر کی گئی ہے اور اختتام نہایت

خوبصورتی کے ساتھ اس بند پر کیا گیا ہے:

تعارف روگ ہو جائے تو اس کو بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے تکمیل تک لانا نہ ہو ممکن
اسے ایک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

اس مجموعے کی دو اہم نظمیں "تاج محل" اور "نورجہاں کے مزار پر" رہ جاتی ہیں۔ دونوں کا تعلق مغل شہنشاہوں سے یعنی جہانگیر اور شاہجہاں سے ہے۔ نورجہاں سے جہانگیر کی محبت کا کیا حال تھا یا شاہجہاں کو ممتاز محل سے کتنا قلبی لگاؤ تھا۔ اس سے کون واقف نہیں ہے۔ لیکن دونوں بادشاہ تھے اور بادشاہوں سے ساحر کو شدید اختلاف تھا اس لئے "نورجہاں" ان کو مظلوم نظر آئی اور تاج محل ان کی نظر میں شہنشاہیت اور مظلومیت کی علامت بن گیا۔ ان دونوں نظموں کا تعلق فکر سے زیادہ جذبات سے ہے جو ایک خاص نظریہ، ایک مخصوص فکر اور موڑ کی دین ہے۔ اس لئے ایک خاص ماحول میں خاص طور سے "تاج محل" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے یہ اشعار تو ایک مدت تک نوجوانوں کی زبان پر رہا کئے:

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ، یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب یہ طاق
ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

اس مجموعے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں کچھ اشعار ایسے ہیں جن کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ساحر کو دیہات، اس کے قدرتی مناظر، وہاں کی سیدھی، سادی زندگی اور طور طریقہ سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس کی وجہ شاید کسانوں اور مزدوروں سے ان کی گہری رغبت ہو سکتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

افق کے دریچے سے کرنوں نے جھانکا — فضا تن گئی راستے مسکرائے
سمٹنے لگی نرم کہرے کی چادر — جواں شاخساروں نے گھونگھٹ اٹھائے
پرندوں کی آواز سے کھیت چونکے — پراسرار لَے میں رہٹ گنگنائے
حسیں شبنم آلود پگڈنڈیوں سے — لپٹنے لگے سبز پیڑوں کے سائے
بادل پہ آکاش کے سینے، ان زلفوں کے سائے ہیں — دوش ہوا پر میخانے ہی میخانے گھر آئے ہیں
رت بدلے گی پھول کھلیں گے جھونکے مدھ برسائیں گے — اُجلے اُجلے کھیتوں میں رنگیں آنچل لہرائیں گے

چرواہے بنسی کی دھن سے گیت فضا میں بوئیں گے   آموں کے جھنڈوں کے نیچے پردیسی دل کھوئیں گے

ہائے یہ شام، یہ جھرنے، یہ شفق کی لالی

میں ان آسودہ فضاؤں کو ذرا جھوم تو لوں

البتہ بعض نظموں میں بعض ایسے ہندی کے الفاظ بھی شامل ہوگئے ہیں جو مناسب نہ تھے۔ جن سے اشعار کی روانی، زبان کی شیرینی اور اثر و تاثیر کو نقصان پہنچا ہے۔ دیکھئے یہ الفاظ کیسے کھدرے اور اردو کے لئے اجنبی ہیں: جیسے کارن، جیون، جیوٹ دھارے، اندھیارے، بیتھ، دھرتی، ارپن، جوگ بھاگ، انگارے، بھسم وغیرہ

مجموعی طور سے ساحر کے کلام کا یہ مجموعہ ان کے عاشقانہ جذبات اور سیاسی افکار کی تلخیوں سے تلخ تر ہوگیا ہے لیکن ان تلخیوں میں بھی ایک خاص لذت ہے اس لئے بار بار مطالعہ کے باوجود اس کا اثر زائل نہیں ہوتا بلکہ عجیب کیفیت چھوڑ جاتا ہے اور جس کی تلخی دیر تک دل و دماغ کو متاثر اور مضطرب رکھتی ہے۔ لیکن ساحر کی شاعری کا جائزہ اس وقت تک مکمل نہیں کہا جا سکتا جب تک ان کی طویل نظم "پرچھائیاں" کا بھی مطالعہ نہ کیا جائے۔

دراصل "پرچھائیاں" ساحر کی نہایت رواں دواں اور فکر انگیز طویل نظم ہے جسے پُراثر اور پُرکیف بنانے کے لئے بار بار بحروں کو تبدیل کرنے کا تجربہ کیا گیا ہے۔ جس کے ذریعہ ساحر کے ماضی کے حسین اوراق پلٹے گئے ہیں اور جنگ کے بھیانک مناظر بھی پیش کئے گئے ہیں اور مستقبل کو جنگ کے مہیب اور تباہ کن حالات سے بچانے کے لئے بھی آواز بلند کی گئی ہے۔ اس نظم سے متعلق خود ساحر لدھیانوی کا یہ کہنا بجا ہے:۔

"..... اس وقت ساری دنیا میں امن اور تہذیب کے تحفظ کے لئے جو تحریک چل رہی ہے یہ نظم اس کا حصہ ہے۔"

اور بلاشبہ ساحر اس نظم کے ذریعہ امن اور تہذیب کے تحفظ کی تحریک کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس سلسلے کی اردو میں یہ پہلی طویل نظم ہے جس نے بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ نظم ساحر کے فکر و خیال سے آگاہ کرنے اور ماضی و حال سے روشناس کرنے میں بھی مدد کرتی ہے۔ جو عرصہ تک بہت مقبول رہی ہے۔ خاص طور سے اس کا یہ آخری بند تو آج بھی تیس سال گزرنے کے بعد بھی لوگوں کی زبان پر ہے:

گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار

عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں

گذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار

عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

کاش ساحر اور زیادہ طویل عمر پاتے اور کئی ایسی طویل نظمیں کہہ جاتے، تو اردو کے شعری خزانے میں گرانقدر اضافہ ہوتا۔ *

۱۵ فروری ۱۹۸۰ء

محبوب نغمہ نگار

ساحر لدھیانوی

کی

روح کے لئے

عقیدت

کے پھول

اوشا کھنہ (موسیقار)

کلامِ ساحر
نظمیں
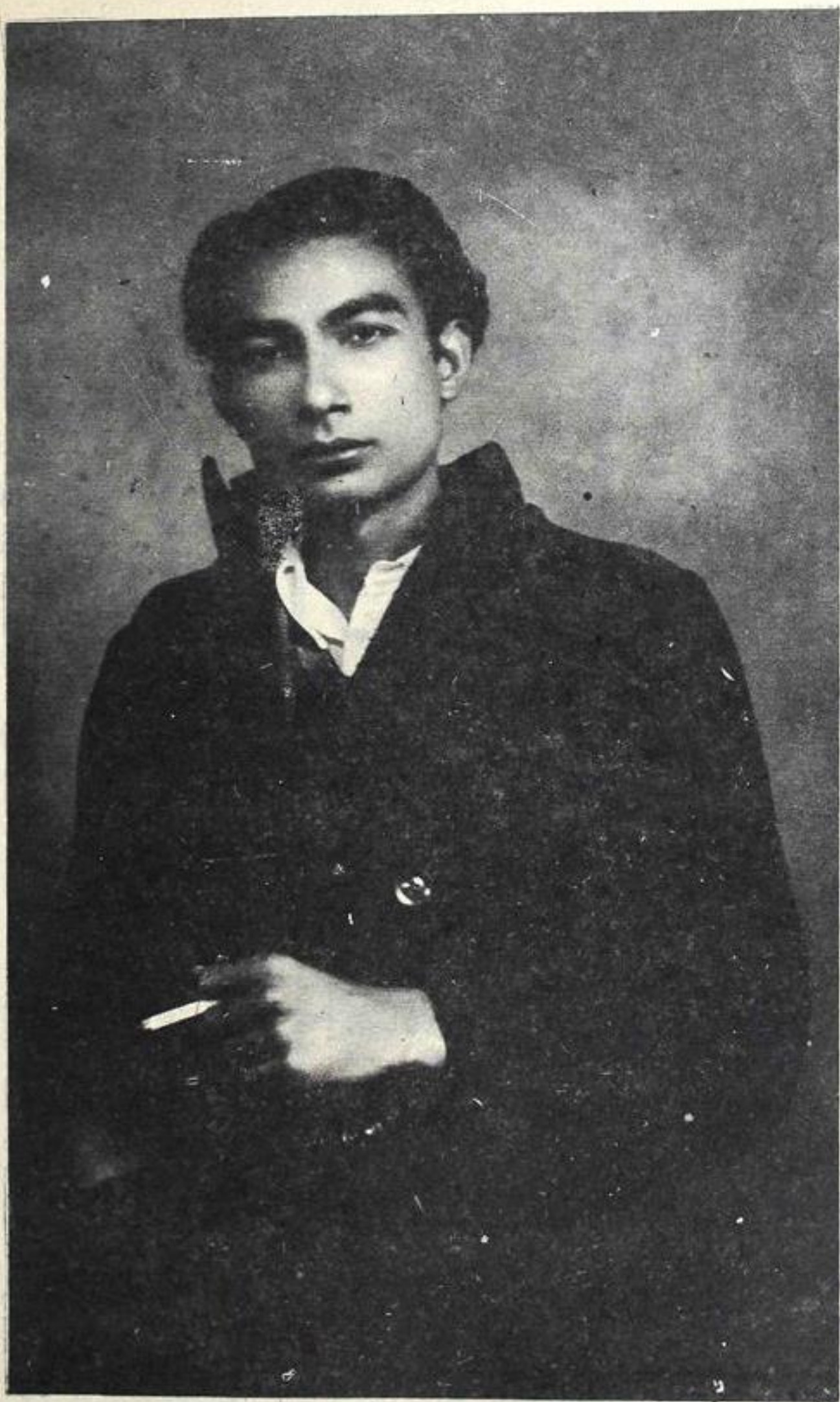
دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے، وہ لوٹا رہا ہوں میں

ردّ عمل

چند کلیاں نشاط کی چُن کر
مدّتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مِل کر اُداس رہتا ہوں

ایک منظر

اُفق کے دریچے سے کرنوں نے جھانکا
فضا تن گئی راستے مسکرائے
سمٹنے لگی نرم کہرے کی چادر
جواں شاخساروں نے گھونگھٹ اٹھائے

پرندوں کی آواز سے کھیت چونکے
پُراسرار لَے میں رہٹ گنگنائے
حسیں شبنم آلود پگڈنڈیوں سے
لپٹنے لگے سبز پیڑوں کے سائے

وہ دور ایک ٹیلے پہ آنچل سا جھلکا
تصوّر میں لاکھوں دیئے جھلملائے

○

ایک واقعہ

اندھیاری رات کے آنگن میں یہ صبح کے قدموں کی آہٹ
یہ بھیگی بھیگی سرد ہوا، یہ ہلکی ہلکی دھندلاہٹ

گاڑی میں ہوں تنہا محوِ سفر اور نیند نہیں ہے آنکھوں میں
بھولے بسرے رومانوں کے خوابوں کی زمیں ہے آنکھوں میں

اگلے دن ہاتھ ہلاتے ہیں، پچھلی پیتیں یاد آتی ہیں
گم گشتہ خوشیاں آنکھوں میں آنسو بن کر لہراتی ہیں

سینے کے ویراں گوشوں میں اِک ٹیس سی کروٹ لیتی ہے
ناکام امنگیں روتی ہیں، امید سہارے دیتی ہے

وہ راہیں ذہن میں گھومتی ہیں جن راہوں سے آج آیا ہوں
کتنی امید سے پہنچا تھا، کتنی مایوسی لایا ہوں

○

یکسوئی

عہدِ گم گشتہ کی تصویر دکھاتی کیوں ہو؟
ایک آوارۂ منزل کو ستاتی کیوں ہو؟
وہ حسیں عہد جو شرمندۂ ایفا نہ ہوا
اُس حسیں عہد کا مفہوم جتاتی کیوں ہو؟
زندگی شعلۂ بے باک بنا لو اپنی
خود کو خاکستر خاموش بتاتی کیوں ہو؟
مَیں تصوّف کے مراحل کا نہیں ہوں قائل
میری تصویر پہ تم پھول چڑھاتی کیوں ہو؟
کون کہتا ہے کہ آہیں ہیں مصائب کا علاج
جان کو اپنی عبث روگ لگاتی کیوں ہو؟
ایک سرکش سے محبت کی تمنّا رکھ کر
خود کو آئین کے پھندوں میں پھنساتی کیوں ہو؟
میں سمجھتا ہوں تقدس کو تمدن کا فریب
تم رسومات کو ایمان بناتی کیوں ہو؟
جب تمہیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال
پھر میری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو؟
تم میں ہمّت ہے تو دنیا سے بغاوت کردو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

○

شہکار

مصوّر! مَیں ترا شہکار واپس کرنے آیا ہوں

اب اِن رنگین رخساروں میں تھوڑی زردیاں بھر دے
حجاب آلود نظروں میں ذرا بے باکیاں بھر دے
لبوں کی بھیگی بھیگی سلوٹوں کو مضمحل کر دے
نمایاں رنگ پیشانی پہ عکسِ سوزِ دل کر دے
تبسّم آفریں چہرے میں کچھ سنجیدگی بھر دے
جواں سینے کی مخروطی اٹھانیں سرنگوں کر دے
گھنے بالوں کو کم کر دے مگر رخشندگی دیدے
نظر سے تمکنت لے کر مذاقِ عاجزی دیدے

مگر ہاں بنچ کے بدلے اِسے صوفے پہ بٹھلا دے
یہاں ۔ میری بجائے اِک چمکتی کار دِکھلا دے

○

نذرِ کالج

اے سرزمینِ پاک کے یارانِ نیک نام
باصد خلوص شاعرِ آوارہ کا سلام

اے وادیٔ جمیل مرے دل کی دھڑکنیں
آداب کہہ رہی ہیں تیری بارگاہ میں

تو آج بھی ہے میرے لئے جنّت خیال
ہیں تجھ میں دفن میری جوانی کے چار سال

کمھلائے ہیں یہاں پہ مری زندگی کے پھول
اِن راستوں میں دفن ہیں میری خوشی کے پھول

تیری نوازشوں کو بھلایا نہ جائے گا
ماضی کا نقش دل سے مٹایا نہ جائے گا

تیری نشاط خیز فضائے جواں کی خیر
گلہائے رنگ و بو کے حسیں کارواں کی خیر

دورِ خزاں میں بھی تری کلیاں کھلی رہیں
تا حشر یہ حسین فضائیں بسی رہیں

ہم ایک خار تھے جو چمن سے نکل گئے
ننگِ وطن تھے حدِّ وطن سے نکل گئے

گائے ہیں اس فضا میں وفاؤں کے راگ بھی
نغماتِ آتشیں سے بکھیری ہے آگ بھی

سرکش بنے ہیں، گیت بغاوت کے گائے ہیں
برسوں نئے نظام کے نقشے بنائے ہیں

نغمہ نشاطِ روح کا گایا ہے بارہا
گیتوں میں آنسوؤں کو چھپایا ہے بارہا

معصومیوں کے جرم میں بدنام بھی ہوئے
تیرے طفیل موردِ الزام بھی ہوئے

اِس سرزمیں پہ آج ہم اِک بار ہی سہی
دنیا ہمارے نام سے بیزار ہی سہی

لیکن ہم ان فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر، یاں نہیں تو یاں سے نکالے ہوئے تو ہیں

(لدھیانہ گورنمنٹ کالج)

۱۹۴۳ء

معذوری

خلوت و جلوت میں تم مجھ سے ملی ہو بارہا
تم نے کیا دیکھا نہیں، میں مسکرا سکتا نہیں

میں، کہ مایوسی مری فطرت میں داخل ہو چکی
جبر بھی خود پر کروں تو گنگنا سکتا نہیں

مجھ میں کیا دیکھا کہ تم الفت کا دم بھرنے لگیں
میں تو خود اپنے بھی کوئی کام آ سکتا نہیں

رُوح افزا ہیں جنونِ عشق کے نغمے، مگر
اب میں اِن گائے ہوئے گیتوں کو گا سکتا نہیں

میں نے دیکھا ہے شکستِ سازِ الفت کا سماں
اب کسی تحریک پر بربط اٹھا سکتا نہیں

دل تمہاری شدتِ احساس سے واقف تو ہے
اپنے احساسات سے دامن چھڑا سکتا نہیں

تم مری ہو کر بھی بیگانہ ہی پاؤ گی مجھے
میں تمہارا ہو کے بھی تم میں سما سکتا نہیں

گائے ہیں میں نے خلوصِ دل سے بھی الفت کے گیت
اب ریا کاری سے بھی چاہوں تو گا سکتا نہیں

کس طرح تم کو بنا لوں میں شریکِ زندگی
میں تو اپنی زندگی کا بار اٹھا سکتا نہیں

یاس کی تاریکیوں میں ڈوب جانے دو مجھے
اب میں شمع آرزو کی لو بڑھا سکتا نہیں

○

خانہ آبادی

(ایک دوست کی شادی پر)

ترانے گونج اٹھے ہیں فضا میں شادیانوں کے
ہوا ہے عطر آگیں، ذرہ ذرہ مسکراتا ہے

مگر دور ـــــ ایک افسردہ مکاں میں سرد بستر پر
کوئی دل ہے کہ ہر آہٹ پہ یونہی چونک جاتا ہے
مری آنکھوں میں آنسو آگئے "نادیدہ آنکھوں" کے
مرے دل میں کوئی غمگین نغمہ سرسراتا ہے
یہ رسمِ انقطاعِ عہدِ الفت، یہ حیاتِ نو
محبت رو رہی ہے اور تمدن مسکراتا ہے

یہ شادی خانہ آبادی ہو میرے محترم بھائی!
"مبارک" کہہ نہیں سکتا مرا دل کانپ جاتا ہے

○

سرزمینِ یاس

جینے سے دل بیزار ہے
ہر سانس اک آزار ہے
کتنی حزیں ہے زندگی
اندوہگیں ہے زندگی
وہ بزمِ احبابِ وطن
وہ ہم نوایانِ سخن
آتے ہیں جس دم یاد اب
کرتے ہیں دل ناشاد اب
گذری ہوئی رنگینیاں
کھوئی ہوئی دلچسپیاں
پہروں رلاتی ہیں مجھے
اکثر ستاتی ہیں مجھے
وہ زمزمے، وہ چہچہے
وہ روح افزا قہقہے
جب دل کو موت آئی نہ تھی
یوں بےحسی چھائی نہ تھی
وہ نازنینانِ وطن
زہرہ جبینانِ وطن
جن میں سے اک رنگیں قبا
آتش نفس آتش نوا
کرکے محبت آشنا
رنگِ عقیدت آشنا
میرے دلِ ناکام کو
خوں گشتۂ آلام کو
داغِ جدائی دے گئی
ساری خدائی لے گئی
ان ساعتوں کی یاد میں
ان راحتوں کی یاد میں
مغموم سا رہتا ہوں میں
غم کی کسک سہتا ہوں میں
سنتا ہوں جب احباب سے
قصے غمِ ایام کے
بیتاب ہو جاتا ہوں میں
آہوں میں کھو جاتا ہوں میں
پھر وہ عزیز و اقربا
جو توڑ کر عہدِ وفا
احباب سے منہ موڑ کر
دنیا سے رشتہ توڑ کر
حدِّ افق کے اس طرف
رنگِ شفق کے اس طرف

اک وادیٔ خاموش د   اک عالم بے ہوش کی
گہرائیوں میں سو گئے   تاریکیوں میں کھو گئے
ان کا تصوّر ناگہاں   لیتا ہے دل میں چٹکیاں
اور خوں رلاتا ہے مجھے   بے کل بناتا ہے مجھے
وہ گاؤں کی ہمجولیاں   مفلوک دہقاں زادیاں
جو دستِ فرطِ یاس سے   اور یورش افلاس سے
عصمت لٹا کر رہ گئیں   خود کو گنوا کر رہ گئیں
غمگیں جوانی بن گئیں   رسوا کہانی بن گئیں
اُن سے کبھی گلیوں میں اب   ہوتا ہوں میں دوچار جب
نظریں جھکا لیتا ہوں مَیں   خود کو چھپا لیتا ہوں مَیں

کتنی حزیں ہے زندگی
اندوہ گیں ہے زندگی

○

شکست

اپنے سینے سے لگائے ہوئے اُمید کی لاش
مدّتوں زیست کو ناشاد کیا ہے میں نے
تو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دو چار
دل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے
جب بھی راہوں میں نظر آئے حریری ملبوس
سرد آہوں میں تجھے یاد کیا ہے میں نے

اور اب، جب کہ مری روح کی پنہائی میں
ایک سنسان سی مغموم گھٹا چھائی ہے
تو دمکتے ہوئے عارض کی شعاعیں لے کر
گل شدہ شمعیں جلانے کو چلی آئی ہے

مری محبوب! یہ ہنگامۂ تجدیدِ وفا
میری افسردہ جوانی کے لئے راس نہیں
میں نے جو پھول چنے تھے ترے قدموں کے لئے
ان کا دھندلا سا تصور بھی مرے پاس نہیں

ایک یخ بستہ اُداسی ہے دل و جاں پہ محیط
اب مری روح میں باقی ہے نہ امید نہ جوش
رہ گیا دب کے گراں بار سلاسل کے تلے

میری درماندہ جوانی کی امنگوں کا خروش

ریگ زاروں میں بگولوں کے سوا کچھ بھی نہیں
سایۂ ابر گریزاں سے مجھے کیا لینا ؟
بجھ چکے ہیں میرے سینے میں محبت کے کنول
اب ترے حُسنِ پشیماں سے مجھے کیا لینا ؟

تیرے عارض پہ یہ ڈھلکے ہوئے سیمیں آنسو
میری افسردگیٔ غم کا مداوا تو نہیں
تیری محبوب نگاہوں کا پیامِ تجدید
اک تلافی ہی سہی ــــ میری تمنا تو نہیں

○

کسی کو اُداس دیکھ کر

تمہیں اُداس سی پاتا ہوں میں کئی دن سے
نہ جانے کون سے صدمے اُٹھا رہی ہو تم
وہ شوخیاں، وہ تبسّم، وہ قہقہے نہ رہے
ہر ایک چیز کو حسرت سے دیکھتی ہو تم
چھپا چھپا کے خموشی میں اپنی بے چینی
خود اپنے راز کی تشہیر بن گئی ہو تم

مری اُمید اگر مٹ گئی تو مٹنے دو
امید کیا ہے بس اک پیش و پس ہے کچھ بھی نہیں
میری حیات کی غمگینیوں کا غم نہ کرو
غمِ حیات غمِ یک نفس ہے کچھ بھی نہیں
تم اپنے حُسن کی رعنائیوں پہ رحم کرو
وفا فریب ہے، طولِ ہوس ہے کچھ بھی نہیں

مجھے تمہارے تغافل سے کیوں شکایت ہو
مری فنا مرے احساس کا تقاضا ہے
مَیں جانتا ہوں کہ دنیا کا خوف ہے تم کو
مجھے خبر ہے یہ دنیا عجیب دنیا ہے
یہاں حیات کے پردے میں موت پلتی ہے
شکستِ ساز کی آواز روحِ نغمہ ہے

مجھے تمہاری جدائی کا کوئی رنج نہیں
مرے خیال کی دنیا میں میرے پاس ہو تم
یہ تم نے ٹھیک کہا ہے تمہیں ملا نہ کروں
مگر مجھے یہ بتا دو کہ کیوں اُداس ہو تم
خفا نہ ہونا مری جراُتِ تخاطب پر
تمہیں خبر ہے، مری زندگی کی آس ہو تم

مرا تو کچھ بھی نہیں ہے میں رو کے جی لوں گا
مگر خدا کے لئے تم اسیرِ غم نہ رہو
ہُوا ہی کیا جو زمانے نے تم کو چھین لیا
یہاں پہ کون ہوا ہے کسی کا، سوچو تو
مجھے قسم ہے مری دکھ بھری جوانی کی
میں خوش ہوں میری محبّت کے پھول ٹھکرا دو

مَیں اپنی روح کی ہراِک خوشی مٹا لوں گا
مگر تمہاری مسرّت مٹا نہیں سکتا
مَیں خود کو موت کے ہاتھوں میں سونپ سکتا ہوں
مگر یہ بارِ مصائب اٹھا، نہیں سکتا
تمہارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے
نجات جن سے میں اِک لحظہ پا نہیں سکتا

یہ اونچے اونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے
ہر ایک گام پہ بھوکے بھکاریوں کی صدا
ہر ایک گھر میں یہ افلاس اور بھوک کا شور
ہر ایک سمت یہ انسانیت کی آہ و بکا
یہ کارخانوں میں لوہے کا شور وغل جس میں

ہے دفن لاکھوں غریبوں کی روح کا نغمہ

یہ شاہراہوں پہ رنگین ساریوں کی جھلک
یہ جھونپڑوں میں غریبوں کے بے کفن لاشے
یہ مال روڈ پہ کاروں کی ریل پیل کا شور
یہ پٹریوں پہ غریبوں کے زرد رو بچّے

گلی گلی میں یہ بکتے ہوئے جواں چہرے
حسین آنکھوں میں افسردگی سی چھائی ہوئی

یہ جنگ اور یہ میرے وطن کے شوخ جواں
خریدی جاتی ہیں اُٹھتی جوانیاں جن کی
یہ بات بات پہ قانون و ضابطے کی گرفت
یہ ذلتیں، یہ غلامی، یہ دورِ مجبوری
یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو
اُداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو

○

میرے گیت

مرے سرکش ترانے سن کے دنیا یہ سمجھتی ہے
کہ شاید میرے دل کو عشق کے نغموں سے نفرت ہے
مجھے ہنگامۂ جنگ و جدل میں کیف ملتا ہے
مری فطرت کو خونریزی کے افسانوں سے رغبت ہے
مری دنیا میں کچھ وقعت نہیں ہے رقص و نغمہ کی
مرا محبوب نغمہ شورِ آہنگِ بغاوت ہے

مگر اے کاش دیکھیں وہ مری پُر سوز راتوں کو
میں جب تاروں پہ نظریں گاڑ کر آنسو بہاتا ہوں
تصور بن کے بھولی وارداتیں یاد آتی ہیں
تو سوزِ درد کی شدت سے پہروں تلملاتا ہوں
کوئی خوابوں میں خوابیدہ امنگوں کو جگاتی ہے
تو اپنی زندگی کو موت کے پہلو میں پاتا ہوں

میں شاعر ہوں مجھے فطرت کے نظاروں سے الفت ہے
مرا دل دشمنِ نغمہ سرائی ہو نہیں سکتا
مجھے انسانیت کا درد بھی بخشا ہے قدرت نے
مرا مقصد فقط شعلہ نوائی ہو نہیں سکتا
جواں ہوں میں، جوانی لغزشوں کا ایک طوفاں ہے
مری باتوں میں رنگِ پارسائی ہو نہیں سکتا

مرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے
کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
غریبوں، مفلسوں کو، بیکسوں کو، بے سہاروں کو
سسکتی نازنینوں کو تڑپتے نوجوانوں کو
حکومت کے تشدّد کو، امارت کے تکبّر کو
کسی کے چیتھڑوں کو، اور شہنشاہی خزانوں کو

تو دل تاب نشاط بزم عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب آور ترانے گا نہیں سکتا

O

شعاعِ فردا

تیرہ و تار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر
اور کچھ دیر اُجالے کے لئے ترسے گا
اور کچھ دیر اٹھے گا دلِ گیتی سے دھواں
اور کچھ دیر فضاؤں سے لہو برسے گا

اور پھر احمریں ہونٹوں کے تبسّم کی طرح
رات کے چاک سے پھوٹے گی شعاعوں کی لکیر
اور جمہور کے بیدار تعاون کے طفیل
ختم ہو جائے گی انساں کے لہو کی تقطیر

اور کچھ دیر بھٹک لے مرے درماندہ ندیم
اور کچھ دن ابھی زہراب کے ساغر پی لے
نور افشاں چلی آتی ہے عروسِ فردا
حال تاریک و ستم افشاں سہی، لیکن جی لے

O

لمحۂ غنیمت

مسکرا، اے زمینِ تیرہ و تار
سر اُٹھا، اے دبی ہوئی مخلوق
دیکھ، وہ مغربی اُفق کے قریب
آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پرانے قمار خانے میں
کہنہ شاطر بہم اُلجھنے لگے
کوئی تیری طرف نہیں نگراں
یہ گراں بار سرد زنجیریں
زنگ خوردہ ہیں، آہنی ہی سہی
آج موقع ہے، ٹوٹ سکتی ہیں

فرصتِ یک نفس غنیمت جان
سر اُٹھا، اے دبی ہوئی مخلوق

اجنبی محافظ

اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
اونچے ہوٹل کے درِ خاص پہ استادہ ہیں
اور نیچے مرے مجبور وطن کی گلیاں
جن میں آوارہ پھرا کرتے ہیں بھوکوں کے ہجوم
زرد چہروں پہ نقاہت کی نمود
خون میں سینکڑوں سالوں کی غلامی کا جمود
علم کے نور سے عاری محروم
فلکِ ہند کے افسردہ نجوم
جن کے تخییل کے پر
چھو نہیں سکتے ہیں اِس اونچی پہاڑی کا سرا
جس پہ ہوٹل کے دریچوں میں کھڑے ہیں تن کر
اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
منہ میں سگریٹ لئے ہاتھوں میں برانڈی کے گلاس
جیب میں نقرئی سکّوں کی کھنک
بھوکے دہقانوں کے ہاتھوں کا عرق
رات کو جس کے عوض بکتا ہے
کسی افلاس کی ماری کا تقدّس ــــــ یعنی
کسی دوشیزۂ مجبور کی عصمت کا غرور
محفلِ عیش کے گونجے ہوئے ایوانوں میں
اونچے ہوٹل کے شبستانوں میں
قہقہے مارتے، ہنستے ہوئے اِستادہ ہیں

اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
اِسی ہوٹل کے قریب ـــــــــ
بھوک کے مجبور غلاموں کے گروہ
ٹکٹکی باندھ کے تکتے ہوئے اوپر کی طرف
منتظر بیٹھے ہیں اس ساعتِ نایاب کے جب
بوٹ کی نوک سے نیچے پھینکے
اجنبی دیس کے بے فکر جوانوں کا گروہ
کوئی سکّہ، کوئی سگریٹ، کوئی کیک
یا ڈبل روٹی کے جھوٹے ٹکڑے
چھینا جھپٹی کے مناظر کا مزہ لینے کو
پالتو کتّوں کے احساس پہ ہنس دینے کو
بھوک کے مجبور غلاموں کا گروہ
ٹکٹکی باندھ کے تکتا ہوا استادہ ہے
کاش! یہ بے حس و بے وقعت و بے دل انساں
روم کے ظلم کی زندہ تصویر
اپنا ماحول بدل دینے کے قابل ہوتے
ڈیڑھ سو سال کے بند سلاسل کٹتے
اپنے آقاؤں سے لے سکتے خراجِ قوّت
کاش! یہ اپنے لئے آپ صف آرا ہوتے
اپنی تکلیف کا خود آپ مداوا ہوتے
اُن کے دل میں ابھی باقی رہتا
قومی غیرت کا وجود
ان کے سنگین و سیہ سینوں میں
گل نہ ہوتی ابھی احساس کی شمع
اور یورپ سے اڈتے ہوئے خطرے کے لئے
یہ کرائے کے محافظ نہ منگانے پڑتے

۱۹۴۴ء

شہزادے

ذہن میں عظمت اجداد کے قصے لے کر
اپنے تاریک گھروندوں کے خلا میں کھو جاؤ
مرمریں خوابوں کی پریوں سے لپٹ کر سو جاؤ
ابر پاروں پہ چلو، چاند ستاروں میں اُڑو
یہی اجداد سے ورثے میں ملا ہے تم کو

دور مغرب کی فضاؤں میں دہکتی ہوئی آگ
اہلِ سرمایہ کی آویزشِ باہم نہ سہی
جنگِ سرمایہ و محنت ہی سہی
دور مغرب میں ہے ـــ مشرق کی فضا میں تو نہیں
تم کو مغرب کے بکھیڑوں سے بھلا کیا لینا؟

تیرگی ختم ہوئی، سرخ شعاعیں پھیلیں
دور مغرب کی فضاؤں میں ترانے گونجے
فتحِ جمہور کے، انصاف کے، آزادی کے
ساحلِ شرق پہ گیسوں کا دھواں چھانے لگا
آگ برسانے لگے اجنبی توپوں کے دہن
خواب گاہوں کی چھتیں گرنے لگیں

اپنے بستر سے اُٹھو
نئے آقاؤں کی تعظیم کرو
اور پھر ـــ اپنے گھروندوں کے خلا میں کھو جاؤ
تم بہت دیر ـــ بہت دیر تلک سوئے رہے

طلوعِ اشتراکیت

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں ، اونچے ایواں کانپ رہے ہیں
مزدوروں کے بگڑے تیور ، دیکھ کے سلطاں کانپ رہے ہیں
جاگے ہیں افلاس کے مارے ، اُٹھے ہیں بے بس دکھیارے
سینوں میں طوفاں کا تلاطم ، آنکھوں میں بجلی کے شرارے
چوک چوک پر ، گلی گلی میں سُرخ پھریرے لہراتے ہیں
مظلوموں کے باغی لشکر ، سیل صفت اُمڈے آتے ہیں
شاہی درباروں کے در سے فوجی پہرے ختم ہوئے ہیں
ذاتی جاگیروں کے حق اور مہمل دعوے ختم ہوئے ہیں
شور مچا ہے بازاروں میں ، ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دنیا ، غصب شدہ حق انسانوں کے
رُسوا ، بازاری خاتونیں ، حقِ نسائی مانگ رہی ہیں
صدیوں کی خاموش زبانیں ، سحر نوائی مانگ رہی ہیں
روندی ، کچلی آوازوں کے شور سے دھرتی گونج اٹھی ہے
دنیا کے انیائے نگر میں ، حق کی پہلی گونج اٹھی ہے
جمع ہوئے ہیں چوراہوں پر آکر بھوکے اور گداگر
ایک لپکتی آندھی بن کر ، ایک بھبھکتا شعلہ ہو کر
کاندھوں پر سنگین کدالیں ، ہونٹوں پر بے باک ترانے
دہقانوں کے دَل نکلے ہیں ، اپنی بگڑی آپ بنانے
آج پرانی تدبیروں سے آگ کے شعلے تھم نہ سکیں گے
اُبھرے جذبے دب نہ سکیں گے ، اکھڑے پرچم جم نہ سکیں گے

راج محل کے دربانوں سے یہ سرکش طوفاں نہ رکے گا
چند کرائے کے تنکوں سے سیلِ بے پایاں نہ رکے گا
کانپ رہے ہیں ظالم سلطاں، ٹوٹ گئے دل جبّاروں کے
بھاگ رہے ہیں ظلِّ الٰہی، منہ اترے ہیں غدّاروں کے

ایک نیا سورج چمکا ہے، ایک انوکھی ضو باری ہے
ختم ہوئی افراد کی شاہی، اب جمہور کی سالاری ہے

⊙

طرحِ نو

سعیٔ بقائے شوکتِ اسکندری کی خیر
ماحولِ خشت بار میں شیشہ گری کی خیر
بے زار ہے کنشت و کلیسا سے اک جہاں
سوداگرانِ دین کی سوداگری کی خیر
فاقہ کشوں کے خون میں ہے جوشِ انتقام
سرمایہ کے فریبِ جہاں پروری کی خیر
طبقاتِ مبتذل میں ہے تنظیم کی نمود
شاہنشہوں کے ضابطۂ خودسری کی خیر
احساس بڑھ رہا ہے حقوقِ حیات کا
پیدائشی حقوقِ ستم پروری کی خیر
ابلیس خندہ زن ہے مذاہب کی لاش پر
پیغمبرانِ دہر کی پیغمبری کی خیر
صحنِ جہاں میں رقص کناں ہیں تباہیاں
آقائے ہست و بود کی صنعت گری کی خیر
شعلے لپک رہے ہیں جہنم کی گود سے
باغِ جناں میں جلوۂ حور و پری کی خیر
انساں الٹ رہا ہے رخِ زیست سے نقاب
مذہب کے اہتمامِ فسوں پروری کی خیر
الحاد کر رہا ہے مرتب جہانِ نو
دیر و حرم کے حیلۂ غارت گری کی خیر

کچھ باتیں

دیس کے ادبار کی باتیں کریں
اجنبی سرکار کی باتیں کریں
اگلی دنیا کے فسانے چھوڑ کر اس جہنم زار کی باتیں کریں
ہو چکے اوصاف پردے کے بیاں
شاہدِ بازار کی باتیں کریں
دہر کے حالات کی باتیں کریں اس مسلسل رات کی باتیں کریں
من و سلویٰ کا زمانہ جا چکا بھوک اور آفات کی باتیں کریں
آؤ پرکھیں دین کے اوہام کو
علمِ موجودات کی باتیں کریں
جابر و مجبور کی باتیں کریں اس کہن دستور کی باتیں کریں
تاجِ شاہی کے قصیدے ہو چکے فاقہ کش جمہور کی باتیں کریں
گرنے والے قصر کی توصیف کیا
تیشۂ مزدور کی باتیں کریں

○

گریز

مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہوگیا تیرا فسونِ زیبائی
اُن آرزوؤں پہ چھائی ہے گردِ مایوسی
جنہوں نے ترے تبسّم میں پرورش پائی
فریبِ شوق کے رنگیں طلسم ٹوٹ گئے
حقیقتوں نے حوادث سے پھر جِلا پائی
سکون و خواب کے پردے سرکتے جاتے ہیں
دماغ و دل میں ہے وحشت کی کارفرمائی
وہ تارے جن میں محبت کا نور تاباں تھا
وہ تارے ڈوب گئے لے کے رنگ و رعنائی
سُلا گئی تھیں جنہیں تیری ملتفت نظریں
وہ درد جاگ اُٹھے پھر سے لے کے انگڑائی
عجیب عالمِ افسردگی ہے رُو بہ فروغ
نہ اب نظر کو تقاضا نہ دل تمنائی
تری نظر، ترے گیسو، تری جبیں ترے لب
مری اُداس طبیعت ہے سب سے اکتائی
میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تری فسوں زائی
مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے
یہاں بھی مل نہ سکی جنتِ شکیبائی

ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات، بند دریچوں سے بھی گذر آئی
مرے ہر ایک طرف ایک شور گونج اٹھا
اور اس میں ڈوب گئی عشرتوں کی شہنائی
کہاں تلک کوئی زندہ حقیقتوں سے بچے
کہاں تلک کرے چھپ چھپ کے نغمہ پیرائی
وہ دیکھ سامنے کے پُر شکوہ ایواں سے
کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ ٹکرائی
وہ پھر سماج نے دو پیار کرنے والوں کو
سزا کے طور پہ بخشی طویل تنہائی
پھر ایک تیرہ و تاریک جھونپڑی کے تلے
سسکتے بچّے پہ بیوہ کی آنکھ بھر آئی
وہ پھر بکی کسی مجبور کی جواں بیٹی
وہ پھر جھکا کسی در پر غرورِ برنائی
وہ پھر کسانوں کے مجمع پہ گن مشینوں سے
حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی
سکوتِ حلقۂ زنداں سے ایک گونج اٹھی
اور اس کے ساتھ مرے ساتھیوں کی یاد آئی
نہیں نہیں، مجھے یوں ملتفت نظر سے نہ دیکھ
نہیں نہیں، مجھے اب تابِ نغمہ پیرائی
مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسونِ زیبائی

○

صبحِ نوروز

پھوٹ پڑیں مشرق سے کرنیں
حال بنا ماضی کا فسانہ
گونجا مستقبل کا ترانہ
بھیجے ہیں احباب نے تحفے
اٹے پڑے ہیں میز کے کونے

دلہن بنی ہوئی ہیں راہیں
جشن مناؤ سالِ نو کے

نکلی ہے بنگلے کے در سے
اِک مفلس دہقان کی بیٹی
افسردہ مرجھائی ہوئی سی
جسم کے دُکھتے جوڑ دباتی
آنچل سے سینے کو چھپاتی

مٹھی میں اک نوٹ دبائے
جشن مناؤ سالِ نو کے

بھوکے، زرد، گداگر بچے
کار کے پیچھے بھاگ رہے ہیں
وقت سے پہلے جاگ اٹھے ہیں
پیپ بھری آنکھیں سہلاتے
سر کے پھوڑوں کو کھجلاتے

وہ دیکھو! کچھ اور بھی نکلے
جشن مناؤ سالِ نو کے

○

ناکامی

میں نے ہر چند غمِ عشق کو کھونا چاہا
غمِ الفت غمِ دنیا میں سمونا چاہا

وہی افسانے مری سمت رواں ہیں اب تک
وہی شعلے مرے سینے میں نہاں ہیں اب تک
وہی بے سود خلش ہے مرے سینے میں ہنوز
وہی بے کار تمنّائیں جواں ہیں اب تک
وہی گیسو مری راتوں پہ ہیں بکھرے بکھرے
وہی آنکھیں مری جانب نگراں ہیں اب تک

کثرتِ غم بھی مرے غم کا مداوا نہ ہوئی
میرے بے چین خیالوں کو سکوں مل نہ سکا
دل نے دنیا کے ہر اک درد کو اپنا تو لیا
مضمحل روح کو اندازِ جنوں مل نہ سکا

میری تخئیل کا شیرازۂ برہم ہے وہی
میرے بجھتے ہوئے احساس کا عالم ہے وہی
وہی بے جان ارادے، وہی بے رنگ سوال
وہی بے روح کشاکش، وہی بے چین خیال

آہ اس کشمکشِ صبح و مسا کا انجام
میں بھی ناکام، مری سعیٔ عمل بھی ناکام

مجھے سوچنے دے

میری ناکام محبّت کی کہانی مت چھیڑ
اپنی مایوس امنگوں کا فسانہ نہ سُنا

زندگی تلخ سہی، زہر سہی، سَم ہی سہی
درد و آزار سہی، جبر سہی، غم ہی سہی
لیکن اِس درد و غم و جبر کی وسعت تو دیکھ
ظلم کی چھاؤں میں دم توڑتی خلقت تو دیکھ
اپنی مایوس امنگوں کا فسانہ نہ سُنا
میری ناکام محبّت کی کہانی مت چھیڑ

جلسہ گاہوں میں یہ دہشت زدہ سہمے انبوہ
رہ گذاروں میں فلاکت زدہ لوگوں کے گروہ
بھوک اور پیاس سے پژمردہ سیہ فام زمیں
تیرہ و تار مکاں، مفلس و بیمار مکیں
نوعِ انساں میں یہ سرمایہ و محنت کا تضاد
امن و تہذیب کے پرچم تلے قوموں کا فساد
ہر طرف آتش و آہن کا یہ سیلاب عظیم
نت نئے طرز پہ ہوتی ہوئی دنیا تقسیم
لہلہاتے ہوئے کھیتوں پہ جوانی کا سماں
اور دہقان کے چھپّر میں نہ بتی نہ دھواں
یہ فلک بوس ملیں، دل کش و سیمیں بازار
یہ غلاظت پہ جھپٹتے ہوئے بھوکے نادار

دور ساحل پہ وہ شفاف مکانوں کی قطار
سرسراتے ہوئے پردوں میں سمٹتے گلزار
در و دیوار پہ انوار کا سیلاب رواں
جیسے اِک شاعرِ مدہوش کے خوابوں کا جہاں

یہ سبھی کیوں ہے؟ یہ کیا ہے؟ مجھے کچھ سوچنے دے
کون انساں کا خدا ہے؟ مجھے کچھ سوچنے دے

اپنی مایوس امنگوں کا فسانہ نہ سُنا
میری ناکام محبت کی کہانی مت چھیڑ

سوچتا ہوں

سوچتا ہوں کہ محبّت سے کنارا کر لوں
دِل کو بیگانۂ ترغیب و تمنّا کر لوں

سوچتا ہوں کہ محبّت ہے جنونِ رُسوا
چند بے کار سے بے ہودہ خیالوں کا ہجوم
ایک آزاد کو پابند بنانے کی ہوس
ایک بیگانے کو اپنانے کی سعیٔ موہوم

سوچتا ہوں کہ محبّت ہے سرور و مستی
اِس کی تنویر سے روشن ہے فضائے ہستی

سوچتا ہوں کہ محبّت ہے بشر کی فطرت
اِس کا مٹ جانا مٹا دینا بہت مشکل ہے
سوچتا ہوں کہ محبّت سے ہے تابندہ حیات
اور یہ شمع بجھا دینا بہت مشکل ہے

سوچتا ہوں کہ محبّت پہ کڑی شرطیں ہیں
اِس تمدّن میں مسرّت پہ بڑی شرطیں ہیں

سوچتا ہوں کہ محبّت ہے اک افسردہ سی لاش
چادرِ عزّت و ناموس میں کفنائی ہوئی
دورِ سرمایہ کی روندی ہوئی رسوا ہستی
درگہِ مذہب و اخلاق سے ٹھکرائی ہوئی

سوچتا ہوں کہ بشر اور محبّت کا جنوں
ایسے بوسیدہ تمدن میں ہے اِک کارِ زبوں

سوچتا ہوں کہ محبت نہ بچے گی زندہ
پیش ازاں وقت کہ سڑ جائے یہ گلتی ہوئی لاش
یہی بہتر ہے کہ بیگانۂ الفت ہو کر
اپنے سینے میں کروں جذبۂ نفرت کی تلاش

اور سودائے محبّت سے کنارا کرلوں
دِل کو بیگانۂ ترغیب و تمنّا کرلوں

موجِ عارض
بھی مری
نکہتِ گیسو
بھی مری
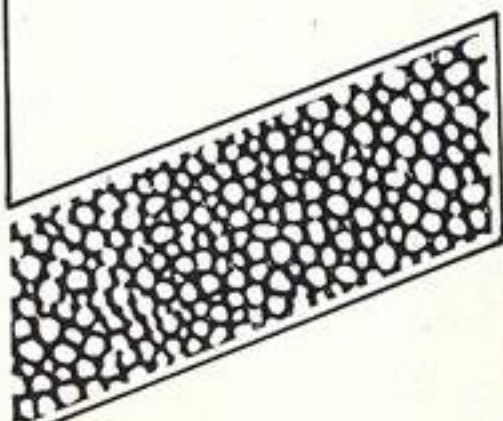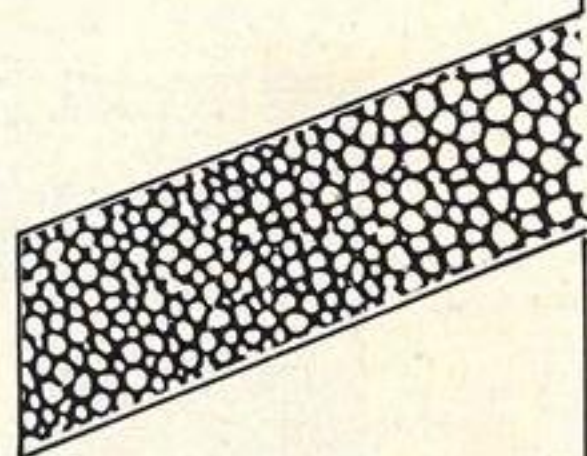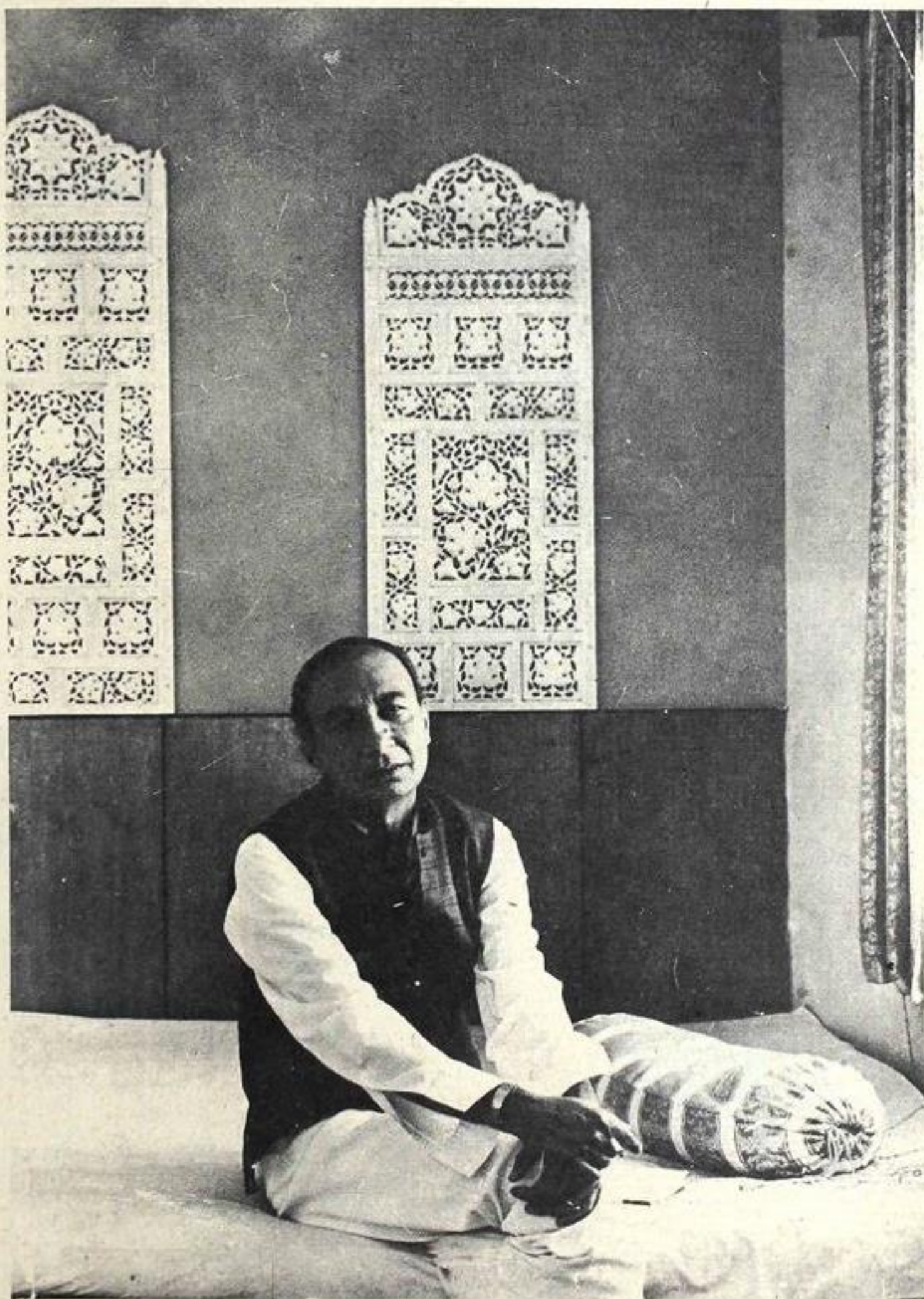
ڈرامائی لمحوں کا تنہا شاعر

ڈاکٹر محمد حسن

ساحراب ہم میں نہیں ہے۔ دلوں میں اترنے والے نغمے بکھیرنے والا شاعر اچانک خاموش ہوگیا۔

ساحر نے اپنے کو پل دو پل کا شاعر کہا تھا اور اپنے عہد کے حسینوں کو اپنا دورِ عشق نذر دیا تھا۔ ساحر خاموش ہو گئے مگر ان کے نغمے مدتوں محفل محفل گونجا کریں گے۔

ساحر کے فن کا معروضی جائزہ لیں تو سب سے چونکا دینے والی خصوصیت ساحر کے منظر نامے نظر آئیں گے۔ ساحر ان شاعروں میں ہیں جو تمثال اور تصویر مرقع سجاتے ہیں۔ ان معنوں میں شاید ساحر سب سے نمایاں طور پر امیجسٹ شاعر تھے۔ ساحر تصویروں کے روپ میں سوچتے تھے غیر مرئی تصورات کو بھی لمس اور حسیت کی لذت دیتے تھے اور تجسیم کی صورت بخش دیتے تھے (شاید فلموں میں ان کی کامیابی کی بڑی وجہ بھی یہی تھی) مگر یہ ابتدا ہی ساحر کا مزاج تھا۔ لمس کی یہ لذت اور تجسیم کی یہ صورت گری ساحر کے فن کو مصوری سے زیادہ سنگ تراشی اور صورت گری قریب کر دیتی ہے مثلاً ان مصرعوں اور شعروں میں:۔

حسیں شبنم آلود پگڈنڈیوں سے   لپٹنے لگے سبز پیڑوں کے سایے

اگلے دن ہاتھ ہلاتے ہیں پچھلی پیتیں یاد آتی ہیں
بس اب تو دامنِ دل چھوڑ دو بے کار امیدو
جواں رات کے سینے پہ دودھیا آنچل   مچل رہا ہے کسی خوابِ مرمریں کی طرح

اجنبی بانہوں کے حلقے میں لچکتی ہوں گی   تیرے مہکے ہوئے بالوں کی ادائیں اب تک

تمہارا جسم ہر اک لہر کے جھکولے سے مری کھلی ہوئی باہوں میں جھول جاتا ہے

ان میں ساکت منظر نگاری نہیں ہے بلکہ حرکت سے معمور اور رفتار اور عمل سے بھرپور تصویریں ہیں جو خود پڑھنے والے کے تجربے کا حصہ بن جاتی ہیں اور ان میں Empathy یا شرکت کا احساس پیدا کرتی ہیں۔

عمل اور حرکت کی یہ تصویریں فلمی مونتاژ کے طرز پر یکجا کر کے نئی مرقع سازی کی بنا ڈالتی ہیں۔ ساحر کی نظم "پرچھائیاں" تو خیر فلمی ڈھنگ کے مختلف مناظر ہی سے عبارت ہے اور اس اعتبار سے شاید اس تکنیک کی سب سے کامیاب نظم ہے لیکن فلمی دنیا سے تعلق سے پہلے بھی ساحر اس طرز کی مرقع سازی کرتے رہے ہیں۔ اس کی مثالیں، ایک منظر۔ ایک واقعہ، کسی کو اداس دیکھ کر، اور خاص طور پر صبح نوروز، اور دھکلے، جیسی نظموں میں ملتی ہیں۔

ساحر متحرک مرقعوں کا شاعر ہے اور یہ امتیاز صرف ساحر کو حاصل ہے کہ وہ لسانیاتی تجسیم والی تصویروں سے یہ مرقع سازی کرتا ہے۔ ساحر کی تقریباً سبھی اہم نظموں میں تناؤ دوسری اور لسانیاتی پیکروں کی مدد سے قائم ہوتا ہے سب سے پہلے "پرچھائیاں" کو لیجئے دونوں دو مرئی تصویریں اس طرح ایک دوسرے کے مقابل ہوتی ہیں۔

تم آ رہی ہو زمانے کی آنکھ سے بچ کر نظر جھکائے ہوئے اور بدن چرائے ہوئے
خود اپنے قدموں کی آہٹ سے جھینپتی ڈرتی خود اپنے سائے کی جنبش سے خوف کھائے ہوئے

تم آ رہی ہو سر عام بال بکھرائے ہزار گونہ ملامت کا بار اٹھائے ہوئے
ہوس پرست نگاہوں کی چیرہ دستی سے بدن کی جھینپتی عریانیاں چھپائے ہوئے

اسی طرح "تاج محل" کی بنیادی آویزش شہنشاہ اور تاج محل بنانے والے معماروں کے درمیان ہے۔ شہنشاہ دولت سے معمار اور مزدوروں کی محنت خرید سکا اور ان کے ذریعے ان کی نہیں اپنی محبوبہ کی یادگار بنانے میں کامیاب ہوا۔ یہی صورت "آج" "کل اور آج" مجموعہ اشتراکیت میں بھی ہے "آج" میں صورت حال کو ساحر نے تصویر کی شکل دے دی ہے۔ اس تصویری ترتیب نے اردو نظم کو ارتقا اور تنظیم کی نئی جہت بخشی۔ غیر مرئی اور کبھی کبھی غیر دلچسپ مضامین اور مناظر کو وہ اپنی صورت گری سے انتہائی دل آویز اور پرکشش بنا دیتے ہیں۔ مثلاً "کل اور آج" کی دو تصویریں:

کل بھی بوندیں برسی تھیں
کل بھی بادل چھائے تھے
اور کوی نے سوچا تھا

بادل یہ آکاش کے سپنے ان زلفوں کے سائے ہیں
دوش ہوا پہ مے خانے ہی مے خانے گھر آئے ہیں
رت بدلے گی پھول کھلیں گے جھونکے مدھ برسائیں گے

اُجلے اُجلے کھیتوں میں رنگیں آنچل لہرائیں گے

(اس موقعے پر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ساحر نے جس طرح دیہات کی زندگی کو جس حسن و کیفیت کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی مثالیں اردو شاعری میں کم ہیں۔ چرواہے بنسی کی دھن سے گیت بوتے ہیں۔ آموں کے جھنڈوں میں پردیسی دل کھوتے ہیں، پینگ بڑھاتی گوری کے ماتھے سے کوندے لپکتے ہیں جو ہڑ کے ٹھہرے پانی میں تارے آنکھ جھپکتے ہیں۔ ندی کے ساز پر ملاح گیت گاتے ہیں۔)

بستی پر بادل چھائے ہیں پر یہ بستی کس کی ہے...
دھرتی پر امرت برسے گا لیکن دھرتی کس کی ہے
ہل جوتے گی کھیتوں میں الہڑ ٹولی دہقانوں کی
دھرتی سے پھوٹے گی محنت فاقہ کش انسانوں کی
فصلیں کاٹ کے محنت کش غلّے کے ڈھیر لگائیں گے
جاگیروں کے مالک آکر سب پونجی لے جائیں گے

آج بھی بادل چھائے ہیں
آج بھی بوندیں برسیں گی
اور کوئی اس سوچ میں ہے

اس ضمن میں تصورات کو situation صورت حال میں تبدیل کرنے کے ہنر کا ذکر بھی ضروری ہے ساحر ایسے بھرپور لمحات کو ڈرامائی صورت حال میں منتقل کر دیتے ہیں مثلاً آزادی کے بعد فسادات کی لہر سے متاثر ہو کر وہ اسے ایک ایسے مغنّی کی صورت گری کرتے ہیں جو قوم کے فرزندوں سے اپنے نغموں کی جھولی پسارے اپنا ہنر، اپنی لے، اپنے سرادر اپنی نے کی بھیک مانگتا ہے اسی طرح دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں جب جرمنی اور انگلستان میں لڑائی چھڑ گئی تو انھوں نے اسے پھر کسی قمار خانے میں دو جواریوں کے جھگڑے سے تعبیر کر کے ان جواریوں کے استبداد کے شکار عوام سے براہ راست خطاب کا وسیلہ اختیار کیا۔

مسکرا، اے زمین تیرہ و تار
سر اٹھا اے دبی ہوئی مخلوق
دیکھ وہ مغربی افق کے قریب
آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پرانے قمار خانے میں
کہنہ شاطر بہم الجھنے لگے

کوئی تیری طرف نہیں نگراں
یہ گراں بار سرد زنجیریں . . . .
آج موقع ہے ٹوٹ سکتی ہیں (لمحۂ غنیمت)

ساحر خطابت، ڈرامائیت اور تجسیمی محاکات سے کام لے کر تصورات کو حرکت اور عمل سے صورت حال میں ڈھال دیتے ہیں اور فی نفسہٖ ایک تجربہ بنا دیتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ وہ غیر ضروری وضاحت سے دامن بچا کر کرتے ہیں ان کی نظموں میں بیانیہ اشارے ہیں مگر بیانیہ منظر نامے بہت کم ہیں اور اس اعتبار سے وہ سردار جعفری سے متاثر ہونے کے بجائے فیض سے زیادہ قریب ہیں گو ان کے یہاں سلام مچھلی شہری (مادام شہزادے، شہہ کار، ایک تصویر رنگ)۔ مجاز (نذر کالج، شکست، ایک شام، طلوع اشتراکیت)۔ جاں نثار اختر (مجھے سوچنے دو، سوچتا ہوں)۔ فیض (آواز آدم، ہراس، لمحۂ غنیمت)۔ سردار جعفری (آج، مفاہمت)۔ اختر شیرانی (متاع غیر، ردعمل، ایک واقعہ)۔ کیفی (یہ کس کا لہو ہے، پھر وہی کنج قفس)۔ مخدوم (بلاوا)۔ جوش ملیح آبادی (اشعار، صفحہ ۶۵ تلخیاں ۱۴ واں ایڈیشن) لیکن اس وسیع اثر پذیری کے بعد کم سے کم سات نظموں میں ساحر اپنا ایک منفرد لب ولہجہ پانے میں کامیاب ہوئے ہیں اور یہ لہجہ ٹھہراؤ، حسیاتی تجسیم، نغمگی اور لطیف تصویروں کی مرقع سازی سے عبارت ہے، یہ منفرد لہجے والی نظمیں ہیں تاج محل، کبھی کبھی، میرے عہد کے حسینو میرے گیت تمہارے ہیں، خوب صورت موڑ، پرچھائیاں اور فن کار۔ ان نظموں کے علاوہ چند غزلیں بھی ہیں جن میں ساحر کی انفرادیت ابھری ہے۔

ساحر کی نظموں میں شعری ترتیب و تشکیل کا تیکھا انداز ہے ایک طرح کی نظمیں تو وہ ہیں جن میں جوش ملیح آبادی کے طرز کا کیفیاتی تسلسل تو ہے کیفیاتی ارتقا نہیں ہے اگر ارتقا ہے تو زیادہ نمایاں نہیں ہوا ہے مثلاً چکلے میں تقریباً یکساں مضامین یا ملتے جلتے مناظر ہر بند میں دہرائے گئے ہیں گو آخر کے تینوں بند عمل کے مختلف ٹکڑوں کا مرقع پیش کرتے کرتے سینوں کی جانب بڑھتے ہوئے ہاتھ، زینوں کی جانب لپکتے ہوئے پاؤں اُجلے دریچے میں پایل کی چھن چھن، تنفس کی الجھن، مدقوق چہرے اور ڈھلکتے بدن کے تذکرے کو ایک خطیبانہ للکار پر جا کر ختم ہوتے ہیں لیکن دوسری قسم کی نظمیں وہ ہیں جو بہت زیادہ گٹھی ہوئی مرتب اور مربوط ہیں، کبھی کبھی جیسی مرتب اور مربوط نظمیں اردو شاعری میں کم ہیں۔ ہر مصرعہ اور ہر بند سلسلہ بہ سلسلہ ارتقا کی کڑی ہے اور پوری نظم ایک دائرے میں ڈھل جاتی ہے۔ پہلا مصرعہ آخری مصرعے سے اس طرح ہم آواز ہے جیسے دائرۂ نظم کے ختم ہونے کے بعد پھر سے شروع ہو رہا ہو اور زندگی اسی خیال کے دائرے میں گردش کر رہی ہو۔

بیچ کی کڑیاں چھوڑ کر مجمل اور موثر بلاغت کے ساتھ کسی ایک ڈرامائی موڑ کو بیان کر دینا بھی ساحر کی تکنیک کی خصوصیت ہے وہ بہت کم بیانیہ ہوتا ہے صرف چند لکیروں سے تصویر مکمل کرتا ہے مگر فلمی مون تاژ کے طرز پر بکھری تصویروں کی بلاغت سے مرقع سجاتا ہے اور کیفیات پیدا کرتا ہے وہ تصویروں اور مرقعوں میں سوچنے اور

محسوس کرنے والا شاعر ہے جس کی نظیر اردو شاعری میں کم یاب ہے اسی لئے اس نغمہ گر مرقع ساز شاعر کو فلمی دنیا میں اتنی کامیابی ملی (جو اسے بہت مہنگی پڑی)، اور اسی لئے وہ پڑھنے والوں کے دلوں کو اس طرح چھوتا ہے کہ ان کی حسیات کا حصہ بن جاتا ہے۔ ساحر اردو میں ڈرامائی لمحوں کا تنہا شاعر ہے۔

ساحر کی شاعری کے دور بہ دور ارتقا کو سامنے رکھا جاتے تو ایسا لگے گا کہ ایک نوجوان نے عنفوان شباب کے نرم و نازک جذبات کی رومانوی خود رحمی سے شاعری کی ابتدا کی۔ محبوبہ کی بے وفائی یا زمانے کے جبر سے جب رومانی خوابوں کا رنگ محل ٹوٹا تو گرد و پیش کے دکھ درد پر آنکھ پڑی اور خود کو اجتماعی دکھ درد میں گم کر دیا، پرچم لہرانے والوں کی خاطر بربط پر گانے لگا، انقلاب کے ترانے چھیڑے خود کو خوشی اور مسرت کی کربناک جد جہد کا جز بنا لیا اور پھر اچانک ایک موڑ آیا جس کے بعد وہ لبرل ازم کی طرف مڑا اور انقلاب کی جگہ محض امن اور سماجی انصاف کی مبہم اقدار کا مغنی بن گیا۔ انقلاب کا ذکر کم، قوم پرستی کا آہنگ زیادہ بلند ہوا۔ لیکن ان سبھی منازل میں ساحر سماجی شرکتوں کا شاعر ہے گریز پائیوں کا نہیں۔ بے شک اس کی شاعری میں فکر کی صلابتیں اور احساس و ادراک کی عمیق گہرائیاں نہیں ہیں لیکن اس کی پوری شاعری اس کے دور کے درد و داغ و جستجو و آرزو میں براہ راست ذہنی اور حسیاتی شرکت کا منظر نامہ ہے اور اسی سے ساحر کو نغمگی بھی ملی اور اثر آفرینی بھی۔

قومی آزادی کی لڑائی ہو یا بحری بیڑے کی بغاوت، فرقہ وارانہ فسادات کی قیامت خیزی ہو یا جنگ کی تباہ کاری، ہندو پاک لڑائی کی لعنتیں ہوں یا بین الاقوامی سطح پر لومبا جیسے عوام دوست رہنماؤں کی شہادت اردو کے ساتھ بے انصافی ہو یا مزدور کسانوں کا استحصال، ساحر کی آواز نغمہ بار رہی ہے اور ان کا دل عوام کی دھڑکنوں سے ہم آہنگی کے ساتھ دھڑکا ہے اور یہی ہم آہنگی ان کی شاعری میں توانائی، سرمستی اور نغمگی بن کر ابھری ہے اسی لئے طبقاتی شعور کے جیسے واضح نقوش ساحر کی نظم 'تاج محل'، اور 'نورجہاں کے مزار پر' میں ملتے ہیں اتنے اردو شاعری میں کسی اور جگہ شاید ہی کہیں ملیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس قسم کی شاعری سماجی سطح پر انقلابی تبدیلیوں سے محترم ہوتی ہے۔ جب وہ تحریکیں جوان ہوں جو نقطۂ نظر کو استناد اور توانائی دے سکیں اسی وقت ادب کی یہ نئی آواز بھی استناد حاصل کرتی ہے۔ بدقسمتی سے ۱۹۵۰ء کے بعد سے طبقاتی شعور کو ہماری انقلابی جماعتوں نے بھی قوم پرستی، کے تابع کر دیا ہے اور اسی لئے ساحر کی شاعری کا یہ توانا حصہ رنگ و نور سے محروم ہوتا گیا اور ان کی شاعری بعد میں ایک نئے موڑ سے گزری۔ مگر ان حد بندیوں کے باوجود ساحر ایک بے مثال مرقع ساز، نغمہ گر اور ڈرامائی لمحوں کے شاعر کی حیثیت سے اردو ادب کی تاریخ میں مدتوں یاد رکھے جائیں گے۔

ساحر + جادوگر + لدھیانوی

عزیز قیسی

برسوں پہلے ۴۷ء یا ۴۸ء کی بات ہے میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا اور اس وقت کے طلبا اور طالبات سب کے سب جنہیں ادب اور شعر کا چسکا تھا ساحر کے عاشق تھے۔ اور ساحر ان کے تصور میں ایک ایسے عاشق کا مبہم سا ہیولا تھے۔ جو زمانہ کا ستایا ہوا نوجوان ہے۔ متوسط طبقے کا جس نے حسن کے دامن میں پناہ لینا چاہی تو حسن نے کسی بہانے سے اس سے بے وفائی کی اور وہ بے چارہ ۔ اب ان اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا کا عہد کرکے اور "مصور میں تیرا شاہکار واپس کرنے آیا ہوں ــــ اس لئے کہ اب میری محبوبہ کسی صاحب زر کی آغوش میں چلی گئی ہے اور اب تو اسے بنچ کی جگہ صوفے پر بٹھلا دے اور میری جگہ۔ ہم دونوں کی تصویر میں ایک چمکتی ہوئی کار ـــــ دکھلا دے۔" کہنے لگا۔ میں ان نظموں کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ جو اُن دنوں نوجوان لڑکیوں کی نوک زبان پر تھیں اور (شاید آج بھی ہیں) یہ گلو گرفتہ، دل گداز اور اداس لہجے والا شاعر ـ بہت مقبول شاعر تھا۔

مقبولیت، بڑی عشوہ طراز اور معشوقہ ہزار شیوہ ہے وہ کسی بھی فنکار کو اپنی ہستی اور اپنے وجود اپنی صلاحیتوں اور اپنی انا کے لئے بڑا سنہری ہالہ متعین کر دیتی ہے۔ یہ سنہری ہالہ اس فنکار کیلئے نہیں اس کے چاہنے والوں کے لئے بھی بڑا محبوب ہوتا ہے۔

ساحر ــــ میرے لئے اس سنہرے ہالے کے شاعر تھے۔ جب مجھے اس دور کے مشہور و مقبول شاعروں سے ملنے کی توفیق ہوئی تو میں عمر کی اور ذہنی عمر کی اس منزل میں تھا جو مداحین کے لئے ہوتی ہے۔ مداح کی عمر ویسے چاہے بڑھ جائے، وہ بوڑھا ہو جائے لیکن وہی ابتدائے بلوغ کی عمر رہتی ہے۔ لیکن میرے لئے یہ عمر بہت جلد ختم ہوگئی! اور شہرت و مقبولیت اور فن ـــ میں تفریق کرنے کا شعور بھی آگیا۔

اس طویل جملہ معترضہ کے بعد ــــ میں پھر، ساحر کی طرف لوٹتا ہوں۔ میں ان سے غالباً ۴۹ء میں ملا۔ میں حیدرآباد سے اپنے ایک بزرگ دوست مسلم ضیائی (مرحوم) جو بے حد نفیس آدمی تھے اور اس دور کے ادیبوں اور شاعروں سے جن کے بے حد اچھے مراسم تھے جو خود اچھے صحافی، ادب شناس اور سخن فہم اور مخلص آدمی تھے، ساحر سے ملنے گیا۔ ساحر، ان دنوں کرشن چندر کے بنگلے میں (چار بنگلہ ورسووا) میں پہلی منزل پر، کرشن چندر کے کرایہ دار کی حیثیت سے مقیم تھے۔ فسادات میں ماں کو کھونے کی ذہنی اذیت سے نکل کر ان کے

ان کے دوبارہ ملنے کی مسرت سے ہم کنار تھے اور پریشان حالی و بے روزگار رہنے کے بعد۔ فلم میں نئے نئے "گیت کار" کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ ان کی مشہور نظم "تاج محل" کی شہرت کے علاوہ بہ حیثیت ذہین و طباع شاعر کے ان کا چرچا، خاص طور پر پورے ہندوستان میں تھا۔ کرشن چندر کے اس بنگلے میں کئی اور ادیب اور شاعر بھی ہوں گے لیکن مجھے وہاں ساحر کے علاوہ صرف نیاز حیدر ملے۔

ساحر مسلم ضیائی کے دوست تھے اور مسلم ضیائی، ابراہیم جلیس کی کتابوں کے ناشر، ابراہیم جلیس، ساحر کے بے تکلف یار۔ مسلم ضیائی ساحر سے پیار کرتے تھے اور ساحر کو جادوگر کہہ کر بلاتے تھے۔ ساحر سے مسلم ضیائی نے مجھے ملایا۔ میں ساحر کے لئے بالکل اجنبی تھا اور وہ بھی ایسا اجنبی جسے ساحر سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ اس کے باوجود مجھے ایسا لگا جیسے ساحر نے مجھے اجنبی نہیں سمجھا اور بالاصرار ناشتہ کرایا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ساحر کے گھر اجنبی ہوں یا شناسا۔ ناشتہ بالاصرار کرانا ان کا معمول تھا۔ اس ملاقات میں یاد نہیں کیا کیا باتیں ہوئیں۔ لیکن ایک بات میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی کہ مسلم ضیائی انھیں جادوگر کہتے رہے۔

پتہ نہیں مسلم ضیائی کا دیا ہوا یہ لقب میرے حافظے کے ساتھ کیوں چپک کر رہ گیا۔ اور ساحر سے جب میں پہلے ایک جونیئر کی حیثیت سے ملا تو ان کی شہرت اور مقبولیت سے مرعوب تھا تب بھی، اور جب، ان سے قدرے بے تکلف ملاقاتیں ہوئیں تب بھی، اور جب آخر آخر میں ان سے کچھ کشیدہ کشیدہ ملاقاتیں ہوئیں تب بھی مجھے ساحر جادوگر ہی لگے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی جادوگر کے ساتھ جو تلازمات ہیں وہ ہر دور میں میرے ذہنی رابطے کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے گئے۔

ابتدائے عشق کے مرحلے میں ساحر ویسے ہی جادوگر نظر آئے جو اپنی شخصیت اور شہرت سے، اپنی حاضر جوابی اور طنز سے اپنی ذہنی براقی کے سبب اپنے مخاطب کو ہپناٹائز کر دیتے تھے۔ یہی اثر مجھ پر بھی ہوتا تھا اور میں مبہوت انہیں دیکھتا رہتا کہ وہ اپنے پٹارے سے کیا کرشمہ باہر نکالتے ہیں اور ایسا اکثر ہوا کہ ہر بار کوئی نہ کوئی حیرت زا اور حیرت افزا کرشمہ وہ دکھاتے رہتے تھے۔ کبھی معلوم ہوتا کہ وہ بے حد دردمند دل کے آدمی ہیں جو ساری انسانیت کا دکھ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں۔ اور ان کے اشعار اور ان کی باتیں اسی درد کی کسک کا اظہار ہیں۔ کبھی ایسا لگتا کہ ساحر کا ذہن اس دنیا کی ناانصافیوں اور زیادتیوں کے سلسلے میں بے حد صاف ہے اور وہ اس سماج کے ہر ٹیڑھ کو ننگا دیکھ چکے ہیں۔ اور کسی ظلم اور جبر کو معاف کرنے والے نہیں۔ کبھی میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ساحر بے پناہ ذہین آدمی ہیں۔ اور ان کی نکتہ آفرینی سب کو متحیر کر دیتی ہے۔ کبھی ان کے طنز کی کاٹ لاجواب نظر آئی۔ کبھی ان کا استہزائیہ انداز بے حد تیز اور نکیلا محسوس ہوتا اور ان کے فقروں کی چبھن بھلائے نہ بھولتی۔ کبھی وہ سراپا انکسار نظر آتے اور یہ اندازہ ہوتا کہ اتنی شہرت اور مقبولیت کے باوجود یہ انکسار ان کی طبیعت کا خاص وصف ہے۔ کبھی وہ اتنے متکبر نظر آتے کہ یگانہ کا شعر یاد آتا ہے

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
پھر یگانہ کس لئے ناحق پرستی کیجئے

یہ ان ملاقاتوں کے تاثرات ہیں جو پہلے پہل ہوئی تھیں۔ اور ان ملاقاتوں کے تاثرات سے جس شخصیت کا تصور ذہن میں بندھتا ہے وہ "مجموعۂ اضداد" نظر آتی ہے۔

ساحر مجموعۂ اضداد تھے۔ ویسے تو ہر فرد مجموعۂ اضداد ہے۔ ہماری پوری زندگی مجموعہ اضداد ہے۔ پورا سماج اور پورا

معاشرہ مجموعہ اضداد ہے۔ مارکسیت نے بھی زندگی، ارتقا، تاریخ اور تہذیب کی یہی تعریف کی ہے۔ عمل، ردعمل، ترقی، تنزل، سبب مسبّب، ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور قرآن کا بھی انسان کے بارے میں یہی ارشاد ہے۔

لقد خلق الانسان باحسن تقویم ۝ ثم رددنٰہ اسفل سافلین ۝

(تحقیق کہ) ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔ پھر ہم اس کو پستی کی حالت والوں سے بھی پست تر کر دیتے ہیں۔ (سورہ تین)

اور ہندوستان کا قدیم فلسفہ بھی۔ اسی تضاد کو، سرشٹی اور دناش کو ایک مظہر، ایک عمل۔ ایک وجود میں یکجا دیکھتا ہے۔ صوفیا رکو بھی ہستی نیستی، خیر و شر اور اثبات و نفی ایک ہی حقیقت کے پہلو نظر آتے ہیں۔ ساحر کی زندگی بھی انہیں اضداد سے عبارت تھی۔

اضداد

ان دنوں جب حیدر آباد میں ایک کلچرل کانفرنس ہوئی تھی۔ جب ساحر فلمی دنیا میں جم گئے تھے اور ایک صاحب اثر نغمہ نگار کی حیثیت سے سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے۔ ان دنوں وہ "کار" — جو مصوّر کے شاہکار میں اپنی جگہ دکھلانے کی فرمائش کر چکے تھے ان کی دسترس میں تھی۔ وہ کار میں حیدر آباد آئے تھے۔ ان کے ساتھ جاں نثار اختر بھی تھے۔ اور ان کی وہ محبوبہ جس کے لئے انہوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ اب نہ ان اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا — کسی اونچے مکان سے اپنے شوہر سے برگشتہ اپنے محبوب شاعر سے ملنے کے لئے چوری چھپے آتی تھی۔ جسے اس نے برسوں پہلے اپنے اونچے مکانوں میں آنے نہیں دیا تھا — ساحر نے اس محبوبہ کے لئے اور ان احباب کے لئے جو اسے ایک مفلس اور ٹھکرایا ہوا عاشق تصور کرتے تھے یہ کرشمہ دکھایا تھا کہ اب وہ ایک کار کا مالک تھا اور اپنی جگہ — تصویر میں نہیں — زندگی میں کار دکھا سکتا تھا — یہ ساحر کی طبیعت کا ایک اور رخ تھا۔ ایک لطیف سا انتقام جس کی چبھن — بڑی دیرپا ہوتی ہے۔

انتقام

ساحر کا رویّہ فلم کے پروڈیوسرس کے ساتھ بھی اسی لطیف انتقام کا تھا جو کبھی کبھی لطیف سے کثیف بھی بن جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی بے مائگی کے دور کا سرمایہ داروں سے انتقام لے رہے ہیں۔ فلم لائن میں شاید کسی نغمہ نگار نے اتنے اعتماد اور سرفرازی سے کسی پروڈیوسر کو دوڑایا ہو، اسے گڑگڑاتا دیکھا ہو۔ اس سے اپنی چاپلوسی اور خوشامد کرائی ہو — میں بھی اُن دنوں فلم لائن میں آیا تھا۔ اور ساحر سے نزدیک ہونے میں ساحر کا یہ رویہ بہت بڑا سبب تھا۔ فلم کا پروڈیوسر اگرچہ سرمایہ دار نہیں ہوتا تھا لیکن اس پیچیدہ نظام معیشت میں استحصال کرنے والوں کے ایجنٹ کی طرح کام کرتا ہے۔

جادوگر نے یہ ایک اور نیا کرشمہ دکھایا تھا۔ اس لائن میں جہاں گیت لکھنے کے لئے، فلم حاصل کرنے کے لئے میں نے بڑے بڑے غیرت مند شاعروں اور ادیبوں کو چاپلوسی اور قدم بوسی سے لے کر سجدہ گزاری تک کرتے دیکھا ہے وہاں ساحر کا یہ وصف مجھے جادو کا کرشمہ ہی لگتا تھا اور میں اس معاملہ میں ہمیشہ ان کا مداح رہا اور آج بھی ہوں۔

میرے، یہاں بمبئی آنے کے بعد، میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں ساحر کے بہت قریبی دوستوں میں رہا ہوں، لیکن ان کے ساتھ مراسم تکلف کے بھی نہیں رہے۔ انہیں دنوں ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آیا۔ وہ میوزک ڈائرکٹرس سے بھی ویسے ہی پیش آتے تھے جیسا پروڈیوسرس سے — یہ ایک اور کرشمہ تھا اس لائن میں، جہاں میوزک ڈائرکٹر شاعروں کا باس ہوتا ہے۔

چھٹے دہے کے آخر میں اور ساتویں دہے کی ابتدا تک، ساحر سے میں کئی بار ملا، کئی بار ان کے گھر گیا، کئی مشاعروں میں محفلوں میں، میٹنگوں میں ان کے ساتھ رہا۔ ان دنوں فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے سکریٹری جہندر ناتھ تھے، ساحر صدر، ساحر نے اپنی صدارت اور ایسوسی ایشن کے لیڈر کی حیثیت سے بعض یادگار کارنامے انجام دیے۔ انہوں نے فلم کے گیت لکھنے والوں کے نام کو "ریڈیو" سے مشتہر کرنے کا سلسلہ شروع کرایا۔ اور گیت لکھنے والوں کی حیثیت معتبر کردی۔ یہ ان کا ایک اور کرشمہ تھا۔

ساحر سے اس زمانے میں ہر سنیچر کی شام، میری ملاقات ہوتی تھی، خلش جعفری جو روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر تھے ان کے ہم جلیسوں میں تھے۔ اکثر میں اور خلش جعفری سنیچر کی شام کو ساحر کے ورسووا کے مکان رات دیر گئے تک ساحر کی مہمان نوازی، بذلہ سنجی، ذہانت اور حافظے کا لطف اٹھاتے۔ رام پرکاش اشک اور پرکاش پنڈت (دونوں اب ساحر کے ساتھ مرحوم ہو چکے ہیں) ان کے بہترین دوستوں میں تھے۔ ان کی دوستی کی بنیاد کہیں ساحر کے ماضی میں تھی۔ رام پرکاش اشک میرے ساتھ تین چار برس فلمستان میں کام کر چکے تھے بہت نفیس آدمی تھے۔ جب انہیں کینسر ہوا تو ساحر نے ہزاروں روپیہ خرچ کر کے انہیں امریکہ علاج کے لئے بھجوایا تھا۔ کسی دوست کے لئے یہ سلوک، میرے لئے ساحر کا ایک اور کرشمہ تھا۔ پرکاش پنڈت بھی مدتوں ساحر کی وجہ سے بمبئی میں سکون و مامون رہے۔ فلم میں آنے کے بعد اکثر لوگ اپنے ماضی کو یا تو بھول جاتے ہیں یا اسے ایسے چھپاتے ہیں جیسے وہ کوئی معیوب بات ہو۔ اور ماضی کے دوستوں کے ساتھ سلوک کرنا تو ایک طرف انہیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ ساحر کی یہ دوست نوازی، جادوگری کا کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے۔ دوستی اور دوست نوازی کا ایک اور کرشمہ جاں نثار مرحوم سے ان کے تعلقات تھے۔ جن کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ "استحصال" اور "حاجت روائی" ہم معنی ہو گئے تھے۔

ساحر نے غالب اور گاندھی پر نظم کہی۔ غالب صدی کی تقریبات میں ساحر کی یہ نظم، ان کی نظم 'تاج محل' کی طرح کافی مقبول ہوئی۔ نظم کی حیثیت چاہے کچھ بھی ہو لیکن اس کی تلخی اور طنز کی کاٹ یادگار ہے۔ ان دنوں ساحر، ارباب اقتدار اور خاص طور پر سیاست والوں کے منھ پر کھری کھوٹی سنانے میں مشہور و بدنام ہو چکے تھے۔ یہ میرے لئے کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ ان کی ذہنی تربیت، ترقی پسند تحریک کے سائے میں ہوئی تھی اور ترقی پسند شاعروں کی مصلحت پسندی، ابن الوقتی اور جاہ پسندی کے خلاف تلخ نوائی اور تلخ گوئی عام بات تھی۔ اسی لئے جب ساحر نے ایک وزیر کی موجودگی میں ہندی کی بالادستی کے خلاف ایک مشاعرے میں تقریر کی اور سناٹا ہو گیا تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ لیکن اگلی صبح جب اخباروں میں یہ خبر چھپی اور کچھ لوگوں نے ٹیلی فون پر ساحر کو قتل کی دھمکی دی اور ایسے خطوط آنے شروع ہوئے تو ساحر کی پریشانی پر حیرت ضرور ہوئی۔ میں دو چار دن ان کے ساتھ رہا۔ انہوں نے اپنی تائید میں ترقی پسند ادیبوں، شاعروں کا ایک بیان اجرا کروایا۔ میں ان کے ساتھ صبح سے شام تک رہتا تھا۔ اور یہ حیرت سے دیکھتا تھا کہ وہ کتنے nervous ہیں۔ چنانچہ ایک رات جب وہ قتل ہونے کے ڈر اور اپنی ماں اور بہن کے بے سہارا ہونے کی بات کر کے رو پڑے تو ـــــ میرے لئے جادوگر کا ایک اور کرشمہ نظر آیا۔

ایسے کتنے ہی واقعات ہیں، کتنی ہی ملاقاتیں ہیں، جن کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کے فن اور شخصیت کے مجھ پر حیرت افزا اور جرأت آفریں پہلوؤں کے انکشافات ہوتے۔ اور اس طویل تعلقات کی عمر میں جو کم سے کم تیس برسوں پر پھیلی ہوئی

ہے۔ میں ساحر کو سمجھ نہیں سکا۔ اس لئے ان کو جاننے کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا۔ اور ایسا دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ہر شخص "اسرار کا گنجینہ" ہے۔

ہر شاعر کو اپنے "عظیم" ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ یہ یقین ساحر کو بھی تھا۔ وہ اکثر بڑی سادگی سے کہا کرتے تھے: "لوگ مجھے عظیم کہتے ہیں اور کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے؟" وہ یہ مانتے تھے کہ سب سے بڑا شاعر وہ ہے جو سب سے زیادہ مقبول ہو اور یہ فقرہ وہ سوالیہ انداز میں جاں نثار اختر سے کہتے۔ "کیوں اختر؟" اور جاں نثار جواب دیتے۔ "اور کیا" لیکن اسی شاعر نے جب کہا کہ میں "پل دو پل" کا شاعر ہوں تو پھر میرے لئے حیرت کا باعث ہوا۔

اُن کے انتقال کی خبر میں نے ٹورنٹو میں سنی۔ وہاں کی تعزیتی محفل میں، ہندوستان سے ہزاروں میل دور کافی آدمی جمع ہو گئے تھے۔ سردار جعفری اور کیفی اعظمی نے بہت جذبات سے بھری تقریریں کیں۔ فیض نے بھی حسب معمول مختصر مگر جامع تقریر کی اور میں نے بھی ان کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالی جو فلم سے اور فلم رائٹرس ایسوسی ایشن اور نغمہ نگاری سے متعلق تھا۔ لیکن حیرت پھر میرے انتظار میں تھی۔ جب میں واپس آیا تو پتہ چلا کہ ایسوسی ایشن کی طرف سے بلائے گئے تعزیتی جلسے میں گنتی کے آدمی تھے اور راہی معصوم رضا نے دل برداشتہ ہو کر کہا تھا "جب میں مر جاؤں تو میری تعزیت کا جلسہ نہ کیا جائے۔"

یہاں اس شہر میں یہ کیفیت تھی جہاں ساحر نے اپنی زندگی کے بہترین برس گزار دیئے۔ جہاں ساحر نے بحیثیت شاعر مقبولیت کی معراج دیکھی۔ جہاں ان کے بے شمار مداح تھے۔ دوسری طرف مدراس جیسے دور افتادہ مقام پر ان کی تعزیت کرنے والے سینکڑوں تھے جو طوفانی بارش میں بھی اپنے محبوب شاعر کو خراج عقیدت پیش کرنے آئے تھے۔ ادھر حیدرآباد میں بھی دو ڈھائی سو افراد جن میں سبھی نامور ادیب اور شاعر موجود تھے اور لدھیانہ کا شہر بند ہو گیا تھا۔ یہ شاید جادوگری کا آخری کرشمہ تھا۔ لیکن آخری کرشمہ شاید وہ پھر دکھانے والا ہو۔ کیونکہ فنکار تو مر کر بھی نہیں مرتا۔ موت کے بعد یہ تو ہر فن کار کے بارے میں کہا جاتا ہے چاہے وہ کسی درجے کا ہو۔ لیکن مجھے ایسا یقین ہے کہ ساحر اکیلے مر کر بھی نہیں مرتا تو معمول کی بات ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے شاید ساحر دوبارہ کسی حیرت افزا انداز سے زندہ ہو گا ــــــ اور جادوگر کا یہ آخری کرشمہ ہو گا۔

کلامِ ساحر
نظمیں
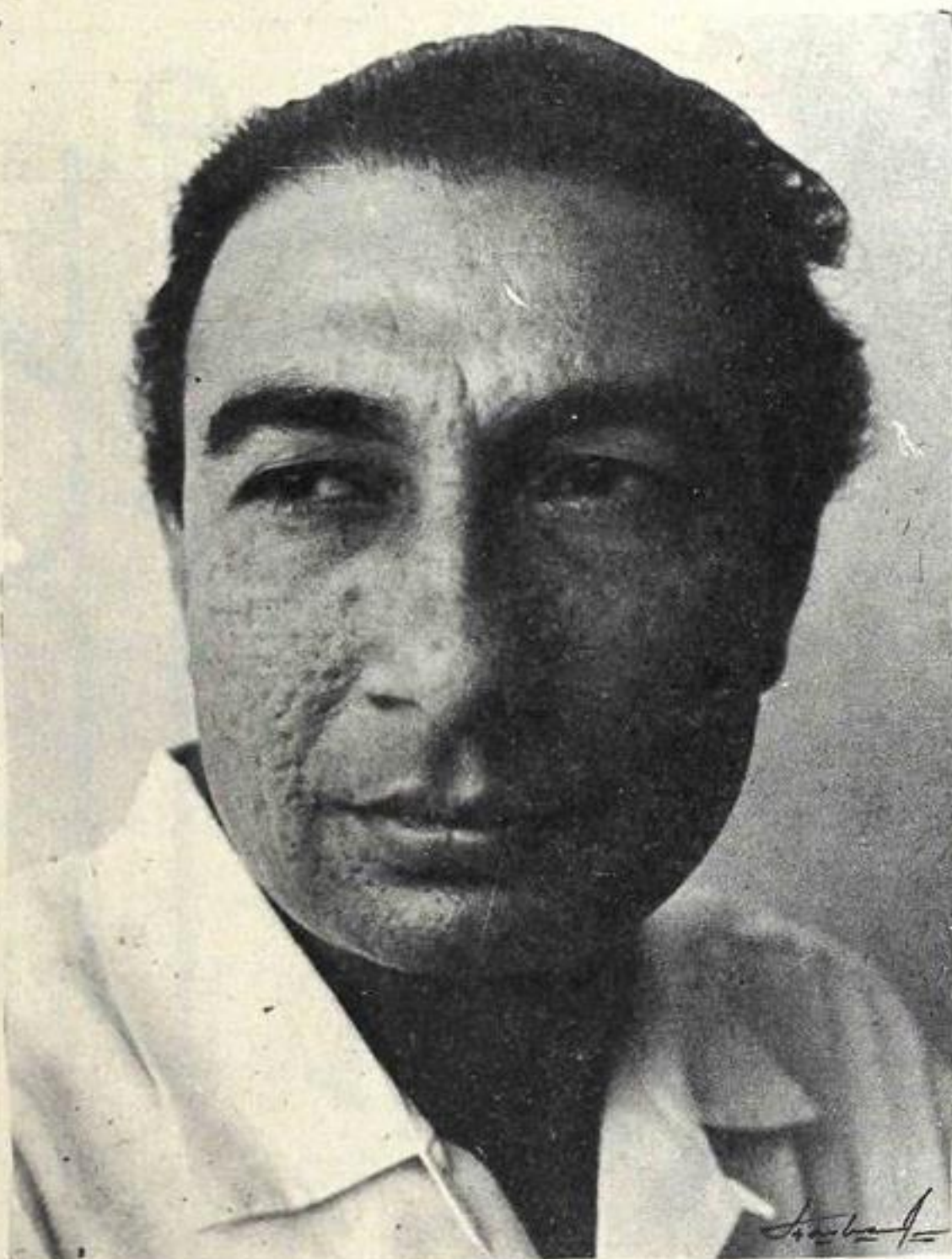
چکلے

یہ کوچے ، یہ نیلام گھر دل کشی کے
یہ لُٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں ، کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

یہ پُر پیچ گلیاں ، یہ بے خواب بازار
یہ گمنام راہی ، یہ سکّوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے ، یہ سودوں پہ تکرار
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

یہ صدیوں سے بے خواب سہمی سی گلیاں
یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں
یہ بِکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

یہ اُجلے دریچوں میں پائل کی چھَن چھَن
تنفس کی اُلجھن پہ طبلے کی دھن دھن
یہ بے روح کمروں میں کھانسی کی ٹھَن ٹھَن
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

یہ گونجے ہوئے قہقہے راستوں پر
یہ چاروں طرف بھیڑ سی کھڑکیوں پر
یہ آوازے کھنچتے ہوئے آنچلوں پر
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

یہ پھولوں کے گجرے ، یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بے باک نظریں ، یہ گستاخ فقرے

یہ ڈھلکے بدن اور یہ مدقوق چہرے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

یہ بھوکی نگاہیں حسینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

یہاں پیر بھی آچکے ہیں، جواں بھی
تن و مند بیٹے بھی ، ابّا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے، ماں بھی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس، رادھا کی بیٹی
پیمبر کی اُمّت، زلیخا کی بیٹی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

ذرا ملک کے رہبروں کو بُلاؤ
یہ کوچے، یہ گلیاں، یہ منظر دکھاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

O

تاج محل

تاج تیرے لئے اِک مظہرِ اُلفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی

میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے
بزمِ شاہی میں غریبوں کا گذر کیا معنی ؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی ؟

میری محبوب! پسِ پردۂ تشہیرِ وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو دیکھا ہوتا
مُردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

اَن گنت لوگوں نے دنیا میں محبّت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے اُن کے
لیکن اُن کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیوں کہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

یہ عمارات و مقابر، یہ فصیلیں، یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
دامنِ دہر پہ اس رنگ کی گُل کاری ہیں
جس میں شامل ہے ترے اور مرے اجداد کا خوں

میری محبوب! انہیں بھی تو محبّت ہو گی
جن کی صنّاعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
اُن کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک اُن پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ، یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب، یہ طاق
اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبّت کا اڑایا ہے مذاق

میری محبوب! کہیں اور مِلا کر مجھ کو

○

ہراس

تیرے ہونٹوں پہ تبسّم کی وہ ہلکی سی لکیر
میری تخییل میں رہ رہ کے جھلک اُٹھتی ہے
یوں اچانک ترے عارض کا خیال آتا ہے
جیسے ظلمت میں کوئی شمع بھڑک اُٹھتی ہے

تیرے پیراہنِ رنگیں کی جنوں خیز مہک
خواب بن بن کے مرے ذہن میں لہراتی ہے
رات کی سرد خموشی میں ہراِک جھونکے سے
تیرے انفاس، تیرے جسم کی آنچ آتی ہے

میں سلگتے ہوئے رازوں کو عیاں تو کردوں
لیکن ان رازوں کی تشہیر سے جی ڈرتا ہے۔
رات کے خواب اُجالے میں بیاں تو کردوں
اِن حسیں خوابوں کی تعبیر سے جی ڈرتا ہے۔

تیری سانسوں کی تھکن، تیری نگاہوں کا سکوت
درحقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسّم، وہ تکلّم تری عادت ہی نہ ہو

سوچتا ہوں کہ تجھے مل کے میں جس سوچ میں ہوں
پہلے اُس سوچ کا مقسوم سمجھ لوں تو کہوں

میں ترے شہر میں انجان ہوں، پردیسی ہوں
ترے الطاف کا مفہوم سمجھ لوں تو کہوں

کہیں ایسا نہ ہو، پاؤں مرے تھرّا جائیں
اور تری مرمریں باہوں کا سہارا نہ ملے
اشک بہتے رہیں خاموش سیہ راتوں میں
اور ترے ریشمی آنچل کا کنارا نہ ملے

کبھی کبھی

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گذرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدّر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی

عجب نہ تھا کہ میں بیگانۂ الم ہو کر
ترے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا
ترا گُداز بدن، تیری نیم باز آنکھیں
انہی حسین فسانوں میں محو ہو رہتا

پکارتیں مجھے جب تلخیاں زمانے کی
ترے لبوں سے حلاوت کے گھونٹ پی لیتا
حیات چیختی پھرتی برہنہ سر اور میں
گھنیری زلفوں کے سائے میں چھپ کے جی لیتا

مگر یہ ہو نہ سکا، اور اب یہ عالم ہے
کہ تو نہیں، ترا غم، تری جستجو بھی نہیں
گذر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی جیسے
اسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا چکا ہوں گلے

گذر رہا ہوں کچھ انجانی رہ گذاروں سے
مہیب سائے مری سمت بڑھتے آتے ہیں
حیات و موت کے پُر ہول خارزاروں سے

نہ کوئی جادہ نہ منزل، نہ روشنی کا سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
انھیں خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس، مگر یوں ہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

فن کار

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج اُن گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں

آج دُکان پہ نیلام اُٹھے گا اُن کا
تو نے جن گیتوں پہ رکھی تھی محبت کی اساس
آج چاندی کے ترازو میں تلے گی ہر چیز
میرے افکار، مری شاعری، مرا احساس

جو تری ذات سے منسوب تھے ان گیتوں کو
مفلسی جنس بنانے پہ اتر آئی ہے
بھوک، تیرے رخِ رنگیں کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنّائی ہے

دیکھ! اس عرصہ گہہ محبت و سرمایہ میں
میرے نغمے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے
تیرے جلوے کسی زردار کی میراث سہی
تیرے خاکے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے

آج اُن گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے

مادام

آپ بے وجہ پریشان سی کیوں ہیں مادام
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی
میرے ماحول میں انسان نہ رہتے ہوں گے

نورِ سرمایہ سے ہے روئے تمدّن کی جِلا
ہم جہاں ہیں وہاں تہذیب نہیں پل سکتی
مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک، آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

لوگ کہتے ہیں تو لوگوں پہ تعجب کیسا ؟
سچ تو کہتے ہیں کہ ناداروں کی عزت کیسی ؟
لوگ کہتے ہیں — مگر آپ ابھی تک چپ ہیں
آپ بھی کہئے غریبوں میں شرافت کیسی ؟

نیک مادام! بہت جلد وہ دور آئے گا
جب ہمیں زیست کے ادوار پرکھنے ہوں گے
اپنی ذلّت کی قسم، آپ کی عظمت کی قسم
ہم کو تعظیم کے معیار پرکھنے ہوں گے

ہم نے ہر دور میں تذلیل سہی ہے لیکن
ہم نے ہر دور کے چہرے کو ضیا بخشی ہے

ہم نے ہر دَور میں محنت کے ستم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دور کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے

لیکن اِن تلخ مباحث سے بھلا کیا حاصل ؛
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہونگے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہو گی
میں جہاں ہوں، وہاں انسان نہ رہتے ہونگے

○

جاگیر

پھر اُسی وادیٔ شاداب میں لوٹ آیا ہوں
جس میں پنہاں مرے خوابوں کی طرب گاہیں ہیں
میرے احباب کے سامان تعیش کے لئے
شوخ سینے ہیں، جواں جسم، حسیں باہیں ہیں

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
کس میں جرأت ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے
سب کے لب پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے

ہائے وہ گرم و دل آویز، ابلتے سینے
جن سے ہم سطوتِ آبا کا صلہ لیتے ہیں
جانے ان مرمریں جسموں کو یہ مریل دہقاں
کیسے ان تیرہ گھروندوں میں جنم دیتے ہیں

یہ لہکتے ہوئے پودے، یہ دمکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے، اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں، سب میرے ہیں

ان کی محنت بھی مری، حاصلِ محنت بھی مرا
ان کے بازو بھی مرے، قوت بازو بھی مری

مَیں خداوند ہوں، اس وسعتِ بے پایاں کا
موجِ عارض بھی مری، نکہتِ گیسو بھی مری

مَیں اُن اجداد کا بیٹا ہوں جنہوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعتِ ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

خاک پر رینگنے والے یہ فسردہ ڈھانچے
ان کی نظریں کبھی تلوار بنی ہیں نہ بنیں
ان کی غیرت پہ ہر اک ہاتھ جھپٹ سکتا ہے
ان کے ابرو کی کمانیں نہ تنی ہیں نہ تنیں

ہائے یہ شام، یہ جھرنے، یہ شفق کی لالی
میں ان آسودہ فضاؤں میں ذرا جھوم نہ لوں
وہ دبے پاؤں اُدھر کون چلی جاتی ہے
بڑھ کے اس شوخ کے ترشے ہوئے لب چوم نہ لوں

○

فرار

اپنے ماضی کے تصور سے ہراساں ہوں میں
اپنے گزرے ہوئے ایّام سے نفرت ہے مجھے
اپنی بے کار تمنّاؤں پہ شرمندہ ہوں
اپنی بے سود امیدوں پہ ندامت ہے مجھے

میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہنے دو
میرا ماضی میری ذلّت کے سوا کچھ بھی نہیں
میری امیّدوں کا حاصل، مری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں

کتنی بے کار امیّدوں کا سہارا لے کر
مَیں نے ایوان سجائے تھے کسی کی خاطر
کتنی بے ربط تمنّاؤں کے مبہم خاکے
اپنے خوابوں میں بسائے تھے کسی کی خاطر

مجھ سے اب میری محبّت کے فسانے نہ کہو
مجھ کو کہنے دو کہ میں نے انھیں چاہا ہی نہیں
اور۔ وہ مست نگاہیں جو مجھے بھول گئیں
میں نے اُن مست نگاہوں کو سراہا ہی نہیں

مجھ کو کہنے دو کہ میں آج بھی جی سکتا ہوں
عشق ناکام سہی ـــــ زندگی ناکام نہیں

اُن کو اپنانے کی خواہش، انہیں پانے کی طلب
شوقِ بے کار سہی، سعیٔ غم انجام نہیں

وہی گیسو، وہی نظریں وہی عارض، وہی جسم
میں جو چاہوں تو مجھے اور بھی مل سکتے ہیں
وہ کنول جن کو کبھی ان کے لئے کِھلنا تھا
اُن کی نظروں سے بہت دور بھی کِھل سکتے ہیں

کل اور آج

کل بھی بوندیں برسی تھیں
کل بھی بادل چھائے تھے
اور کوی نے سوچا تھا

بادل یہ آکاش کے سپنے ان زلفوں کے سائے ہیں
دوشِ ہوا پر میخانے ہی میخانے گھر آئے ہیں
رُت بدلے گی پھول کھلیں گے جھونکے مدھ برسائیں گے
اُجلے اُجلے کھیتوں میں رنگیں آنچل لہرائیں گے
چرواہے بنسی کی دھن سے گیت فضا میں بوئیں گے
آموں کے جھنڈوں کے نیچے پردیسی دل کھوئیں گے
پینگ بڑھاتی گوری کے ماتھے سے کوندے لپکیں گے
جوہڑ کے ٹھہرے پانی میں تارے آنکھیں جھپکیں گے
اُلجھی اُلجھی راہوں میں وہ آنچل تھامے آئیں گے
دھرتی، پھول، آکاش، ستارے سپنا سا بن جائیں گے
کل بھی بوندیں برسی تھیں
کل بھی بادل چھائے تھے
اور کوی نے سوچا تھا

○

آج بھی بوندیں برسیں گی
آج بھی بادل چھائے ہیں
اور کوی اس سوچ میں ہے

بستی پر بادل چھائے ہیں، پر یہ بستی کس کی ہے؟
دھرتی پر امرت برسے گا لیکن یہ دھرتی کس کی ہے؟
ہل جوتے گی کھیتوں میں الہڑ ٹولی دہقانوں کی
دھرتی سے پھوٹے گی محنت فاقہ کش انسانوں کی
فصلیں کاٹ کے محنت کش غلّے کے ڈھیر لگائیں گے
جاگیروں کے مالک آکر، سب "پونجی" لے جائیں گے
بوڑھے دہقانوں کے گھر بنیے کی قرقی آئے گی
اور قرضے کے سود میں کوئی گوری بیچی جائے گی
آج بھی جنتا بھوکی ہے اور کل بھی جنتا ترسی تھی
آج بھی رم جھم برکھا ہوگی، کل بھی بارش برسی تھی
آج بھی بادل چھائے ہیں
آج بھی بوندیں برسیں گی
اور کوئی اس سوچ میں ہے

○

متاعِ غیر

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گذر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
میری راتوں کے مقدّر میں سحر ہے کہ نہیں

چار دن کی یہ رفاقت جو رفاقت بھی نہیں
عمر بھر کے لئے آزار ہوئی جاتی ہے
زندگی یوں تو ہمیشہ سے پریشان سی تھی
اب تو ہر سانس گرانبار ہوئی جاتی ہے

میری اُجڑی ہوئی نیندوں کے شبستانوں میں
تو کسی خواب کے پیکر کی طرح آئی ہے
کبھی اپنی سی، کبھی غیر نظر آئی ہے
کبھی اخلاص کی مورت، کبھی ہرجائی ہے

پیار پر بس تو نہیں ہے مرا لیکن پھر بھی
تو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں
تو نے خود اپنے تبسّم سے جگایا ہے جنہیں
اُن تمنّاؤں کا اظہار کروں یا نہ کروں

تو کسی اور کے دامن کی کلی ہے لیکن
میری راتیں تری خوشبو سے بسی رہتی ھیں

تو کہیں بھی ہو ترے پھول سے عارض کی قسم
تیری پلکیں، میری آنکھوں پہ جھکی رہتی ہیں

تیرے ہاتھوں کی حرارت، ترے سانسوں کی مہک
تیرتی رہتی ہے احساس کی پنہائی میں
ڈھونڈتی رہتی ہیں تخئیل کی باہیں تجھ کو
سرد راتوں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں

تیرا اندازِ کرم ایک حقیقت ہے مگر
یہ حقیقت بھی حقیقت میں فسانہ ہی نہ ہو
تیری مانوس نگاہوں کا یہ محتاط پیام
دل کے خوں کرنے کا اک اور بہانہ ہی نہ ہو

کون جانے مرے امروز کا فردا کیا ہے
قربتیں بڑھ کے پشیمان بھی ہو جاتی ہیں
دل کے دامن سے لپٹتی ہوئی رنگیں نظریں
دیکھتے دیکھتے انجان بھی ہو جاتی ہیں

میری درماندہ جوانی کی تمنّاؤں کے
مضمحل خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
تیرے دامن میں گلستاں بھی ہیں ویرانے بھی
میرا حاصل — مری تقدیر بتا دے مجھ کو

○

ایک تصویرِ رنگ

مَیں نے جس وقت تجھے پہلے پہل دیکھا تھا
تو جوانی کا کوئی خواب نظر آئی تھی
حُسن کا نغمۂ جاوید ہوئی تھی معلوم
عشق کا جذبۂ بے تاب نظر آئی تھی

اے طرب زارِ جوانی کی پریشان تتلی
تو بھی اِک بوئے گرفتار ہے معلوم نہ تھا
تیرے جلوؤں میں بہاریں نظر آتی تھیں مجھے
تو ستم خوردۂ ادبار ہے معلوم نہ تھا

تیرے نازک سے پروں پر یہ زروسیم کا بوجھ
تیری پرواز کو آزاد نہ ہونے دے گا
تو نے راحت کی تمنّا میں جو غم پالا ہے
وہ تری روح کو آباد نہ ہونے دے گا

تو نے سرمائے کی چھاؤں میں پنپنے کے لئے
اپنے دل، اپنی محبّت کا لہو بیچا ہے
دن کی تزئین فسردہ کا اثاثہ لے کر
شوخ راتوں کی مسرّت کا لہو بیچا ہے

زخم خوردہ ہیں تخیّل کی اُڑانیں تیری
تیرے گیتوں میں تری روح کے غم پلتے ہیں

مرمریں آنکھوں میں یوں حسرتیں لو دیتی ہیں
جیسے ویران مزاروں پہ دیئے جلتے ہیں

اِس سے کیا فائدہ رنگین لبادوں کے تلے
روح جلتی رہے، گھلتی رہے، پژمردہ رہے
ہونٹ ہنستے ہوں دکھاوے کے تبسّم کے لئے
دِل غمِ زیست سے بوجھل رہے آزردہ رہے

دل کی تسکیں بھی ہے آسائشِ ہستی کی دلیل
زندگی صرف زر و سیم کا پیمانہ نہیں
زیست احساس بھی ہے، شوق بھی ہے درد بھی ہے
صرف انفاس کی ترتیب کا افسانہ نہیں

عمر بھر رینگتے رہنے سے کہیں بہتر ہے
ایک لمحہ جو تری روح میں وسعت بھر دے
ایک لمحہ جو ترے گیت کو شوخی دے دے
ایک لمحہ، جو تری لے میں مسرّت بھر دے

اِسی دوراہے پر

اب نہ اِن اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا
میں نے اِک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی
اپنی نادار محبّت کی شکستوں کے طفیل
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی، جھنجھلائی تھی

اور یہ عہد کیا تھا کہ بہ ایں حالِ تباہ
اب کبھی پیار بھرے گیت نہیں گاؤں گا
کسی چلمن نے پکارا بھی تو بڑھ جاؤں گا
کوئی دروازہ کھُلا بھی تو پلٹ آؤں گا

پھر ترے کانپتے ہونٹوں کی فسوں کار ہنسی
جال بُننے لگی، بُنتی رہی، بُنتی ہی رہی
میں کھِنچا تجھ سے، مگر تو مری راہوں کے لئے
پھول چنتی رہی، چنتی رہی، چنتی ہی رہی

برف برسائی مرے ذہن و تصوّر نے مگر
دل میں اِک شعلۂ بے نام سا لہرا ہی گیا
تیری چپ چاپ نگاہوں کو سلگتے پا کر
میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

اپنی بدلی ہوئی نظروں کے تقاضے نہ چھپا
میں اِس انداز کا مفہوم سمجھ سکتا ہوں

تیرے زرکار دریچوں کی بلندی کی قسم
اپنے اقدام کا مقسوم سمجھ سکتا ہوں

اَب نہ اِن اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا
میں نے اِک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی
اسی سرمایہ و افلاس کے دوراہے پر
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی، جھنجھلائی تھی

میں نہیں تو کیا؟

مرے لئے یہ تکلف، یہ دکھ، یہ حسرت کیوں؟
مری نگاہِ طلب آخری نگاہ نہ تھی
حیات زارِ جہاں کی طویل راہوں میں
ہزار دیدۂ حیراں فسوں بکھیریں گے
ہزار چشمِ تمنّا بنے گی دستِ سوال
نکل کے خلوتِ غم سے نظر اُٹھاؤ تو
وہی شفق ہے، وہی ضو ہے، میں نہیں تو کیا؟

مرے بغیر بھی تم کامیاب عشرت تھیں
مرے بغیر بھی آباد تھے نشاط کدے
مرے بغیر بھی تم نے دیئے جلائے ہیں
مرے بغیر بھی دیکھا ہے ظلمتوں کا نزول
مرے نہ ہونے سے امّید کا زیاں کیوں ہو؟
بڑھی چلو مئے عشرت کے جام چھلکاتی
تمہاری سیج، تمہارے بدن کے پھولوں پر
اُسی بہار کا پرتو ہے، میں نہیں تو کیا؟

مرے لئے یہ اُداسی، یہ سوگ کیوں آخر؟
ملیح چہرے یہ گردِ فسردگی کیسی
بہارِ غازہ سے عارض کو تازگی بخشو
علیل آنکھوں میں کاجل لگاؤ رنگ بھرو
سیاہ جوڑے میں کلیوں کی کہکشاں گوندھو

ہزار ہانپتے سینے، ہزار کانپتے لب
تمہاری چشمِ توجہ کے منتظر ہیں ابھی
جلو میں نغمہ و رنگ و بہار و نور لئے
حیات گرمِ تگ و دو ہے، میں نہیں تو کیا؟

خودکشی سے پہلے

اُف یہ بے درد سیاہی یہ ہوا کے نوحے
کس کو معلوم ہے اس شب کی سحر ہو کہ نہ ہو
اِک نظر تیرے دریچے کی طرف دیکھ تو لوں
ڈوبتی آنکھوں میں پھر تابِ نظر ہو کہ نہ ہو

ابھی روشن ہیں ترے گرم شبستاں کے دیئے
نیلگوں پردوں سے چھنتی ہیں شعاعیں اب تک
اجنبی باہوں کے حلقے میں لچکتی ہوں گی
تیرے مہکے ہوئے بالوں کی ادائیں اب تک

سرد ہوتی ہوئی بتّی کے دھوئیں کے ہمراہ
ہاتھ پھیلائے بڑھے آتے ہیں بوجھل سائے
کون پونچھے مری آنکھوں کے سلگتے آنسو
کون، اُلجھے ہوئے بالوں کی گرہ سلجھائے

آہ! یہ غارِ ھلاکت، یہ دیئے کا محبس
عمر اپنی انہی تاریک مکانوں میں کٹی
زندگی فطرتِ بے حس کی پرانی تقصیر
اِک حقیقت تھی، مگر چند فسانوں میں کٹی

کتنی آسائشیں ہنستی رہیں ایوانوں میں
کتنے در میری جوانی پہ سدا بند رہے

کتنے ہاتھوں نے بُنا اطلس و کمخواب مگر
میرے ملبوس کی تقدیر میں پیوند رہے

ظلم سہتے ہوئے۔ انسانوں کے اس مقتل میں
کوئی فردا کے تصوّر سے کہاں تک بہلے
عمر بھر رینگتے رہنے کی سزا ہے جینا
ایک دو دن کی اذیّت ہو تو کوئی سہہ لے

وہی ظلمت ہے فضاؤں پہ ابھی تک طاری
جانے کب ختم ہو انساں کے لہو کی تقطیر
جانے کب نکھرے سیہ پوش فضا کا جوبن
جانے کب جاگے ستم خوردہ بشر کی تقدیر

ابھی روشن ہیں ترے گرم شبستاں کے دیئے
آج میں موت کے غاروں میں اتر جاؤں گا
اور دم توڑتی بتّی کے دھوئیں کے ہمراہ
سرحدِ مرگِ مسلسل سے گذر جاؤں گا

لہو نذر دے رہی ہے حیات

مرے جہاں میں سمن زار ڈھونڈنے والے
یہاں بہار نہیں آتشیں بگولے ھیں
دھنک کے رنگ نہیں۔ سرمئی فضاؤں میں
افق سے تابہ افق پھانسیوں کے جھولے ہیں
پھر ایک منزلِ خونبار کی طرف ہیں رواں
وہ رہ نما جو کئی بار راہ بھولے ہیں

بلند دعوئ جمہوریت کے پردے میں
فروغ محبس و زنداں ہے، تازیانے ہیں
بنام امن ہیں جنگ و جدل کے منصوبے
بہ شورِ عدل، تفاوت کے کارخانے ہیں
دلوں پہ خوف کے پہرے، لبوں پہ قفلِ سکوت
سروں پہ گرم سلاخوں کے شامیانے ہیں

مگر مٹے ہیں کہیں جبر اور تشدّد سے
وہ فلسفے کہ جلا دے گئے دماغوں کو
کوئی سپاہِ ستم پیشہ چُور کر نہ سکی
بشر کی جاگی ہوئی روح کے ایاغوں کو
قدم قدم پہ لہو نذر دے رہی ہے حیات
سپاہیوں سے اُلجھتے ہوئے چراغوں کو

رواں ہے قافلۂ ارتقائے انسانی
نظامِ آتش و آہن کا دل ہلائے ہوئے
بغاوتوں کے دہل بج رہے ہیں چار طرف
نکل رہے ہیں جواں مشعلیں جلائے ہوئے
تمام ارض جہاں کھولتا سمندر ہے
تمام کوہ بیاباں ہیں تلملائے ہوئے

مری صدا کو دبانا تو خیر ممکن ہے
مگر حیات کی للکار، کون روکے گا ؟
فصیلِ آتش و آہن بہت بلند سہی
بدلتے وقت کی رفتار کون روکے گا ؟
نئے خیال کی پرواز روکنے والو !
نئے عوام کی تلوار کون روکے گا ؟

پناہ لیتا ہے جن محبسوں کی تیرہ نظام
وہیں سے صبح کے لشکر نکلنے والے ہیں
ابھر رہے ہیں فضاؤں میں احمریں پرچم
کنارے مشرق و مغرب کے ملنے والے ہیں
ہزار برق گرے، لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں

○

بشرطِ استواری

خونِ جمہور میں بھیگے ہوئے پرچم لے کر
مجھ سے افراد کی شاہی نے وفا مانگی ہے
صبح کے نور پہ تعزیر لگانے کے لئے
شب کی سنگین سیاہی نے وفا مانگی ہے

اور یہ چاہا ہے کہ میں قافلۂ آدم کو
ٹوکنے والی نگاہوں کا مددگار بنوں
جس تصوّر سے چراغاں ہے سرِ جادۂ زیست
اس تصوّر کی ہزیمت کا گنہگار بنوں

ظلم پروردہ قوانین کے ایوانوں سے
بیڑیاں تکتی ہیں، زنجیر صدا دیتی ہے
طاقِ تادیب سے انصاف کے بُت گھورتے ہیں
مسندِ عدل سے شمشیر صدا دیتی ہے

لیکن اے عظمتِ انساں کے سنہرے خوابو!
میں کسی تاج کی سطوت کا پرستار نہیں
میرے افکار کا عنوانِ اُرادت تم ہو
میں تمہارا ہوں لٹیروں کا وفادار نہیں

سفر نصیب رفیقو! قدم بڑھائے چلو
پرانے راہ نما لوٹ کر نہ دیکھیں گے
طلوعِ صبح سے تاروں کی موت ہوتی ہے
شبوں کے راج دلارے اِدھر نہ دیکھیں گے

نیا سفر ہے پرانے چراغ گُل کردو

فریبِ جنتِ فردا کے جال ٹوٹ گئے
حیات اپنی امیدوں پہ شرمسار سی ہے
چمن میں جشنِ ورودِ بہار ہو بھی چکا
مگر نگاہِ گل و لالہ سوگوار سی ہے

فضا میں گرم بگولوں کا رقص جاری ہے
افق پہ خون کی مینا چھلک رہی ہے ابھی
کہاں کا مہرِ منوّر، کہاں کی تنویریں
کہ بام و در پہ سیاہی جھلک رہی ہے ابھی

فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابن آدم نے
خرد گنوا کے، جنوں آزما کے کیا پایا
وہی شکستِ تمنّا، وہی غمِ ایام
نگارِ زیست نے سب کچھ لٹا کے کیا پایا

بھٹک کے رہ گئیں نظریں خلا کی وسعت میں
حریم شاہدِ رعنا کا کچھ پتہ نہ ملا
طویل راہ گذر ختم ہو گئی لیکن
ہنوز اپنی مسافت کا منتہا نہ ملا

ایک شام

قمقموں کی زہر اُگلتی روشنی !
سنگ دل، پُرہول دیواروں کے سائے
آہنی بُت ، دیو پیکر اجنبی
چیختی، چنگھاڑتی خونیں سرائے
روح اُلجھی جا رہی ہے، کیا کروں ؟

چار جانب ارتعاشِ رنگ و نور
چار جانب اجنبی بانہوں کے جال
چار جانب خوں فشاں پرچم بلند
مَیں، مری غیرت، مرا دستِ سوال
زندگی شرما رہی ہے، کیا کروں ؟

کارگاہِ زیست کے ہر موڑ پر
روحِ چنگیزی براگندہ نقاب
تھام ! اے صبحِ جہانِ نو کی ضو
جاگ اے مستقبلِ انساں کے خواب
آس ڈوبی جا رہی ہے، کیا کروں ؟

○

تیری آواز

رات سنسان تھی، بوجھل تھیں فضا کی سانسیں
روح پر چھائے تھے بے نام غموں کے سائے
دل کو یہ ضد تھی کہ تو آئے تسلّی دینے
مری کوشش تھی کہ کمبخت کو نیند آ جائے

دیر تک آنکھوں میں چبھتی رہی تاروں کی چمک
دیر تک ذہن سلگتا رہا تنہائی ــــ میں
اپنے ٹھکرائے ہوئے دوست کی پُرسش کے لئے
تو نہ آئی، مگر اس رات کی پنہائی میں

یوں اچانک تری آواز کہیں سے آئی
جیسے پربت کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے
یا زمینوں کی محبّت میں تڑپ کر ناگاہ
آسمانوں سے کوئی شوخ ستارا ٹوٹے

شہد سا گھل گیا تلخابۂ تنہائی میں
رنگ سا پھیل گیا دل کے سیہ خانے میں
دیر تک یوں تری مستانہ صدائیں گونجیں
جس طرح پھول چٹکنے لگیں ویرانے میں

تو بہت دور کسی انجمنِ ناز میں تھی
پھر بھی محسوس کیا میں نے کہ تو آئی ہے

اور نغموں میں چھپا کر مرے کھوئے ہوئے خواب
میری روٹھی ہوئی نیندوں کو منا لائی ہے

رات کی سطح پہ اُبھرے ترے چہرے کے نقوش
وہی چپ چاپ سی آنکھیں وہی سادہ سی نظر
وہی ڈھلکا ہوا آنچل، وہی رفتار کا خم
وہی رہ رہ کے لچکتا ہوا نازک پیکر

تو مرے پاس نہ تھی، پھر بھی سحر ہونے تک
تیرا ہر سانس مرے جسم کو چھو کر گذرا
قطرہ قطرہ ترے دیدار کی شبنم ٹپکی
لمحہ لمحہ تری خوشبو سے معطّر گذرا

اب یہی ہے تجھے منظور تو اے جانِ قرار
میں تری راہ نہ دیکھوں گا سیہ راتوں میں
ڈھونڈ لیں گی مری ترسی ہوئی نظریں تجھ کو
نغمہ و شعر کی اُمڈی ہوئی برساتوں میں

اب ترا پیار ستائے گا تو میری ہستی
تری مستی بھری آواز میں ڈھل جائے گی
اور یہ روح، جو تیرے لئے بے چین سی ہے
گیت بن کر ترے ہونٹوں پہ مچل جائے گی

تیرے نغمات ترے حُسن کی ٹھنڈک لے کر
میرے تپتے ہوئے ماحول میں آجائیں گے
چند گھڑیوں کے لئے ہو کہ ہمیشہ کے لئے
میری جاگی ہوئی راتوں کو سُلا جائیں گے

خوبصورت موڑ

چلو اِک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

نہ مَیں تم سے کوئی امّید رکھوں دل نوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں میں
نہ ظاہر ہو تمہاری کشمکش کا راز نظروں سے

تمہیں بھی کوئی اُلجھن روکتی ہے پیش قدمی سے
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ جلوے پرائے ھیں
مرے ہمراہ بھی رسوائیاں ہیں میرے ماضی کی
تمہارے ساتھ بھی گذری ہوئی راتوں کے سائے ہیں

تعارف روگ ہو جائے تو اس کو بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھّا
وہ افسانہ جسے تکمیل تک لانا نہ ہو ممکن
اُسے اِک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھّا

چلو اِک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

ایک ملاقات

تری تڑپ سے نہ تڑپا تھا میرا دل لیکن
ترے سکون سے بے چین ہو گیا ہوں میں
یہ جان کر تجھے کیا جانے، کتنا غم پہنچے
کہ آج تیرے خیالوں میں کھو گیا ہوں میں

کسی کی ہو کے تو اس طرح میرے گھر آئی
کہ جیسے پھر کبھی آئے تو گھر ملے نہ ملے

نظر اٹھائی، مگر ایسی بے یقینی سے
کہ جس طرح کوئی پیشِ نظر ملے نہ ملے
تو مسکرائی، مگر مسکرا کے رک سی گئی
کہ مسکرانے سے غم کی خبر ملے نہ ملے
رکی تو ایسے کہ جیسے تری ریاضت کو
اب اِس ثمر سے زیادہ ثمر ملے نہ ملے
گئی تو سوگ میں ڈوبے قدم یہ کہہ کے گئے
سفر ہے شرط، شریکِ سفر ملے نہ ملے

تری تڑپ سے نہ تڑپا تھا میرا دل لیکن
ترے سکون سے بے چین ہو گیا ہوں میں
یہ جان کر تجھے کیا جانے، کتنا غم پہنچے
کہ آج تیرے خیالوں میں کھو گیا ہوں میں

ہم عصر

تو بھی کچھ پریشاں ہے
تو بھی کچھ سوچتی ہوگی
تیرے نام کی شہرت، تیرے کام کیا آئی

مَیں بھی کچھ پشیماں ہوں
میں بھی غور کرتا ہوں
میرے کام کی عظمت، میرے کام کیا آئی

تیرے خواب بھی سونے
میرے خواب بھی سونے
تیری میری شہرت سے
تیرے میرے غم دونے

تو بھی اِک سُلگتا بَن
میں بھی اِک سُلگتا بن
تیری قبر تیرا فن
میری قبر میرا فن

اب تجھے میں کیا دوں گا
اب مجھے تو کیا دے گی
تیری میری غفلت کو
زندگی سزا دے گی

تو بھی کچھ پریشاں ہے
تو بھی کچھ سوچتی ہوگی
تیرے نام کی شہرت، تیرے کام کیا آئی

مَیں بھی کچھ پشیماں ہوں
مَیں بھی غور کرتا ہوں
میرے کام کی عظمت، میرے کام کیا آئی

انتظار

چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

دُور وادی میں دودھیا بادل
جُھک کے پربت کو پیار کرتے ہیں
دل میں ناکام حسرتیں لے کر
ہم ترا انتظار کرتے ہیں

اِن بہاروں کے سائے میں آجا
پھر محبت جواں رہے نہ رہے
زندگی تیرے نامرادوں پر
کل تلک مہرباں رہے نہ رہے

روز کی طرح آج بھی تارے
صبح کی گرد میں نہ کھو جائیں
آ ترے غم میں جاگتی آنکھیں
کم سے کم ایک رات سو جائیں

چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

خون پھر
خون ہے
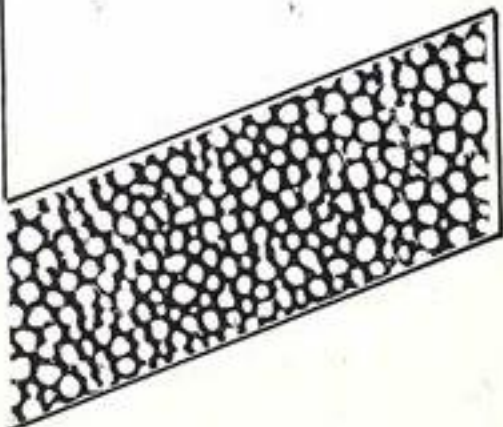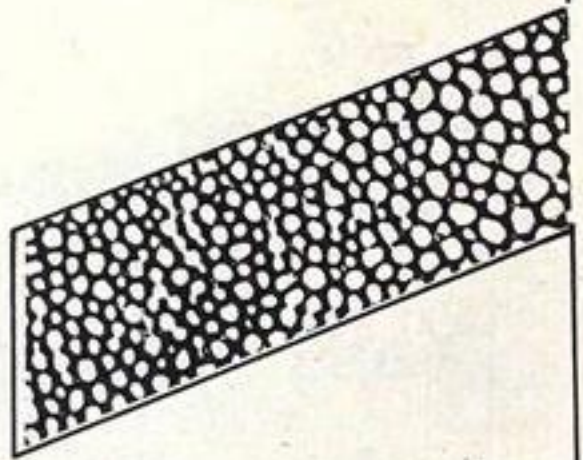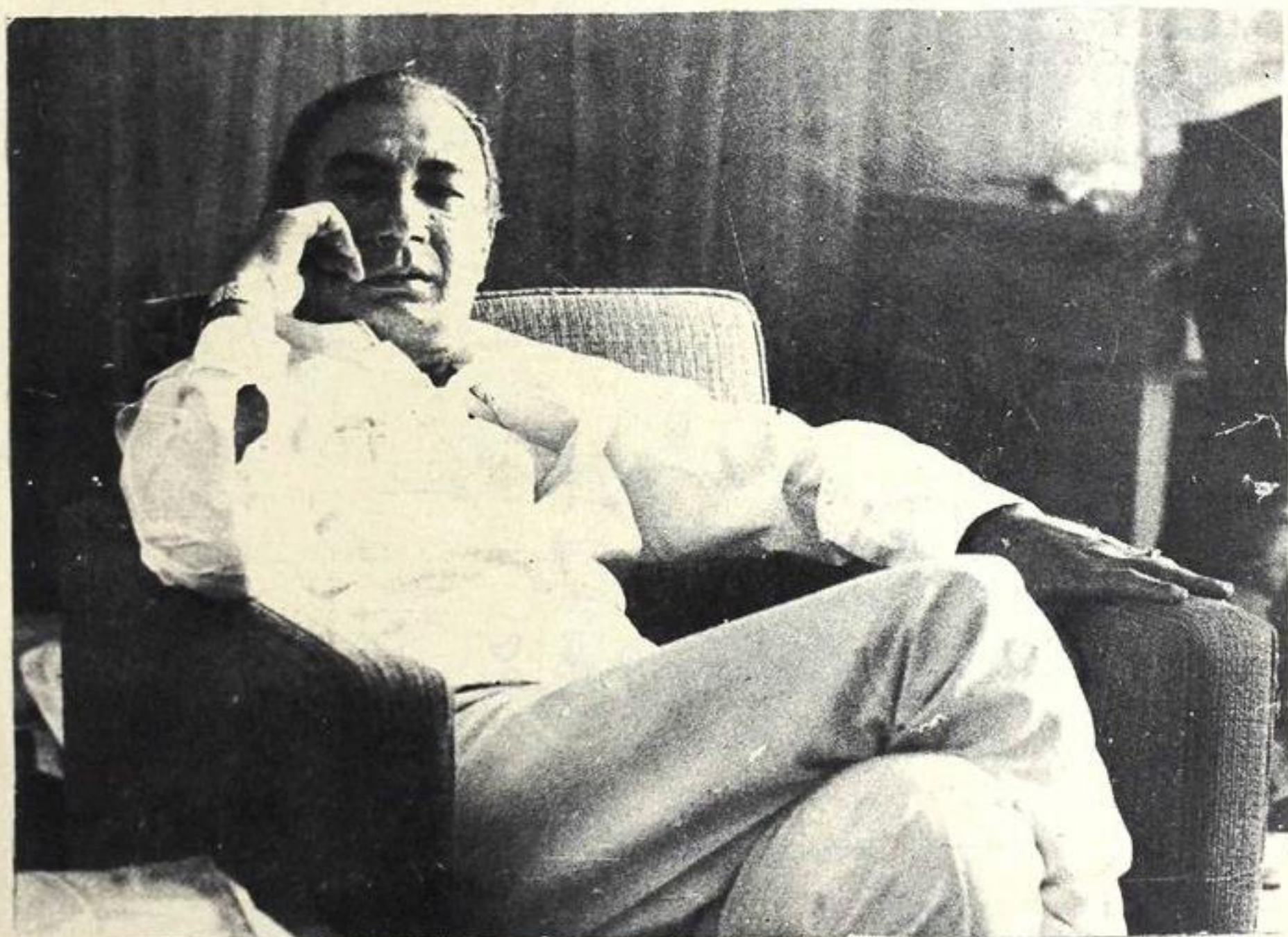
ساحر لدھیانوی ــــ ایک سچّا شاعر

پروفیسر نظیر صدیقی۔ اسلام آباد
(پاکستان)

ساحر لدھیانوی کی ساحری نے شاعری کی شکل اختیار کی اور ان کی شاعری میں ساحری کا عنصر کسی نہ کسی حد تک ہر جگہ موجود ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری خواہ سیاسی ہو یا فلمی، اس میں دلوں کو مس کرنے والے مصرعے ضرور ملتے ہیں۔

بظاہر یہ بات شاعرانہ یعنی مبالغہ آمیز معلوم ہوگی، لیکن صرف ان لوگوں کو جن کے نزدیک شاعری کا دوسرا نام مبالغہ ہے۔ شاعری مبالغہ بھی ہو سکتی ہے، ہوتی بھی ہے، لیکن اچھی شاعری مبالغہ آمیز ہونے کے باوجود صداقت سے خالی نہیں ہوتی۔ اور بہترین شاعری تو عین صداقت ہی ہوتی ہے۔

چونکہ ساحر صرف شاعر نہیں، ترقی پسند شاعر تھے اس لئے یہاں یہ سوال بھی ذہن میں انگڑائی لے رہا ہے کہ کیا مقصدی اور مبلّغانہ شاعری کا بھی صداقت سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ بلکہ ایسی شاعری کا شاعری سے بھی کوئی تعلق ہوتا ہے یا نہیں۔

اس سوال کے جواب کے لئے اگر اقبالؔ اور فیضؔ کی شاعری کے بہترین حصے پر نظر رکھی جائے تو جواب غالباً یہی ملے گا کہ مقصدی اور مبلّغانہ شاعری نہ صداقت سے بیگانہ ہوتی ہے نہ شاعری کے اعلیٰ معیار سے بے تعلق۔ لیکن اس بات کا دارومدار شاعر کی ہنرمندی پر ہے۔ اگر شاعر ہنرمند نہ ہو تو شاعری اور صداقت کا غیر شاعرانہ اظہار بن کر رہ جاتی ہے یا ترقی پسندوں اور اسلام پسندوں کی منظوم نعرہ بازی۔

ترقی پسند شعرا اپنی نعرہ بازی کے لئے خاصے بدنام رہے ہیں۔ لیکن ترقی پسندوں میں جو شعراء بدنام کم اور مقبول زیادہ ہوئے ان میں سرِ فہرست فیضؔ ہیں۔ اور فیضؔ کے بعد ـــــ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ـــــ مجازؔ اور ساحرؔ۔ یہ تینوں شاعر اپنی ترقی پسندی کے باوجود اچھے بلکہ بہت اچھے شاعر بننے میں ناکام نہیں رہے۔ فیضؔ اپنے شاعرانہ امکانات کے اعتبار سے جتنی کامیابی کے اہل تھے اتنے کامیاب شاعر بن چکے ہیں۔ البتہ مجازؔ اور ساحرؔ کی شاعرانہ کامیابیوں کے باوجود مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے سارے امکانات بروئے کار نہ آسکے۔

بہرحال ساحر شروع سے آخر تک ایک مقبول شاعر رہے۔ انہوں نے خاصی نوعمری میں اپنی نظم "تاج محل" کے ذریعہ متحدہ ہندوستان کے طول و عرض میں فوری شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ یاد رہے بات ہے کہ توجہ کو گرفتار کر لینے والے بعض عروض کے باوجود ساحر کی یہ نظم فنی نقائص سے مملو ہے اور نظریاتی اعتبار سے اس درجہ ناقص کہ پروفیسر ممتاز حسین کے پائے کے ترقی پسند نقاد نے اسے ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے کرنا ضروری جانا۔ لیکن آج بھی ساحر کا خوارسی نظم ہے۔ ساحر اسی نظم کے حوالے سے یاد آتے ہیں۔ ان کی نظم "پرچھائیاں" کی کتنی ہی تعریف کیوں نہ کی جائے۔ لیکن ان کی جو نظم عام پڑھے لکھے لوگوں کے دل و دماغ کا جزو بن چکی ہے وہ "تاج محل" ہی ہے۔ جس میں عوام کے لئے بڑی اپیل ہے۔ عام آدمی جب اس شعر کو گنگناتا ہے ؎

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

تو محسوس کرتا ہے کہ اس نے اپنی غربت کا انتقام لے لیا ہے۔ البتہ وہ یہ بات محسوس نہیں کر سکتا کہ شہنشاہی، جاگیرداری، سرمایہ داری یہ سب کچھ انسانیت کے حق میں لعنت سہی لیکن ان لعنتوں کے ادوار میں بھی انسان نے جو ثقافتی کارنامے انجام دیئے ہیں وہ احترام اور تحفظ کے مستحق ہیں۔ کسی شیکسپیئر یا غالب کو صرف اس لئے برا نہیں کہا جا سکتا کہ وہ غیر اشتراکی دور کے غیر اشتراکی شاعر تھے یا یہ کہ انہوں نے بادشاہوں کی شان میں قصیدے بھی لکھے تھے۔ سلطانیٔ جمہور کا زمانہ سر آنکھوں پر لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ جو نقش کہن نظر آئے اسے مٹا دیا جائے۔

جوش ملیح آبادی کہا کرتے تھے "نیا نیا مسلمان قصائی کی دکان"۔ کچھ ایسا ہی حال نئے نئے ترقی پسندوں کا تھا۔ انہیں نہ تو نوجوانی میں محبوبہ ملتی تھی نہ جوانی میں ملازمت۔ نتیجۃً ہر چیز سے برسرِ پیکار۔ انہوں نے ماضی کو یکسر مسترد کر دیا۔ اور حال کو سمجھے بغیر مستقبل کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں دوسری جنگ عظیم ان کا استقبال کرنے کے لئے کھڑی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے خطرات سے بال بال بچے تو ملک کی تقسیم اور آزادی کے ہاتھوں فسادات کے شکار ہونے لگے۔

فسادات پر نثر و نظم دونوں میں بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن ان میں سے بہت کم چیزیں زندہ رہ سکیں یا رہیں گی۔ خود ساحر نے بھی فسادات پر نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ فسادات پر لکھی جانے والی شاعری میں ساحر کی یہ غزل ؎

طرب زاروں پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گزری
دل مرحوم تیرے زندہ ارمانوں پہ کیا گزری

کامیاب ترین غزلوں میں سے ہے اور اس کے چھ شعروں میں سے ہر شعر جو زبان زد عام ہے۔ بہت ممکن ہے کل بھی زندہ رہے۔

اگرچہ ساحر نے نظمیں زیادہ کہیں۔ لیکن وہ اردو کے ان معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جو نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اور میرے ایک نظریئے کے مطابق نظم میں ان کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ وہ ایک کامیاب غزل گو تھے۔ یہ بات جس طرح اقبال اور فیض پر صادق آتی ہے اسی طرح ساحر پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ اردو شاعری کی روایت کا خاصہ یہی ہے کہ جو شخص اچھا غزل گو ہوگا وہ اچھا نظم نگار بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ اگر کوئی شخص اچھا نظم نگار ہے تو وہ اچھا غزل گو بھی ہو۔

جہاں ساحر کی نظم "تاج محل" اپنی فنی اور نظریاتی خامیوں کے باوجود زندہ رہنے کی صلاحیت کی حامل معلوم ہوتی ہے وہاں ان کی مذکورہ بالا غزل اپنی خوبیوں کے باعث زندہ رہے گی۔ اس غزل کی ردیف جو سوالیہ واقع ہوئی ہے۔ ہر شعر میں ایک چبھتا ہوا سوال اٹھا رہی ہے۔ اور ہر سوال کے الفاظ نہایت برجستہ ہیں۔ اتنے برجستہ کہ چھ شعر کی یہ غزل آسانی سے حافظے کا جزو بن جاتی ہے۔
ساحر کے کلام کی مقدار کچھ زیادہ نہیں لیکن ترقی پسند شاعروں میں فیض کے بعد غالباً وہ دوسرے شاعر ہیں جن کے زیادہ سے زیادہ مصرعے اور شعر زبان زد عام ہیں۔ اس معاملے میں اگر کوئی اور ترقی پسند شاعر ان کے قریب پہنچتا ہے تو وہ مجاز ہیں۔ فیض، ساحر اور مجاز کی شعریت اور غنائیت قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ ان تینوں کی شعریت اور غنائیت کے اجزائے ترکیبی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہاں اس بات پر اصرار ضروری ہے کہ ایک جملے یا ایک سانس میں ان تینوں شاعروں کے نام لینے کے یہ معنی نہیں کہ تینوں ہم رنگ اور ہم رتبہ ہیں۔ ان تینوں کی ایک اور مشترک خوبی یا خصوصیت یہ بھی ہے کہ تینوں کامیاب غزل گو بھی ہیں اور کامیاب نظم نگار بھی۔ نظم نگاری میں ان کی کامیابی کا راز بنیادی طور پر ان کے کامیاب غزل گو ہونے میں پوشیدہ ہے۔ ان تینوں کے ہاں quotable اور memorable مصرعے اور شعر جس قدر غزلوں میں ملتے ہیں اسی قدر نظموں میں بھی۔ ساحر نے اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ اثر فیض ہی سے قبول کیا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ ساحر پر پہلا اور آخری اثر فیض ہی کا ہے۔ غالباً یہ فیض ہی کا اثر ہے کہ انہوں نے اپنی زیادہ تر نظموں میں ایسے بند استعمال کئے ہیں جن کے دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ساحر کی نظموں میں فیض کی نظموں کا اختصار اور صفات کے استعمال میں بھی فیض کا انداز دیکھا جا سکتا ہے۔ ساحر نے بات کہنے کا direct اسلوب بھی فیض ہی سے لیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ فیض نے اپنے direct اسلوب پر قناعت نہیں کی کیونکہ وہ ہیئت اور اسلوب کے معاملے میں میراجی اور راشد سے کم سہی لیکن تجربہ پسند ضرور ہیں۔ یہ تجربہ پسندی ساحر کے ہاں اور بھی کم ہے۔ تقریباً نہ ہونے کے برابر۔ وہ یقیناً کوئی ambitious شاعر نہ تھے۔ وہ اپنے عہد کی زندگی میں انقلاب کے متمنی ضرور تھے لیکن وہ اپنے عہد کی شاعری میں کسی انقلاب کے لئے کوشاں نہ تھے۔ ان کی شاعری ایک دل زدہ اور دردمند انسان کی شاعری ہے۔ ان سے ان کی دل زدگی اور انسانی دردمندی نے جو کچھ کہلوایا انہوں نے کہا۔ ان کے اندر ایک شاعرانہ روح ضرور تھی جو اُن کی اور ان کے زمانے کی خطیبانہ شاعری کے باوجود آخر تک زندہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کئی اچھے شعر، ایک یادگار غزل اور ایک نہایت خوبصورت نظم[1] دے گئے۔ اس نظم کا عنوان 'خوبصورت موڑ' ہے۔ ذاتی طور پر میں اسے نہ صرف ساحر کی سب سے کامیاب نظم تصور کرتا ہوں بلکہ اسے اردو کی کامیاب ترین نظموں میں شمار کرتا ہوں۔ سنا ہے کہ یہ نظم کسی فلمی گیت کے طور پر بھی استعمال کی گئی ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس سے اس نظم کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آ سکتی۔ اگر دنیا کے بڑے ناولوں اور ڈراموں پر فلمیں بننے سے ان ناولوں اور ڈراموں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو کسی فلم میں ساحر کی اس نظم کے گائے جانے سے اس نظم کو کیوں کر نقصان پہنچ سکتا ہے۔

---

[1] چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

ساحر کی شہرت "تاج محل" سے وابستہ سہی لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی حیات ابدی کا دار ومدار "خوب صورت موڑ" پر رہے گا۔ اتنی مختصر، اتنی مکمل، اتنی حسین اور اتنی بلیغ نظم اردو میں بہت کم لکھی گئی ہے۔ اس میں جو بات جتنی سچائی سے کہی گئی ہے۔ سچائی کو تلخ یا ترش بنائے بغیر —— وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔

ساحر یقیناً ایک سچے شاعر تھے —— ایک ایسے شاعر جسے سچائی کو شاعری کے سانچے میں ڈھالنے کا ہنر آتا تھا۔ اُن کے کلام کی گرفت صرف پڑھنے والوں پر نہیں لکھنے والوں پر بھی رہی ہے۔ بعض اوقات ان کا اثر وہاں بھی نظر آتا ہے جہاں اس کے ہونے کا کوئی ظاہری امکان بھی نہیں ہوتا۔ ★

○

زندگی کو بے نیازِ آرزو کرنا پڑا
آہ! کن آنکھوں سے انجامِ تمنا دیکھئے

(ساحر)

میرا ہمعصر میرا ساتھی

کیفی اعظمی

آج کل فلمی دنیا پر جتنے خطرات منڈلا رہے ہیں، ان میں ساحر لدھیانوی سب سے شدید ہیں معلوم نہیں گیت لکھتے لکھتے وہ کس وقت پروڈیوسر اور ڈائرکٹر ہو جائیں۔ اُن کا یہ رجحان خاص بمبئی کی پیداوار ہے۔ جب میں پہلی بار ان سے ملا تھا، اس وقت وہ شاعر تھے اور غالباً جب آخری بار ملوں گا اُس وقت بھی وہ شاعر ہی رہیں گے، اس لئے نہیں کہ اُن کی صلاحیتیں شاعری تک محدود ہیں مگر ان کو کیا کہ ڈائرکٹری، پروڈیوسری یا اس نوع کے کسی شعبے میں اتنی قوت نہیں کہ وہ ساحر کو مستقلاً زیر کر سکے۔

درمیانی طبقے کے عام "اسکیم باز" نوجوانوں کی طرح ساحر بھی کسی نقطہ پر نہیں ٹھہر سکتے، چلتے رہنا، چلتے ہی رہنا اُن کا مقدر ہے، وہ بھی سیدھے خطِ پر نہیں، کاوا کاٹتے ہوئے طالب علمی ہی کے زمانے سے زندگی کی تلخ حقیقتیں اُنکا پیچھا کر رہی ہیں، وہ بھاگنا نہیں چاہتے۔ مگر بھاگ رہے ہیں۔ اُنکے سامنے ایک وسیع میدان ہے، ایک روشن منزل ہے۔ مگر دو فرلانگ لانبی سڑک" کیسے طے کی جائے جس پر ساحر کے جانے پہچانے ہزاروں نوجوان اپنے کاندھوں پر اپنا بوجھ لئے ٹہل رہے ہیں، گھوم رہے ہیں، دوڑ رہے ہیں، اُنکی رفتار کا دائرہ روز بروز سمٹ رہا ہے اور وہ اپنے ہی چکر میں پھنسے جا رہے ہیں۔

کالج میں طلباء کی تنظیم سے ساحر کی جو عملی وابستگی تھی وہ کالج سے نکلتے ہی ہمدردی سے بدل گئی اور زندگی کی ان مجبوریوں نے اُن کو پوری طرح دبوچ لیا جو کسی کو مات دیتی ہیں، کسی سے مات کھاتی جاتی ہیں۔

زندگی کیسے گذاری جائے، یہ ایک بار سبھی کو سوچنا پڑتا ہے۔ مگر ہمارے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کا مسئلہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے، اُن کے سامنے بیک وقت دو سوال آئے ہیں، زندہ کیسے رہا جائے؟ اور اپنے رجحانوں کو پروان کیسے چڑھایا جایائے؟ بیکاری میں زندگی مشکل ہے، کلرکی میں رجحانوں کا پنپنا ناممکن۔

ساحر نے اپنی نظموں کا مجموعہ مرتب کیا اور اس کو فروخت کرنے نکلے، شاید اس موقع پر ان کے ذہن میں تصنیف و تالیف کے سہارے جی لینے کا منصوبہ ہو۔ لیکن جب ایجنٹوں کو ۲۵ اور ۳۳ فیصد کمیشن اور مصنفوں کو ۱۲ یا ۱۵ فیصد رائلٹی ملتی ہو تو سوچنا

پڑتا ہے کہ کتاب لکھی جائے یا کتاب بیچی جائے۔

ساحر کو ایک مشکل اور پیش آئی ہوگی کہ ان کی کتاب خریدے کون؟ چھاپے کون؟ وہ لاکھ ہونہار شاعر سہی مگر اتنے مشہور کہاں تھے جس سے ہمارے ناشر صاحبان متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کی بازار میں اتنی مانگ کہاں تھی کہ خادمانِ زبان و ادب خاطر خواہ نفع کما سکیں۔ پریت لڑی نے بڑا حوصلہ کیا کہ کتاب چھاپ دی۔

یہ ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے، اس سے پہلے میں م۔ حسن لطیفی کے علاوہ لدھیانہ کے کسی شاعر کو نہیں جانتا تھا جب "تلخیاں" کی جلد قومی جنگ (نیا زمانہ بمبئی) میں تبصرے کیلئے آئی اور میں نے اُس کا مطالعہ کیا تو خوشی بھی ہوئی، حیرت بھی، خوشی اس امر کی کہ ساحر کی شاعری اس اُلجھاؤ، ابہام اور بے روح لذتیت سے پاک تھی، جس کو جنگ کے زمانہ میں نوجوان شعراء نے اپنا فن بنا لیا تھا۔ اور حیرت یہ ہوئی کہ ایسا ہونہار شاعر اب تک کہاں چھپا ہوا تھا؟

میں نے ارادہ کیا کہ ساحر کو خط لکھوں گا اور مبارک باد دوں گا لیکن نہ خط لکھ سکا نہ مبارک باد دے سکا۔ خط تو کاہلی کے کی وجہ سے نہیں لکھا مبارک باد ڈر کے مارے نہیں دے سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں ایک شاعر نے جو لیڈر بھی بننا چاہتے تھے مجھے اسی حرکت پر بُری طرح پھٹکارا تھا۔ میں نہ تو اچھی طرح ان کے منصوبوں سے واقف تھا نہ عقاید سے صرف صاحب سلامت تھی۔ ایک دن سرِ راہ ملاقات ہوگئی، لا کے نتائج آچکے تھے اور انھوں نے کامیابی حاصل کرلی تھی۔ میں نے مزاج پرسی کے بعد اس کامیابی پر مبارک باد دیدی اور وہ بھڑک گئے۔ "مجھے آپ کی مبارک باد نہیں چاہیئے"، میں سمجھا کہ شاید مجھ سے سہو ہوا یہ کامیاب نہیں ہوئے اور میری مبارک باد کو طنز سمجھ رہے ہیں ان کے متعلق ایسا سوچنا قرینِ قیاس بھی تھا۔ میں معذرت کرنے لگا کہ معاف فرمائیے گا۔ میں نے سنا ہی تھا کہ آپ کامیاب ہوگئے ہیں۔

اب انھوں نے سینے سے لپٹی ہوئی چادر کی سلوٹیں دور کیں اور کھدر کی ٹوپی ماتھے پر کچھ اور کج کر کے تقریر کرنے لگے۔ "سنا آپ نے صحیح ہے، مگر نہ تو آپ کی تہنیت میں کوئی خلوص اور نہ مجھے اتنی فرصت کہ رسمی مبارکبادیں لیتا پھروں، کل ہی ناگ پور سے ایک کانفرنس کی صدارت کرکے پلٹا ہوں، وہاں بھی ہزاروں آدمی مبارک باد دینا چاہتے تھے مگر میں نے سب کو روک دیا، مجھے یقین ہے ہے کہ جب تک ہندستان آزاد نہیں ہوگا اس وقت تک ہم کو وقت کی قدر ہوگی نہ ہم رواج سے چھٹکارا پائیں گے۔

وہ بے تکان بول رہے تھے اور میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کس مصیبت میں پھنس گیا۔ اتنے میں کاندھے پر سے ان کی چادر ڈھلک گئی اور موقعہ مل گیا۔ "یہ تو سچ ہے کہ میری نیت میں خلوص ولوص نہیں تھا میں خلوص کے بیجا استعمال کا قائل بھی نہیں ہوں آپ کو مبارک باد اس لئے دی تھی کہ شاید ہندوستان کی آزادی کے بعد آپ سے کوئی غرض وابستہ ہوجائے۔ اگر مصلحت اندیشی کو آپ رواج پرستی سمجھتے ہیں تو خدا حافظ"۔

انہیں دنوں کسی رسالے میں شورش کاشمیری وغیرہ کے ساتھ ساحر کی ایک تصویر شائع ہوئی تھی اس میں یہ حضرت بھی کافی طرحدار معلوم ہوتے تھے میں نے سوچا مبارک باد بھیج کے کون خطرہ مول لے۔ لیکن جب ان کی دو تین نظمیں قومی جنگ میں چھپنے کے لئے آئیں تو ایک گونہ قربت سی محسوس ہونے لگی اور ملنے کا اشتیاق پیدا ہوگیا۔ ملاقات ہو کیسے؟ میں بمبئی میں وہ لاہور میں۔ مگر یقین تھا کہ کسی نہ کسی حیثیت سے ایک دن ان کو بمبئی آنا ہی پڑے گا۔

بمبئی ہمارے ملک کا سب سے بڑا صنعتی مرکز ہے، اس لئے ادبی مرکز بھی روٹی اور ادب کا تعلق یہاں بہت واضح ہے۔ یادش بخیر دلّی اور لکھنؤ کی مرکزیت مسلّم۔ مگر ہر شخص کے سامنے آج سب سے پہلے مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ ؎

ہم نے مانا کہ دلّی میں رہیں۔ کھائیں گے کیا؟

اس کھائیں گے کیا؟ کو قحط غم الفت کے پردے میں کب تک چھپایا جا سکتا ہے آج اردو کے اکثر نامور ادیب اور شاعر شمالی ہند سے آ کر بمبئی میں براجمان ہیں۔ میر کی طرح بعض کو یہاں ہر وقت اپنی زبان کے بگڑ جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے مگر غذائی زنجیریں ڈھیلی نہیں پڑتی۔ وہ ادب اور آرٹ کی تخلیق کے لئے ہر خارجی تقاضے کو برا سمجھتے ہیں۔ مگر فلم پروڈیوسروں کی تحکم آمیز فرمائشیں کون ٹال سکتا ہے۔

نگاہ ملتے ہی چیتون کڑی نہیں رہتی
بڑوں کی بات بھی اس جا بڑی نہیں رہتی　　(آرزو)

اور ساحر کو بھی بمبئی آنا پڑا۔

ساحر سے میری پہلی ملاقات حیدرآباد کے اسٹیشن پر ہوئی، وہاں انجمن ترقی پسند مُصنّفین کی کانفرنس تھی اور بمبئی سے ایک اچھا خاصہ قافلہ روانہ ہوا تھا، اسی قافلہ میں میں بھی تھا جب ہم لوگ حیدرآباد اسٹیشن پر اُترے تو کلیم اللہ نے خبر دی کہ دوسری ٹرین سے جو پانچ منٹ میں آنے والی ہے، ساحر آ رہے ہیں۔ میں کانفرنس کے رضاکاروں کے ساتھ ساحر کے استقبال کے لئے وہیں ٹھہر گیا ٹرین آئی اور ساحر لڑھکتے لڑھکتے ہوئے ڈبّے میں سے پلیٹ فارم پر آ رہے۔ ساڑھے پانچ فٹ کا قد، جو کسی طرح سیدھا کیا جا سکے تو چھ فٹ ہو جائے، لانبی لانبی لچکیلی ٹانگیں، پتلی سی کمر، چوڑا سینہ، چہرہ پر چیچک کے داغ، سرکش ناک، خوبصورت آنکھیں، آنکھوں میں جھینپا جھینپا سا تفکر، بڑے بڑے بال، لچلچی چال، جسم پر قمیص، پتلون منڈھی ہوئی اور ہاتھ میں سگریٹ کا ٹن۔

میں نے بڑی بیتابی سے بڑھ کر اپنا نام بتایا اور ساحر دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھ پر ڈھے پڑے، میں خود بھی مصافحے سے بغلگیری میں زیادہ کیف پاتا ہوں مگر اس وقت کچھ گھبرا سا گیا کہ بیچارے کو کہیں چکر تو نہیں آ گیا ہے، کچھ طبیعت تو خراب نہیں ہے، مزاج پُرسی کرنے ہی والا تھا کہ انہوں نے بغیر کچھ کہے ہوئے سگریٹ کا ٹن میری طرف بڑھا دیا اور میں نے محسوس کیا کہ اب اُن سے کچھ ان کے متعلق کہنا پوچھنا اس بے تحاشہ خلوص کی توہین ہے لیکن خاموشی تو توڑنی ہی تھی، میں نے پوچھا "بھئی قاسمی صاحب کیوں نہیں آئے؟" اور وہ دو لفظوں میں جواب دے کے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھے اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔

ہم لوگ وہاں چل کر جھرتی ناکے (چنگی) پہونچے۔ یہاں ہمارے بکس کھلوا گئے۔ بستر ٹٹولے گئے۔ "تخلصات" رجسٹر میں درج ہوئے اس اثنا میں فراق صاحب جو ہماری ہی گاڑی میں تھے اور ساحر دونوں کی سراسیمگی اس قدر قابل رحم تھی کہ خود جھرتی ناکے کے ایک کارندے نے بڑھ کر فراق صاحب کو تسلّی دی، "مولی صاحب یہ ہماری ریاست کا قاعدہ ہے آپ گھبراؤ نہیں"۔ یہیں میں نے پہلی بار ساحر کی ہنسی دیکھی۔ وہ نہ مسکراتے ہیں نہ قہقہہ لگاتے ہیں بلکہ ان کو ہنسی کا اچھو ہوتا ہے اور اس اچھو کے ساتھ ہی شرم کی بھی ایسی لہر آتی ہے کہ آس پاس والے بھی غرق ہو جائیں۔

جائے قیام پر پہونچ کر فراق صاحب اپنا کلام سنانے میں اور کچھ لوگ نہانے دھونے میں مصروف ہو گئے ہم دونوں اس کمرے میں جاکر فرش پر لیٹ گئے جہاں مہمانوں کا سامان رکھوایا گیا تھا۔

ان دونوں قومی جنگ کے ادارے میں ایک رفیق کی ضرورت تھی اور میں وہاں ساحر کو کھینچنا چاہتا تھا مگر اپنا ارادہ ظاہر کرنے سے پہلے ان کے مسائل، ان کے مشاغل اور منصوبوں سے واقف ہونا ضروری تھا، حالانکہ درمیانی طبقے کے کسی نوجوان کی زندگی دیکھ لیجیے۔ آپ اس کو اپنی زندگی سے زیادہ مختلف نہ پائیں گے۔

ساحر کی سرگذشت کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں نکلی۔ لدھیانہ کے ایک جاگیردار کے چشم و چراغ، ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کر کے جب کالج میں پہونچے تو دوسری عظیم جنگ چھڑ گئی۔ کالج سے باہر نکلے تو ضرورت کی تمام چیزیں چور بازار پہونچ چکی تھیں اور ہندوستان کے پوربی حصے میں اتنا بڑا کال پڑا کہ تیس لاکھ انسان ایڑیاں رگڑ کے مر گئے۔ ان حالات میں زندگی جو شکل قبول کرتی ہے وہ ہمارے لئے اجنبی نہیں۔ مگر ساحر کی داستان میں ایک نیا باب بھی ہے۔

ساحر کے والد بزرگوار نے کئی شادیاں کی تھیں۔ ساحر ابھی کمسن ہی تھے کہ ان کی ماں اور والد کے تعلقات خراب ہو گئے اور نئی نزاع پیدا ہو گئی کہ ساحر کس کے پاس رہیں؟ جاگیردار باپ کو ایک ولی عہد کی ضرورت تھی اور تعلقات سے ساحر کے علاوہ اُن کی کوئی دوسری اولاد نہیں تھی، اس لئے انہوں نے گھر کا جھگڑا کورٹ میں پہونچا دیا۔ ساحر مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئے اور انہوں نے ماں کے پاس رہنے کی خواہش ظاہر کی، اب ساحر کے والد کو اُن سے کیا دلچسپی رہ سکتی تھی، "خون اور روح کے رشتے" روز بروز جھول کھاتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ساحر نے جب پڑھنا شروع کیا تو ان کے والد نے اپنی بڑی توہین محسوس کی کہ اتنے بڑے جاگیردار کا بیٹا اسکول کیوں جاتا ہے اور اُنہوں نے جب یہ سُنا کہ ان کا ولی عہد شاعر ہو گیا ہے اور شعر کہتا ہے تو غصہ نفرت میں بدل گیا۔ لیکن جب یہ خبر ملی کہ لدھیانہ کا مجسٹریٹ ساحر کی شاعری پسند کرتا ہے اور اپنی موٹر بھیج کے اُن کو بلواتا ہے تو ایک بار پدرانہ محبت پھر جاگ اٹھی اور اُنھوں نے اِدھر اُدھر کہنا شروع کیا۔

"میرا بیٹا شاعر ہو گیا ہے وہ مجسٹریٹ صاحب کے بنگلے میں چلا جاتا ہے۔"

مگر عبدالحئی صاحب باپ کی دولت سے فیضیاب پھر بھی نہ ہو سکے۔ انکی تعلیم ماں اور ماموں نے دلوائی۔ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد زندہ رہنے کے لئے اپنے فن، اپنی شاعری اپنے احساس کو چاندی کے ترازو میں تلوانا پڑا۔

ساحر قومی جنگ کے ادارے میں بڑی خوشی سے آنے کو تیار تھے۔ مگر ضعیف ماں کو کس پر چھوڑتے۔ مجبوراً صرف بمبئی کی تفریح کا پروگرام بن سکا۔

یہاں تفریح کے ہزاروں سامان اور ہزاروں مقامات ہیں۔ لیکن وہ شہر کے کس حصے میں ہیں اور وہاں پہونچا کیسے جائے میں اسی فکر میں تھا کہ ساحر نے میری مشکل ایسی فرمائش سے آسان کر دی کہ میں یہاں مزدور بستیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان بستیوں جانا اور ساحر کو لے جانا میرے لئے کوئی مشکل مرحلہ نہیں تھا۔

قومی جنگ کے ذریعے بمبئی کے مزدور ساحر کے نام سے واقف ہو چکے تھے۔ جب مدن پورہ کے نوجوانوں کو ان کے آنے

کی خبر ملی تو ان میں سے بعض ساتھی پارٹی آفس آئے اور ساحر کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دے گئے۔

مدن پورہ بمبئی کے محنت کش مسلمانوں کا علاقہ ہے، اس علاقے کے جنگ جو مزدوروں کا سیاسی، سماجی، معاشی اور طبقاتی شعور بہت بیدار ہے وہ سُرخ جھنڈے کی رہنمائی میں سرمایہ داروں سے بار ہا ٹکرا چکے ہیں، انھوں نے قومی تحریک کو بھی اپنا خون دیا، ٹریڈ یونین تحریک کو بھی اور ترقی پسند ادب کی تحریک میں بھی حصّہ لے رہے۔

وہ جان گئے ہیں کہ بالادست طبقے نے اُن سے ذرائع پیداوار کے ساتھ ساتھ نظیر اور پریم چند کو بھی چھین لیا ہے اسی لئے ان کی جدوجہد مہنگائی بھتے اور بونس تک محدود نہیں وہ تہذیب و تمدن کا غصب شدہ سرمایہ بھی واپس مانگ رہے ہیں۔ نوجوان پارٹی کے نام سے انہوں نے اپنی ایک انجمن بنائی ہے۔ اس انجمن کی اپنی ایک لائبریری، مطالعہ گھر ہے، ہر سال ایک بڑا مشاعرہ بھی ہوتا ہے جس میں مزدور شعرا کے مولانا حسرتؔ موہانی، جگرؔ مرادآبادی۔ ساغرؔ نظامی، مجازؔ، مخدومؔ، مجروحؔ، نظرؔ حیدرآبادی، شاہد صدیقی اور سردارؔ جعفری ایسے نامور شعرا بھی برابر شریک ہوتے رہے ہیں۔

میں ساحرؔ کو لے کر مقررہ وقت پر مدن پورہ پہونچا۔ بیس پچیس نوجوان ایک گلی میں ٹاٹ بچھائے بیٹھے تھے، ساحرؔ کے لئے اسی ٹاٹ پر انھوں نے توشک اور توشک پر سفید چادر بچھا رکھی تھی، ساحرؔ کو دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گئے۔ ان کے مسکراتے ہوئے چہرے کہہ رہے تھے۔ ساحرؔ صاحب آیئے اب تک آپ جن مجلسوں میں تھے ہم وہاں نہیں پہنچ سکے، ہم وہاں آنا چاہتے بھی نہیں۔ اس لئے ہم نے خود آپ کو بلوالیا اس تنگ و تاریک بستی میں آپ کا تو دم تو نہیں گھٹتا۔ یہاں کارپوریشن کے کارندے کبھی نہیں آتے لیکن پولیس روز آتی ہے، یہاں قومی رہنما صرف الکشن کے موقعے پر آتے ہیں لیکن وبائیں ہر موسم میں آتی ہیں۔ مگر آپ نہ جھجکئے آپ یہاں پائیں گے بہت کچھ، کھوئیں گے کچھ نہیں، ہم آپ کو اپنا آلۂ تفریح نہیں بنائیں گے ہم محنت کش ہیں، ہم مزدور ہیں۔

اور میں نے محسوس کیا کہ ساحرؔ کسی سوچ میں پڑ گئے۔ ہمارا بڑے سے بڑا ادیب جب مزدوروں کے کسی جلسے میں پہونچتا ہے تو اُن کو پسینہ آجاتا ہے کون ہے جس نے یہ نہ سوچا ہو کہ میرے فن میں وہ صداقتیں کہاں جو زندگی میں ہیں، میرے آرٹ میں وہ تنومندی کہاں جس کو محنت جنم دیتی ہے۔ میرے تصور میں وہ خلوص کہاں جو جدوجہد سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک بار فکر و تخیل کی پر شکوہ مگر کھوکھلی تعمیر زمین پر آرہتی ہے۔ کچھ لوگ مزدوروں کو نافہم کہہ کر پھر اپنی انانیت کو فریب دیدیتے ہیں۔ کچھ لوگ آئندہ اپنے فن کو نیا روپ دینے کی نیت باندھ لیتے ہیں۔

مگر ساحرؔ کا معاملہ کچھ اور ہی تھا غالباً اُس وقت ان کو شعر و سخن کی وہ مجلسیں یاد آرہی تھیں جو کسی بڑے خوبصورت ڈرائنگ روم میں منعقد ہوتی ہیں جواب آور صوفے، ریشمی قالین، بے داغ دیواروں پر آویزاں نیم برہنہ تصویریں، شیشے کی الماریوں میں محبوس اقبالؔ اور ٹیگور کی روحیں، پینے کے لئے بہترین شربت، بہترین چائے، بہترین سگرٹیں، کھانے کے لئے بہترین کیک، بہترین پیسٹری، بہترین پھل ______________ مگر زندگی ______________

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

میں نے لوگوں سے ساحرؔ کا تعارف کرایا اور انھوں نے اپنی نظمیں سنانا شروع کیں "مجھے سوچنے دے"، "وہ چکلے"

"تاج محل"، "شاعِ فردا"، "بنگال"، "طلوعِ اشتراکیت"، "اجنبی محافظ"، "احساسِ کامراں"، ایک کے بعد دوسری نظم پڑھی جارہی تھی اور نوجوان مزدور خوش تھے، وہ اپنی زبان، اپنی نظر، اپنے چہرے اور اپنی تمام حرکات سے ساحر کو داد دے رہے تھے۔

دو تین گھنٹے کی نشست کے بعد جب ہم لوگ واپس ہوئے، تو ساحر گنگنا رہے تھے۔

احساس بڑھ رہا ہے حقوقِ حیات کا

پیدائشی حقوقِ ستم پروری کی خیر

انساں الٹ رہا ہے رخِ زیست سے نقاب

مذہب کے اہتمامِ فسوں پروری کی خیر

رات کو سونے سے پہلے مجھ کو ساحر نے اور میں نے ساحر کو یاد دلایا کہ صبح بریل چلنا ہے پہلے پارٹی آفس میں رفیقوں سے ملیں گے اور گھات لگ گئی تو کوئی کارخانہ بھی دیکھ لیں گے مگر ساحر کی صبح حسبِ دستور ۱۲ بجے دن کو ہوئی اور وہ خدا خدا کر کے بیدار ہوئے ان کے سو کے اٹھنے کی ادا عجیب و غریب ہے، ایک سیلی انگڑائی لینے کے بعد گھٹنے سمیٹ کر پنجوں کے بل بستر پر بیٹھ جاتے ہیں، الجھے الجھے بال، سرخ سرخ آنکھیں اور آنکھوں میں یہ تنبیہ کہ "و کسی نے چھیڑا تو پھر سو جاؤں گا"۔

بیس پچیس منٹ تک اسی انداز سے بیٹھے چپ چاپ کسی ایک طرف دیکھتے رہتے ہیں، اس کے اٹھنا شروع کرتے ہیں، پہلے کمرے سے اوپر کا حصہ سیدھا ہوتا ہے۔ پھر گھٹنوں، اور گھٹنوں کے بعد پنڈلیوں پر دباؤ پڑتا ہے اور اس طرح وہ تین قسطوں میں اٹھ جاتے ہیں۔

دوسرے دن ہم لوگ کامریڈ امتیاز خاں کے ساتھ گھاٹ مزدوروں سے ملنے گئے، اتفاق سے وہ بھرتی کا دن تھا اور ہزاروں مزدور دھوپ میں قطار باندھے کھڑے تھے، ان میں گوانی بھی تھے، پنجابی بھی اور پٹھان بھی اکثر سالا سارا دن یونہی گذر جاتا ہے اور بھرتی نہیں ہوتی، بھرتی ہو بھی تو کام مل جانا یقینی نہیں۔ دلال آتا ہے پورے ہجوم میں سے چند فربہ اور تندرست نوجوانوں کو ٹھونک بجا کر چن لے جاتا ہے، اس سے خاطر خواہ رشوت لیتا ہے پھر وہ گھاٹ سارنگوں کے سامنے کھڑے کئے جاتے ہیں۔ جو خوش قسمت وہاں بھی انتخاب میں آتے ہیں اُن کو گھاٹ سارنگوں کی مٹھیاں گرم کرنا پڑتی ہیں۔ اس کے بعد گھاٹ ہے سمندر ہے، جہاز ہے اور اعضا شکن مشقت، مگر حقوق کچھ نہیں۔

اس اندھیر نگری میں پہلی بار امتیاز مرحوم لال جھنڈا لے کر پہونچے تھے اور مزدوروں کو منظم کر رہے تھے۔ ہم لوگ تقریباً چار گھنٹے مزدوروں کی کس مپرسی، تباہ حالی اور لوٹ گھسوٹ کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے اور گھاٹ سارنگوں، دلالوں کی خونی نظریں امتیاز کا تعاقب کرتی رہیں، وہ امتیاز کے خون کے پیاسے تھے انہوں نے ایک دن امتیاز کا خون پی بھی لیا۔

ساحر اس دن بہت متاثر تھے، ان کی آنکھوں سے، چہرے سے، سکوت سے، دلالوں، گھاٹ سارنگوں اور ان انسانیت سوز نظام کے لئے نفرت برس رہی تھی، ایسے موقع پر وہ عموماً کچھ دیر کے لئے خاموش ہو جاتے ہیں پھر اچانک، سماجی پس منظر، معاشی تعلقات اور طبقاتی شعور ایسی اصطلاحوں کا سہارا لے کر بولنے لگتے ہیں، "کچھ نہیں، ایمان سے دیکھتے ہو یہاں مزدور کی یہ حالت ہے

اور قومی رہنما فرماتے ہیں، کیمونسٹ ہڑتال کرواتے ہیں۔"

ایک سنجیدہ ماحول میں جہاں ہر چیز کا مذاق اڑادیا جاتا ہے زندگی کے پچیس برس گذارنے سے ساحر کی فکر نے وفاعی انداز اختیار کرلیا ہے وہ کسی چیز کو ایک اثباتی زاویئے سے دیکھنے اور دکھانے کے عیوض اس زاویے سے دیکھتے اور اسکی تردید کرنے لگتے ہیں جو گمراہ کن ہو۔

اس نظم میں جس کو میں ان کی شاعری کا نیا منشور سمجھتا ہوں جب وہ مزدوروں سے یہ عہد کرتے ہیں کہ "میرے گیت تمہارے ہیں" تو فوراً ان کے سامنے درمیانی طبقے کے کھوکھلے نقاد آجاتے ہیں اور ساحر کو کہنا پڑتا ہے۔

مجھ کو اس کا رنج نہیں ہے لوگ مجھے فنکار نہ مانیں

فکر و سخن کے تاجر، میرے شعروں کو اشعار نہ مانیں

یہ نظم انھیں ترغیبات کا نچوڑ ہے، جو ساحر کو مزدوروں کی زندگی سے حاصل ہوئیں۔ وہ جاتے جاتے مجھ سے وعدہ کر گئے کہ میں بہت جلد کوئی صورت نکال کر بمبئی آجاؤں گا۔ اور قومی جنگ کے ادارے میں کام کروں گا۔ مجھ کو یقین تھا کہ وہ اپنا وعدہ بھولے نہ ہوں گے۔ ان کا حافظہ بہت اچھا ہے۔ اپنی ساری نظمیں ان کو یاد ہیں۔ مجاز، فیض، عبدالحمید عدم، الطاف شہدی اور دوسرے شعراء کے ہزاروں شعر ان کو یاد ہیں، شورش کاشمیری کی تقریریں دیوندر ستیارتھی اور متل کے لطیفے یاد ہیں۔ شیریں فرہاد کا پورا ڈراما اور وہ ہزاروں جملے یاد ہیں جو اب تک ان کی تعریف یا برائی میں کہے یا لکھے گئے ہیں وہ بمبئی آنے کا وعدہ بھی نہیں بھولے۔ ہاں کیمونسٹ ہڈکوارٹرز میں آنے کے بجائے ہندستانی کلامندر میں آئے۔ گھریلو زندگی کی پابندیوں نے پھر ان کے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔

"میرے گیت تمہارے ہیں"، میں ساحر نے عوام سے یہ کہا تھا

تم سے قوت لے کر اب میں تم کو راہ دکھاؤں گا

تم پرچم لہرانا ساتھی، میں بربط پر گاؤں گا

ساحر کی ساری الجھنوں کا سبب یہی "تقسیم عمل"، ہے وہ بربط پر گانا اس لئے چاہیں کہ پرچم لہرانے والوں کے رگ پٹھوں میں خون تیزی سے گردش کرتا ہے۔ مگر خود اپنے دست و بازو میں اتنی طاقت نہیں پاتے کہ گاتے بھی رہیں، پرچم بھی لہراتے رہیں۔

اس معاملے میں ترقی پسند ادیب دو رائیں رکھتے ہیں، بعضوں کا خیال ہے کہ دنیا کی موجودہ کش مکش میں ترقی پسند قوتوں کی حمایت ضرور کرنی چاہئے مگر کسی قسم کی عملی وابستگی فن کے لئے مضر ثابت ہوگی اور بعضوں کا خیال ہے کہ ان ترقی پسند قوتوں سے علاحدگی ہی فن کی موت ہے۔ ساحر پہلے گروہ کا ساتھ نہیں وہ جانتے ہیں کہ تنہائی آرٹ کی سب سے بڑی دشمن ہے، جد وجہد، فتح و شکست جزر و مد، کشمکش، وبال، شدت، محنت، مشقت اور حرکت کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہے اور زندگی کے بغیر آرٹ کی تخلیق ناممکن اجتماعی ہنگاموں سے بھاگ کے جو فن کار اپنی ذات میں قلعہ بند ہو جاتا ہے، اس کا فن ایک دائرے میں اور دائرہ نقطے میں تحلیل ہوتا رہتا ہے، اپنے بوجھ کے دبے چیختے رہتے کہ، تنگ و نظر میں پراپگنڈہ نہیں کروں گا، میں نعرہ زنی نہیں کروں گا، میں سچا آرٹسٹ ہوں، میرے نغمے میں آفاقیت، ابدیت، یوٹوپیائیت ہے"، مگر رواں دواں قافلہ آگے بڑھتا جاتا ہے اور اپنے پیچھے ایک اضمحلال،

افسردگی، تھکن اور مایوسی چھوڑ جاتا ہے۔ اس فضا میں نمو نہیں، حرکت نہیں، تازگی نہیں، ترغیب نہیں آب و رنگ نہیں، تخلیق کیسے ممکن ہے۔

ساحر اسی رواں دواں قافلے کے ساتھ ہیں لیکن جب وہ باہر نکلنے کے لئے اپنی ذات کا دائرہ توڑنے لگتے ہیں تو کہیں سے ایک حسین و جمیل کار اکران کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔

یہ کار جب تک خوش حالوں کے موٹر خانے سے باہر نکالی نہیں جائے گی درمیانی طبقے میں اس کی پرستش ہوتی رہے گی اور ہمارے نوجوان ادیب اور شاعر اس کے پیچھے دوڑتے رہیں گے ساحر کے ذہن میں اس کار نے گتھی ڈال دی ہے وہ کم سے کم ایک بار یہ کار ضرور حاصل کرنا چاہتے ہیں، عیش کوشی کے لئے نہیں، بورژوا طبقے کو زک دینے کے لئے، ان لوگوں سے انتقام لئے جنھوں نے " مادام " کی مجلس میں ان کی مفلسی کا مذاق اڑایا۔ اسی دوراہے پر، گردا اڑانے کے لئے جہاں ان کو بار بار قسم کھانا پڑی ہے کہ

اب نہ اِن اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا

اس بنگلے کے سامنے ہارن بجانے کے لئے جہاں ان کی محبوبہ اپنی نظروں کا حجاب، اپنے لبوں کی بھیگی بھیگی سلوٹیں، چہرے کا تبسم، اور سینے پر مخروطی اٹھانیں لئے ہوئے کار پر بیٹھ کر چلی گئی اور ان کو دل تھام کر مصور سے یہ فرمائشیں کرنی پڑی

مگر ہاں بنچ کے بدلے اسے صوفے پہ بٹھلا دے

یہاں میرے بجائے اک چمکتی کار دکھلا دے

اسی لئے انھوں نے پرچم اپنے ساتھی کے کاندھے پر رکھ دیا ہے اور بربط خود اٹھا لیا ہے۔ پرچم تو لہراتا رہے گا، کاش بربط بھی بجتا رہے اور ساحر گاتے رہیں۔ مگر اس منزل میں دل دھڑکتا مزور رہے۔ زندگی بڑی بے درد ہے اس نے انقلابی دور میں ایسے ہزاروں ہاتھوں سے بربط چھین لیا ہے جن کے کاندھوں پر پرچم نہیں تھا۔

فکر و عمل کے اسی تضاد نے ساحر کی زندگی میں نراجیت اور فن میں افسردگی پیدا کر دی ہے، وہ باپ کی جاگیر ہو یا کسی اور کی ساحر زمین کا جائز وارث کسانوں کو سمجھتے ہیں، مگر نجی زندگی کی محرومیاں اور باپ جاگیر پانے کا قانونی حق ان کو بار بار اسی وادی شاداب کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیتا ہے، جس کی حقیقت سے ساحر پوری طرح واقف ہیں۔

میں ان اجداد کا بیٹا ہوں جنھوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعت ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

جن لوگوں نے ساحر کو قریب سے نہیں دیکھا ہے شاید ان کو یہ معلوم ہو کہ اپنے ماحول سے مایوسی اور ترقی پذیر قوتوں سے دوری نے ساحر کی مزاج میں بے انتہا شک پیدا کر دیا ہے۔ ریڈیو سر تنخواہ بڑھا دے تو سوچنے لگتے ہیں، کوئی خاص بات تو نہیں ہے، کوئی لڑکی سلام کرلے تو فکر پیدا ہو جاتی ہے کہ میری ناکامیوں میں کوئی اضافہ تو نہیں ہونے والا ہے۔ اور کوئی لڑکی واقعی محبت کرنے لگے تو دل دھڑکنے لگتا ہے کہ

تیری سانسوں کی تھکن، تیری نگاہوں کا سکوت　　در حقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں　　وہ تبسم، وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

کھاتے پیتے گھرانوں میں شاعروں اور آرٹسٹوں کو جس طرح کھلا کے مارا جاتا ہے، ساحر بھی اسی کے شکار ہوتے رہے ہیں، انھوں نے خلوص، محبت، وفاداری اور عشق کے عہد و پیمان کو سکوں کے پاؤں سے پارہ پارہ ہوتے بار بار دیکھا ہے۔

کسی چلمن نے پکارا بھی تو بڑھ جاؤں گا
کوئی دروزہ کھلا بھی تو پلٹ آؤں گا

مگر زندگی رہتی گھوم پھر کے اسی دوراہے پر ہے، اس لئے ذہن و تصور کے برف برسانے کے باوجود۔

تری چپ چاپ نگاہوں کو سلگتے پا کر
میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

لیکن اب کی بدلی ہوئی نظروں کے تقاضے سمجھنے میں ان کو زیادہ دیر نہیں لگی۔

اپنی بدلی ہوئی نظروں کے تقاضے نہ چھپا
میں اس انداز کا مفہوم سمجھ سکتا ہوں
تیرے زرکار دریچوں کی بلندی کی قسم
اپنے اقدام کا مقسوم سمجھ سکتا ہوں

"اب نہ اِن اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا
میں نے اک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی
اسی سرمایہ و افلاس کے دوراہے پر
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی جھنجھلائی تھی

اس طرح فریبوں اور ناکامیوں کا یہ سلسلہ زندگی کو گھیرتا چلا جاتا ہے۔ محبت کی ناکامی اُردو شاعری کا خاص موضوع ہے، جس معاشرے میں مردوں، عورتوں کے درمیان اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہوں، وہاں شب ہجر کا ڈھلنا معجزہ ہی ہوگا، یہی شب ہجر اردو کی پوری عشقیہ شاعری پر چھائی ہوئی ہے۔

پرانے شعرا کے دیوان کے دیوان دیکھ ڈالئے، اس شب ہجر کے پس منظر میں محبوب کی بے وفائی کے سوا کوئی چیز

بھرتی دکھائی نہ دے گی۔ ادھر کچھ نوجوان شعرانے جو محبوبوں کو بالطبع شریر نہیں سمجھتے یہ دیکھنے کی بھی کوشش کی ہے کہ وہ کیا اسباب ہیں جو محبوبوں کو بے نیازی و سرد مہری پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اسکو کوشش میں ساحر غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے وہ ہر چیز کو اس کے مادی پس منظر میں دیکھنے کی وجہ سے صحیح نتائج نکال لینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں

اگر حسن و عشق بھی اسی مادی دنیا کی چیزیں ہیں ــــ اور وہ ہیں تو مادی حالات ان پر اثر انداز بھی ہو سکتے ہیں ــــ اور وہ ہوتے ہیں ــــ

سوچتا ہوں کہ محبت پہ کڑی شرطیں ہیں
اس تمدن میں مسرت پہ بڑی شرطیں ہیں
سوچتا ہوں کہ محبت ہے اک افسردہ سی لاش
چادرِ عزت و ناموس میں کفنائی ہوئی
دَورِ سرمایہ کی روندی ہوئی رسوا ہستی
درگہِ مذہب و اخلاق سے ٹھکرائی ہوئی

ــــ اس احساس کا فوری ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ۔

سوچتا ہوں کہ محبت نہ بچے گی زندہ
پیش ازاں وقت کہ سڑ جائے یہ گلتی ہوئی لاش
یہی بہتر ہے کہ بیگانۂ الفت ہو کر
اپنے سینے کروں جذبۂ نفرت کی تلاش
اور سودائے محبت سے کنارا کرلوں
دل کو بیگانۂ ترغیب و تمنا کرلوں

مگر فوراً حیات کے تقاضے ٹوکتے ہیں۔

زندگی شعلۂ بے باک بنا لو اپنی
خود کو خاکسترِ خاموش بناتی کیوں ہو
کون کہتا ہے کہ آہیں ہیں مصائب کا علاج
جان کو اپنی عبث روگ لگاتی کیوں ہو
تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہو شادی کرلو

اور جب جذبات میں ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے اور یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ سماج، مذہب، تہذیب، دولت

اور عسرت کی دیواریں عشق ہی نہیں جن کے سامنے بھی کھڑی ہیں جو صرف جذبات کی تحریک ڈھائی نہیں جا سکتیں تو لہجہ بدلنے لگتا ہے۔

زخم خوردہ ہیں تخیّل کی اڑانیں تیری
تیرے گیتوں میں تری روح کے غم پلتے ہیں
سرمگیں آنکھوں میں یوں حسرتیں لو دیتی ہیں
جیسے ویران مزاروں پہ دیئے جلتے ہیں

دل کی تسکیں بھی ہے آسائش ہستی کی دلیل
زندگی صرف زر و سیم کا پیمانہ نہیں
زیست احساس بھی ہے، شوق بھی ہے، درد بھی ہے
صرف انفاس کی ترتیب کا افسانہ نہیں

اور جب حسن عشق کی محرومی پہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں گرد و پیش کا جائزہ لیتی ہیں تو اپنا درد دنیا کے درد کا ایک حصّہ نظر آتا ہے اور یہیں سے "شعاع فردا" لپکتی ہوئی دکھائی دینے لگتی ہے۔

اور کچھ روز نہ بھٹک لے مرے درماندہ ندیم
اور کچھ دن ابھی زہراب کے ساغر پی لے
نور افشاں چلی آتی ہے عروسِ فردا
حال تاریک و سم افشاں سہی لیکن جی لے

یہ ساحر کی فکر اور فن کا مخصوص انداز ہے، وہ چھوٹے چھوٹے تجربات کو اس ڈھنگ سے ترتیب دیتے ہیں کہ زندگی کے مختلف روپ، مختلف تقاضے اور مختلف محرکات واضح ہو جاتے ہیں۔ محبت ان کے پاس ایک معیار ہے جس پر وہ موجودہ سماج اس کے اخلاق و آداب، اس کے دستور و قوانین کو پرکھتے اور ان کا کھوکھلا پن ثابت کرتے رہتے ہیں۔

میرے عشق پیشہ دوست جو اپنی محبوباؤں کو مختلف شعرا کی نظمیں سنانے اور ان کے پردے میں اپنی قلبی واردات ظاہر کرنے کے خوگر ہیں۔ ایک دن مجھ سے بڑے فیصلہ کن انداز میں کہنے لگے "تمہاری اس جدید شاعری میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ مجموعے کے مجموعے پڑھ ڈالی کوئی ڈھنگ کی نظم نہیں ملتی جو کسی کو سنائی جا سکے۔ لے دے کے ایک ساحر کی کتاب ہے جس میں کچھ مطلب کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ ابھی دو تین دن ہوئے میں نے اپنی محبوبہ کو ان کی ایک نظم لکھ بھیجی تو وہ رونے لگی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساحر نے وہ نظم ہمارے ہی لئے لکھی ہے"

میں اس دعوے کے پہلے جز سے متفق نہیں ہوں لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ ساحر آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دینے کا گر

خوب جانتے ہیں، یا یوں کہئے کہ اُن کے تجربات صرف اُنہیں کے نہیں ایک دور کے، ایک پود کے تجربات ہیں۔

آج درمیانی طبقہ جن الجھنوں کا شکار ہے ساحر اس کی ترجمانی میں بہت کامیاب ہیں۔

میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تری فسوں زائی
مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے
یہاں بھی مل نہ سکی جنت شکیبائی
ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات بند دریچوں سے بھی گزر آئی

ساحر نے یہ صرف اپنی کشمکش، اپنی الجھنوں اور اپنی سراسیمگی کی کہانی نہیں سنائی ہے بلکہ اپنی ذات کو اس ہجوم میں گم کر دیا ہے۔ جس کے سامنے نہ کوئی جادۂ نہ منزل ہے۔

میں ساحر کو بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں، وہ جتنے کامیاب شاعر ہیں اُتنے ہی اچھے دوست بھی، جو خلوص ان کے فن میں ہے وہی شخصیت میں ہے، احساس و تاثر کی جو شدت ان کی نظموں میں ملتی ہے وہی زندگی میں نظر آتی ہے، جو بھولا پن ان کے چہرے پر ہے وہی لہجہ میں ہے۔

مجھے اکثر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ میں ساحر کو اُن کی شاعری کے رشتے سے عزیز رکھتا ہوں، یا اُن کی شاعری کو خود اُن کے ناتے سے، اور یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں اب تک کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساحر نے اپنی شخصیت کا سارا گداز شاعری میں بھر دیا ہے اور شاعری کی ساری جاذبیت اپنے خط و خال میں جذب کر لی ہے آئینہ سے آئینہ گر کا اُبھرنا لطیفہ ہی سہی لیکن تلخیاں کا مطالعہ کیجئے، تو اس کے مصنف کی روح بولتی دکھائی دے گی، مصنف سے باتیں کیجئے، تو معلوم ہوگا کہ آپ اس کی نظمیں پڑھ رہے ہیں۔

سچائی ان کی شاعری کی اور اُن کی سب سے بڑی خوبی ہے، اگر ان پر یاس کا دورہ پڑتا ہے، تو وہ چھپاتے نہیں اگر ان کے پیروں میں لغزش پیدا ہوتی ہے تو وہ شرماتے نہیں۔

ابھی انہوں نے کوئی بڑی نظم نہیں کہی ہے اور شاید جب تک نراجیت کا عمل ہے وہ کہہ بھی نہیں سکیں گے،

دیر تک کسی مجلس میں بیٹھ نہیں سکتے گھبرا جانا، اکتا جانا، ساتھ چلتے چلتے آگے بڑھ جانا، پیچھے رہ جانا ان کی حضوریت ہے ہر چیز کے اچھے اور برے پہلوؤں پر ان کی نظر فوراً پہنچ جاتی ہے۔ لیکن کوئی فیصلہ کرنا، یہ ساحر کے بس کا روگ نہیں، زندگی کے بڑے بڑے مسائل تو الگ رہے، وہ جلدی یہ طے نہیں کر پاتے کہ کون سی پتلون پر کون قمیص پہنیں۔

یہ منظر اُن کے اکثر دوستوں نے دیکھا ہوگا کہ سو کر اٹھنے کے بعد وہ بکس کے پاس جا کے بیٹھ جاتے ہیں اور سارے دُھلے ہوئے کپڑے بکس سے نکال کر اپنے ارد گرد پھیلا دیتے ہیں۔ اور دیر تک اس پتلون سے وہ قمیص اور اس قمیص سے وہ پتلون ملا کر دیکھتے ہیں۔

ان کی یہ کمزوری کانفرنسوں اور مشاعروں میں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، مائیکروفون کے سامنے پہونچنے کے بعد اگر مجمع میں سے آوازیں آنے لگیں "ساحر صاحب! تاج محل سنائیے"، "ساحر صاحب! فنکار سنائیے" بس ساحر صاحب کے ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں اور اپنی منتخب کی ہوئی نظم فوراً ذہن سے محو ہو جاتی ہے۔

جن دنوں ساحر لدھیانے سے ہندوستان کلا مندر (بمبئی) میں آئے، میں لکھنؤ میں تھا، نئی نئی کمپنی اور ان کی نئی نئی ملازمت لیکن یہاں پہنچتے ہی انہوں نے اپنے ہر ایسے دوست کو جو فلمی دنیا کی سیر کرنا چاہتا تھا بلانا شروع کیا۔ جب میں لکھنؤ سے واپس آیا اور ان سے ملنے گیا تو وہ ایک کمرے بھر دوست جمع کر چکے تھے۔

ساحر کی زندگی میں دوستوں کا بڑا دخل ہے وہ ایک دن بھی تنہا نہیں رہ سکتے۔ جہاں جاتے ہیں وہاں کچھ لوگوں کو اپنا پتہ لکھا دیتے ہیں اور ان کا پتہ لکھ لاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر ان کو کچھ کھونا پڑے، کچھ ایثار کرنا پڑے تو کبھی دریغ نہیں کریں گے، جب اس طرح بھرتی کی جائے تو بہادر اور بزدل ہر طرح کے رنگروٹ ملیں گے۔ فلمی دنیا سے تعلق یا دلچسپی رکھنے والوں کے پاس آج کافی وقت ہے اور ان میں سے اکثر ساحر کے دوست بن گئے ہیں، یہ وضعدار دوست تقریباً روزانہ کسی نہ کسی طرف سے گھومتے پھرتے آکر اس وقت ساحر کا مزاج ضرور پوچھ لیتے ہیں جب وہ کسی ہوٹل میں بیٹھے آملیٹ کھا رہے ہوں۔

بمبئی کے قیام میں ساحر نے نظمیں کم، پیسے زیادہ پیدا کیے۔ مگر اپنے لئے نہیں، ٹیکسی والے کیلئے ___ دوست، ٹیکسی، آملیٹ ساحر کی زندگی میں تین پرچھائیاں بھی ہیں۔

کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ اگر ساحر شادی کر لیں تو ان کی زندگی میں بڑی حد تک نظم و ضبط پیدا ہو جائے۔ یقیناً ہو جائے، مگر شادی کے لئے بھی تو نظم و ضبط کی ضرورت ہے۔

پچپن برس کی عمر میں تین چار حادثے تو ایسے ہو چکے ہیں کہ شادیاں ان پر منڈلائیں، منڈلاتی رہیں اور منڈلا کے رہ گئیں۔ مگر ساحر ہر مرتبہ بچ نکلے۔

ہر شے قریب آکے کشش اپنی کھو گئی
وہ بھی علاجِ شوقِ گریزاں نہ کر سکے

اور اس شوقِ گریزاں نے آخر ساحر کو اس منزل میں پہونچا دیا۔

تم مری ہو کر بھی بیگانہ ہی پاؤگی مجھے
میں تمہارا ہو کے بھی تم میں سما سکتا نہیں
گائے ہیں میں نے خلوص دل سے بھی الفت کے گیت
اب ریاکاری سے بھی چاہوں تو گا سکتا نہیں
کس طرح تم کو بنا لوں میں شریک زندگی
میں تو اپنی زندگی کا بار اٹھا سکتا نہیں۔

بھی زندگی کی محرومیوں نے، شکستوں اور الجھنوں نے ساحر کو اس قدر گھلایا، پگھلایا ہے کہ ان میں احساس ہی احساس باقی رہ گیا ہے جس کے تار کسی مدھم سی تحریک سے جھنجھنا اٹھتے ہیں اور اُن کا ایک ایک رُواں ہر بے انصافی کے خلاف احتجاج کرنے لگتا ہے۔ اپنے ہم وطنوں کی پستی کا مظاہرہ دیکھ کر وہ تلملا اٹھتے ہیں، چیخ اٹھتے ہیں، جب اجنبی قوم کے بے فکر نوجوانوں کا گروہ ہندوستانی گداگروں کی بھوک سے کھیلتا لطف اندوز ہوتا ہے اور ہندوستانی گداگر ڈبل روٹی کے ایک جھوٹے ٹکڑے پر آپس میں لڑکر بے فکروں کے لئے سامان تفریح پیدا کرتا ہے تو ساحر کا احساس اور ان کا شعور شعور کی گرفت سے نکل جاتا ہے اور وہ اپنے منہ کی ساری کڑواہٹ اپنی ذات سمیت اپنے ہم وطنوں کے منہ پر تھوک دیتے ہیں۔

کاش یہ بے حس و بے وقعت و بے دل انسان
روم کے ظلم کی زندہ تصویر
اپنا ماحول بدل دینے کے قابل ہوتے
ڈیڑھ سو سال کے پابند سلاسل کتے
اپنے آقاؤں سے لے سکتے خراج قوت

اس محکوم، مجبور اور بھوکے ملک میں جس کی تقدیس اور روحانیت کے نغمے آنکھ بند کر کے گائے جاتے ہیں۔ قدم قدم پر چکلے قائم ہیں، اس لئے ہندوستانی ادب میں بھی چکلے ہیں۔

یہاں آپ کی اجازت سے میں اپنی ایک رائے ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ساحر نے ثنا خوانِ تقدیس مشرق کو جس شدت، جس نفرت اور جس خلوص سے جھنجھوڑا ہے اس کی مثال مجھے کسی دوسرے فن پارے میں نہیں ملتی۔

چکلے میں ساحر کی غیرت اس کی روح، اس کے احساس کی تلملاہٹ بلندی کے انتہائی نقطے پر نظر آتی ہے۔ میں یہ نظم پڑھتا ہوں۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ساحر نے نہ جانے کس احساس کی کس شدت کے ساتھ یہ نظم لکھی ہے، ان کے لہجے کی مخصوص افسردگی یہاں ایک بے پناہ بہاؤ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اس کو چاہے میری خود غرضی کہہ لیجئے، لیکن یہ میری تمنا ضرور رہے، کہ ساحر ایک بار کسی ایسی چٹان سے ٹکرا جائیں کہ ان کی شخصیت پارہ پارہ ہو جائے ان کی صلاحیتوں کو جگانے کے لئے یہ تصادم بہت ضروری ہے۔ یہ میرے اور میری طرح اکثر ساتھیوں کے دیکھے ہوئے مناظر ہوں گے کہ ساحر عام طور سے سمٹے سمٹائے بیٹھے رہتے ہیں، لیکن اگر ان کے رگ حمیت پر کوئی بے دردی کے ساتھ نشتر رکھ دے تو ساحر دیکھتے دیکھتے کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔

وہ پہلی بار جب بمبئی آئے تھے تو کارپوریشن کا الکشن ہونے والا تھا اور کانگریسی رکن کا مقابلہ مزدوروں کے محبوب رہنما کامریڈ بھوگلے کر رہے تھے جو خود بھی مزدور ہیں۔ ہزار دقتوں کے بعد ساحر میرے ساتھ پولنگ اسٹیشن پر گئے ہیں وہاں جا کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا اور ساحر ایک گنجان درخت کے نیچے لیٹ رہے، اس دن ان کی طبیعت بھی کچھ خراب تھی۔ پولنگ اسٹیشن پر غنڈوں نے کانگریس کی آڑ لے کر اودھم مچا رکھا تھا، کمیونسٹ رضاکاروں پر پتھر پھینکنا، گالیاں دینا،

٭ ...مزدوروں ووٹروں پر طرح طرح کا دباؤ ڈالنا، ساحر یہ "تماشہ" خاموشی سے نہیں دیکھ سکے، فوراً کمیونسٹ رضاکاروں کی صف میں شامل ہوگئے اور شام کے ساڑھے چھ بجے تک نعرے لگاتے رہے، دوڑتے رہے، کام کرتے رہے اور اس دن انھوں نے نہ آملیٹ کھایا نہ ٹیکسی ہی پر بیٹھے۔

پچھلے دنوں احمد آباد میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس تھی، اور ساحر بیتو راس کانفرنس میں بے دلی کے ساتھ حصّہ لے رہے تھے، ایک اجلاس میں کچھ لوگوں نے خلل ڈالنا چاہا۔ بار بار شور مچانا شروع کیا، ساحر جو اب تک ساری دنیا سے روٹھے بیٹھے تھے اچانک جاگ اٹھے اور جب مائیکروفون پر پہونچے تو ان کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، آنکھیں سُرخ ہوکر اور بڑی ہوگئی تھیں۔ اس وقت ساحر نے اپنی نظم طلوعِ اشتراکیت اتنی آن بان سے سنائی کہ سارا مجمع ان کے ساتھ بہہ گیا۔

شور مچا ہے بازاروں میں ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دنیا غصب شدہ حق انسانوں کے
رسوا بازاری خاتونیں حق نسائی مانگ رہی ہیں
صدیوں کی خاموش زبانیں سحر نوائی مانگ رہی ہیں
روندی کچلی آوازوں کے شور سے دھرتی گونج اٹھی ہے
دنیا کے انیائے نگر میں حق کی پہلی گونج اٹھی ہے
آج پرانی تدبیروں سے آگ کے شعلے تھم نہ سکیں گے
ابھرے جذبے دب نہ سکیں گے اکھڑے پرچم جم نہ سکیں گے
ایک نیا سورج چمکا ہے ایک نئی ضو باری ہے
ختم ہوئی افراد کی شاہی اب جمہور کی سالاری ہے

٭ ایک طویل مضمون جو ۱۹۸۳ء میں "نئے ادب کے معمار" نامی کتابی سلسلے میں شائع ہوا تھا (مدیر)

موسیقار خیّام پیش کرتے ہیں
ٹرپل سیون انٹرپرائزز
جانِ وفا
رتی اگنی ہوتری بطور جانِ وفا فاروق شیخ
پردیپ ۔ خیّام
سینما سکوپ، ایسٹ مین کلر ۔ پرساد لیباریٹری
ہدایت کار :۔ موسیقی : خیّام ۔ فلم ساز : عبدالرب بن محفوظ
گانے :۔ نقش لائلپوری ۔ ندا فاضلی ۔ بشر نواز ۔ اثر ملکاپوری ۔
معاون فلم ساز :۔ بیگم فاطمہ ۔ احمد سالم بن محفوظ ۔ کہانی :۔ ابراہیم شفیق
اسکرین پلے :۔ اعظم شفیقی ۔ مکالمے :۔ رحیم سیّد ظہیر انور
کیمرہ :۔ یو ایس سری واستو ۔ آرٹ :۔ سوم ناتھ ۔ ساونڈ :۔ قاسم علی ۔ تدوین :۔ وامن گرو
اسٹلس :۔ پربھات کار ۔ پروڈکشن منیجر :۔ سعید اقبال ۔ اسسٹنٹ منیجر :۔ رفیق احمد
جاری کردہ : ٹرپل سیون انٹرپرائزز
A-71 وکھشا پارک ۔ ۱۰ویں سڑک جوہو اسکیم بمبئی ۴۹ ۔۔۔ فون ۵۲۳۹۴۵

کلامِ ساحر
نظمیں
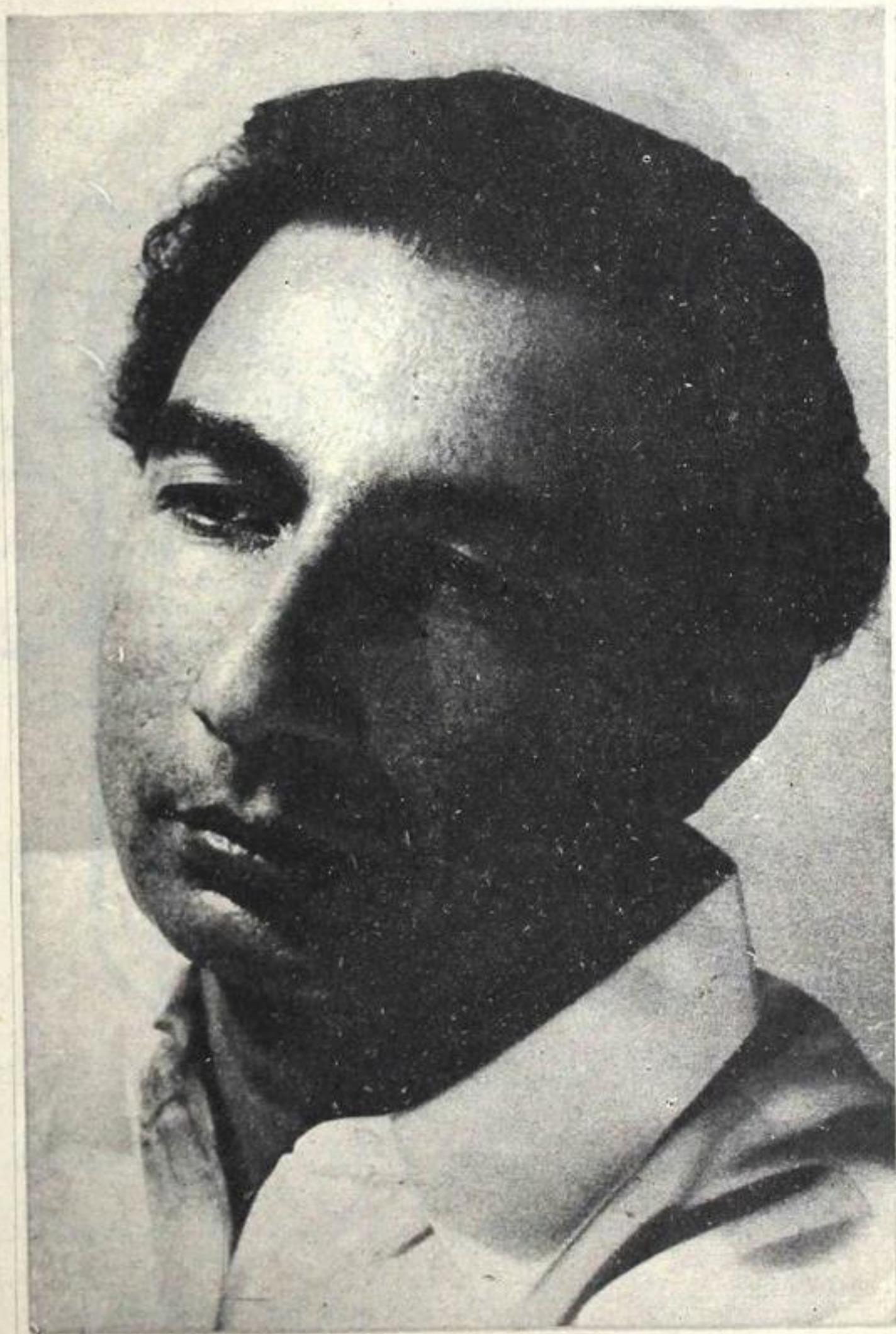
میرے گیت تمہارے ہیں

اب تک میرے گیتوں میں، امید بھی تھی پسپائی بھی
موت کے قدموں کی آہٹ بھی، جیون کی انگڑائی بھی
مستقبل کی کرنیں بھی تھیں، حال کی بوجھل ظلمت بھی
طوفانوں کا شور بھی تھا، اور خوابوں کی شہنائی بھی

آج سے میں اپنے گیتوں میں آتش پارے بھر دوں گا
مدھم، لچکیلی تانوں میں جیوٹ دھارے بھر دوں گا
جیون کے اندھیارے پتھ پر مشعل لے کر نکلوں گا
دھرتی کے پھیلے آنچل میں سرخ ستارے بھر دوں گا

آج سے اے مزدور کسانو! میرے راگ تمہارے ہیں
فاقہ کش انسانو! میرے جوگ بہاگ تمہارے ہیں
جب تک تم بھوکے ننگے ہو، یہ شعلے خاموش نہ ہونگے
جب تک بے آرام ہو تم، یہ نغمے راحت کوش نہ ہونگے

مجھ کو اس کا رنج نہیں ہے، لوگ مجھے فنکار نہ مانیں
فکر و سخن کے تاجر، میرے شعروں کو اشعار نہ مانیں
میرا فن، میری امیدیں، آج سے تم کو ارپن ہیں
آج سے میرے گیت تمہارے دکھ اور سکھ کا درپن ہے

تم سے قوت لے کر، اب میں تم کو راہ دکھاؤں گا
تم پرچم لہرانا ساتھی، میں بربط پر گاؤں گا
آج سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا

○

●

تم مجھے بھول بھی جاؤ تو یہ حق ہے تم کو
میری بات اور ہے میں نے تو محبت کی ہے

نورجہاں کے مزار پر

پہلوئے شاہ میں یہ دختر جمہور کی قبر
کتنے گُم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتی ہے
کتنے خونریز حقائق سے اٹھاتی ہے نقاب
کتنی کچُلی ہوئی جانوں کا پتہ دیتی ہے

کتنے مغرور شہنشاہوں کی تسکیں کیلئے
سالہا سال حسیناؤں کے بازار لگے
کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیش کے لئے
سُرخ محلوں میں جواں جسموں کے انبار لگے

کیسے ہر شاخ سے منہ بند مہکتی کلیاں
نوچ لی جاتی تھیں تزئین حرم کی خاطر
اور مرجھا کے بھی آزاد نہ ہوسکتی تھیں
ظِلِّ سبحان کی الفت کے بھرم کی خاطر

کیسے اِک فرد کے ہونٹوں کی ذراسی جنبش
سرد کر سکتی تھی بے لوث وفاؤں کے چراغ
لوٹ سکتی تھی دمکتے ہوئے ماتھوں کا سہاگ
توڑ سکتی تھی مئے عشق سے لبریز ایاغ

سہمی سہمی سی فضاؤں میں یہ ویراں مرقد
اتنا خاموش ہے فریاد کناں ہو جیسے

سرد شاخوں میں ہوا چیخ رہی ہے ایسے
روحِ تقدیس و وفا مرثیہ خواں ہو جیسے

تو مری جان! مجھے حیرت و حسرت سے نہ دیکھ
ہم میں کوئی بھی جہاں نور و جہاں گیر نہیں
تو مجھے چھوڑ کے، ٹھکرا کے بھی جا سکتی ہے
تیرے ہاتھوں میں مرے ہاتھ ہیں زنجیر نہیں

قحطِ بنگال

جہانِ کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو!
نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں

یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیش کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسلِ آدم و حوا بلک بلک کے مرے

ملیں اسی لئے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں
چمن کو اس لئے مالی نے خون سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں
زمیں کی قوّتِ تخلیق کے خداوندو!
ملوں کے منتظمو! سلطنت کے فرزندو!

پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے
نظامِ زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں
خموش ہونٹوں سے، دم توڑتی نگاہوں سے
بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

۱۹۴۳ء

احساسِ کامراں

دوسری جنگِ عظیم میں نازی فوجوں کی شکست اور سوویت فوجوں کے جرمن سرحد عبور کرنے پر لکھی گئی۔

افقِ روس سے پھوٹی ہے نئی صبح کی ضو
ظلمتِ شب کا جگر چاک ہوا جاتا ہے
تیرگی جتنا سنبھلنے کے لیے رکتی ہے
سُرخ سیل اور بھی بے باک ہوا جاتا ہے

سامراج اپنے وسیلوں پہ بھروسا نہ کرے
کہنہ زنجیروں کی جھنکاریں نہیں رہ سکتیں
جذبۂ نصرتِ جمہور کی بڑھتی رَو میں
ملک اور قوم کی دیواریں نہیں رہ سکتیں

سنگ و آہن کی چٹانیں ہیں عوامی جذبے
موت کے رینگتے سایوں سے کہو ہٹ جائیں
کروٹیں لے کے مچلنے کو ہے سیلِ انوار
تیرہ و تار گھٹاؤں سے کہو، چھٹ جائیں

سالہا سال کے بے چین شراروں کا خروش
اک نئی زیست کا در باز کیا چاہتا ہے
عزمِ آزادیٔ انساں، بہ ہزاراں جبروت

اک نئے دور کا آغاز کیا چاہتا ہے

برتر اقوام کے مغرور خداؤں سے کہو
آخری بار ذرا اپنا ترانہ دہرائیں
اور پھر اپنی سیاست پہ پشیماں ہو کر
اپنے ناکام ارادوں کا کفن لے آئیں

سرخ طوفان کی موجوں کو جکڑنے کے لئے
کوئی زنجیرِ گراں کام نہیں آ سکتی
رقص کرتی ہوئی کرنوں کے تلاطم کی قسم
عرصۂ دہر پہ اب شام نہیں چھا سکتی

○

یہ کس کا لہو ہے؟

(جہازیوں کی بغاوت ——— ۱۹۴۶ء)

اے رہبرِ ملک و قوم ذرا
آنکھیں تو اٹھا، نظریں تو ملا
کچھ ہم بھی سنیں، ہم کو بھی بتا
یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟

دھرتی کی سلگتی چھاتی کے بے چین شرارے پوچھتے ھیں
تم لوگ جنہیں اپنا نہ سکے، وہ خون کے دھارے پوچھتے ہیں
سڑکوں کی زباں چلاتی ہے، ساگر کے کنارے پوچھتے ہیں
یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟
اے رہبرِ ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟

وہ کون سا جذبہ تھا جس سے فرسودہ نظامِ زیست ہلا
جھلسے ہوئے ویراں گلشن میں اک آس امید کا پھول کھلا
جنتا کا لہو فوجوں سے ملا، فوجوں کا لہو جنتا سے ملا
یہ کس کا جنوں ہے کون مرا؟
اے رہبرِ ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟

کیا قوم و وطن کی جے گا کر، مرتے ہوئے راہی غنڈے تھے؟

جو دیش کا پرچم لے کے اٹھے ، وہ شوخ سپاہی غنڈے تھے؟
جو بارِ غلامی سہہ نہ سکے ، وہ مجرمِ شاہی غنڈے تھے؟
یہ کس کا لہو ہے ، کون مرا ؟
اے رہبرِ ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے ، کون مرا ؟

اے عزمِ فنا دینے والو ، پیغامِ بقا دینے والو!
اب آگ سے کیوں کتراتے ہو؟ شعلوں کو ہوا دینے والو!
طوفان سے اب ڈرتے کیوں ہو؟ موجوں کو صدا دینے والو!
کیا بھول گئے اپنا نعرہ ؟
اے رہبرِ ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے ، کون مرا ؟

سمجھوتے کی اُمید سہی ، سرکار کے وعدے ٹھیک سہی
ہاں مشقِ ستم افسانہ سہی ، ہاں پیار کے وعدے ٹھیک سہی
اپنوں کے کلیجے مت چھیدو ، اغیار کے وعدے ٹھیک سہی
جمہور سے یوں دامن نہ چھڑا
اے رہبرِ ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا ؟

ہم ٹھان چکے ہیں اب جی میں ، ہر ظالم سے ٹکرائیں گے
تم سمجھوتے کی آس رکھو ، ہم آگے بڑھتے جائیں گے
ہر منزلِ آزادی کی قسم ، ہر منزل پر دہرائیں گے
یہ کس کا لہو ہے کون مرا ؟
اے رہبرِ ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا ؟

مفاہمت

نشیبِ ارض پہ ذرّوں کو مشتعل پا کر
بلندیوں پہ سفید اور سیاہ مل ہی گئے
جو یادگار تھے باہم ستیزہ کاری کی
بہ فیضِ وقت وہ دامن کے چاک سِل ہی گئے

جہاد ختم ہوا دورِ آشتی آیا
سنبھل کے بیٹھ گئے محملوں میں دیوانے
ہجومِ تشنہ لباں کی نگاہ سے اوجھل
چھلک رہے ہیں شرابِ ہوس کے پیمانے

یہ جشن جشنِ مسرّت نہیں تماشا ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس
ہزار شمعِ اخوّت بجھا کے چمکے ہیں
یہ تیرگی کے ابھارے ہوئے حسیں فانوس

یہ شاخِ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی، تو شراروں کے پھول لائے گی
نہ پھل سکی تو نئی فصلِ گل کے آنے تک
ضمیرِ ارض میں اک زہر چھوڑ جائے گی

بمبئی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء
(جشنِ آزادی)

آج

ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لئے
چاند، تاروں، بہاروں کے سپنے بُنے
حُسن اور عشق کے گیت گاتا رہا
آرزوؤں کے ایواں سجاتا رہا
میں تمہارا مغنّی تمہارے لئے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہا
آج لیکن مرے دامنِ چاک میں
گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں
میرے بربط کے سینے میں نغموں کا دم گھُٹ گیا ہے
تانیں چیخوں کے انبار میں دب گئی ہیں
اور گیتوں کے سُر ہچکیاں بن گئے ہیں
میں تمہارا مغنّی ہوں نغمہ نہیں ہوں
اور نغمے کی تخلیق کا سازوساماں
ساتھیو! آج تم نے بھسم کر دیا ہے
اور میں ــــ اپنا ٹوٹا ہوا ساز تھامے
سرد لاشوں کے انبار کو تک رہا ہوں
میرے چاروں طرف موت کی وحشتیں ناچتی ہیں
اور انساں کی حیوانیت جاگ اٹھی ہے
بربریت کے خونخوار عفریت
اپنے ناپاک جبڑوں کو کھولے
خون پی پی کے غرّا رہے ہیں
بچّے ماؤں کی گودوں میں سہمے ہوئے ہیں

عصمتیں سر برہنہ پریشاں ہیں
ہر طرف شورِ آہ و بکا ہے
اور میں اس تباہی کے طوفان میں
آگ اور خون کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہوں
مجھ کو امن اور انصاف کی بھیک دو
میرے گیتوں کی لے میرے سُر، میری نے
میرے مجروح ہونٹوں کو پھر سونپ دو
ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لئے
انقلاب اور بغاوت کے نغمے الاپے
اجنبی راج کے ظلم کی چھاؤں میں
سرفروشی کے خوابیدہ جذبے اُبھارے
اور اس صبح کی راہ دیکھی
جس میں اس ملک کی روح آزاد ہو
آج زنجیرِ محکومیت کٹ چکی ہے
اور اس ملک کے بحر و بر، بام و در
اجنبی قوم کے ظلمت افشاں پھریرے کی منحوس چھاؤں سے آزاد ہیں
کھیت سونا اگلنے کو بے چین ہیں
وادیاں لہلہانے کو بے تاب ہیں
کوہساروں کے سینے میں ہیجان ہے
سنگ اور خشت بے خواب و بیدار ہیں
ان کی آنکھوں میں تعمیر کے خواب ہیں
ان کے خوابوں کو تکمیل کا روپ دو
ملک کی وادیاں، گھاٹیاں، کھیتیاں

عورتیں، بچیاں
ہاتھ پھیلائے خیرات کی منتظر ہیں
اُن کو امن اور تہذیب کی بھیک دو
ماؤں کو اُن کے ہونٹوں کی شادابیاں
ننھے بچوں کو ان کی خوشی بخش دو
ملک کی روح کو زندگی بخش دو
مجھ کو میرا ہُنر، میری لے بخش دو
میرے سُر بخش دو، میری نے بخش دو
آج ساری فضا ہے بھکاری
اور میں اس بھکاری فضا میں
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہوں
مجھ کو پھر میرا کھویا ہوا ساز دو
میں تمہارا مغنّی ــ تمہارے لئے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہوں گا

(آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی) ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء

آوازِ آدم

دبے گی کب تلک آوازِ آدم ہم بھی دیکھیں گے
رکیں گے کب تلک جذباتِ برہم ہم بھی دیکھیں گے
چلو یونہی سہی، یہ جورِ پیہم ہم بھی دیکھیں گے

درِ زنداں سے دیکھیں، یا عروجِ دار سے دیکھیں
تمہیں رسوا سرِ بازارِ عالم، ہم بھی دیکھیں گے
ذرا دم لو، مآلِ شوکتِ جم ہم بھی دیکھیں گے

بہ زعمِ قوتِ فولاد و آہن دیکھ لو تم بھی
بہ فیضِ جذبۂ ایمانِ محکم ہم بھی دیکھیں گے
جبینِ کج کلاہی خاک پر خم ہم بھی دیکھیں گے

مکافاتِ عمل، تاریخِ انساں کی روایت ہے
کرو گے کب تلک ناوک فراہم ہم بھی دیکھیں گے
کہاں تک ہے تمہارے ظلم میں دم ہم بھی دیکھیں گے

یہ ہنگامِ وداعِ شب ہے اے ظلمت کے فرزندو!
سحر کے دوش پر گلنار پرچم ہم بھی دیکھیں گے
تمہیں بھی دیکھنا ہوگا یہ عالم، ہم بھی دیکھیں گے

۲۶ جنوری

آؤ کہ آج غور کریں اس سوال پر
دیکھے تھے ہم نے جو وہ حسیں خواب کیا ہوئے

دولت بڑھی تو ملک میں افلاس کیوں بڑھا
خوش حالیٔ عوام کے اسباب کیا ہوئے

جو اپنے ساتھ ساتھ چلے کوئے دار تک
وہ دوست، وہ رفیق، وہ احباب کیا ہوئے

کیا مول لگ رہا ہے شہیدوں کے خون کا
مرتے تھے جن پہ ہم وہ سزایاب کیا ہوئے

بے کس برہنگی کو کفن تک نہیں نصیب
وہ وعدہ ہائے اطلس و کمخواب کیا ہوئے

جمہوریت نواز، بشر دوست، امن خواہ
خود کو جو خود دیئے تھے وہ القاب کیا ہوئے

مذہب کا روگ آج بھی کیوں لاعلاج ہے
وہ نسخہ ہائے نادر و نایاب کیا ہوئے

ہر کوچہ شعلہ زار ہے، ہر شہر قتل گاہ

یک جہتیٔ حیات کے آداب کیا ہوئے

صحرائے تیرگی میں بھٹکتی ہے زندگی
اُبھرے تھے جو اُفق پہ وہ مہتاب کیا ہوئے

مجرم ہوں میں اگر، تو گنہ گار تم بھی ہو
اے رہبرانِ قوم خطا کار تم بھی ہو

خون پھر خون ہے

"......ایک مقتول لومبا، ایک زندہ لومبا سے کہیں زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔"

——— جواہر لال نہرو

ظلم پھر ظلم ہے، بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

خاکِ صحرا پہ جمے یا کفِ قاتل پہ جمے
فرقِ انصاف پہ یا پائے سلاسل پہ جمے
تیغِ بیداد پہ، یا لاشۂ بسمل پہ جمے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

لاکھ بیٹھے کوئی چھپ چھپ کے کمیں گاہوں میں
خون خود دیتا ہے جلادوں کے مسکن کا سراغ
سازشیں لاکھ اُڑھاتی رہیں ظلمت کا نقاب
لے کے ہر بوند نکلتی ہے ہتھیلی پہ چراغ

ظلم کی قسمتِ ناکارہ و رسوا سے کہو
جبر کی حکمتِ پُرکار کے ایما سے کہو
محملِ مجلسِ اقوام کی لیلیٰ سے کہو
خون دیوانہ ہے دامن پہ لپک سکتا ہے
شعلۂ تند ہے، خرمن پہ لپک سکتا ہے

تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا

آج وہ کوچہ و بازار میں آنکلا ہے
کہیں شعلہ، کہیں نعرہ، کہیں پتھر بن کر
خون چلتا ہے تو رکتا نہیں سنگینوں سے
سر اٹھاتا ہے تو دبتا نہیں آئینوں سے

ظلم کی بات ہی کیا، ظلم کی اوقات ہی کیا
ظلم بس ظلم ہے آغاز سے انجام تلک
خون پھر خون ہے، سو شکل بدل سکتا ہے
ایسی شکلیں کہ مٹاؤ تو مٹائے نہ بنے
ایسے شعلے کہ بجھاؤ تو بجھائے نہ بنے
ایسے نعرے کہ دباؤ تو دبائے نہ بنے

○

جواہر لال نہرو

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مٹ جانے سے انسان نہیں مرجاتے
دھڑکیں رکنے سے ارمان نہیں مرجاتے
سانس تھم جانے سے اعلان نہیں مرجاتے
ہونٹ جم جانے سے فرمان نہیں مرجاتے
جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے

وہ جو ہر دین سے منکر تھا، ہراک دھرم سے دُور
پھر بھی ہر دین، ہراِک دھرم کا غم خوار رہا

ساری قوموں کے گناہوں کا کڑا بوجھ لئے
عُمر بھر صورتِ عیسیٰ جو سرِ دار رہا

جس نے انسانوں کی تقسیم کے صدمے جھیلے
پھر بھی انساں کی اخوّت کا پرستار رہا

جس کی نظروں میں تھا اک عالمی تہذیب کا خواب
جس کا ہر سانس نئے عہد کا معمار رہا

جس نے زردارِ معیشت کو گوارا نہ کیا
جس کو آئینِ مساوات پہ اصرار رہا

اس کے فرمانوں کی، اعلانوں کی تعظیم کرو
راکھ تقسیم کی، ارمان بھی تقسیم کرو

موت اور زیست کے سنگم پہ پریشاں کیوں ہو
اس کا بخشا ہوا سہ رنگ عَلم لے کے چلو

جو تمہیں جادۂ منزل کا پتہ دیتا ہے
اپنی پیشانی پہ وہ نقشِ قدم لے کے چلو

دامنِ وقت پہ اب خون کے چھینٹے نہ پڑیں
ایک مرکز کی طرف دیر و حرم لے کے چلو

ہم مٹا ڈالیں گے سرمایہ و محنت کا تضاد
یہ عقیدہ، یہ ارادہ، یہ قسم لے کے چلو

وہ جو ہمراز رہا، حاضر و مستقبل کا
اُس کے خوابوں کی خوشی، روح کا غم لے کے چلو

جسم کی موت، کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مٹ جانے سے انسان نہیں مرجاتے
دھڑکنیں رکنے سے ارمان نہیں مرجاتے
سانس تھم جانے سے اعلان نہیں مرجاتے
ہونٹ جم جانے سے فرمان نہیں مرجاتے

جشنِ غالب

اکیس برس گذرے آزادئ کامل کو
تب جا کے کہیں ہم کو غالب کا خیال آیا
تربت ہے کہاں اُس کی، مسکن تھا کہاں اس کا
اب اپنے سخن پرور ذہنوں میں سوال آیا

سو سال سے جو تربت چادر کو ترستی تھی
اب اس پہ عقیدت کے پھولوں کی نمائش ہے
اُردو کے تعلق سے کچھ بھید نہیں کھلتا
یہ جشن، یہ ہنگامہ، خدمت ہے کہ سازش ہے

جن شہروں میں گونجی تھی غالب کی نوا برسوں
اُن شہروں میں اب اردو بے نام و نشاں ٹھہری
آزادئ کامل کا اعلان ہوا جس دن
معتوب زباں ٹھہری غدّار زباں ٹھہری

جس عہدِ سیاست نے یہ زندہ زباں کچلی
اس عہدِ سیاست کو مرحوموں کا غم کیوں ہے
غالب جسے کہتے ہیں اُردو ہی کا شاعر تھا
اردو پہ ستم ڈھا کر غالب پہ کرم کیوں ہے

یہ جشن، یہ ہنگامے، دلچسپ کھلونے ہیں
کچھ لوگوں کی کوشش ہے، کچھ لوگ بہل جائیں

جو وعدۂ فردا پر اب ٹل نہیں سکتے ہیں
ممکن ہے کہ کچھ عرصہ اس جشن پہ ٹل جائیں

یہ جشن مبارک ہو، پر یہ بھی صداقت ہے
ہم لوگ حقیقت کے احساس سے عاری ہیں
گاندھی ہو کہ غالب ہو انصاف کی نظروں میں
ہم دونوں کے قاتل ہیں، دونوں کے پجاری ہیں

(فروری ۱۹۶۹ء)

گاندھی ہو یا غالب ہو

(گاندھی شتابدی اور غالب صدی کے اختتام پر لکھی گئی)

گاندھی ہو یا غالب ہو
ختم ہوا دونوں کا جشن
آؤ، انہیں اب کر دیں دفن

ختم کرو تہذیب کی بات
بند کرو کلچر کا شور
ستیہ، اہنسا، سب بکواس
تم بھی قاتل، ہم بھی چور
ختم ہوا دونوں کا جشن
آؤ، انہیں اب کر دیں دفن

وہ بستی، وہ گاؤں ہی کیا؛
جس میں ہریجن ہو آزاد
وہ قصبہ، وہ شہر ہی کیا؛
جو نہ بنے احمدؔ آباد[1]
ختم ہوا دونوں کا جشن
آؤ، انہیں اب کر دیں دفن

گاندھی ہو، یا غالب ہو
دونوں کا کیا کام یہاں
اب کے برس بھی قتل ہوئی
ایک کی شکشا، اک کی زباں
ختم ہوا دونوں کا جشن
آؤ، انہیں اب کر دیں دفن

(فروری ۱۹۷۰ء)

[1] اس سال کے بدترین فرقہ وارانہ فساد کی طرف اشارہ ہے۔

دل ابھی

زندگی سے اُنس ہے
حُسن سے لگاؤ ہے
دھڑکنوں میں آج بھی
عشق کا الاؤ ہے
دِل ابھی بُجھا نہیں

رنگ بھر رہا ہوں میں
خاکۂ حیات میں
آج بھی ہوں منہمک
فکرِ کائنات میں
غم ابھی لٹا نہیں

حرفِ حق عزیز ہے
ظُلم ناگوار ہے
عہدِ نو سے آج بھی
عہد اُستوار ہے
میں ابھی مرا نہیں

اے نئی نسل!

۲۲ نومبر ۱۹۷۰ء کو ساحر صاحب کی پرانی درسگاہ گورنمنٹ کالج لدھیانہ کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ اس موقعہ پر کالج کی طرف سے مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ نے انہیں گولڈ میڈل پیش کیا۔ ساحر صاحب نے یہ نظم اسی تقریب کے لئے لکھی اور اسے کالج کے نئے اور پرانے طالب علموں کے اجتماع میں پڑھا۔

(ادارہ)

میرے اجداد کا وطن یہ شہر
میری تعلیم کا جہاں یہ مقام

میرے بچپن کی دوست یہ گلیاں
جن میں رسوا ہوا شباب کا نام

یاد آتے ہیں اِن فضاؤں میں
کتنے نزدیک اور دور کے نام

کتنے خوابوں کے ملگجے چہرے
کتنی یادوں کے مرمریں اجسام

کتنے ہنگامے، کتنی تحریکیں
کتنے نعرے جو تھے زبان زدِ عام

میں یہاں جب شعور کو پہنچا
اجنبی قوم کی تھی قوم غلام

یونین جیک درسگاہ پہ تھا
اور وطن میں تھا سامراجی نظام

اسی مٹّی کو ہاتھ میں لے کر
ہم بنے تھے بغاوتوں کے امام

یہیں جانچے تھے دھرم کے دشواش
یہیں پرکھے تھے دین کے اوہام

یہیں مُنکر بنے روایت کے
یہیں توڑے رواج کے اصنام

یہیں نکھرا تھا ذوقِ نغمہ گری
یہیں اُترا تھا شعر کا الہام

میں جہاں بھی رہا جہیں کا رہا — مجھ کو بھولے نہیں ہیں یہ در و بام
نام میرا جہاں جہاں پہنچا — ساتھ پہنچا ہے اس دیار کا نام
میں یہاں میزباں بھی، مہماں بھی — آپ جو چاہیں دیجئے مجھے نام
نذر کرتا ہوں اِن فضاؤں کی — اپنا دل، اپنی روح، اپنا کلام
اور فیضانِ عِلم جاری ہو — اور اونچا ہو اس دیار کا نام
اور شاداب ہو یہ ارضِ حسیں — اور مہکے یہ وادیٔ گلفام
اور اُبھریں صنم گری کے نقوش — اور چھلکیں مئے سخن کے جام
اور نکلیں وہ بے نوا، جن کو — اپنا سب کچھ کہیں وطن کے عوام
قافلے آتے جاتے رہتے ہیں — کب ہوا ہے یہاں کسی کا قیام
نسل در نسل کام جاری ہے — کارِ دنیا کبھی ہوا نہ تمام

کل جہاں میں تھا، آج تو ہے وہاں
اے نئی نسل! تجھ کو میرا اسلام

امنِ عالم کے ادب میں ایک خوبصورت اضافہ

سردار جعفری

ایک اچھی نظم کی خصوصیات وہی ہیں جنہیں غالب نے حُسن کی کیفیت بیان کرنے کے لئے چار لفظوں میں ادا کیا ہے۔ "سادگی و پُرکاری، بےخودی و ہُشیاری۔" ان چاروں کیفیات کا امتزاج مشکل ہے لیکن جب یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے تو نظم ایک مکمل پیکرِ حسن بن کر سامنے آتی ہے اور دلوں کو موہ لیتی ہے۔

ساحر نے ایک سادہ سی کہانی کو جو بارہا ہم نے سنی ہے اور دیکھی ہے اور محسوس کی ہے اور نظر انداز کی ہے اپنی رنگین بیانی اور آتش فشانی سے پُرکیف بنا دیا ہے۔ اس کی سادگی اس کے موضوع اور مواد میں ہے۔ اور پُرکاری اس تکنیک میں جو شاعر نے استعمال کی ہے۔ بےخودی اس مکمل ہم آہنگی سے پیدا ہوئی ہے جو شاعر کو اپنے موضوع سے ہے۔ اس بےخودی کے عالم میں بھی اس کے سماجی شعور نے اُسے ہشیار رکھا ہے۔ اگر یہ ہوشیاری نہ ہوتی تو رنگین بیانی میں آتش بیانی کی آمیزش نہ ہو سکتی اور نظم کا آخری حصہ نہ لکھا جاتا۔

پرچھائیاں ساحر کی بیشتر نظموں کی طرح محاکات کا ایک اچھا نمونہ ہے اور بیک وقت غنائی اور بیانیہ کیفیات کی حامل ہے۔ وہ غنائی کیفیت جو بیانیہ عناصر سے آنکھ چراتی ہے بسا اوقات ذاتی داخلیت کے نہاں خانوں میں جلوے دکھا کر رہ جاتی ہے اور وہ بیانیہ کیفیت جو غنائی عناصر سے گریز کرتی ہے ایک طرح کی ظاہر نگاری میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کی مثال " نہر پر چل رہی ہے پن چکی " سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ ساحر کی یہ نظم اس کی پوری شاعری کی طرح ان دونوں عیوب سے پاک ہے۔

اس محاکاتی کیفیت کو پیدا کرنے کے لئے ساحر نے لفظوں کے استعمال میں بھی بڑی خوش مذاقی دکھائی ہے۔ اس نے بعض مقامات پر لفظوں سے نقاشی اور رنگ کاری کا کام لیا ہے اور وہاں اس کا قلم شاعر کے قلم کے بجائے مصور کا موقلم بن گیا ہے۔ الفاظ جو چند حروف کی اجتماعی شکل ہیں پگھل کر رنگ اور خطوط کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

اور کاغذ سے صفحہ پر ایک منظر کھینچ دیتے ہیں۔ ان کی صوتی کیفیت میں بھی ٹکراؤ اور جھنکار کے بجائے ایک خاموش اور بے آواز روانی ہے جیسے صاف اور چکنی سطح پر آہستہ آہستہ پانی بہہ رہا ہو۔

میں نے "پرچھائیاں" پڑھنے سے پہلے اس نظم کو مختلف جلسوں اور مشاعروں میں ساحر کی زبان سے کئی بار سنا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ اس کی اثر آفرینی کسی ایک طبقے یا گروہ تک محدود نہیں ہے۔

اس کی دو وجہیں ہیں۔

پہلی اور بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ اس کا موضوع اس عہد کا سب سے اہم سوال ہے۔ جس کا جواب ساری دنیا کو دینا ہے اور "عالمی امن تحریک" اس پر شاہد ہے کہ اس کا جواب ہر ملک، ہر قوم، ہر نسل، ہر طبقے ہر مکتبِ خیال کے آدمی نے ایک ہی طرح دیا ہے۔ دنیا کی نصف سے زیادہ آبادی نے امنِ عالم کے محضر پر اپنی مہر ثبت کی ہے۔ ساحر لدھیانوی نے یہ خوبصورت نظم لکھ کر اپنے دستخط کئے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ساحر نے اپنی بات ایک کہانی کی شکل میں کہی ہے اور کہانی نظم کو اور زیادہ عام فہم بنا دیتی ہے ہماری بعض بہترین نظمیں عام انسانوں کی سمجھ کی سطح سے بہت اونچی ہیں لیکن ساحر کی نظم "پرچھائیاں" اپنی سادہ کہانی اور آسان بیانی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وسیع حلقوں تک پہنچ سکے گی۔ اس کے نوّے فیصدی سے بھی کچھ زیادہ الفاظ ہماری روزمرہ گفتگو کے الفاظ ہیں۔ کلاسکیت اور روایت کے نام پر ساحر نے اپنی نظم کو اجنبی اور غیر مانوس الفاظ سے بوجھل نہیں بنایا ہے۔ ساحر کی کامیابی اس میں ہے کہ اس نے اپنے سادہ اور آسان الفاظ سے اس عہد کی بعض اہم حقیقتوں کو ایسے مصرعوں میں ڈھال دیا ہے جو زبان پر چڑھ بھی جاتے ہیں اور دل پر اثر بھی کرتے ہیں۔ مثلاً جب وہ یہ کہتا ہے کہ اس دور میں جینے کی قیمت یا دار و رسن یا خواری ہے تو وہ ایک مصرع میں سب کچھ سمیٹ لیتا ہے جو ایک پوری کتاب کا موضوع ہے یہی تاثر اور گہرائی اس شعر میں ہے ؎

بہت دنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا
کہ جب جوان ہوں بچے تو قتل ہو جائیں

اسی انداز سے اس نے اتنے بے پناہ اور اچھوتے مصرعے بھی کہے ہیں جیسے :-

"وہ سنگین حقائق زاروں میں خوابوں کی رِدائیں جلتی ہیں"

اس نظم میں کہانی کہنے کی تکنیک بھی نئی ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے اس سے پہلے یہ تکنیک کسی اردو شاعر نے استعمال نہیں کی اور میں جتنا غور کرتا ہوں اتنے ہی مجھے اس تکنیک کے وسیع تر امکانات نظر آتے ہیں۔ یہ تکنیک ساحر نے براہِ راست فلم سے لی ہے جس میں وہ گذشتہ چھ سال سے ایک کامیاب گیت لکھنے والے شاعر کی طرح کام کر رہا ہے۔ وہ ایک طرف خوبصورت اور کامیاب گیت لکھ رہا تھا اور دوسری طرف غالباً غیر شعوری طور سے ایک نئی تکنیک کو آہستہ آہستہ پروان چڑھا رہا تھا جس نے اب "پرچھائیاں" نظم کا روپ اختیار کیا ہے۔

یہ کہانی ایک پر سکون چاندنی رات کے منظر سے شروع ہوتی ہے جس میں کہانی کا مرکزی کردار جو ایک دکھے ہوئے دل اور لٹی ہوئی زندگی کا فنکار ہے دو محبت کرنے والوں کو دیکھتا ہے اور اس طرح اس کی یادوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

تصورات کی پرچھائیاں اُبھرتی ھیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقین کی طرح

یہاں اس کی کھوئی ہوئی محبت کی بہت سی تصویریں یکے بعد دیگرے اس کے ذہن کے پردے پر اُبھرتی ہیں اور کھو جاتی ہیں، ہر دو تصویروں کے بیچ میں ایک تخیلی جست ہے جس میں پڑھنے والا شاعر کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے۔ تصویروں کا یہ سلسلہ کامیاب محبت کے دلکش لمحوں تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور بحر کی تبدیلی کے ساتھ ایک نئے منظر کا آغاز ہوتا ہے جس میں مکھن سی ملائم راہیں، چرخوں کی صدائیں، چوپال کی رونقیں، پھولوں کی قبائیں غارت ہو جاتی ہیں اور وفا شعار عورتوں کے پاکیزہ جسموں کی تجارت شروع ہو جاتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت بنگال کے قحط میں یہی سب کچھ ہوا تھا۔

یہ عام زندگی کی تصویر جو ایک سیلاب کی سی کیفیت کے ساتھ اُبھری تھی، ختم ہوتی ہے تو مرکزی کردار یعنی لٹے ہوئے فنکار کی دردناک تصویروں کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا ہے۔ نظم کی پہلی بحر واپس آجاتی ہے اور تصورات کی پرچھائیاں بھیانک ہو کر ذہن کے پردے سے گزرنے لگتی ہیں اور اس منزل پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں جہاں کسی کا کوئی نہیں آج سب اکیلے ہیں۔

یہاں بحر پھر بدلتی ہے اور سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی شام اُبھرتی ہے، جہاں فنکار کی محبوبہ اپنی ساری پاکیزگی کے باوجود بک چکی ہے اور فنکار روٹی کے چند سوکھے ٹکڑے حاصل کرنے کے لئے در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے اور اپنی زندگی اور محبوبہ کی عصمت اور دونوں کے پیار کو نہیں بچا سکتا۔ اور اس تلخ تجربے سے گزرنے کے بعد وہ اس منزل پر پہلی بار یہ محسوس کرتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور اس کیوں کا جواب وہ بڑی ایمانداری اور خلوص سے دیتا ہے۔

مجبور ہوں میں، مجبور ہو تم، مجبور یہ دُنیا ساری ہے
اس دور میں جینے کی قیمت یا دار و رسن یا خواری ہے

میں دار و رسن تک جا نہ سکا، تم جہد کی حد تک آ نہ سکیں
ہم تم دو ایسی روحیں ہیں جو منزلِ تسکیں پا نہ سکیں

یہاں ساحر نے بڑی فنکاری سے اس ذلیل زندگی اور اس کے نظام کو بدلنے کے لئے جہد و پیکار کا ولولہ انگیز پیام دیا ہے۔

یہیں سے ساحر کی رنگین بیانی، آتش بیانی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور نظم کا آخری حصہ شروع ہوتا ہے جس میں لٹا ہوا فنکار نئے محبت کرنے والوں کی نازک زندگیوں کو جنگ، قحط اور افلاس سے بچانے کا عہد کرتا ہے اور ساری دنیا کو اس منحوس جنگ کے خلاف منظم کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

ہمارا پیار حوادث کی تاب لا نہ سکا
مگر انہیں تو مرادوں کی رات مل جائے
ہمیں تو کشمکشِ مرگِ بے اماں ہی ملی
انہیں تو جھومتی گاتی حیات مل جائے

اور اس تیسری جنگ کے خطرے کے سامنے جو ایٹمی ہتھیاروں سے لڑی جائے گی۔ اسے نئی محبت کرنے والی روحیں ہی نہیں بلکہ اپنی تنہائیاں اور اپنے تصورات کی پرچھائیاں بھی غیر محفوظ معلوم ہوتی ہیں اور وہ پچھلی جنگوں اور آنے والی جنگ کا مقابلہ اس طرح کرتا ہے۔

گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں

گذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

اس طرح نظم اس ذاتی تاثر کی سطح پر واپس آجاتی ہے جس سے شروع ہوئی تھی۔ نظم کا یہ خاتمہ بے حد خوبصورت اور مؤثر ہے۔ ساحر لدھیانوی نے اس نظم کے ذریعہ اردو کی طویل نظموں اور امنِ عالم کے ادب میں ایک خوب صورت اضافہ کیا ہے۔

آج دیوالی کی رات ہے اور ہندوستان کے در و بام چراغوں سے جگمگا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ساحر کی نظم امن عالم کی تحریک کو آگے بڑھانے میں مدد دے گی اور دلوں کو امن اور محبت کے چراغوں سے جگمگا دے گی۔

پھولوں سے لدی ہوئی چمپا کی خوشبو

سید سجاد ظہیر

آج سے کوئی تین برس پہلے لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں مجھے ساحر کی زبانی اُن کی نظم "پرچھائیاں" سُننے کا اتفاق ہوا۔

عام طور پر اس قسم کے اجتماعوں میں غزلیہ انداز کی مختصر اور سادہ چیزیں پڑھی جاتی ہیں۔ مَیں نے ساحر کو بڑی جرأت کے ساتھ اس رواج کو توڑتے دیکھا۔ وہ ایک موسم سرما کی ٹھٹھرتی ہوئی رات تھی اور مشاعرہ چار پانچ گھنٹے سے جاری تھا۔ سننے والوں کے چہروں پر تھکن نمایاں ہونے لگی تھی کہ ساحر نے اپنی ایک سو نوّے مصرعوں کی طویل نظم پڑھنی شروع کی۔ نظم کے پہلے ہی چند مصرعوں نے مجمع پر ایک سنگین خاموشی طاری کر دی اور سطحی تفریح کا ماحول رخصت ہو گیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ گویا ہم ایک مغموم حُسن کی طلسماتی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔ جہاں دو معصوم اور سادہ روحوں کی دلگداز داستان ــــ جنہیں جنگ، نفرت اور لوٹ کھسوٹ کے ہاتھوں تباہی و بربادی کا شکار ہونا پڑا۔ ایک لمحہ کے لئے ہمیں غم و اندوہ سے معمور کر دیتی ہے اور دوسرے لمحے ہمارے غایت درجہ نیک اور شریفانہ جذبات کو امن عالم کے قیام اور ایک ایسے معقول اور منصفانہ سماجی نظام کی تشکیل کے لئے ابھارتی ہے جو اس قسم کے المیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناممکن بنا دے۔

شاعر کا بلند ترین عمل ہم پر اس طرح اثر انداز ہوتا ہے جس طرح ایک گیت میں عام اور پیش پا افتادہ الفاظ موسیقی میں ڈھل جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے ذہنوں اور ہماری روحوں کے نہاں خانوں میں جو کوڑا کرکٹ اور عامیانہ پن پوشیدہ ہے وہ تحلیل ہو کر ایک ایسی مسرت اور ایسے جوش کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے جیسے نئی بلندیوں پر جاگی ہوئی نئی محبت۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ساحر نے اس نظم میں فن کی عظیم اور مقدس بلندیوں کو چھو لیا ہے۔ اس عظمت اور بلندی کو چھونے کا سبب صرف اس کا کمالِ فن ہی نہیں یہ سبب بھی ہے کہ اس کا فن آج کے ہندوستانی عوام کے دلوں میں بھری ہوئی شدید ترین اور متبرک خواہش کا مظہر ہے ایک نئی اور ولولہ انگیز زندگی کی تعمیر کی خواہش جو امن آزادی اور محبت سے معمور ہو۔

اس نظم میں ایک بھرپور نشاطیہ ماحول اور سحر انگیزی ہے جو خالصتہً ہندوستانی ہے۔ پھولوں سے لدی ہوئی چمپا کی ڈالی کی اس بوجھل خوشبو کی طرح جو ہمارے ہاں کی بارش بھری گرمی میں پھیلتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں ایک عالمگیر انسانی اپیل بھی ہے۔ کیونکہ یہ خوشبو اس باغ کے احاطے سے بہت دور دور تک پہنچتی ہے جہاں سے یہ خوشبو پیدا ہوئی۔

(انگریزی سے ترجمہ)
(۲۸ جولائی ۱۹۶۱ء)

☆

○

پھر نہ کیجے مری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھئے آپ نے پھر پیار سے دیکھا ہم کو

(ساحر)

کلامِ ساحر
نظمیں
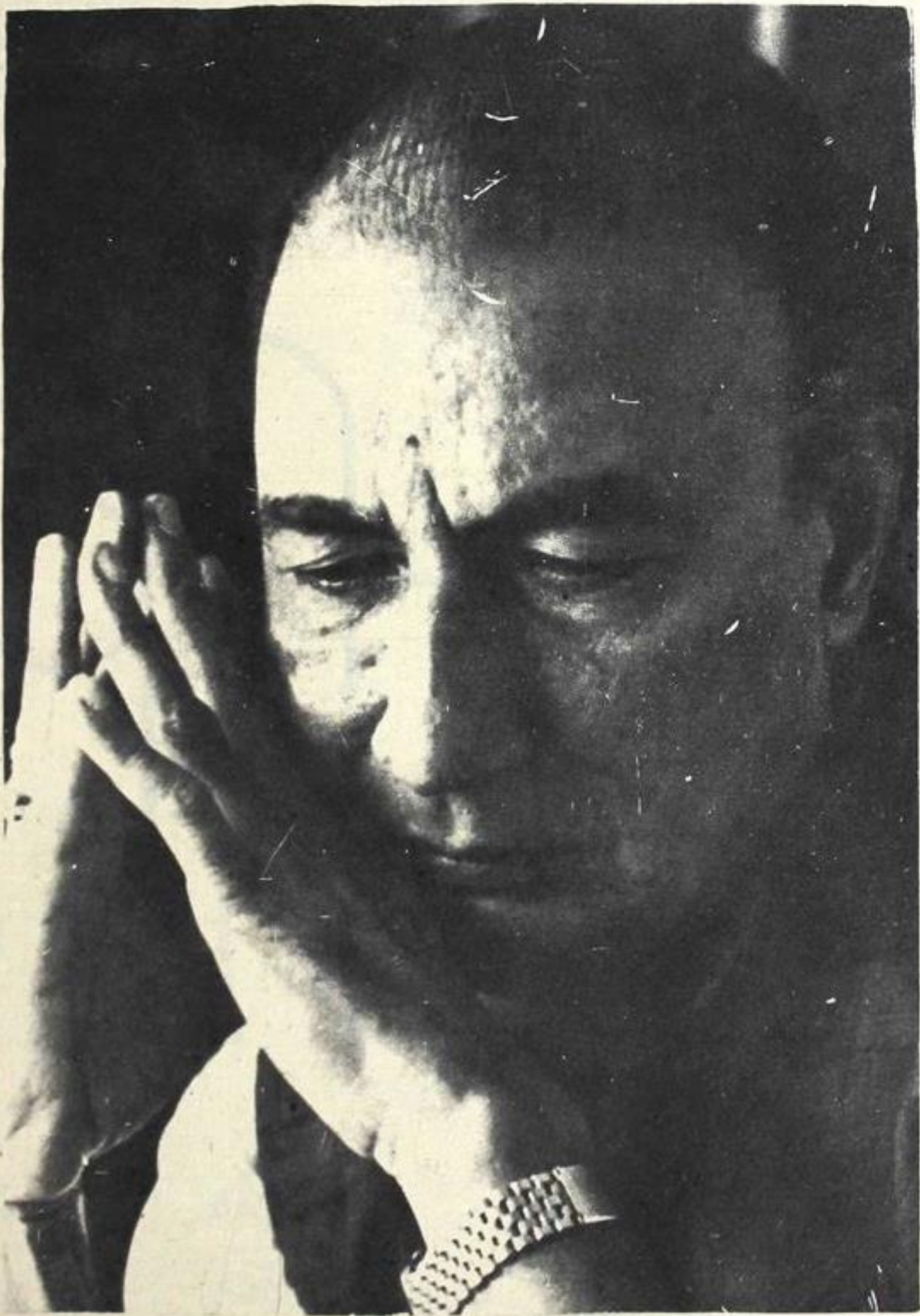
آؤ کہ کوئی خواب بُنیں

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں، کل کے واسطے
ورنہ یہ رات، آج کے سنگین دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بن سکیں

گو ہم سے بھاگتی رہی یہ تیز گام عمر
خوابوں کے آسرے پہ کٹی ہے تمام عمر

زلفوں کے خواب، ہونٹوں کے خواب اور بدن کے خواب
معراجِ فن کے خواب، کمالِ سخن کے خواب
تہذیبِ زندگی کے، فروغِ وطن کے خواب
زنداں کے خواب، کوچۂ دار و رسن کے خواب

یہ خواب ہی تو اپنی جوانی کے پاس تھے
یہ خواب ہی تو اپنے عمل کی اساس تھے
یہ خواب مر گئے تو بے رنگ ہے حیات
یوں ہے کہ جیسے دستِ تہہ سنگ ہے حیات

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں، کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بُن سکیں

میرے عہد کے حسینو!

وہ ستارے جن کی خاطر کئی بے قرار صدیاں
مری تیرہ بخت دنیا میں ستارہ وار جاگیں
کبھی رفعتوں پہ لپکیں، کبھی وسعتوں سے الجھیں
کبھی سوگوار سوئیں، کبھی نغمہ بار جاگیں

وہ بلند بام تارے، وہ فلک مقام تارے
جو نشان دے کے اپنا، رہے بے نشاں ہمیشہ
وہ حسیں، وہ نورزادے، وہ خلا کے شاہزادے
جو ہماری قسمتوں پر رہے حکمراں ہمیشہ

جنہیں مضمحل دلوں نے ابدی پناہ جانا
تھکے ہارے قافلوں نے جنھیں خضرِ راہ جانا
جنہیں کم سنوں نے چاہا کہ لپک کے پیار کرلیں
جنہیں مہ وشوں نے مانگا کہ گلے کا ہار کرلیں
جنہیں عاشقوں نے چاہا کہ فلک سے توڑ لائیں
کسی راہ میں بچھائیں، کسی سیج پر سجائیں
جنہیں بُت گروں نے چاہا کہ صنم بنا کے پوجیں
یہ جو دور کے حسیں ہیں، انہیں پاس لاکے پوجیں
جنہیں مطربوں نے چاہا کہ صداؤں میں پرولیں
جنہیں شاعروں نے چاہا کہ خیال میں سمولیں
جو ہزار کوششوں پر بھی شمار میں نہ آئے
کبھی خاکِ بے بضاعت کے دیار میں نہ آئے

جو ہماری دسترس سے رہے دُور دُور اب تک
ہمیں دیکھتے رہے ہیں جو بصد غرور اب تک

مرے عہد کے حسینوں! وہ نظر نواز تارے
مرا دورِ عشق پرور تمہیں نذر دے رہا ہے
وہ جنوں جو آب و آتش کو اسیر کر چکا تھا
وہ خلار کی وسعتوں سے بھی خراج لے رہا ہے

میرے ساتھ رہنے والو! میرے بعد آنے والو!
مرے دَور کا یہ تحفہ تمہیں ساز گار آئے
کبھی تم خلار سے گزرو کسی سیم تن کی خاطر
کبھی تم کو دل میں رکھ کر کوئی گل عذار آئے

(اسپتنک کی ایجاد پر)

اے شریف انسانو

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی اور معاہدۂ تاشقند کی سالگرہ پر نشر کی گئی۔

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسلِ آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں
امنِ عالم کا خون ہے آخر

بم گھروں پر گریں، کہ سرحد پر
روحِ تعمیر زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے
زیست فاقوں سے تلملاتی ہے

ٹینک آگے بڑھیں کہ پیچھے ہٹیں
کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے
فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ
زندگی میتوں پہ روتی ہے

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتیاج کل دے گی

اِس لئے اے شریف انسانو!
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں
شمع جلتی رہے تو بہتر ہے

۲

برتری کے ثبوت کی خاطر
خوں بہانا ہی کیا ضروری ہے
گھر کی تاریکیاں مٹانے کو
گھر جلانا ہی کیا ضروری ہے

جنگ کے اور بھی تو میداں ہیں
صرف میدانِ کشت و خون ہی نہیں
حاصلِ زندگی خرد بھی ہے
حاصلِ زندگی جنوں ہی نہیں

آؤ اس تیرہ بخت دنیا میں
فکر کی روشنی کو عام کریں
امن کو جن سے تقویت پہنچے
ایسی جنگوں کا اہتمام کریں

جنگ، وحشت سے بربریت سے
امن تہذیب و ارتقا کے لئے
جنگ، مرگ آفریں سیاست سے
امن، انسان کی بقا کے لئے

جنگ ، افلاس اور غلامی سے
امن ، بہتر نظام کی خاطر
جنگ ، بھٹکی ہوئی قیادت سے
امن ، بے بس عوام کی خاطر

جنگ ، سرمائے کے تسلّط سے
امن ، جمہور کی خوشی کے لئے
جنگ ، جنگوں کے فلسفے کے خلاف
امن ، پُرامن زندگی کے لئے

٥

پرچھائیاں

'پرچھائیاں' میری پہلی طویل نظم ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں امن و تہذیب کے تحفظ کے لئے جو تحریک چل رہی ہے، یہ نظم اس کا ایک حصہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر نوجوان نسل کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ اُسے جو دنیا اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی ہے وہ آئندہ نسلوں کو اس سے بہتر اور خوب صورت دنیا دے کر جائے۔ میری یہ نظم اسی کوشش کا ادبی روپ ہے۔

ساحر لدھیانوی

جوان رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خوابِ مرمریں کی طرح
حسین پھول، حسیں پتیاں، حسیں شاخیں
لچک رہی ہیں کسی جسمِ نازنیں کی طرح
فضا میں گھل سے گئے ہیں افق کے نرم خطوط
زمیں حسین ہے، خوابوں کی سرزمیں کی طرح
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح
وہ پیڑ جن کے تلے ہم پناہ لیتے تھے
کھڑے ہیں آج بھی ساکت کسی امیں کی طرح

انہیں کے سائے میں پھر آج دو دھڑکتے دل
خموش ہونٹوں سے کچھ کہنے سننے آئے ہیں
نہ جانے کتنی کشاکش سے، کتنی کاوش سے
یہ سوتے جاگتے لمحے چرا کے لائے ہیں

یہی فضا تھی، یہی رت، یہی زمانہ تھا
یہیں سے ہم نے محبت کی ابتدا کی تھی
دھڑکتے دل سے، لرزتی ہوئی نگاہوں سے
حضورِ غیب میں ننھی سی التجا کی تھی
کہ آرزو کے کنول کھل کے پھول ہو جائیں
دل و نظر کی دعائیں قبول ہو جائیں

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

تم آ رہی ہو زمانے کی آنکھ سے بچ کر
نظر جھکائے ہوئے اور بدن چرائے ہوئے
خود اپنے قدموں کی آہٹ سے جھینپتی ڈرتی
خود اپنے سائے کی جنبش سے خوف کھائے ہوئے
تصوّرات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

رواں ہے چھوٹی سی کشتی ہواؤں کے رخ پر
ندی کے ساز پہ ملّاح گیت گاتا ہے
تمہارا جسم ہر اک لہر کے جھکولے سے
مری کھُلی ہوئی باہوں میں جھول جاتا ہے
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

میں پھول ٹانک رہا ہوں تمہارے جوڑے میں
تمہاری آنکھ مسرّت سے جھکتی جاتی ہے
نہ جانے آج میں کیا بات کہنے والا ہوں
زبان خشک ہے آواز رکتی جاتی ہے
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

مرے گلے میں تمہاری گداز باہیں ہیں
تمہارے ہونٹوں پہ میرے لبوں کے سائے ہیں
مجھے یقین کہ ہم اب کبھی نہ بچھڑیں گے
تمہیں گمان کہ ہم مل کے بھی پرائے ہیں
تصوّرات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

مرے پلنگ پہ بکھری ہوئی کتابوں کو
ادائے عجز و کرم سے اٹھا رہی ہو تم
سہاگ رات جو ڈھولک پہ گائے جاتے ہیں
دبے سُروں میں وہی گیت گا رہی ہو تم
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

وہ لمحے کتنے دلکش تھے وہ گھڑیاں کتنی پیاری تھیں
وہ سہرے کتنے نازک تھے وہ لڑیاں کتنی پیاری تھیں
بستی کی ہر اک شاداب گلی خوابوں کا جزیرہ تھی گویا
ہر موجِ نفس، ہر موجِ صبا، نغموں کا ذخیرہ تھی گویا

ناگاہ لہکتے کھیتوں سے ٹاپوں کی صدائیں آنے لگیں
بارود کی بوجھل بُو لے کر پچھم سے ہوائیں آنے لگیں
تعمیر کے روشن چہرے پر تخریب کا بادل پھیل گیا
ہر گاؤں میں وحشت ناچ اٹھی، ہر شہر میں جنگل پھیل گیا
مغرب کے مہذب ملکوں سے کچھ خاکی وردی پوش آئے
اٹھلاتے ہوئے مغرور آئے، لہراتے ہوئے مدہوش آئے

خاموش زمیں کے سینے میں خیموں کی طنابیں گڑنے لگیں
مکھن سی ملائم راہوں پر بوٹوں کی خراشیں پڑنے لگیں

فوجوں کے بھیانک بینڈ تلے چرخوں کی صدائیں ڈوب گئیں
جیپوں کی سلگتی دھول تلے پھولوں کی قبائیں ڈوب گئیں

انسان کی قیمت گرنے لگی، اجناس کے بھاؤ چڑھنے لگے
چوپال کی رونق گھٹنے لگی، بھرتی کے دفاتر بڑھنے لگے
بستی کے سجیلے شوخ جواں، بن بن کے سپاہی جانے لگے
جس راہ سے کم ہی لوٹ سکے اس راہ پہ راہی جانے لگے
ان جانے والے دستوں میں غیرت بھی گئی، برنائی بھی
ماؤں کے جواں بیٹے بھی گئے، بہنوں کے چہیتے بھائی بھی
بستی پہ اداسی چھانے لگی، میلوں کی بہاریں ختم ہوئیں
آموں کی لچکتی شاخوں سے جھولوں کی قطاریں ختم ہوئیں
دھول اڑنے لگی بازاروں میں، بھوک اگنے لگی کھلیانوں میں
ہر چیز دکانوں سے اٹھ کر، روپوش ہوئی تہہ خانوں میں
بدحال گھروں کی بدحالی، بڑھتے بڑھتے جنجال بنی
مہنگائی بڑھ کر کال بنی، ساری بستی کنگال بنی
چرواہیاں رستہ بھول گئیں، پنہاریاں پنگھٹ چھوڑ گئیں
کتنی ہی کنواری ابلائیں، ماں باپ کی چوکھٹ چھوڑ گئیں

افلاس زدہ دہقانوں کے ہل بیل بکے، کھلیان بکے
جینے کی تمنّا کے ہاتھوں، جینے کے سب سامان بکے
کچھ بھی نہ رہا جب بکنے کو جسموں کی تجارت ہونے لگی
خلوت میں بھی جو ممنوع تھی وہ جلوت میں جسارت ہونے لگی

تصوّرات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
تم آ رہی ہو سرِ عام بال بکھرائے

ہزار گونہ ملامت کا بار اُٹھائے ہوئے
ہوس پرست نگاہوں کی چیرہ دستی سے
بدن کی جھینپتی عریانیاں چھپائے ہوئے
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

مَیں شہر جا کے ہر اک در پہ جھانک آیا ہوں
کسی جگہ مری محنت کا مول مِل نہ سکا
ستمگروں کے سیاسی قمار خانے میں
الم نصیب فراست کا مول مل نہ سکا
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

تمہارے گھر میں قیامت کا شور برپا ہے
محاذِ جنگ سے ہرکارہ تار لایا ہے
کہ جس کا ذکر تمہیں زندگی سے پیارا تھا
وہ بھائی "نرغۂ دشمن" میں کام آیا ہے
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

ہر ایک گام پہ بدنامیوں کا جمگھٹ ہے
ہر ایک موڑ پہ رسوائیوں کے میلے ہیں
نہ دوستی، نہ تکلف، نہ دلبری نہ خلوص
کسی کا کوئی نہیں آج سب اکیلے ہیں
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

وہ رہ گذر جو مرے دل کی طرح سونی ہے
نہ جانے تم کو کہاں لے کے جانے والی ہے
تمہیں خرید رہے ہیں ضمیر کے قاتل

اُفق پہ خونِ تمنّائے دل کی لالی ہے
تصوّرات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے
اُس شام مجھے معلوم ہوا، کھیتوں کی طرح اس دنیا میں
سہمی ہوئی دوشیزاؤں کی مسکانِ بھی بیچی جاتی ہے
اُس شام مجھے معلوم ہوا، اس کارگہِ زرداری میں
وہ بھولی بھالی روحوں کی پہچان بھی بیچی جاتی ہے

اُس شام مجھے معلوم ہوا، جب باپ کی کھیتی چھن جائے
ممتا کے سنہرے خوابوں کی انمول نشانی بکتی ہے
اُس شام مجھے معلوم ہوا، جب بھائی جنگ میں کام آئیں
سرمائے کے قحبہ خانے میں بہنوں کی جوانی بکتی ہے
سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے

تم آج ہزاروں میل یہاں سے دور کہیں تنہائی میں
یا بزمِ طرب آرائی میں
میرے سپنے بنتی ہوگی بیٹھی آغوش پرائی میں

اور میں سینے میں غم لے کر دن رات مشقت کرتا ہوں
جینے کی خاطر مرتا ہوں
اپنے فن کو رسوا کر کے اغیار کا دامن بھرتا ہوں

مجبور ہوں میں، مجبور ہو تم، مجبور یہ دنیا ساری ہے
تن کا دکھ من پر بھاری ہے
اس دَور میں جینے کی قیمت، یا دار و رسن یا خواری ہے

میں دار و رسن تک جا نہ سکا، تم جہد کی حد تک آ نہ سکیں
چاہا تو مگر اپنا نہ سکیں
ہم تم دو ایسی روحیں ہیں جو منزلِ تسکیں پا نہ سکیں

جینے کو جیئے جاتے ہیں مگر، سانسوں میں چتائیں جلتی ہیں
خاموش وفائیں جلتی ہیں
سنگین حقائق زاروں میں، خوابوں کی ردائیں جلتی ہیں

اور آج جب اِن پیڑوں کے تلے پھر دو سائے لہرائے ہیں
پھر دو دل ملنے آئے ہیں
پھر موت کی آندھی اٹھی ہے، پھر جنگ کے بادل چھائے ہیں

میں سوچ رہا ہوں ان کا بھی اپنی ہی طرح انجام نہ ہو
ان کا بھی جنوں ناکام نہ ہو
ان کے بھی مقدّر میں لکھی، اک خون میں لتھڑی شام نہ ہو

سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے ابتک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے

ہمارا پیار حوادث کی تاب لا نہ سکا
مگر انہیں تو مرادوں کی رات مل جائے
ہمیں تو کشمکشِ مرگِ بے اماں ہی ملی
انہیں تو جھومتی گاتی حیات مل جائے

بہت دنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا
کہ جب جوان ہوں بچے تو قتل ہو جائیں
بہت دنوں سے ہے یہ خبط حکمرانوں کو
کہ دور دور کے ملکوں میں قحط بو جائیں

بہت دنوں سے جوانی کے خواب ویراں ہیں
بہت دنوں سے محبت پناہ ڈھونڈتی ہے
بہت دنوں سے ستم دیدہ شاہراہوں میں
نگاہِ زیست کی عصمت پناہ ڈھونڈتی ہے

چلو کہ آج سبھی پائمال روحوں سے
کہیں کہ اپنے ہر اک زخم کو زباں کر لیں
ہمارا راز، ہمارا نہیں سبھی کا ہے
چلو کہ سارے زمانہ کو راز داں کر لیں

چلو کہ چل کے سیاسی مقامروں سے کہیں
کہ ہم کو جنگ و جدل کے چلن سے نفرت ہے
جسے لہو کے سوا کوئی رنگ راس نہ آئے
ہمیں حیات کے اس پیرہن سے نفرت ہے

کہو کہ اب کوئی قاتل اگر اِدھر آیا

تو ہر قدم پہ زمیں تنگ ہوتی جائے گی
ہر ایک موجِ ہوا رخ بدل کے جھپٹے گی
ہر ایک شاخ رگِ سنگ ہوتی جائے گی

اُٹھو کہ آج ہر اک جنگ جو سے یہ کہہ دیں
کہ ہم کو کام کی خاطر کلوں کی حاجت ہے
ہمیں کسی کی زمیں چھیننے کا شوق نہیں
ہمیں تو اپنی زمیں پر ہلوں کی حاجت ہے

کہو کہ اب کوئی تاجر ادھر کا رخ نہ کرے
اب اس جگہ کوئی کنواری نہ بیچی جائے گی
یہ کھیت جاگ پڑے اُٹھ کھڑی ہوئیں فصلیں
اب اس جگہ کوئی کیاری نہ بیچی جائے گی

یہ سر زمین ہے گوتم کی اور نانک کی
اس ارضِ پاک پہ وحشی نہ چل سکیں گے کبھی
ہمارا خون امانت ہے نسلِ نو کے لئے
ہمارے خون پہ لشکر نہ پل سکیں گے کبھی

کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
تو اس دمکتے ہوئے خاکداں کی خیر نہیں
زمیں کی خیر نہیں، آسماں کی خیر نہیں

گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

غزل کا مزاج داں
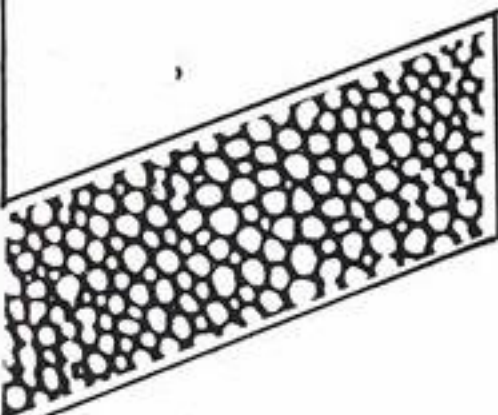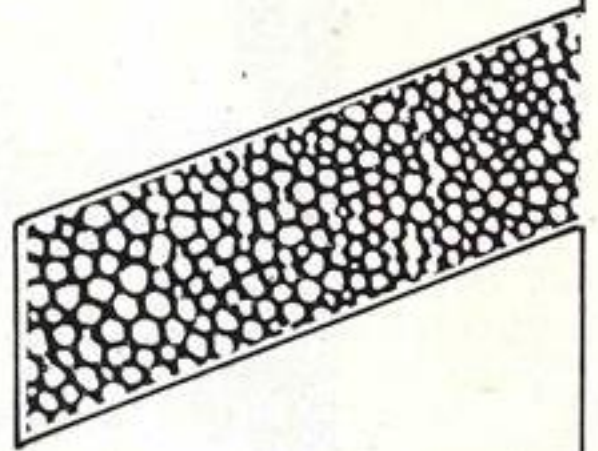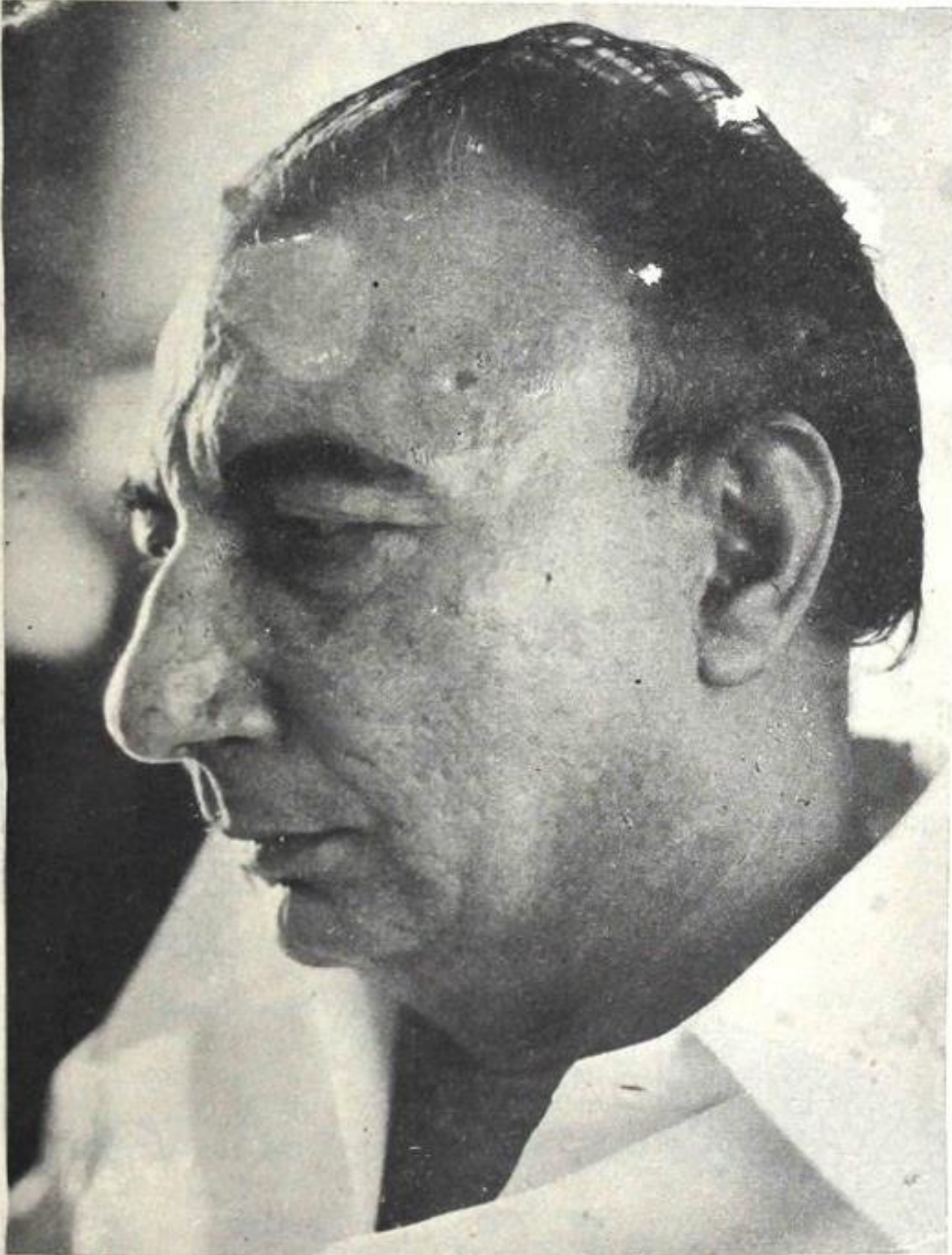
ساحر کی غزل گوئی

نازصدیقی (مرحومہ)

یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ نظم نگار شاعر اچھا غزل گو نہیں ہو سکتا اس طرح جو شاعر غزل گوئی میں کمال حاصل کرتے ہیں وہ اچھی نظم نہیں کہہ سکتے فانی بدایونی نے غزل گوئی کے عنوان سے اپنی ایک ریڈیو تقریر میں اس خیال کی تائید کرتے ہوئے یہ استدلال پیش کیا تھا۔

"..... بعض طبائع اختصار پسند ہوتے ہیں وہ وسیع مضامین کو مختصر سے مختصر الفاظ میں ادا کر دینے کی قدرت رکھتے ہیں اور بعض ذرا سی بات کو ذرا سے خیال کو جب تک جی بھر کے طول نہ دیں لیں سمجھتے ہیں کہ حق ادا نہیں ہوا اور سمجھتے کیا ہیں حقیقت بھی یہ ہے کہ اجمال ان کے بس کی بات نہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ معذور ہیں کوئی بھی اس اعتبار سے قابل الزام نہیں۔ نتیجۃً یہ لازم آتا ہے کہ غزل گوئی کے اہل وہی لوگ ہوتے ہیں، جو کسی کیفیت کو مختصر الفاظ میں ادا کرنے کی فطرتی قابلیت رکھتے ہیں، جو یہ نہیں کر سکتے وہ نظم کہنے پر مجبور ہیں اور انہیں نظم ہی کہنا بھی چاہیے۔" [1]

فانی نے جو استدلال پیش کیا ہے وہ نفسیاتی اور فنی اعتبار سے وزن رکھتا ہے لیکن اسے ایک کلیہ کے طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا یہ روایت قدیم زمانے سے رہی ہے کہ کسی شاعر کو ایک صنف سخن میں زیادہ شہرت اور مرتبہ حاصل ہو جائے تو دوسری اصناف میں اس کے کارناموں سے صرف نظر کر لیا جاتا ہے چنانچہ اکثر مورخینِ ادب اور نقادوں نے جہاں میرؔ کو غزل کا اور سوداؔ کو قصیدے کا استاد تسلیم کیا ہے۔ وہیں اپنے تنقید سے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش ہے کہ دوسرکا اصناف میں ان شاعروں کی تخلیقات زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں اس تنقید کا یہ اثر ہوا کہ زمانہ حال تک بھی سوداؔ کی غزلیہ شاعری کو ناقابل اعتنا سمجھا گیا ادھر بعض نقادوں نے سوداؔ کی غزل پر توجہ کی اور

---

[1] ڈاکٹر مغنی تبسم فانی کی نادر تحریریں ص ۱۰۳

اور اس کی خوبیوں کو اجاگر کیا تو سودا کا ذکر اب ایک اہم غزل گو کی حیثیت سے بھی کیا جانے لگا ہے۔ غالب کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ ان کی غزل گوئی کے مقابلے میں قصیدہ نگاری کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی اور یہ خیال عام ہو گیا کہ قصیدہ نگاری کی حیثیت سے ذوق کا مقام غالب سے بہت اونچا ہے۔ یہاں بھی یہی تصور کارفرما رہا ہے کہ اچھا غزل گو شاعر مربوط اور بیانیہ اصناف میں کامیاب ثابت نہیں ہوتا۔ چونکہ غالب نے غزل میں ایک امتیازی مقام حاصل کر لیا تھا اس لئے یہ فرض کر لیا گیا کہ اس پائے کا قصیدہ لکھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی حالاں کہ بہ نظر وسعت دیکھا جائے تو قصیدہ نگاری کی حیثیت سے غالب کو ذوق پر بلکہ بعض اعتبار سے سودا پر بھی فوقیت دی جا سکتی ہے۔ حضرت علیؑ کی منقبت میں غالب نے جو قصیدہ لکھا اردو کی ساری منقبتی شاعری اس کا جواب پیش نہیں کر سکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایجاز اور رایمائیت جو غزل کا خاص فنی وصف ہے اسے غزل کے علاوہ دوسرے اصناف میں برتا جا سکتا ہے اور برتا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس وصف کے بغیر غزل سطحی ہو جاتی ہے اور یہی وصف دوسری اصناف کے حُسن اور معنویت کو بڑھاتا ہے۔ چنانچہ غالب کے متذکرہ قصیدے کو سودا اور ذوق کے قصیدوں پر اسی بناء پر فوقیت حاصل ہے اور یہی وصف اقبال کی بہترین نظموں میں بھی نمایاں ہے۔ اقبال کی نظموں میں ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں جنھیں نظم سے الگ کر کے پڑھا جائے تو وہ غزل کے شعر کی طرح ایک مکمل مفہوم اور بھرپور تاثر کے حامل نظر آتے ہیں جدید نقاد خاص طور پر تاثراتی نقاد شاعری کو مختلف اصناف میں بانٹنے اور ہر صنف کے لئے الگ قواعد اور قوانین وضع کرنے کی مخالفت کرتے ہیں۔

ساحر ویسے ایک نظم نگار شاعر کی حیثیت سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں اور زیادہ تر انہوں نے نظمیں لکھی ہیں لیکن صنف غزل میں بھی ان کی اپنی انفرایت نمایاں ہے اور اس مفروضے کی نفی کرتے ہیں کہ ایک نظم نگار شاعر اچھا غزل گو نہیں ہو سکتا۔ ساحر کو غزل گوئی سے فطری مناسبت بھی ہے ان کی نظمیں بھی تغزل سے خالی نہیں ہوتیں۔ مجنوں گورکھپوری نے وصف کیطرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''ساحر شاعری کی فطری صلاحیت اور بے دریغ قوت لے کر آئے ہیں وہ چاہے غزل کہیں چاہے نظم چاہے غزل نما نظم لکھیں یا نظم نما غزل وہ بہر صورت شاعری کا پورا حق ادا کرنے کی قابلیت اپنے اندر رکھتے ہیں اور یہ بڑی بات ہے کہ وہ خارجی عوارض اور داخلی تاثرات کو سلیقے کے ساتھ سمو کر ایک آہنگ بنانے کا فن خوب جانتے ہیں۔ ان کے ہر مصرعے میں مادی محرکات و موثرات کے احساس کے ساتھ وہ کیفیت بڑے سلیقے کے ساتھ گھلی ملی ہوتی ہے جو صرف بے ساختہ داخلی ابھار سے پیدا ہو سکتی ہے ہم کو اصرار ہے کہ ساحر نظم کہیں یا غزل ان کے کلام کی سب سے زیادہ ناگریز اور ناقابل انکار خصوصیت غزلیت یا تغزل ہے۔'' [1]

ساحر کے کلام میں غزل کا سرمایہ بظاہر بہت محدود نظر آتا ہے ان کے مجموعۂ کلام "تلخیاں" میں صرف نو غزلیں، غزل کے عنوان کے تحت شامل ہیں اور دوسرے مجموعۂ کلام "آؤ کہ کوئی خواب بُنیں" میں غزل کے عنوان کے تحت کوئی تخلیق شامل نہیں پہلے مجموعے میں مزید ۳ غزلیں ہیں جن کو "اشعار" کا عنوان دیا گیا ہے اسی طرح دوسرے مجموعہ میں ۱۲ غزلیں شامل ہیں لیکن ان پر نظم کی طرح مختلف

1۔ مجنوں گورکھپوری۔ صبا حیدرآباد دکن، فروری۔ مارچ ۱۹۵۷ء)

عنوانات لگائے گئے ہیں اور زیادہ تر عنوانات یا تو غزل کی ردیف ہیں یا مصرعہ اولیٰ کے ابتدائی الفاظ۔ ان دونوں مجموعوں میں کل ۲۶ غزلیں شامل ہیں یہ غزلیں ان کے سوا ہیں جو ساحر نے فلموں کے لئے لکھی ہیں۔ انسان کے مزاج اور فنی اختلاف کی بحث سے قطع نظر جب ایک اچھا اور منفرد شاعر نظم نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہے تو وہ صنف غزل میں ایک نئی آواز اور آہنگ کا اضافہ کرتا ہے۔ اقبال ایک نظم گو شاعر تھے لیکن جب انہوں نے غزل کی طرف توجہ کی تو اس کی دنیا ہی بدل دی اس کا اعتراف نظیر صدیقی نے اس طرح کیا ہے۔

"غزل میں اقبال نہ صرف معنوی بلکہ لسانی جدتوں کے اعتبار سے بھی غالب سے آگے بڑھ گئے ہیں اقبال کی زبان غزل کی مروجہ زبان سے ذرا بھی میل نہیں کھاتی اس کے باوجود اگر ان کی زبان نامانوس معلوم نہیں ہوتی تو اس کی وجہ اقبال کی غیر معمولی فنی چابک دستی کے سوا کچھ نہیں۔ . . غزل میں اقبال نے ایک بہت بڑی جدت یہ پیدا کی کہ اس کا لہجہ اور آہنگ یکسر بدل دیا" [۱]

اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ غزل کی روایتی زبان اور بندھے ٹکے استعارے استعمال نہیں کرتے بلکہ اس کو اظہار کے نئے پیرایوں سے روشناس کراتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ساحر کی غزل بھی عام ڈگر سے ہٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے ان کے اظہار کے پیرایوں میں ندرت اور تازگی ملتی ہے۔ ان کی غزلوں میں روایتی مضامین شاذ ہی ملیں گے۔ ساحر نے غزل کی بنیادی روایات کی پاس داری کرتے ہوئے اس میں نظم کی بعض خصوصیات سمونے کی کوشش کی ہے شاید اس وجہ سے بعض ایسی غزلوں جن میں مضمون کا تسلسل یا موضوع کی مرکزیت نمایاں ہے غزل کہنے کے بجائے اشعار کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے یا پھر نظم کی طرح ان پر بھی عنوانات لگائے گئے ہیں لیکن ہم ان کو غزل ہی کہیں گے کیوں کہ

۱۔ ان کا سانچہ غزل کا ہے۔
۲۔ ہر شعر تاثر کی انفرادیت اور خیال کی وحدت کا حامل ہے مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں

بیگانۂ صفت جادۂ منزل سے گزر جا
ہر چیز سزاوار نظارہ نہیں ہوتی

(اشعار)

دشمنوں ہی سے بیر نبھ جائے
دوستوں سے تو آشنائی گئی

(یہ زمین جسقدر)

اس طرح زندگی نے دیا ہے ہمارا ساتھ
جیسے کوئی نباہ رہا ہو رقیب سے

(دیکھا ہے زندگی کو)

۱۔ "جدید غزل پاکستان اور ہندوستان میں"، فنون لاہور۔ (جدید غزل نمبر جنوری ۱۹۶۹ء) ص ۱۵

ساحر کی چند ایسی ہی غزلوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، بعض نقادوں نے بھی انہیں ناکام غزل گو قرار دیا ہے۔ چنانچہ ظفر ادیب لکھتے ہیں۔

"ان کی شاعری نظمیہ ہے غزلیہ نہیں۔ اس میں نظم کا عنصر نمایاں رہتا ہے مزاج بھی نظم پسند ہی ہے، کہنے کا انداز بھی اور سوچنے کا طور بھی نظم پسند ہی ہے، مگر وہ غزل میں خاصی بات بنائے رکھتے ہیں اور فضا کو غیر غزلیہ محسوس نہیں ہونے دیتے۔۔۔ ورنہ ان کی غزل کی سرحد کو نہ چھو سکتیں اور نظم سے بہت الگ ہوتے ہوئے بھی غزل نہ کہلائی جا سکتیں۔" [1]

اس میں شک نہیں کہ ساحر کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن کسی خیال یا جذبے کو وضاحت کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ ان میں مفہوم کی صرف ایک ہی سطح ابھرتی ہے۔ مثلاً

بھڑکا رہے ہیں آگ لبِ نغمہ گر سے ہم
خاموش کیا رہیں گے زمانے کے ڈر سے ہم

جراءتِ انساں پہ گو تادیب کے پہرے رہے
فطرتِ انساں کو کب زنجیر پہنائی گئی

لیکن انہوں نے خالص استعاراتی زبان استعمال کی اور حذف و ایماء سے بھی کام لیا ہے شعر پہلو دار ہو گئے ہیں۔

گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم

اس شعر میں حذف و ایماء سے کچھ اس طرح کام لیا گیا ہے کہ دو مصرعوں میں حیات عشق کی ایک طویل روداد سما گئی ہے پہلا مصرعہ "گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے" جدائی کے حادثے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ اس جدائی کی نوعیت کیا ہے۔ محبوب اور عاشق کی جدائی دائمی مفارقت کی شکل رکھتی ہے۔ ساحر کی شاعری کے قاری کے لئے یہ جاننا مشکل نہیں ہے کہ اس جدائی کا سبب کیا ہے۔ محبوبہ اور عاشق اس لئے ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے کہ سماج اور خاندان کے ادارے اس ملاپ کے خلاف ہیں اوّل تو عشق ہی ان کے نزدیک ایک ناقابل معافی گناہ ہے پھر یہ عشق نتیجہ خیز اس لئے نہیں ہو سکتا کہ عاشق مفلوک الحال شاعر ہے اور اس کی محبوبہ اونچے طبقے سے تعلق رکھتی ہے محبوبہ کی شادی کسی اور شخص سے طے کر دی جاتی ہے جو صاحب جائیداد ہے بنگلہ اور کار رکھتا ہے اور بینک میں جس کا کافی روپیہ جمع ہے۔ ہمارے سماج میں عورتوں پر ایسی پابندیاں ہیں کہ شادی کے بعد اس کا بہت ہی کم امکان ہے کہ وہ زندگی میں کبھی ایک دوسرے کی صورت دیکھ سکیں۔ ایسا ہو تو وہ ایک اتفاقی امر ہوگا۔ زندگی میں اگر ایسا اتفاق پیش آ جائے تو شاعر محبوبہ سے کہتا ہے کہ ہم اپنا حال تری بے بسی سے پوچھیں گے۔ مدّت کے بچھڑے ہوئے جب ملتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کا حال دریافت کرتے ہیں لیکن شاعر اپنی محبوبہ کا حال دریافت کرنے کے بجائے خود اپنا حال پوچھتا ہے گویا وہ اس تمام مدّت میں خود اپنے حال سے بے خبر رہا۔ کسی اور نے بھی نہ تو اس کا حال پوچھا، نہ ہی اس کو اس کی حالت سے باخبر کیا وہ محبوبہ سے ہی اپنا حال دریافت

کرنا نہیں چاہتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ اتنی بے بس ہے کہ اس کا حال نہیں پوچھ سکے گی یا اس کی حالت پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکے گی۔ البتہ محبوبہ کی بے بسی اس کو آئینہ دکھادے گی گویا عاشق کے حال زار اور محبوبہ کی بے بسی میں اتنا گہرا رشتہ ہے کہ محبوبہ کی بے بسی کو دیکھ کر اسے خود اپنی حالت کا اندازہ ہوجائے گا۔

یہ منظر کون منظر ہے کہ پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گذری

اس شعر کو غزل کے دیگر اشعار کے تسلسل میں پڑھا جائے تو آزادی کے بعد مذہب کے نام پر برصغیر میں ہونے والے بھیانک اور شرمناک فسادات کا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے کہ کس طرح ہری بھری بستیاں دیکھتے ہی دیکھتے شعلہ پوش ہوکر سیہ خانوں میں تبدیل ہوگئیں اس مخصوص حوالے کے بغیر بھی شعر زندگی کے عام مشاہدے اور تجربے کا جذباتی اظہار ہے۔ فنا اور ناپائیداری کی مؤثر تصویریں میرؔ اور دوسرے شاعروں کے کلام میں بھی مل جاتی ہیں لیکن ساحرؔ نے ایک منفرد اور جداگانہ زاویے سے اسے پیش کیا ہے "شبستان"، کا لفظ ساحرؔ کی شاعری میں ایک علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اونچے طبقے کی عیش کوشیوں اور سیہ کاریوں کی طرف ہمارے ذہن کو منتقل کرتا ہے اس اعتبار سے "شبستان" ایک سیاہ خانہ ہے شبستان خواہ کسی کا ہو اس کی روشنی آخر کار گل ہوجاتی ہے اور وہ تاریکی کا مکان بن جاتا ہے۔

شبستاں دل کا استعارہ بھی ہو سکتا ہے جس میں حسین یادوں کی شمعیں روشن تھیں لیکن اب وہی دل سیہ خانہ بن گیا۔ سیہ خانوں سے یہ پوچھنا کہ شبستانوں پہ کیا گذری تجاہل عارفانہ ہے۔ کیوں کہ شبستان پر جو گزرچکی ہے اسکی روداد سیہ خانے زبانِ حال سے بیان کر رہے ہیں۔

ساحرؔ کی غزلوں اور اشعارِ غزل کو دو گرہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ وہ غزلیں اور اشعار جن میں عشق کے جذبات اور تجربات پیش کئے گئے ہیں۔

۲۔ وہ غزلیں اور اشعار جن میں زیادہ تر سیاسی مسائل کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اول الذکر قسم کی غزلیہ شاعری میں عشق کے تجربات اور مسائل کے تعلق سے ساحرؔ کا وہی مخصوص رویہ جھلکتا ہے جو ان کی عشقیہ نظموں میں بھی نمایاں ہے۔ اس عشق میں محبوب کے قرب و وصال کی گھڑیاں بہت مختصر رہی ہیں۔ اول تو غم دوراں نے اس کی مہلت کم دی پھر سماج نے ان چاہنے والوں کے درمیان مستقل طور پر دیواریں کھڑی کر دیں، چنانچہ اس قسم کے اشعار جن میں آغازِ محبت عشق کی کیفیات اور معاملات کا بیان ہو ساحرؔ کی غزلوں میں خال خال ہی ملتے ہیں۔

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے

۱؎ گفت و شنید ص ۲۳۷

نگاہیں جھکتے جھکتے بھی ہم ٹکراہی جاتی ہے
محبت چھپتے چھپتے بھی نمایاں ہو ہی جاتی ہے
جب کبھی ان کی توجہ میں کمی پائی گئی
از سر نو داستان شوق دھرائی گئی
انہیں پتہ بھی چلے اور وہ خفا بھی نہ ہوں
اِس احتیاط سے کیا مدعا کی بات کریں

محبوب سے عرضِ مدعا کرنے اور دل کی حالت بیان کرنے کی خواہش اور ناکامی کا اظہار میرؔ نے بار بار باندھا ہے۔ ان کا یہ شعر مشہور ہے۔

کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

میرؔ کے علاوہ اور شاعروں نے بھی مختلف انداز میں اس خیال کا اعادہ کیا ہے لیکن ساحرؔ نے ایک نیا نکتہ پیدا کیا ہے۔ کشمکشِ اظہار کا جو نفسیاتی سبب پیش کیا گیا ہے وہ اصلیت پر مبنی اور عام تجربے سے قریب ہے لیکن کسی شاعر کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوئی تھی۔ اظہارِ حال کے سلسلے میں عشق کی احتیاط کے مقابل حُسنِ محتاط کی کیفیت کو بھی ساحرؔ نے منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔

یہ اجتناب ہے عکسِ شعورِ محبوبی
یہ احتیاط، ستم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

محبوب کی احتیاط کا تقاضہ ہے کہ وہ اجتناب سے کام لے اور یہ اجتناب عاشق کے حق میں سم بن جاتا ہے لیکن شاعر محسوس کرتا ہے کہ اس اجتناب (جو بظاہر احتیاط معلوم ہوتا ہے) کا اصل سبب محبوب کا شعور ہے کہ وہ کسی کا محبوب ہے۔ یا محبوبیت رکھتا ہے اس سبب کا افشا ہونا عاشق کے لئے مژدۂ جاں فزا بن جاتا ہے۔ اس صورت میں محبوب کی احتیاط عاشق کے لئے ستم ہی نہیں کچھ اور چیز بن جاتی ہے۔

عشق میں تفرقہ ڈالنے والی   ایک قوت زمانہ ہے زمانہ کی اصطلاح میں سماج اور غمِ حیات دونوں شامل ہیں جیسا کہ ساحرؔ کے اس شعر سے ظاہر ہے۔

یہ کس مقام پہ پہونچا دیا زمانے نے
کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

یہاں جو تجربہ اور احساس پیش کیا گیا ہے وہ اردو کی غزلیہ شاعری میں ناپید نہ سہی عام نہیں ہے۔ اسی حالت کو غالبؔ نے دوسرے انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

دونوں اشعار میں زمانہ اور غمِ زمانہ کا کردار ایک ہے۔ لیکن اس کے نتائج پیش کرتے ہوتے جس ردِ عمل کا اظہار کیا گیا ہے وہ دونوں شعروں میں مختلف ہے۔ غالب کو اس بات کا غم ہے کہ زمانہ لذتِ الم اٹھانے کی فرصت نہیں دیتا۔ غمِ عشق غم ہونے کے باوجود ایک دلکشی اور لذت رکھتا ہے یہ بات غمِ زمانہ میں نہیں پائی جاتی۔ ساحر کے شعر کی کیفیت اس سے بالکل جداگانہ ہے اول تو اس کا انداز غالب کے شعر کی طرح بیانیہ ہے۔ یہ کس مقام پہ پہونچا دیا کہنے میں استعجاب کے ساتھ حزن کی کیفیت بھی شامل ہے عاشق کی زندگی کی خوش بختی یہ ہے کہ وہ محبوب کے اختیار میں ہو لیکن زمانے نے اس کو محبوب سے جدا کر کے ایسے مقام پر پہونچا دیا ہے جہاں اس کی زندگی محبوب کی دسترس سے باہر ہو چکی ہے۔

ساحر کی عشقیہ شاعری کا ایک خاص موضوع "ترکِ الفت" ہے ترکِ الفت کے مضامین قدیم شعراء نے بھی باندھے ہیں۔ واسوخت کی بنیاد اسی پر قائم ہوئی۔ لیکن واسوخت کا شاعر حقیقت میں ترکِ الفت نہیں کرتا۔ وہ محبوب کو اس کی بے وفائی کا احساس دلانے کے لئے جلی کٹی سناتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ محبوب پر اس کی دھمکیوں نے اثر کیا ہے تو پھر اس کے دل سے اس صدمے کے اثر کو مٹانے لئے کہتا ہے کہ یہ باتیں تو محض چھیڑ کے لئے تھیں ورنہ اس کی محبت میں کوئی کمی ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ غزل میں ترکِ الفت کے مضمون کو حسرت نے نت نئے پیرایوں میں باندھا ہے لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ محبت ایسی چیز نہیں جسے ارادتاً ترک کیا جاسکے۔ محبوب کو بھلانے کی کوشش بے سود ہی ثابت ہوتی ہے۔

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

عشق کی اس قدیم روایت کی پاس داری میں ساحر نے بھی چند شعر ایسے کہے ہیں جن میں ظاہر ہوتا ہے کہ ترکِ تعلق اور ترکِ محبت کی خواہش دونوں ہی انہیں گوارا نہیں لیکن عشق میں کبھی کبھی ایسی صورت حال ضرور پیدا ہوتی ہے جیسا کہ وہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

میں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے

ترکِ محبت کی آرزو ایک غیر معقول آرزو ہے، محض دیوانگی ہے غمِ روزگار کے ہاتھوں میں اپنے حواس کھو بیٹھا ہوں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ میں تم سے ترکِ محبت کی آرزو کروں۔ ایک اور شعر میں ترکِ تعلق اور ترکِ محبت کا فرق نفسیاتی ژرف نگاہی کے ساتھ اس طرح نمایاں کیا گیا ہے۔

ہم سے اگر ہے ترکِ تعلق تو کیا ہوا
یارو کوئی تو ان کی خبر پوچھتے چلو

اس بات سے قطع نظر کہ صحیح محاورہ خبر لینا ہے اور ردیف کی مجبوری سے خبر پوچھنا باندھا گیا ہے، اس شعر میں محبت

کی نفسیات کو نہایت ہی فطری اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

بعض ترقی پسند شعرا نے غمِ زندگی اور غمِ انسانیت کو غمِ محبت پر ترجیح دیتے ہوئے ترکِ عشق کے راگ الاپے ہیں۔

ساحر نے ایک شعر میں اسی خیال کو یوں پیش کیا ہے

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

لیکن اس جواز کے ساتھ ترکِ الفت کی بات ساحر نے دو ایک بار یوں ہی چلتے چلتے کہہ دی ہے۔ ساحر کے ہاں ترکِ الفت کا میلان ایک نفسیاتی سبب رکھتا ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں ساحر ایک فراق پسند عاشق ہے وہ اس لذت کا شیدائی بھی نہیں جو دوری کے غم میں ہوتی ہے بلکہ ایسا کہ ساحر خود کہتے ہیں ان کی غم پسندی کا اصل سبب ان کی اذیت کوشی ہے۔

یہ تیری یاد ہے یا میری اذیت کوشی
ایک نشتر سا رگِ جاں کے قریب آج بھی ہے

ساحر کی غزلوں میں عشقیہ اشعار کا تناسب مسائلی شاعری کے مقابلے میں بہت کم ہے ترقی پسند شعرا نے سیاسی اور سماجی مسائل کو اپنی غزل کا خاص موضوع بنایا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نوجوان شاعروں نے ابتدا میں غزل گوئی سے احتراز کیا۔ رفتہ رفتہ غزل گوئی کی مخالفت ختم ہوگئی اور ترقی پسند شعرا بھی اس صنف میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

غزل میں سیاسی مسائل کی پیش کشی ترقی پسندوں سے مخصوص نہیں لیکن ترقی پسند شعرا کی سیاسی شاعری ان کے پیش رو شاعروں کے سیاسی کلام سے نمایاں طور پر مختلف ہے۔ پیش رو شعرا کے سیاسی خیالات کسی سماجی نظریہ اور فلسفۂ حیات سے مربوط نہ تھے۔ ترقی پسند شعرا مخصوص زاویئے سے دیکھتے تھے اس کا یہ فائدہ ہوا کہ وہ غزل کو ایک نئی استعاراتی زبان اور فرہنگِ شعر دے سکے۔ ساحر نے غزل کے مزاج اس کی روایات اور آداب کو ہمیشہ ملحوظ رکھا فیض، مجروح اور ساحر اس اعتبار سے قابلِ تحسین ہیں کہ یکساں شعری روایت اور فرہنگِ شعر سے استفادہ کرنے کے باوجود ان کی غزل گوئی کا انداز اور زبان کو برتنے کا سلیقہ ایک دوسرے سے مختلف ہے فیض اور مجروح دونوں نے غزلیہ شاعری کے علائم اور استعاروں کو وسعت دی ہے۔ فیض کے اکثر اشعار میں ہماری توجہ سب سے پہلے نئے تشبیہی علاقے پر مبذول ہوتی ہے اور یہاں تعمیم سے کام لیا ہے۔ قدیم تشبیہی علاقے والے مفہوم کی طرف بعد ازاں ذہن منتقل ہوتا ہے مثلاً

ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہِ وفا شعاراں

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گذری ہے

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو پند گرو راہ گزر تو دیکھو

جنھیں خبر تھی کہ شرطِ نواگری کیا ہے
وہ خوش نوا گلہ، قید و بند کیا کرتے

ان اشعار کو پڑھتے ہوئے اور بالخصوص جب یہ معلوم ہو کہ یہ فیض کا کلام ہے تو ہمارے ذہن میں سیاسی حوالے ابھرنے لگتے ہیں۔ پھر بھی فیض کی غزل میں ان کی نظموں کے برخلاف استعارے استعاریت رکھتے ہیں محض اصطلاح یا کوڈ نہیں بن جاتے۔

مجروح نے ابتدا میں غیر سیاسی غزلیں کہیں پھر غزل کے استعاروں کی توسیع اس طرح کی کہ وہ سیاسی مفہوم پر حاوی ہونے لگے چند غزلوں میں استعاروں کا پردہ اٹھا دیا اور براہ راست سیاسی خیالات نظم کرنے لگے بعد ازاں پرانی روش پر چل پڑے اور کسی قدر فیض کے اسلوب سے بھی استفادہ کیا۔ ساحر کی غزل گوئی کا انداز فیض اور مجروح سے مختلف ہے ان کے اشعار یا تو غیر سیاسی ہوتے ہیں یا مسائل وہ تعمیم سے کام لیتے بھی ہیں تو اس طرح نہیں کہ عشقیہ شعر میں سیاسی مفہوم بھی پنہاں ہوں۔ البتہ ایسی تعمیم ضرور پائی جاتی ہے جس میں سیاسی اشعار میں زندگی کے دوسرے تجربات سمٹ آتے ہوں غزل کی صنف میں ساحر کی خالص مسائلی اور سیاسی شاعری کی مثال یہ اشعار ہیں۔

ہے جنھیں سب سے زیادہ دعوئ حبِ وطن
آج ان کی وجہ سے حُبِ وطن رسوا تو ہے

نسل در نسل انتظار رہا
قصر ٹوٹے نہ بے نوائی گئی

ہمارے عہد کی تہذیب میں قبا ہی نہیں
اگر قبا ہو تو بندِ قبا کی بات کریں

کانپ اٹھیں قصر شاہی کے گنبد، تھرتھرائے زمیں معبد کی
کوچہ گردوں کی وحشت تو جاگے، غمزدوں کو بغاوت تو آئے

ان اشعار میں نہ تو ایمائیت سے کام لیا گیا ہے اور نہ ہی "مشاہدۂ حق کی گفتگو"، بادہ و ساغر کی زبان میں کی گئی ہے۔ لیکن ساحر کی غزلیہ شاعری میں ایک ارفع سطح بھی ملتی ہے جہاں وہ مسائل حیات اور خاص طور پر سیاسی مسائل کو مخصوص حالات کے پس منظر میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اگر قاری پس منظر سے آگاہ ہو تو ان اشعار کی ایمائیت اسے شاعر کے جذبات تک پہونچا دے گی دوسری طرف اس پس منظر کے بغیر بھی وہ اشعار گہری معنویت اور شدتِ احساس کے حامل نظر آئیں گے۔ اس سلسلہ کی ایک زندہ مثال ساحر کی وہ غزل ہے جو انھوں نے آزادی اور تقسیم ہند کے بعد فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہو کر کہی تھی

طربزار وں پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گذری
دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گذری

فسادات کے پس منظر میں یہ مطلع خاص مفہوم اور کیفیت کا حامل ہو جاتا ہے آزادی سے قبل آزادی سے جو توقعات وابستہ تھیں انہیں فسادات نے خاک میں ملا دیا۔ آرزوؤں اور ارمانوں کا خون کر دیا۔ یہ آرزو طرب زار اور صنم خانے آباد کرنے کی تھی لیکن خوابوں میں بسائے ہوئے یہ سارے محل ڈھا دیئے گئے۔ مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ فسادات کی زد میں اگر طرب زار اور صنم خانے تاراج ہو گئے۔ فسادات کے حوالے کے بغیر بھی یہ شعر انسانی زندگی کی اس صورتِ حال کی ترجمانی بھی کرتا ہے کہ آرزوؤں اور ارمانوں کا مسلسل خون ہو رہا ہے اس کے باوجود بھی دل زندہ ہے۔ دلِ زندہ سے یہ پوچھنا کہ "ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گذری"، شدید طنز کی کیفیت رکھتا ہے۔

زمیں نے خون اگلا آسماں نے آگ برسائی ②

جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گذری

مصرعِ اولیٰ فسادات کی خونریزی اور تباہی کی بھیانک تصویر آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے جب انسانوں کے دن بدلے، کہہ کر آزادی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مخصوص حوالے کے بغیر بھی ان الفاظ سے دنیا کے عظیم انقلابات کی داستانیں کانوں میں گونج اٹھتی ہیں۔

آزادی کے بعد جو فسادات برپا ہوئے ان کی نوعیت فرقہ وارانہ تھی مذہب اور خدا کے نام پر معصوم انسانوں کا خون بہایا گیا ظاہر ہے کہ یہ عمل مذاہب کی اصل تعلیم کے خلاف تھا چنانچہ مذہب اور خدا کے ناموں کے استحصال پر طنز کرتے ہوئے ساحر کہتے ہیں۔

میرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے ابتک ③

مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گذری

غرض یہ کہ پوری غزل ایک خاص اقداری بحران کے پس منظر میں لکھی گئی ہے اور قدروں کا بحران جب اور جہاں کہیں پیدا ہو یہ اشعار برمحل اور عصری حسّیت کے ترجمان معلوم ہوں گے۔ ان میں جذبے کی شدت ہے لیکن جذباتیت نہیں ہے اس لئے دل کو چھو لیتے ہیں اس غزل کے بارے میں نظیر صدیقی کہتے ہیں۔

"یہ غزل ۱۹۴۷ء کے فسادات سے متعلق دو چار بہترین شعری تخلیقات میں سے ہے۔ فسادات ایک زمانے تک شعر و ادب کا موضوع بنے رہے۔ اس موضوع نے شاعروں سے شعر تو بہت کہلوائے لیکن اس موضوع پر کامیاب غزلیں دو چار سے زیادہ نہیں ان میں بھی سب سے پہلے مجھے ساحر کی متذکرہ غزل یاد آتی ہے" ۱؎

ساحر کی سیاسی شاعری کی یہی خوبی ہے کہ وہ خالی خولی نعرہ بازی نہیں ہے دوسری طرف اس میں تعمیم کے ساتھ تخصیص بھی پائی جاتی ہے جیسا کہ محولہ بالا اشعار میں دیکھ چکے ہیں۔

ساحر کی غزل میں عشقیہ جذبات اور سیاسی مسائل کے علاوہ ایسے تجربات اور جذبات کا اظہار ملتا ہے جن کا تعلق انسانی زندگی کے وجودی مسائل سے ہے عام طور پر ترقی پسند شاعران تجربات اور احساسات سے دامن کشاں گزر جاتے ہیں یا پھر بھونڈے طریقے سے اس کو سماجی اور سیاسی عمل کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ ساحر نے ایسے موقعوں پر اپنے سیاسی عقیدے کو خود اپنے جذبے اور احساس پر مسلّط کرنے

۱؎ نظیر صدیقی "جدید غزل پاکستان اور ہندوستان میں"، فنون لاہور (جدید غزل نمبر۔ جنوری ۱۹۶۹ء) میں ۱۶۸

کی کوشش نہیں کی۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

پیدائش کے دن سے موت کی زد میں ہیں

اس مقتل میں کون ہمیں لے آیا ہے

یہاں دنیا کو مقتل کہا گیا ہے اور یہ شعر موت اور فنا کے اس المیہ احساس کو پیش کرتا ہے جو زندگی کی لایعنیت پر منتج ہوتا ہے۔ فانی نے بھی دنیا کے لئے کوچۂ قاتل (مقتل) کا استعارۃً استعمال کیا ہے۔

یہ کوچۂ قاتل ہے آباد ہی رہتا ہے

اک خاک نشیں اٹھا اک خاک نشیں آیا

فانی کے اس شعر میں قاتل کا استعارہ اس طرح لایا گیا ہے کہ وہ ایک جانا پہچانا خاص شخص ہی ہے۔ قتل ہونا مقتولوں کا ارادی فعل ہے وہ قتل ہونے کی خواہش لئے اس کوچہ میں آتے ہیں اس کی وجہ سے فانی کے شعر میں موت کا خوف ابھرنے نہیں پایا ہے جب کہ ساحر کے شعر میں قاتل نامعلوم ہے اور قتل ہونا انسان کا مقدر ہے، دوسرے مصرعے میں "کون" کا لفظ سوال کے لئے نہیں لایا گیا ہے اصل زور مقتل کے لفظ پر ہے قتل ہونا ایک مجبوری ہے جس سے مفر نہیں۔ الفاظ کا یہ استعمال مجموعی طور پر شعر میں خوف اور غم کے ساتھ احتجاج کا بھی اظہار کرتا ہے۔ ساحر کے مندرجہ ذیل اشعار کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ان کے تجربے اور مشاہدے کی انفرادیت کے ساتھ ان کے وجودی طرز احساس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

جھوٹ تو قاتل ٹھہرا اس کا کیا رونا

سچ نے بھی انسان کا خون بہایا

آئینے سے بگڑ کے بیٹھ گئے

جن کی صورت جنھیں دکھائی گئی

موت پائی صلیب پر ہم نے

عمر بن باس میں بتا دی گئی

خودداریوں کے خون کو ارزاں نہ کر سکے

ہم اپنے جوہروں کو نمایاں نہ کر سکے

تنگ آ چکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم

ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

☆

ساحر لدھیانوی نمبر

کے لئے نیک خواہشات
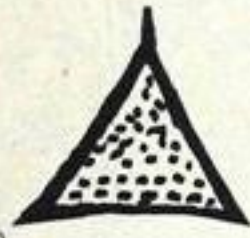
کلامِ ساحر
غزلیں

○
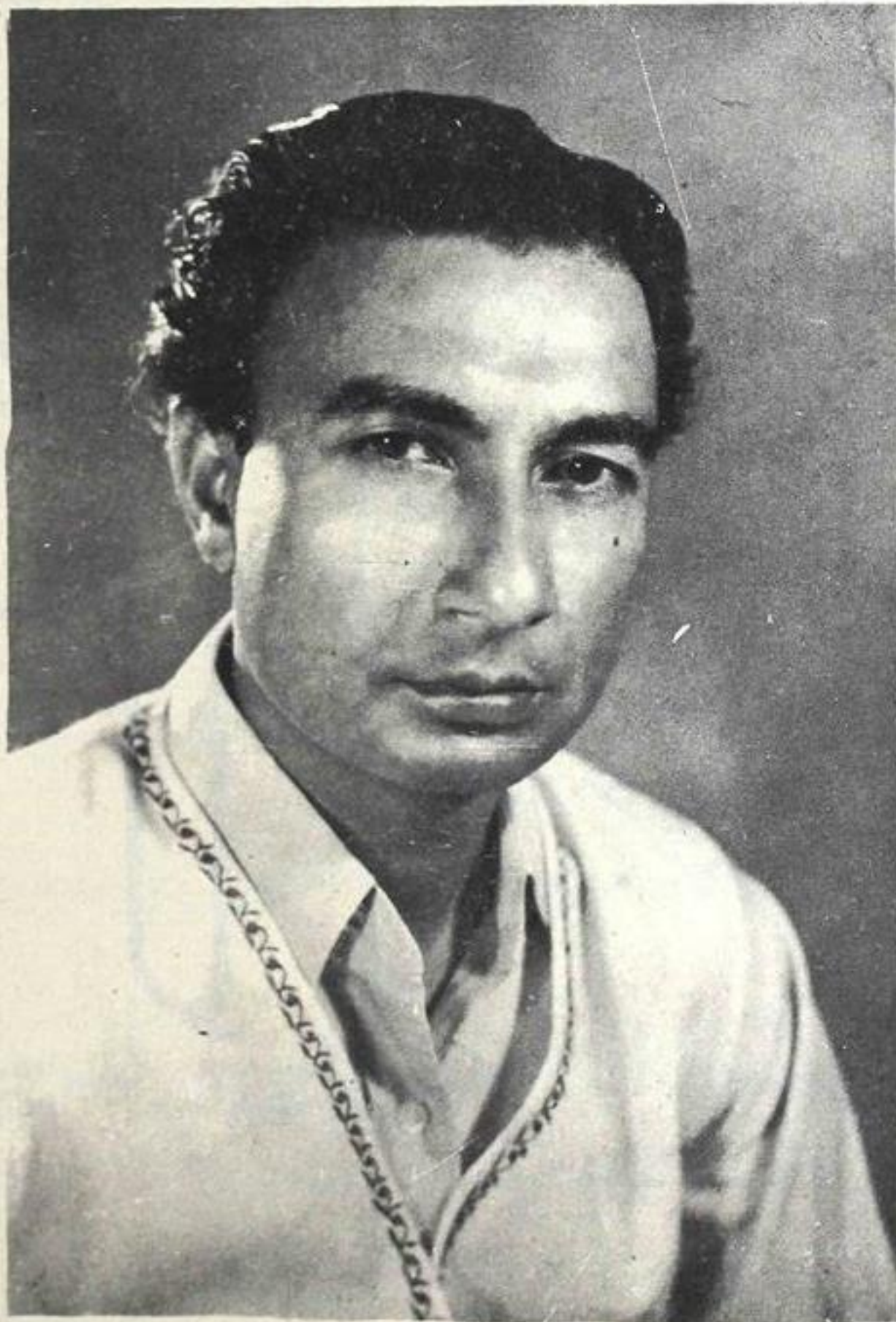
محبت ترک کی مَیں نے، گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو، زہر یہ بھی پی لیا میں نے

ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنّا کے سہارے جی لیا میں نے

انہیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

بس اب تو دامنِ دل چھوڑ دو بے کار امیدو!
بہت دُکھ سہہ لئے میں نے، بہت دن جی لیا میں نے

○

دیکھا تو تھا یوں ہی کسی غفلت شعار نے
دیوانہ کر دیا ہے دلِ بے اختیار نے

اے آرزو کے دُھندلے خرابو جواب دو
پھر کس کی یاد آئی تھی مجھ کو پکارنے

تجھ کو خبر نہیں مگر اِک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے

میں، اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے

اب اے دلِ تباہ ترا کیا خیال ہے
ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوارنے

○

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

مایوسئ مآلِ محبّت نہ پوچھئے
اپنوں سے پیش آئے ہیں بیگانگی سے ہم

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

اُبھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم

گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم

اللہ رے فریبِ مشیّت کہ آج تک
دنیا کے ظلم سہتے رہے خامشی سے ہم

○

ہوس نصیب نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

ابھی نہ چھیڑ محبّت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

تمہارے عہدِ وفا کو میں عہد کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبّت کا اعتبار نہیں

نہ جانے کتنے گلے اس میں مضطرب ہیں ندیم
وہ ایک دل جو کسی کا گلہ گزار نہیں

گریز کا نہیں قائل حیات سے لیکن
جو سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا زمانے نے
کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

○

ہر چند مری قوّتِ گفتار ہے محبوس
خاموش مگر طبع خود آرا نہیں ہوتی

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

نالاں ہوں میں بیداریٔ احساس کے ہاتھوں
دنیا مرے افکار کی دنیا نہیں ہوتی

بیگانہ صفت جادۂ منزل سے گذر جا
ہر چیز سزا وارِ نظارا نہیں ہوتی

فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

○

خودداریوں کے خون کو ارزاں نہ کر سکے
ہم اپنے جوہروں کو نمایاں نہ کر سکے

ہو کر خرابِ مئے ترے غم تو بھلا دیئے
لیکن غمِ حیات کا درماں نہ کر سکے

ٹوٹا طلسمِ عہدِ محبّت کچھ اس طرح
پھر آرزو کی شمع فروزاں نہ کر سکے

ہر شئے قریب آ کے کشش اپنی کھو گئی
وہ بھی علاجِ شوقِ گریزاں نہ کر سکے

کس درجہ دل شکن تھے محبّت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

مایوسیوں نے چھین لیئے دل کے ولولے
وہ بھی نشاطِ روح کا ساماں نہ کر سکے

○

عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی
حقیقت آشنائی اصل میں گم کردہ راہی ہے
عروسِ آگہی پروردۂ ابہام ہے ساقی
مبارک ہو ضعیفی کو خرد کی فلسفہ دانی
جوانی بے نیازِ عبرت انجام ہے ساقی
ہوس ہوگی اسیرِ حلقۂ نیک و بد عالم
محبت ماورائے فکرِ ننگ و نام ہے ساقی
ابھی تک راستے کے پیچ و خم سے دل دھڑکتا ہے
میرا ذوقِ طلب شاید ابھی تک خام ہے ساقی
وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردۂ شب کو
جہاں ہر صبح کے دامن پہ عکسِ شام ہے ساقی
مرے ساغر میں مئے ہے اور ترے ہاتھوں میں بربط ہے
وطن کی سرزمیں میں بھوک سے کہرام ہے ساقی
زمانہ برسرِ پیکار ہے پُر ہول شعلوں سے
ترے لب پر ابھی تک نغمۂ خیام ہے ساقی

○

نفس کے لوچ میں رم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
حیات، ساغرِ سم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے

مری ندیم! محبت کی رفعتوں سے نہ گر
بلند بامِ حرم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

تری نگاہ مرے غم کی پاس دار سہی
مری نگاہ میں غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

یہ اجتناب ہے عکسِ شعورِ محبوبی
یہ احتیاط، ستم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

اِدھر بھی ایک اچٹتی نظر کہ دنیا میں
فروغِ محفلِ جم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

نئے جہان بسائے ہیں فکرِ آدم نے
اب اس زمیں پہ ارم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

○

طرب زاروں پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گذری؟
دلِ زندہ! ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گذری؟

زمیں نے خون اُگلا، آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے، تو انسانوں پہ کیا گذری؟

ہمیں یہ فکر، اُن کی انجمن کس حال میں ہوگی
انھیں یہ غم کہ ان سے چھٹ کے دیوانوں پہ کیا گذری؟

میرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گذری؟

یہ منظر کون سا منظر ہے، پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو، شبستانوں پہ کیا گذری؟

چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آگئے لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گذری؟

○

جب کبھی اُن کی توجّہ میں کمی پائی گئی
از سرِ نو داستانِ شوق دہرائی گئی
بک گئے جب تیرے لب پھر تجھ کو کیا شکوہ اگر
زندگانی بادہ و ساغر سے بہلائی گئی
اے غمِ دنیا تجھے کیا علم تیرے واسطے
کن بہانوں سے طبیعت راہ پر لائی گئی
ہم کریں ترکِ وفا، اچھا چلو یوں ہی سہی
اور اگر ترکِ وفا سے بھی نہ رسوائی گئی
کیسے کیسے چشم و عارض گردِ غم سے بجھ گئے
کیسے کیسے پیکروں کی شانِ زیبائی گئی
دل کی دھڑکن میں توازن آچلا ہے خیر ہو
میری نظریں بجھ گئیں یا تیری رعنائی گئی
اُن کا غم، اُن کا تصور، ان کے شکوے اب کہاں
اب تو یہ باتیں بھی اے دل! ہو گئیں آئی گئی
جرأتِ انساں پہ گو تادیب کے پہرے رہے
فطرتِ انساں کو کب زنجیر پہنائی گئی
عرصۂ ہستی میں اب تیشہ زنوں کا دور ہے
رسمِ چنگیزی اٹھی، توقیرِ دارائی گئی

○

ہر قدم مرحلۂ دار و صلیب آج بھی ہے
جو کبھی تھا وہی انساں کا نصیب آج بھی ہے

جگمگاتے ہیں اُفق پار ستارے لیکن
راستہ منزلِ ہستی کا مہیب آج بھی ہے

سرِ مقتل جنہیں جانا تھا وہ جا بھی پہنچے
سرِ منبر کوئی محتاط خطیب آج بھی ہے

اہلِ دانش نے جسے امرِ مسلّم مانا
اہلِ دل کے لئے وہ بات عجیب آج بھی ہے

یہ تری یاد ہے یا میری اذیت کوشی
ایک نشتر سا رگِ جاں کے قریب آج بھی ہے

کون جانے یہ ترا شاعرِ آشفتہ مزاج
کتنے مغرور خداؤں کا رقیب آج بھی ہے

○

بھڑکا رہے ہیں آگ لبِ نغمہ گر سے ہم
خاموش کیا رہیں گے زمانے کے ڈر سے ہم

کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

مانا کہ اِس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گذرے جدھر سے ہم

○

اس طرف سے گذرے تھے قافلے بہاروں کے
آج تک سلگتے ہیں، زخم رہ گذاروں کے

خلوتوں کے شیدائی، خلوتوں میں کھلتے ہیں
ہم سے پوچھ کر دیکھو، راز پردہ داروں کے

پہلے ہنس کے ملتے ہیں، پھر نظر چراتے ہیں
آشنا صفت ہیں لوگ، اجنبی دیاروں کے

شغلِ مئے پرستی گو، جشنِ نامرادی تھا
یوں بھی کٹ گئے کچھ دن، تیرے سوگواروں کے

گیسوؤں کی چھاؤں میں دل نواز چہرے ہیں
یا حسیں دھندلکوں میں، پھول ہیں چناروں کے

تم نے صرف چاہا ہے، ہم نے چھو کے دیکھے ہیں
پیرہن گھٹاؤں کے، جسم برق پاروں کے

○

بہت گھٹن ہے کوئی صورت بیاں نکلے
اگر صدا نہ اٹھے، کم سے کم فغاں نکلے

فقیرِ شہر کے تن پر لباس باقی ہے
امیرِ شہر کے ارماں ابھی کہاں نکلے

حقیقتیں ہیں سلامت تو خواب بہتیرے
ملول کیوں ہوں جو کچھ خواب رائیگاں نکلے

وہ فلسفے جو ہر اک آستاں کے دشمن تھے
عمل میں آئے تو خود وقفِ آستاں نکلے

اُدھر بھی خاک اُڑی ہے اُدھر بھی زخم پڑے
جدھر سے ہو کے بہاروں کے کارواں نکلے

ستم کے دور میں ہم اہلِ دل ہی کام آئے
زباں پہ ناز تھا جن کو وہ بے زباں نکلے

○

اب آئیں یا نہ آئیں اِدھر، پوچھتے چلو
کیا چاہتی ہے اُن کی نظر پوچھتے چلو

ہم سے اگر ہے ترکِ تعلق، تو کیا ہوا
یارو! کوئی تو ان کی خبر پوچھتے چلو

جو خود کو کہہ رہے ہیں کہ منزل شناس ہیں
اُن کو بھی کیا خبر ہے، مگر پوچھتے چلو

کس منزلِ مراد کی جانب رواں ہیں ہم
اے رہروانِ خاک بسر پوچھتے چلو

○

لب پہ پابندی تو ہے، احساس پر پہرا تو ہے
پھر بھی اہلِ دل کو احوالِ بشر کہنا تو ہے

خونِ اعدا سے نہ ہو، خونِ شہیداں ہی سے ہو
کچھ نہ کچھ اس دور میں رنگِ چمن نکھرا تو ہے

اپنی غیرت بیچ ڈالیں، اپنا مسلک چھوڑ دیں
رہنماؤں میں بھی کچھ لوگوں کا یہ منشا تو ہے

ہے جنہیں سب سے زیادہ دعویٔ حبِّ وطن
آج اُن کی وجہ سے حبِّ وطن رسوا تو ہے

بجھ رہے ہیں ایک ایک کر کے عقیدوں کے دیئے
اس اندھیرے کا بھی لیکن سامنا کرنا تو ہے

جھوٹ کیوں بولیں فروغِ مصلحت کے نام پر
زندگی پیاری سہی، لیکن ہمیں مرنا تو ہے

○

کل کے پھولوں سے تھا جس کا رشتہ آج کے غنچہ چینوں میں کیوں ہو
سال خوردہ ایاغوں کی تلچھٹ، نوجواں آبگینوں میں کیوں ہو

ساعتِ فصلِ گل ہے جوانی، کیوں نہ جشنِ مے و مہ وشاں ہو
عاقبت کے عذابوں کا رونا، ان مبارک مہینوں میں کیوں ہو

بغض کی آگ، نفرت کے شعلے، میکشوں تک پہنچنے نہ پائیں
فصل یہ مندروں، مسجدوں کی، میکدوں کی زمینوں میں کیوں ہو

○

میں زندہ ہوں یہ مشتہر کیجئے
مرے قاتلوں کو خبر کیجئے

زمیں سخت ہے، آسماں دور ہے
بسر ہو سکے تو بسر کیجئے

ستم کے بہت سے ہیں ردِّ عمل
ضروری نہیں چشم تر کیجئے

وہی ظلم بارِ دگر ہے تو پھر
وہی جرم بارِ دگر کیجئے

قفس توڑنا بعد کی بات ہے
ابھی خواہشِ بال و پر کیجئے

○

اہلِ دل اور بھی ہیں ، اہلِ وفا اور بھی ہیں
ایک ہم ہی نہیں ، دنیا سے خفا اور بھی ہیں

ہم پہ ہی ختم نہیں مسلکِ شوریدہ سری
چاک دل اور بھی ہیں ، چاک قبا اور بھی ہیں

کیا ہوا گر مرے یاروں کی زبانیں چپ ہیں
میرے شاہد ، مرے یاروں کے سوا اور بھی ہیں

سر سلامت ہے تو کیا سنگِ ملامت کی کمی
جان باقی ہے تو پیکانِ قضا اور بھی ہیں

منصفِ شہر کی وحدت پہ نہ حرف آجائے
لوگ کہتے ہیں کہ اربابِ جفا اور بھی ہیں

○

دیکھا ہے زندگی کو کچھ اتنا قریب سے
چہرے تمام لگنے لگے ہیں عجیب سے

اے رُوحِ عصر جاگ ، کہاں سو رہی ہے تو
آواز دے رہے ہیں پیمبر صلیب سے

اس رینگتی حیات کا کب تک اٹھائیں بار
بیمار اب اُلجھنے لگے ہیں طبیب سے

ہر گام پر ہے مجمعِ عشّاق منتظر
مقتل کی راہ ملتی ہے کوئے حبیب سے

اس طرح زندگی نے دیا ہے ہمارا ساتھ
جیسے کوئی نباہ رہا ہو رقیب سے

○

صدیوں سے انسان یہ سنتا آیا ہے
دکھ کی دھوپ کے آگے، سکھ کا سایا ہے

ہم کو اِن سستی خوشیوں کا لوبھ نہ دو
ہم نے سوچ سمجھ کر غم اپنایا ہے

جھوٹ تو قاتل ٹھہرا، اُس کا کیا رونا
سچ نے بھی انسان کا خوں بہایا ہے

پیدائش کے دن سے موت کی زد میں ہیں
اس مقتل میں کون ہمیں لے آیا ہے

اوّل اوّل جس دل نے برباد کیا
آخر آخر وہ دل ہی کام آیا ہے

اُتنے دن احسان کیا دیوانوں پر
جتنے دن لوگوں نے ساتھ نبھایا ہے

○

نغمہ جو ہے تو روح میں ہے نے میں کچھ نہیں
گر تجھ میں کچھ نہیں، تو کسی شے میں کچھ نہیں

تیرے لہو کی آنچ سے گرمی ہے جسم کی
مئے کے ہزار وصف سہی، مئے میں کچھ نہیں

جس میں خلوصِ فکر نہ ہو، وہ سخن فضول
جس میں نہ دل شریک ہو اس لَے میں کچھ نہیں

کشکولِ فن اٹھا کے سوئے خسرواں نہ جا
اب دستِ اختیارِ جم و کے میں کچھ نہیں

○

یہ زمیں جس قدر سجائی گئی
زندگی کی تڑپ بڑھائی گئی

آئینے سے بگڑ کے بیٹھ گئے
جن کی صورت جنہیں دکھائی گئی

دشمنوں ہی سے بیر نبھ جائے
دوستوں سے تو آشنائی گئی

نسل در نسل انتظار رہا
قصر ٹوٹے، نہ بے نوائی گئی

زندگی کا نصیب کیا کہیئے
ایک سیتا تھی جو ستائی گئی

ہم نہ اوتار تھے نہ پیغمبر
کیوں یہ عظمت ہمیں دلائی گئی

موت پائی صلیب پر ہم نے
عمر بن باس میں بتائی گئی

○

توڑ لیں گے ہر اک شے سے رشتہ توڑ دینے کی نوبت تو آئے
ہم قیامت کے خود منتظر ہیں، پر کسی دن قیامت تو آئے

ہم بھی سقراط ہیں عہدِ نو کے، تشنہ لب ہی نہ مر جائیں یارو
زہر ہو یا مئے آتشیں ہو، کوئی جام شہادت تو آئے

ایک تہذیب ہے دوستی کی، ایک معیار ہے دشمنی کا
دوستوں نے مروّت نہ سیکھی، دشمنوں کو عداوت تو آئے

رند رستے میں آنکھیں بچھائیں، جو کہے بن سنے مان جائیں
ناصحِ نیک طینت کسی شب سوئے کوئے ملامت تو آئے

علم و تہذیب، تاریخ و منطق، لوگ سوچیں گے ان مسئلوں پر
زندگی کے مشقت کدے میں کوئی عہدِ فراغت تو آئے

کانپ اُٹھیں قصرِ شاہی کے گنبد، تھرتھرائے زمیں معبدوں کی
کوچہ گردوں کی وحشت تو جاگے، غم زدوں کو بغاوت تو آئے

○

جو لطف مے کشی ہے نگاروں میں آئے گا
یا باشعور بادہ گساروں میں آئے گا

وہ جس کو خلوتوں میں بھی آنے سے عار ہے
آنے پہ آئے گا تو ہزاروں میں آئے گا

ہم نے خزاں کی فصل چمن سے نکال دی
ہم کو پیامِ مرگ بہاروں میں آئے گا

اس دورِ احتیاج میں جو لوگ جی لئے
ان کا بھی نام شعبدہ کاروں میں آئے گا

جو شخص مرگیا ہے وہ ملنے کبھی کبھی
پچھلے پہر کے سرد، ستاروں میں آئے گا

○

فن جو نادار تک نہیں پہنچا
اپنے معیار تک نہیں پہنچا
اُس نے بروقت بے رخی برتی
شوق، آزار تک نہیں پہنچا
عکسِ مے ہو، کہ جلوۂ گل ہو
رنگِ رخسار تک نہیں پہنچا
حرفِ انکار سربلند رہا
ضعفِ اقرار تک نہیں پہنچا
حکمِ سرکار کی پہنچ مت پوچھ
اہلِ سرکار تک نہیں پہنچا
عدل گاہیں تو دور کی شے ہیں
قتل اخبار تک نہیں پہنچا
انقلاباتِ دہر کی بنیاد؟
حق، جو حقدار تک نہیں پہنچا
وہ مسیحا نفس نہیں، جس کا
سلسلہ دار تک نہیں پہنچا

بستی بستی
پربت پربت
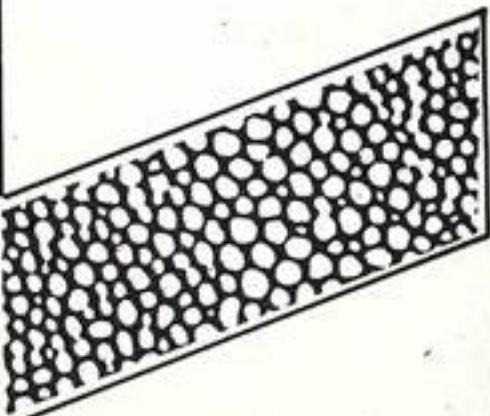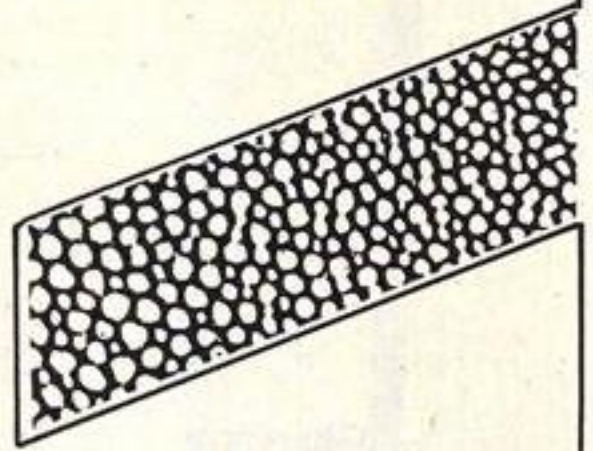
گیتوں کا رسیا

جاں نثار اختر (مرحوم)

ساحر جب ایک گیت نگار کی حیثیت سے فلم انڈسٹری میں داخل ہوا اس وقت عام طور پر فلمی گیتوں کا معیار اس حد تک ادنیٰ اور پست ہو چکا تھا کہ محض رکیک قسم کی تک بندی کو گیت نگاری کی معراج سمجھا جانے لگا تھا۔ بنگال کی ہندی فلموں میں آرزو نے گیتوں کو جو روپ اور سنگھار بخشا تھا۔ وہ بمبئی کے فلمی شاعروں کے ہاتھوں لُٹ چکا تھا۔ اُن دنوں یہ پروپیگنڈا کہ فلمی گیت لکھنا بڑے ادیبوں اور شاعروں کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اتنا عام ہو چکا تھا کہ بہت سے پڑھے لکھے پروڈیوسر اور ڈائرکٹر بھی ذہنی طور پر اس کا شکار نظر آتے تھے۔ حد یہ ہے کہ ان بکواس گیتوں کے جواز میں یہ کہا جاتا تھا کہ ہم کیا کریں، آج کل پبلک یہی مانگتی ہے اور یہ بات وہ لوگ کہتے تھے جنہیں کبھی عوام سے رابطے کی توفیق نہیں ہوئی تھی اور نہ کبھی انہوں نے پبلک پلیٹ فارم پر آنے کی جرأت کی ان حالات میں ساحر کے قلم نے ایک بار پھر گیتوں کے معیار کو اُبھارنے اور سنوارنے کی جو کوشش کی، اس نے نہ صرف اس زہر آلود پروپیگنڈے کا بطلان کیا۔ بلکہ فلمی گیتوں کو ذہنی گندگی اور غلاظت سے نکال کر ستھری اور نکھری ادبیت سے روشناس کرایا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ فلمی شاعری ادبی شاعری کا کسی طرح بھی بدل ہو سکتی ہے۔ لیکن فلمی گیتوں میں ادبی رنگ کو میں ضروری سمجھتا ہوں یہی ادبی رنگ ہے جو گیتوں کو ایک طرف حُسن بیان عطا کرتا ہے تو دوسری طرف تخیل کی لطافت اور جذبات کی پاکیزگی بخشتا ہے۔ فلمی شاعری کی تکنیک بھی ادبی شاعری کی تکنیک سے مختلف ہوتی ہے فلم کی حیثیت ایک ڈرامہ کی ہے اور گیت اس ڈرامہ کے منظوم ٹکڑے ہیں فلمی گیت نگار کو مختلف موقع و محل کے مطابق مختلف کرداروں کے لئے گیت کہنے ہوتے ہیں یہ گیت کبھی فراق کی داستان کہتے ہیں، تو کبھی آپس کی چھیڑ، چھاڑ کو دھراتے ہیں کبھی کوئی طوائف یا کسی کیفے کی کوئی حسینہ سامانِ تفریح کے طور پر اُنہیں گاتی ہے، کبھی یہ لوری بنتے ہیں، تو کبھی بچوں کے معصوم جذبات کا اظہار کبھی یہ دُنیوی مصائب کی پکاریں تو کبھی مزاح وظرافت کی خوش آہنگ جھنکار، کبھی اس پردے میں دُنیا کی بے ثباتی کی بات ہوتی ہے تو کبھی یہ انسانی جد جہد

کے جوشیلے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں کبھی یہ موت کا راگ ہیں تو کبھی زندگی کا بھرپور نغمہ۔ اس اعتبار سے فلمی شاعری کا بہت وسیع دائرہ ہے لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ گیت کہنے والا کہاں تک کامیابی کے ساتھ اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوا ہے ایک طوائف کے گیت میں پست اور رکیک جذبات بھی کہے جاسکتے ہیں اور یہی گیت نازک عاشقانہ جذبات کا حامل بھی ہوسکتا ہے اسی طرح کیفے میں گانے والی لڑکی ایک مہذب گیت بھی گاسکتی ہے اور یہی گیت کنایہ اور محاکات کے انداز میں ایک خوبصورت دعوتِ عشق بھی بن سکتا ہے مزاحیہ گیتوں میں گھٹیا قسم کی باتیں بھی کہی جاسکتی ہیں یا پھر ان میں طنز شامل کرکے انہیں ادبی ظرافت کا نمونہ بھی بنایا جاسکتا ہے "غرض کیا کہا گیا ہے" کا سوال بہت اہم ہے اور پھر اسی کے ساتھ "کیسا کہا گیا ہے" کا سوال بھی جڑا ہوا ہے جس میں شاعر کے لئے قدرت بیاں کے علاوہ بلاغت کے پورے اصولوں کو جاننا لازمی ہوجاتا ہے ایک نقطہ جو فلمی شاعری میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ گیتوں میں عام مقبولیت (Popular Apeal) کا خیال رکھنا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز آسان زبان اور عام فہم بیان کیساتھ ساتھ گیتوں میں بھرپور جذباتیت کا مطالعہ کرتی ہے۔ بغیر جذباتی عنصر کے کسی گیت کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہونا ممکن نہیں ہوتا۔

فلمی گیتوں کی تکنیک کے سلسلے میں یہ امر خصوصاً قابلِ اظہار ہے کہ گیت نگار کو بنی بنائی دھنوں پر موقع و محل کے اعتبار سے الفاظ بٹھانے ہوتے ہیں گیتوں کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ لوک گیتوں کی تشکیل میں موسیقی اور شاعری کے دھارے بیک وقت مل کر پھوٹتے رہے آگے چل کر گیتوں اور نغموں کی تخلیق کی جو عام صورت نظر آتی ہے وہ یہ کہ شاعر یا کوی کی لکھی ہوئی چیزوں کی دھنیں مرتب کی جانے لگیں فلمی دنیا میں معاملہ برعکس ہے۔ عام دستور یہ ہوگیا ہے کہ میوزک ڈائرکٹر دھن پہلے تیار کرلیتا ہے بعد میں شاعر اس پر بول کہتا ہے۔　　　اس کی وجہ اگر ایک طرف موجودہ شاعروں کی موسیقی سے ناواقفیت ہے تو دوسری طرف اکثر میوزک ڈائرکٹروں کی اپنی کمزوریاں بھی ہیں جو کہے ہوتے بولوں کی طرزیں بناتے ہوئے گھبراتے ہیں اور کتراتے ہیں، بہرحال ابتدا میں شاعر کو بڑی عرق ریزی اور جگر سوزی سے کام لینا ہوتا ہے کچھ عرصے میں دھنوں کے پیچ وخم اور سروں کے زیر وبم کو سمجھنے کی اہلیت خود بخود پیدا ہوجاتی ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ شاعری اور موسیقی کا ازلی رشتہ ہے شاعر اگر موسیقی داں نہ ہو تو بھی اسے موسیقی سے ایک ذہنی ربط ضرور ہوتا ہے چاہے وہ کتنا ہی پست شعور کیوں نہ ہو۔ اس ذہنی تربیت کے بعد اُس کے لئے کسی دُھن پر بھی بول کہنا اتنا ہی آسان اور سہل ہوجاتا ہے۔ جتنا عروض کے مقررہ اوزان پر غزل یا نظم کی تخلیق کرنا۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اس بندش کے ساتھ خوبصورت اور کامیاب گیت لکھنا ایک کامیاب شاعر ہی کا کام ہے۔

آیئے ساحر کے ان گیتوں کا جائزہ لیں جو اس وقت کتابی شکل میں ہمارے اور آپ کے سامنے آئے ہیں۔ اس مجموعہ کا ایک گیت "چاند مدھم ہے آسمان چپ ہے،،

ایک ادبی شہ پارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انتظار کی کرب آلود کیفیت اور محبوب کو دیکھنے کی بے پایاں حسرت جس جس طرح ان سیدھے سادھے الفاظ میں سموئی ہوئی ہے، اس نے گیت کو ایسی فضا اور ایسا تاثر بخش دیا ہے جو دلوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔

روز کی طرح آج بھی تارے
صبح کی گرد میں نہ کھو جائیں

آ ترے غم میں جاگتی آنکھیں
کم سے کم ایک رات سو جائیں

چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

اسی طرح ساحر کا یہ گیت۔

آنکھ کھلتے ہی چھپ گئے ہو کہاں
تم ابھی تھے یہاں
ابھی سانسوں کی خوشبو ہواؤں میں ہے
ابھی قدموں کی آہٹ فضاؤں میں ہے
ابھی شاخوں پہ ہیں انگلیوں کے نشاں
تم ابھی تھے یہاں

ان لطیف احساسات کی ترجمانی کرتا ہے جو محبوب کے تصور یا تخیل کو متشکل کر کے زندگی سے معمور کر دیتے ہیں۔
فلمی گیتوں کا ایک عام موضوع محبت کا پہلا احساس بھی ہے ساحر نے اس موقع پر ایک لڑکی کے نازک جذبات کی ترجمانی کی ہے اس طرح

نین جھک جھک کے اٹھے
پاؤں رُک رُک کے اٹھے
آ گئی چال نئی
بات کچھ بن ہی گئی
زلف شانہ نے پڑی
ایک خوشبو سی اڑی
کھُل گئے راز کئی
بات کچھ بن ہی گئی

ساحر نے ہجر و فراق کے موضوع پر بھی بڑے دل گداز گیت کہے ہیں:

جانے وہ کیسے لوگ تھے جنکے پیار کو پیار ملا

میری عمر سے لمبی ہو گئی بیرن رات جدائی کی

تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے

اُس کا یہ گیت ،، سُن جا دل کی داستاں،،

ہندوستان گیر شہرت حاصل کر چکا ہے ، الفاظ اور جذبات کی خوبصورتی گیتوں کے لئے بڑی اہم ہے ۔ جو دُھن ساحر کو اس گیت کے لئے دی گئی ہوگی اُس پر آجا آجا بالما " بھی موزوں کیا جا سکتا تھا ۔ لیکن یہیں ایک شاعر اور تک بند کا فرق سامنے آتا ہے ۔ ساحر ایک باشعور شاعر ہے اور اس لئے اُس کے ان گیتوں میں بھی جو غم جاناں پر مشتمل ہیں ۔ غم دوراں کی جھلکیاں مل جاتی ہیں ۔

تم نے کتنے سپنے دیکھے میں نے کتنے گیت بُنے
اس دنیا کے شور میں لیکن دل کی دھڑکن کون سنے

حُسن کے کھلتے پھول ہمیشہ بیدردوں کے ہاتھ بکے
اور چاہت کے متوالوں کو دھول ملی ویرانے کی
دل کے نازک جذبوں پر بھی راج ہے سونے چاندی کا
یہ دنیا کیا قیمت دے گی سادہ دل انسانوں کی

یہ حقیقت ہے کہ ساحر کے گیتوں کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا ترقی پسندانہ مواد PROGR - ESSIVE CONTENT ہے اس نے بڑی جرأت و قوت کے ساتھ اپنے گیتوں میں یہ آواز اٹھائی ہے وہ ایک بیدار اور پختہ شعور لے کر فلمی دنیا میں داخل ہوا ہے اُس کی پہلی ہی فلم " بازی " میں اُس کا یہ نغمہ ذہنوں کو چونکا دینے والا تھا

ڈرتا ہے زمانے کی نگاہوں سے بھلا کیوں
انصاف ترے ساتھ ہے الزام اٹھالے
ٹوٹے ہوئے پتوار ہیں کشتی کے تو کیا غم
ہاری ہوئی باہوں کو ہی پتوار بنالے

یہ آواز یہ آہنگ فلمی گیتوں کی دُنیا کیلئے نیا تھا اور پھر ساحر اپنی اُس آواز کو روز بروز تیز کرتا گیا۔ اور آج وہ کھل کر اپنے سماجی شعور کو پوری فنکارانہ نزاکتوں کے ساتھ اپنے گیتوں میں پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے گیتوں میں "یہ دنیا جہاں آدمی کچھ نہیں ہے"، کو ٹھکراتا ہوا ملتا ہے اُس کے گیتوں میں ان لاوارث اور بیکس بچوں کی آواز سنائی دیتی ہے جن کے لئے "سڑکیں یہی ماں اور سڑکیں ہی پتا" کا حکم رکھتی ہیں۔ اس کے گیتوں میں اُس عورت کی چیخ ہے جو "اوتار، پیمبر جنتی ہے پھر بھی شیطان کی بیٹی ہے"۔

اس کے گیتوں میں ان مزدوروں کی بات ہے جن کی محنت کے بل بوتے پر دُنیا کی تمام مادی آسائش اور آرائش مہیا ہیں۔

"ماٹی سے ہم لعل نکالیں، موتی لائیں جل سے"

ساحر محنت کا استحصال EXPLOITATION برداشت نہیں کرتا اور اسی لئے اُس کے گیت میں یہ نعرہ کھُل کر گونج اٹھتا ہے۔

"ہاتھ بڑھا کر چھین لو اپنے سپنوں کی تعبیریں"

وہ سرمایہ داری پر بھرپور ضرب لگاتا ہے ایک گیت میں اُس نے اس تفریق کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی پیداوار ہے جس میں ہر فرد کو پنپنے اور پروان چڑھنے کے لئے برابر کے مادی ذرائع و مواقع حاصل نہیں ہیں اور جس کے نتیجہ میں اگر ایک کی تقدیر سُکھ ہے تو دوسرے کی دُکھ۔

دو کلیاں گلشن کی
اک سہرے کے بیچ گندھے اور من ہی من اترائے
اک ارتھی کی بھینٹ چڑھے اور دھول میں مل جائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی کس کو دوش لگائے
دو سکھیاں بچپن کی
ایک سنگھاسن پر بیٹھے اور روپ متی کہلائے
دوجی اپنے روپ کے کارن گلیوں میں بک جائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی کس کو دوش لگائے

ساحر ایسے ناحق اور غیر مساوی نظام کا دشمن ہے۔ اُس کی پُرامید طبیعت اس اندھیرے کو چھٹتا ہوا محسوس کرتی ہے اور وہ چلا اٹھتا ہے۔

"کس کے روکے رکا ہے سویرا"

وہ عمل اور ردِّ عمل کے فطری اور سائنسی اصول سے واقف ہے

رات جتنی ہی سنگین ہو گی
صبح اتنی ہی رنگین ہو گی

غم نہ کر گر ہے بادل گھنیرا
کس کے روکے رکا ہے سویرا

اپنے گیت "رات کے راہی" میں صبح نو کی بشارت اس طرح دیتا ہے

دھرتی کے پھیلے آنگن میں پل دو پل ہے رات کا ڈیرا
ظلم کا سینہ چیر کے دیکھو جھانک رہا ہے نیا سویرا
ڈھلتا دن مجبور سہی چڑھتا سورج مجبور نہیں
رات کے راہی تھک مت جانا صبح کی منزل دور نہیں
اور "پھر وہ صبح کبھی تو آئے گی"

میں اُن تمام مصائب و آرام کے ختم ہونے کا یقین دلاتا ہے جو آج زہر بن کر ہمارے سماج کی رگوں میں سرایت کئے ہوتے ہیں۔

یہ نرک سے گندی دنیا جب سورگ بنائی جائیگی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

کوئی شک نہیں کہ ساحر کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے فلموں کو ایسے گیت دیئے جو سیاسی اور سماجی شعور سے لبریز ہیں یہ ایک بڑا اقدم ہے جو ساحر نے بڑی دلیری سے اٹھایا۔ وہ ہمارے بعض دوسرے شاعروں کی طرح فلمی دنیا کی گندگی میں ڈوب کر نہیں رہ گیا بلکہ اُس نے اپنے قلم کی قوت سے فلمی گیتوں کو اگر ایک طرف حُسن کی لطافت اور نزاکت اور عشق کا درد اور کسک بخشی تو دوسری طرف سماجی مادی اور اقتصادی شعور دیا۔ اس خود کو دھوکا دیا نہ اپنے فن کو نہ ترقی پسند تحریک کو، نہ عوام کو، اس نے وہ کیا جو بحیثیت ایک بیدار شاعر اُس کا فرض تھا۔ اور اُس کے اس کارنامے پر میں اُسے مبارک باد دیتا ہوں۔
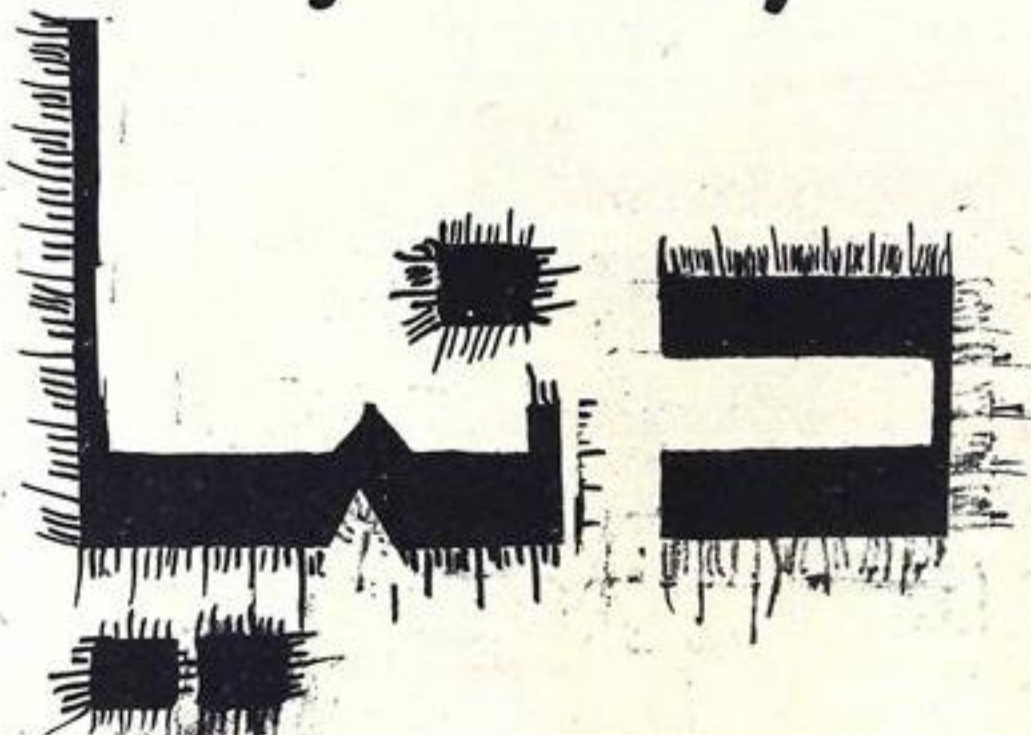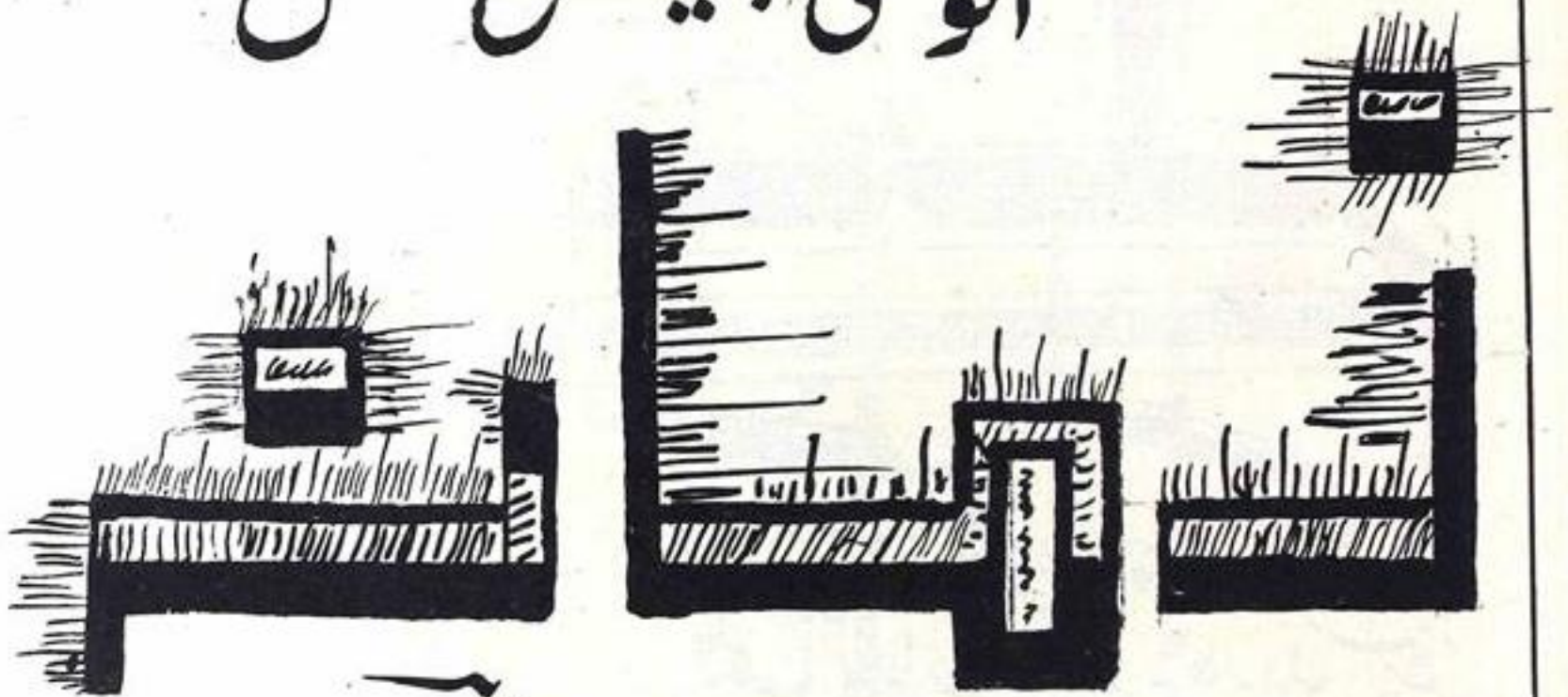
یش چوپڑہ کی حیات افروز پیشکش
تکمیل کے
مراحل
پر
فاصلے
جس میں فرح اور روہن کپور پہلی بار اسکرین پر
ساتھ میں سنیل دت، ریکھا، راج ببر، فاروق شیخ
اور دیپتی نول
موسیقار ـــــ شیو ہری
گیت کار ـــــ شہریار
پروڈیوسر اور ڈائرکٹر ـــــ یش چوپڑہ
جاری کردہ
یش راج فلمز:- ۱۲ روڈ نمبر، ولے پارلے اسکیم جوہو بمبئی ۵۶ ۰۰ ۴۰۰ فون ۵۶۷۸۱۸
۵۶۹۲۵۲

کلامِ ساحر

گیت
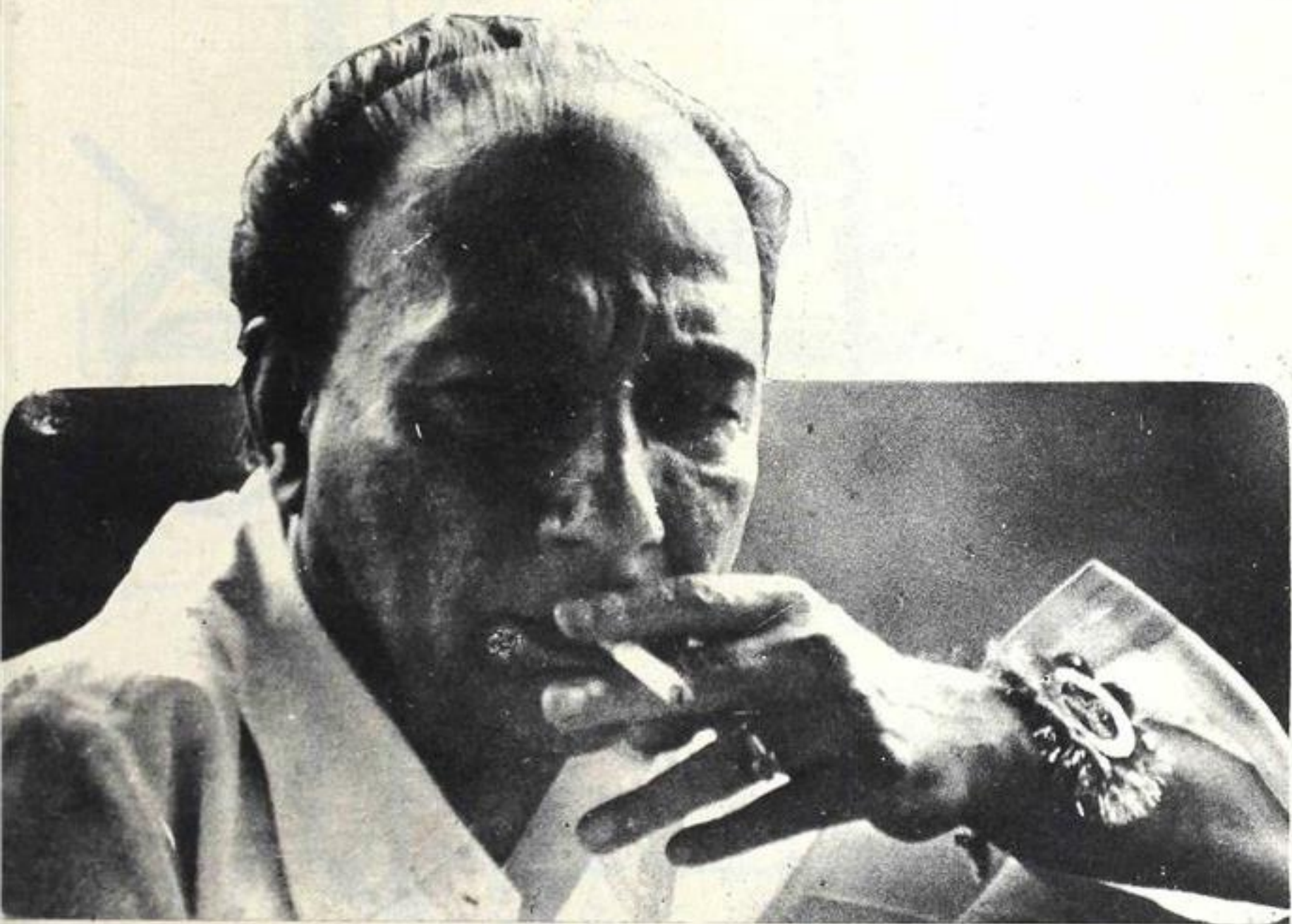
اشکوں میں جو پایا ہے، وہ گیتوں میں دیا ہے
اس پر بھی سنا ہے کہ زمانہ کو گِلا ہے

جو تار سے نکلی ہے، وہ دھن سب نے سنی ہے
جو ساز پہ گذری ہے، وہ کس دل کو پتہ ہے

ہم پھول ہیں، اوروں کے لئے لائے ہیں خوشبو
اپنے لئے لے دے کے بس اِک داغ ملا ہے

جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کے پیار کو پیار ملا
ہم نے تو جب کلیاں مانگیں، کانٹوں کا ہار ملا
خوشیوں کی منزل ڈھونڈی تو غم کی گرد ملی
چاہت کے نغمے چاہے تو آہ سرد ملی
دل کے بوجھ کو دونا کر گیا جو غم خوار ملا
بچھڑ گیا ہر ساتھی دے کر پل دو پل کا ساتھ
کس کو فرصت ہے جو تھامے دیوانوں کا ہاتھ
ہم کو اپنا سایہ تک اکثر بے زار ملا
اس کو ہی جینا کہتے ہیں تو یوں ہی جی لیں گے
اُف نہ کریں گے، لب سی لیں گے، آنسو پی لیں گے
غم سے اب گھبرانا کیسا، غم سو بار ملا

یہ وادیاں، یہ فضائیں بلا رہی ہیں تمہیں   خموشیوں کی صدائیں بلا رہی ہیں تمہیں

ترس رہے ہیں جواں پھول ہونٹ چھونے کو   مچل مچل کے ہوائیں بُلا رہی ہیں تمہیں

تمہاری زلفوں سے خوشبو کی بھیک لینے کو   جھکی جھکی سی گھٹائیں بلا رہی ہیں تمہیں

حسین چمپئی پیروں کو جب سے دیکھا ہے   ندی کی مست ادائیں بلا رہی ہیں تمہیں

میرا کہا نہ سنو، ان کی بات تو سن لو   ہر ایک دل کی دعائیں بلا رہی ہیں تمہیں

تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے
ہم بھری دنیا میں تنہا ہو گئے
موت بھی آتی نہیں　　آس بھی جاتی نہیں
دل کو یہ کیا ہو گیا　　کوئی شے بھاتی نہیں

ایک جان اور لاکھ غم　　گھٹ کے رہ جائے نہ دم
آؤ تم کو دیکھ لیں　　ڈوبتی نظروں سے ہم
تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے
ہم بھری دنیا میں تنہا ہو گئے

جائیں تو جائیں کہاں
سمجھے گا کون یہاں، درد بھرے دل کی زباں
جائیں تو جائیں کہاں
مایوسیوں کا مجمع ہے جی میں
کیا رہ گیا ہے اس زندگی میں
روح میں غم، دل میں دھواں
جائیں تو جائیں کہاں
اُن کا بھی غم ہے، اپنا بھی غم ہے
اب دل کے بچنے کی امید کم ہے
اک کشتی، سو طوفاں
جائیں تو جائیں کہاں

سب میں شامل ہو مگر سب سے جدا لگتی ہو
صرف ہم سے ہی نہیں، خود سے بھی خفا لگتی ہو
آنکھ کھلتی ہے نہ جھکتی ہے کسی کی خاطر　سانس چڑھتی ہے نہ رکتی ہے کسی کی خاطر
جو کسی در پہ نہ ٹھہرے، وہ ہوا لگتی ہو

زلف لہرائے تو آنچل میں چھپالیتی ہو　ہونٹ تھرائیں تو دانتوں میں دبالیتی ہو
جو کبھی کھل کے نہ برسے وہ گھٹا لگتی ہو

جاگی جاگی نظر آتی ہو نہ سوئی سوئی　تم کہ ہو اپنے خیالات میں کھوئی کھوئی
کسی مایوس مصوّر کی دعا لگتی ہو

پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا ہے
سُرمئی اُجالا ہے، چمپئی اندھیرا ہے

دونوں وقت ملتے ہیں، دو دلوں کی صورت سے
آسماں نے خوش ہو کر رنگ سا بکھیرا ہے

ٹھہرے ٹھہرے پانی میں گیت سرسراتے ہیں
بھیگے بھیگے جھونکوں میں خوشبوؤں کا ڈیرا ہے

کیوں نہ جذب ہو جائیں اس حسیں نظارے میں
روشنی کا جھرمٹ ہے، مستیوں کا گھیرا ہے

میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ ملا
میں وہ نغمہ ہوں جسے پیار کی محفل نہ ملی
وہ مسافر ہوں جسے کوئی بھی منزل نہ ملی
زخم پائے ہیں، بہاروں کی تمنا کی تھی
میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
کسی گیسو، کسی آنچل کا سہارا بھی نہیں
راستے میں کوئی دھندلا سا ستارا بھی نہیں
میری نظروں نے نظاروں کی تمنا کی تھی
میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
دل میں ناکام امیدوں کے بسیرے پائے
روشنی لینے کو نکلا تو اندھیرے پائے
رنگ اور نور کے دھاروں کی تمنا کی تھی
میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی

۲

مَیں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ ملا
میری راہوں سے جدا ہو گئیں راہیں اُن کی
آج بدلی نظر آتی ہیں نگاہیں اُن کی
جن سے اِس دل نے سہاروں کی تمنا کی تھی
مَیں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی

پیار مانگا تو سسکتے ہوئے ارمان ملے
چین چاہا تو امڈتے ہوئے طوفان ملے
ڈوبتے دل نے کناروں کی تمنا کی تھی
میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی

اے دل زباں نہ کھول صرف دیکھ لے
کسی سے کچھ نہ بول، صرف دیکھ لے
یہ حسیں جگمگاہٹیں   آنچلوں کی سرسراہٹیں
یہ نشے میں جھومتی زمیں   سب کے پاؤں چومتی زمیں
کس قدر ہے گول صرف دیکھ لے
اے دل زباں نہ کھول صرف دیکھ لے
کتنا سچ ہے کتنا جھوٹ ہے   کتنا حق ہے کتنی لوٹ ہے
رکھ سبھی کی لاج کچھ نہ کہہ   کیا ہے یہ سماج کچھ نہ کہہ
ڈھول کا یہ پول صرف دیکھ لے
اے دل زباں نہ کھول صرف دیکھ لے
مان لے جہاں کی بات کو   دن سمجھ لے کالی رات کو
چلنے دے یونہی یہ سلسلہ   یہ نہ بول کس کو کیا ملا
ترازوؤں کا جھول صرف دیکھ لے
اے دل زباں نہ کھول صرف دیکھ لے

یہ رات، یہ چاندنی پھر کہاں
سُن جا دل کی داستاں

پیڑوں کی شاخوں پہ سوئی سوئی چاندنی
تیرے خیالوں میں کھوئی کھوئی چاندنی
اور تھوڑی دیر میں تھک کے لوٹ جائے گی
رات یہ بہار کی پھر کبھی نہ آئے گی
دو چار پل اور ہے یہ سماں
سن جا دل کی داستاں

لہروں کے ہونٹوں پہ دھیما دھیما راگ ہے
بھیگی ہواؤں میں ٹھنڈی ٹھنڈی آگ ہے
اس حسین آگ میں تو بھی جل کے دیکھ لے
زندگی کے گیت کی دھن بدل کے دیکھ لے
کھُلنے دے اب دھڑکنوں کی زباں
سن جا دل کی داستاں

جاتی بہاریں ہیں اُٹھتی جوانیاں
پھولوں کے سائے میں کہہ لے کہانیاں
ایک بار چل دیئے گر تجھے پکار کے
لوٹ کر نہ آئیں گے قافلے بہار کے
آجا ابھی زندگی ہے جواں
سُن جا دل کی داستاں

محفل سے اٹھ جانے والو! تم لوگوں پر کیا الزام
تم آباد گھروں کے باسی، میں آوارہ اور بدنام
میرے ساتھی خالی جام!

دو دن تم نے پیار جتایا، دو دن تم سے میل رہا
اچھا خاصا وقت کٹا اور اچھا خاصا کھیل رہا
اب اس کھیل کا ذکر ہی کیا، وقت کٹا اور کھیل تمام
میرے ساتھی خالی جام!

تم نے ڈھونڈی سکھ کی دولت میں نے پالا غم کا روگ
کیسے بنتا، کیسے نبھتا، یہ رشتہ اور یہ سنجوگ
میں نے دل کو دل سے تولا تم نے مانگے پیار کے دام
میرے ساتھی خالی جام!

تم دنیا کو بہتر سمجھے، میں پاگل تھا خوار ہوا
تم کو اپنانے نکلا تھا، خود سے بھی بیزار ہوا
دیکھ لیا گھر پھونک تماشا، جان لیا اپنا انجام
میرے ساتھی خالی جام!

وقت سے دن اور رات، وقت سے کل اور آج　　وقت کی ہر شے غلام، وقت کا ہر شے پہ راج

وقت کی پابند ہیں آتی جاتی رونقیں　　وقت ہے پھولوں کی سیج، وقت ہے کانٹوں کا تاج

وقت کے آگے اُڑی کتنی تہذیبوں کی دھول　　وقت کے آگے مٹے کتنے مذہب اور رواج

وقت کی گردش سے ہے چاند تاروں کا نظام　　وقت کی ٹھوکر میں ہیں، کیا حکومت کیا سماج

آدمی کو چاہئے وقت سے ڈر کر رہے　　کون جانے کس گھڑی وقت کا بدلے مزاج

★

تورا من، درپن کہلائے
بھلے بُرے سارے کرموں کو دیکھے اور دکھائے
تورا من، درپن کہلائے
من ہی دیوتا، من ہی ایشور، من سے بڑا نہ کوئے
من اجیارا جب جب پھیلے، جگ اُجیارا ہوئے
اِس اجلے درپن پر پرانی دھول نہ جمنے پائے
تورا من، درپن کہلائے
سکھ کی کلیاں، دُکھ کے کانٹے، من سب کا آدھار
من سے کوئی بات چھپے ناں، من کے نین ھزار
جگ سے چاہے بھاگ لے کوئی من سے بھاگ نہ پائے
تورا من، درپن کہلائے

ہر طرح کے جذبات کا اعلان ہیں آنکھیں
شبنم کبھی شعلہ کبھی طوفان ہیں آنکھیں

آنکھوں سے بڑی کوئی ترازو نہیں ہوتی
تلتا ہے بشر جس میں وہ میزان ہیں آنکھیں

آنکھیں ہی ملاتی ہیں زمانے میں دلوں کو
انجان ہیں ہم تم، اگر انجان ہیں آنکھیں

لب کچھ بھی کہیں اس سے حقیقت نہیں کھلتی
انسان کے سچ جھوٹ کی پہچان ہیں آنکھیں

آنکھیں نہ جھکیں تیری کسی غیر کے آگے
دنیا میں بڑی چیز مری جان ہیں آنکھیں

کسی پتھر کی مورت سے محبّت کا ارادہ ہے
پرستش کی تمنّا ہے، عبادت کا ارادہ ہے

جو دل کی دھڑکنیں سمجھے نہ آنکھوں کی زباں سمجھے
نظر کی گفتگو سمجھے نہ جذبوں کا بیاں سمجھے
اُسی کے سامنے اس کی شکایت کا ارادہ ہے

سنا ہے ہر جواں پتھر کے دل میں آگ ہوتی ہے
مگر جب تک نہ چھیڑو شرمگیں پردے میں سوتی ہے

یہ سوچا ہے کہ دل کی بات اس کے روبرو کہہ دیں
نتیجہ کچھ بھی نکلے آج اپنی آرزو کہہ دیں
ہر اک بے جا تکلف سے بغاوت کا ارادہ ہے

دوگانا

ا: میں نے دیکھا ہے کہ پھولوں سے لدی شاخوں میں
تم لچکتی ہوئی یوں میرے قریب آئی ہو
جیسے مدت سے یوں ہی ساتھ رہا ہو اپنا
جیسے اب کی نہیں، برسوں کی شناسائی ہو

ب: میں نے دیکھا ہے کہ گاتے ہوئے جھرنوں کے قریب
اپنی بے تابیٔ جذبات کہی ہے تم نے
کانپتے ہونٹوں سے، رکتی ہوئی آواز کے ساتھ
جو مرے دل میں تھی وہ بات کہی ہے تم نے

ا: آنچ دینے لگا قدموں کے تلے برف کا فرش
آج جانا کہ محبت میں ہے گرمی کتنی
سنگ مرمر کی طرح سخت بدن میں تیرے
آ گئی ہے میرے چھونے سے نرمی کتنی

ب: ہم چلے جاتے ہیں، اور دور تلک کوئی نہیں
صرف پتوں کے چٹخنے کی صدا آتی ہے
دل میں کچھ ایسے خیالات نے کروٹ لی ہے
مجھکو تم سے نہیں، اپنے سے حیا آتی ہے

اِن اُجلے محلوں کے تلے
ہم گندی گلیوں میں پلے

سو سو بوجھے من پہ لئے
میل اور ماٹی تن پہ لئے
دُکھ سہتے، غم کھاتے رہے
پھر بھی ہنستے گاتے رہے

ہم دیپک، طوفاں میں جلے
ہم گندی گلیوں میں پلے

دنیا نے ٹھکرایا ہمیں
رستوں نے اپنایا ہمیں
سڑکیں ماں، سڑکیں ہی پتا
سڑکیں گھر، سڑکیں ہی چِتا

کیوں آئے، کیا کر کے چلے
ہم گندی گلیوں میں پلے

دل میں کھٹکا کچھ بھی نہیں
ہم کو پروا کچھ بھی نہیں
چاہو تو ناکارہ کہو
چاہو تو آوارہ کہو

ہم ہی بُرے، تم سب ہو بھلے
ہم گندی گلیوں میں پلے

جانے کیا تو نے کہی
جانے کیا میں نے سُنی
بات کچھ بن ہی گئی

سنسناہٹ سی ہوئی
تھرتھراہٹ سی ہوئی
جاگ اُٹھے خواب کئی
بات کچھ بن ہی گئی

نین جُھک جُھک کے اُٹھے
پاؤں رُک رُک کے اُٹھے
آ گئی چال نئی
بات کچھ بن ہی گئی

زلف شانے پہ مڑی
ایک خوشبو سی اڑی
کھل گئے راز کئی
بات کچھ بن ہی گئی

موت کتنی بھی سنگدل ہو، مگر
زندگی سے تو مہرباں ہوگی

نت نئے رنج دل کو دیتی ہے
زندگی ہر خوشی کی دشمن ہے
موت سب سے نباہ کرتی ہے
زندگی، زندگی کی دشمن ہے
کچھ نہ کچھ تو سکون پائے گا
موت کے بس میں جس کی جاں ہوگی
زندگی اور نسل، نام اور دولت
زندگی کتنے فرق مانتی ہے
موت حد بندیوں سے اونچی ہے
ساری دنیا کو ایک جانتی ہے
جن اصولوں پہ مر رہے ہیں ہم
اُن اصولوں کی قدر داں ہوگی
موت سے اور کچھ ملے نہ ملے
زندگی سے تو جان چھوٹے گی
مسکراہٹ نصیب ہو کہ نہ ہو
آنسوؤں کی لڑی تو ٹوٹے گی
ہم نہ ہوں گے تو غم کسے ہوگا؛
ختم ہر غم کی داستاں ہوگی

ایشور، اللہ، تیرے نام
سب کو سنمتی دے بھگوان

اس دھرتی پر بسنے والے
سب ہیں تیری گود کے پالے
کوئی نیچ نہ کوئی مہان
سب کو سنمتی دے بھگوان

ذاتوں، نسلوں کے بٹوارے
جھوٹ کہائیں تیرے دوارے
تیرے لئے سب ایک سمان
سب کو سنمتی دے بھگوان

جنم کا کوئی مول نہیں ہے
جنم منش کا تول نہیں ہے
کرم سے ہے سب کی پہچان
سب کو سنمتی دے بھگوان

میں نے پی شراب، تم نے کیا پیا؟ آدمی کا خوں
میں ذلیل ہوں تم کو کیا کہوں

تم پیو تو ٹھیک ۔ ہم پئیں تو پاپ تم جیو تو پنیہ ۔ ہم جئیں تو پاپ
تم شریف لوگ ۔ تم امیر لوگ ہم تباہ حال ۔ ہم فقیر لوگ
زندگی بھی روگ موت بھی عذاب
میں نے پی شراب

تم کہو تو سچ ۔ ہم کہیں تو جھوٹ تم کو سب معاف ۔ ظلم ہو کہ لوٹ
تم نے کتنے دل ۔ چاک کر دیئے کتنے بستے گھر ۔ خاک کر دیئے
میں نے تو کیا خود کو ہی خراب
میں نے پی شراب

ریت اور رواج ۔ سب تمہارے ساتھ دھرم اور سماج ۔ سب تمہارے ساتھ
اپنے ساتھ کیا؟ دھول اور دھواں آج چاہے تم ۔ نوچ لو زباں
آنے والا دور لے گا سب حساب
میں نے پی شراب
تم نے کیا پیا؟ آدمی کا خوں
میں ذلیل ہوں تم کو کیا کہوں؟

ل : نہ تو کارواں کی تلاش ہے، نہ تو راہبر کی تلاش ہے
مرے شوقِ خانہ خراب کو تری رہ گذر کی تلاش ہے
ب : مرے نامراد جنون کا ہے علاج کوئی تو موت ہے
جو دوا کے نام پہ زہر دے اسی چارہ گر کی تلاش ہے
ل : تیرا عشق ہے میری آرزو، تیرا عشق ہے میری آبرو
تیرا عشق کیسے میں چھوڑ دوں، میری عمر بھر کی تلاش ہے
دل عشق، جسم عشق ہے، اور جان عشق ہے
ایمان کی جو پوچھو تو ایمان عشق ہے
تیرا عشق کیسے میں چھوڑ دوں، میری عمر بھر کی تلاش ہے
ب : وحشت دل رسن و دار سے روکی نہ گئی
کسی خنجر، کسی تلوار سے روکی نہ گئی
عشق مجنوں کی وہ آواز ہے جس کے آگے
کوئی لیلیٰ کسی دیوار سے روکی نہ گئی
ـــــــــ یہ عشق عشق ہے
ل : وہ ہنس کے اگر مانگیں تو ہم جان بھی دے دیں
یہ جان تو کیا چیز ہے، ایمان بھی دے دیں
عشق آزاد ہے، ہندو نہ مسلمان ہے عشق
آپ ہی دھرم ہے اور آپ ہی ایمان ہے عشق
جس سے آگاہ نہیں شیخ و برہمن دونوں
اس حقیقت کا گرجتا ہوا اعلان ہے عشق
عشق نہ پچھے دین دھرم نوں عشق نہ پچھے ذاتاں
عشق دے ہتھوں گرم لہو وِچ ڈبیاں لکھ براتاں

یہ عشق عشق ہے

جب جب کرشن کی بنسی باجی، نکلی رادھا سج کے
جان اجان کا دھیان بھلا کے لوک لاج کو تج کے
بن بن ڈولی جنک دلاری پہن کے پریم کی مالا
درشن جل کی پیاسی میرا پی گئی بس کا پیالہ
یہ عشق عشق ہے ـــــــــــ

اللہ اور رسولؐ کا فرمان عشق ہے
یعنی حدیث عشق ہے قرآن عشق ہے
گوتم کا اور مسیحؑ کا ارمان عشق ہے
یہ کائنات عشق ہے اور جان عشق ہے
عشق سرمدؒ، عشق ہی منصور ہے
عشق موسیٰؑ، عشق کوہ طور ہے
خاک کو بت اور بت کو دیوتا کرتا ہے عشق
انتہا یہ ہے کہ بندے کو خدا کرتا ہے عشق
یہ عشق عشق ہے ـــــــــــ

آج کیوں ہم سے پردا ہے ؟
تیرا ہر رنگ ہم نے دیکھا ہے
تیرا ہر ڈھنگ ہم نے دیکھا ہے
ہاتھ کھیلے ہیں تیری زلفوں سے
آنکھ واقف ہے تیرے جلووں سے
تجھ کو ہر طرح آزمایا ہے
پا کے کھویا ہے کھو کے پایا ہے
انکھڑیوں کا بیاں سمجھتے ہیں
دھڑکنوں کی زباں سمجھتے ہیں
چوڑیوں کی کھنک سے واقف ہیں
چھاگلوں کی چھنک سے واقف ہیں
ناز و انداز جانتے ہیں ہم
تیرا ہر راز جانتے ہیں ہم
آج کیوں ہم سے پردا ہے ؟

منہ چھپانے سے فائدہ کیا ہے
دل دکھانے سے فائدہ کیا ہے
اُلجھی اُلجھی لٹیں سنوار کے آ
حسن کو اور بھی نکھار کے آ
نرم گالوں میں بجلیاں لے کر
شوخ آنکھوں میں تتلیاں لے کر

آبھی جا اب ادا سے لہراتی
ایک دلہن کی طرح شرماتی
تو نہیں ہے تو رات سونی ہے
عشق کی کائنات سونی ہے
مرنے والوں کی زندگی تو ہے
اس اندھیرے کی روشنی تو ہے
آج کیوں ہم سے پردا ہے ؟

آترا انتظار کب سے ہے
ہر نظر بے قرار کب سے ہے
شمع رہ رہ کے جھلملاتی ہے
سانس تاروں کی ڈوبی جاتی ہے
تو اگر مہربان ہو جائے
ہر تمنا جوان ہو جائے
آبھی جا اب کہ رات جاتی ہے
ایک عاشق کی بات جاتی ہے
خیر ہو تیری زندگانی کی
بھیک دے دے ہمیں جوانی کی
تجھ پہ سو جان سے فدا ہیں ہم
ایک مدت کے آشنا ہیں ہم
آج کیوں ہم سے پردا ہے ؟

تو ہندو بنے گا، نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے، انسان بنے گا

اچھا ہے ابھی تک ترا کچھ نام نہیں ہے
تجھ کو کسی مذہب سے کوئی کام نہیں ہے
جس علم نے انسانوں کو تقسیم کیا ہے
اُس علم کا تجھ پر کوئی الزام نہیں ہے
تو بدلے ہوئے وقت کی پہچان بنے گا
انسان کی اولاد ہے، انسان بنے گا

مالک نے ہر انسان کو انسان بنایا
ہم نے اُسے ہندو یا مسلمان بنایا
قدرت نے تو بخشی تھی ہمیں ایک ہی دھرتی
ہم نے کہیں بھارت، کہیں ایران بنایا
جو توڑ دے ہر بند وہ طوفان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

نفرت جو سکھائے وہ دھرم تیرا نہیں ہے
انساں کو جو روندے وہ قدم تیرا نہیں ہے
قرآن نہ ہو جس میں وہ مندر نہیں تیرا
گیتا نہ ہو جس میں وہ حرم تیرا نہیں ہے
تو امن کا اور صلح کا ارمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اُسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا، جب جی چاہا دھتکار دیا

تلتی ہے کہیں دیناروں میں، بکتی ہے کہیں بازاروں میں
ننگی نچوائی جاتی ہے، عیّاشوں کے درباروں میں
یہ وہ بے عزت چیز ہے جو بٹ جاتی ہے عزت داروں میں
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا

مردوں کے لئے ہر ظلم روا، عورت کیلئے رونا بھی خطا
مردوں کے لئے لاکھوں سیجیں، عورت کیلئے بس ایک چتا
مردوں کے لئے ہر عیش کا حق، عورت کیلئے جینا بھی سزا
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا

جن سینوں نے ان کو دودھ دیا، اُن سینوں کا بیوپار کیا
جس کوکھ میں ان کا جسم ڈھلا، اُس کوکھ کا کاروبار کیا
جس تن سے اُگے کونپل بن کر، اُس تن کو ذلیل و خوار کیا
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں کے اسے بازار دیا

مردوں نے بنائیں جو رسمیں اُن کو حق کا فرمان کہا
عورت کے زندہ جلنے کو، قربانی اور بلیدان کہا
عصمت کے بدلے روٹی دی اور اس کو بھی احسان کہا
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا

سنسار کی ہر اِک بے شرمی، غربت کی گود میں پلتی ہے
چکلوں ہی میں آکر رکتی ہے، فاقوں سے جو راہ نکلتی ہے
مردوں کی ہوس ہے جو اکثر، عورت کے پاپ میں ڈھلتی ہے
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا

عورت سنسار کی قسمت ہے، پھر بھی تقدیر کی ہیٹی ہے
اوتار، پیمبر جنتی ہے، پھر بھی شیطان کی بیٹی ہے
یہ وہ بد قسمت ماں ہے جو بیٹوں کی سیج پہ لیٹی ہے
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا

دو بوندیں ساون کی ـــــ
اِک ساگر کی سیپ میں ٹپکے اور موتی بن جائے
دوجی گندے جل میں گر کر اپنا آپ گنوائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی، کس کو دوش لگائے
دو بوندیں ساون کی

دو کلیاں گلشن کی ـــــ
اِک سہرے کے بیچ گندھے اور من ہی من اترائے
اِک ارتھی کی بھینٹ چڑھے اور دھولی میں مل جائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی، کس کو دوش لگائے
دو کلیان گلشن کی

دو سکھیاں بچپن کی ـــــ
اِک سنگھاسن پر بیٹھے، اور روپ متی کہلائے
دوجی اپنے روپ کے کارن، گلیوں میں بک جائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی، کس کو دوش لگائے
دو سکھیاں بچپن کی

میں نے شاید تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

اجنبی سی ہو مگر غیر نہیں لگتی ہو
وہم سے بھی جو ہو نازک وہ یقیں لگتی ہو
ہائے یہ پھول سا چہرہ یہ گھنیری زلفیں
میرے شعروں سے بھی تم مجھ کو حسیں لگتی ہو

دیکھ کر تم کو کسی رات کی یاد آتی ہے
ایک خاموش ملاقات کی یاد آتی ہے
ذہن میں حسن کی ٹھنڈک کا اثر جاگتا ہے
آنچ دیتی ہوئی برسات کی یاد آتی ہے

میری آنکھوں میں جھکی رہتی ہیں پلکیں جس کی
تم وہی میرے خیالوں کی پری ہو کہ نہیں
کہیں پہلے کی طرح پھر تو نہ کھو جاؤ گی
جو ہمیشہ کے لئے ہو وہ خوشی ہو کہ نہیں

میں نے شاید تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

میں زندگی کا ساتھ نبھاتا چلا گیا　　ہر فکر کو دھوئیں میں اڑاتا چلا گیا

بربادیوں کا سوگ منانا فضول تھا　　بربادیوں کا جشن مناتا چلا گیا

جو مل گیا اسی کو مقدّر سمجھ لیا　　جو کھو گیا میں اُس کو بھلاتا چلا گیا

غم اور خوشی میں فرق نہ محسوس ہو جہاں　　میں دل کو اس مقام پہ لاتا چلا گیا

کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا
بات نکلی تو ہر اِک بات پہ رونا آیا

ہم تو سمجھے تھے کہ ہم بھول گئے ہیں اُن کو
کیا ہوا آج یہ کس بات پہ رونا آیا

کس لئے جیتے ہیں ہم، کس کے لئے جیتے ہیں
بارہا ایسے سوالات پہ رونا آیا

کون روتا ہے کسی اور کی خاطر اے دوست
سب کو اپنی ہی کسی بات پہ رونا آیا

ل : ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دل ابھی بھرا نہیں

ابھی ابھی تو آئی ہو		بہار بن کے چھائی ہو
ہوا ذرا مہک تو لے		نظر ذرا بہک تو لے
یہ شام ڈھل تو لے ذرا		یہ دل سنبھل تو لے ذرا
میں تھوڑی دیر جی تو لوں		نشے کے گھونٹ پی تو لوں

ابھی تو کچھ کہا نہیں، ابھی تو کچھ سنا نہیں

ب : ستارے جھلملا اُٹھے		چراغ جگمگا اُٹھے
بس اب نہ مجھ کو ٹوکنا		نہ بڑھ کے راہ روکنا
اگر میں رک گئی ابھی		تو جا نہ پاؤں گی کبھی
یہی کہو گے تم سدا		کہ دل ابھی نہیں بھرا

جو ختم ہو کسی جگہ، یہ ایسا سلسلہ نہیں

ل : ادھوری آس چھوڑ کے		ادھوری پیاس چھوڑ کے
جو روز یوں ہی جاؤ گی		تو کس طرح نبھاؤ گی ؛
کہ زندگی کی راہ میں		جواں دلوں کی چاہ میں
کئی مقام آئیں گے		جو ہم کو آزمائیں گے

بُرا نہ مانو بات کا، یہ پیار ہے گلہ نہیں

ب : جہاں میں ایسا کون ہے کہ جس کو غم ملا نہیں
دکھ اور سکھ کے راستے بنے ہیں سب کے واسطے
جو غم سے ہار جاؤ گے تو کس طرح نبھاؤ گے
خوشی ملے ہمیں کہ غم جو ہوگا بانٹ لیں گے ہم
مجھے تم آزماؤ تو ذرا نظر ملاؤ تو
یہ جسم دو سہی مگر، دلوں میں فاصلہ نہیں
تمہارے پیار کی قسم تمہارا غم ہے میرا غم
نہ یوں بجھے بجھے رہو جو دل کی بات ہے کہو
جو مجھ سے بھی چھپاؤ گے تو پھر کسے بتاؤ گے
میں کوئی غیر تو نہیں دلاؤں کس طرح یقیں
کہ تم سے میں جدا نہیں ہوں، مجھ سے تم جدا نہیں

سرمئی رات ہے ستارے ہیں آج دونوں جہاں ہمارے ہیں
صبح کا انتظار کون کرے؟

پھر یہ رُت، یہ سماں ملے نہ ملے آرزو کا چمن کھلے نہ کھلے
وقت کا اعتبار کون کرے؟

لے بھی لو ہم کو اپنی باہوں میں روح بے چین ہے نگاہوں میں
التجا بار بار کون کرے؟

آج سجن موہے انگ لگا لو جنم سپھل ہو جائے
ہردے کی پیڑا دیہہ کی اگنی، سب شیتل ہو جائے
کئے لاکھ جتن، مورے من کی تپن، مورے تن کی جلن نہیں جائے
کیسی لاگی یہ لگن، کیسی جاگی یہ اگن، جیا دھیر دھرن نہیں پائے
پریم سُدھا اتنی برسا دو جگ جل تھل ہو جائے
آج سجن موہے انگ لگا لو جنم سپھل ہو جائے

کئی جگوں سے ہیں جاگے، مورے نین ابھاگے، کہیں جیا نہیں لاگے بِن تورے
سُکھ دیکھے ناہیں آگے، دُکھ پیچھے پیچھے بھاگے، جگ سونا سونا لاگے بِن تورے
پریم سُدھا اتنی برسا دو جگ جل تھل ہو جائے
آج سجن موہے انگ لگا لو جنم سپھل ہو جائے

موہے اپنا بنا لو موری باہنہ پکڑ لو، میں ہوں جنم جنم کی داسی
موری پیاس بجھا دو من ہر گردھر، میں ہوں انتر گھٹ تک پیاسی
پریم سدھا اتنی برسا دو، جگ جل تھل ہو جائے
آج سجن موہے انگ لگا لو، جنم سپھل ہو جائے

من رے، تو کاہے نہ دِھیر دھرے
وہ نِرموہی موہ نہ جانیں، جن کا موہ کرے
من رے، تو کاہے نہ دِھیر دھرے

اِس جیون کی چڑھتی ڈھلتی دھوپ کو کس نے باندھا
رنگ پہ کس نے پہرے ڈالے، روپ کو کس نے باندھا
کاہے یہ جتن کرے
من رے، تو کاہے نہ دِھیر دھرے

اُتنا ہی اُپکار سمجھ، کوئی جتنا ساتھ نبھا دے
جنم مرن کا میل ہے سپنا، یہ سپنا بسرا دے
کوئی نہ سنگ مرے
من رے، تو کاہے نہ دِھیر دھرے

ہر وقت تیرے حُسن کا ہوتا ہے سماں اور
ہر وقت مجھے چاہیئے اندازِ بیاں اور
پھولوں سا کبھی نرم تو شعلوں سا کبھی گرم　　مستانہ اداؤں میں کبھی شوخی ہے کبھی شرم
ہر صبح گماں اور ہے، ہر رات گماں اور　　ہر وقت ترے حسن کا ہوتا ہے سماں اور
بھرنے نہیں پاتیں ترے جلووں سے نگاہیں　　تھکنے نہیں پاتیں تجھے لپٹا کے یہ بانہیں
چھو لینے سے ہوتا ہے ترا جسم جواں اور
ہر وقت ترے حسن کا ہوتا ہے سماں اور

کعبے میں رہو یا کاشی میں، نسبت تو اسی کی ذات سے ہے
تم رام کہو کہ رحیم کہو، مطلب تو اسی کی بات سے ہے

یہ مسجد ہے، وہ بتخانہ، چاہے یہ مانو، چاہے وہ مانو
مقصد تو ہے دل کو سمجھانا، چاہے یہ مانو، چاہے وہ مانو

یہ شیخ و برہمن کے جھگڑے، سب ناسمجھی کی باتیں ہیں
ہم نے تو ہے بس اتنا جانا، چاہے یہ مانو، چاہے وہ مانو

گر جذبِ محبت صادق ہو، ہر در سے مرادیں ملتی ہیں
ہر گھر ہے اُسی کا کاشانہ، چاہے یہ مانو، چاہے وہ مانو

سنسار کی ہر شے کا اتنا ہی فسانہ ہے　　اِک دھند سے آنا ہے، اک دھند میں جانا ہے

یہ راہ کہاں سے ہے، یہ راہ کہاں تک ہے　　یہ راز کوئی راہی سمجھا ہے نہ جانا ہے

اِک پل کی پلک پر ہے ٹھہری ہوئی یہ دنیا　　اِک پل کے جھپکنے تک ہر کھیل سہانا ہے

کیا جانے کوئی کس پر، کس موڑ پر کیا بیتے　　اس راہ میں اے راہی! ہر موڑ بہانہ ہے

ل: پاؤں چھو لینے دو پھولوں کو، عنایت ہوگی
ورنہ ہم کو نہیں، ان کو بھی شکایت ہوگی

ب: آپ جو پھول بچھائیں انہیں ہم ٹھکرائیں
ہم کو ڈر ہے کہ یہ توہینِ محبت ہوگی

ل: دل کی بے چین امنگوں پہ کرم فرماؤ
اتنا رُک رُک کے چلوگی تو قیامت ہوگی

ب: شرم روکے ہے اِدھر، شوق اُدھر کھینچے ہے
کیا خبر تھی کبھی اس دل کی یہ حالت ہوگی

ل: شرم غیروں سے ہوا کرتی ہے اپنوں سے نہیں
شرم ہم سے بھی کروگی تو مصیبت ہوگی

چھو لینے دو نازک ہونٹوں کو کچھ اور نہیں ہے جام ہے یہ　　قدرت نے جو ہم کو بخشا ہے وہ سب سے حسین انعام ہے یہ

شرما کے نہ یوں ہی کھو دینا رنگین جوانی کی گھڑیاں　　بے تاب دھڑکتے سینوں کا ارمان بھرا پیغام ہے یہ

اچھوں کو بُرا ثابت کرنا دنیا کی پرانی عادت ہے　　اس مے کو مبارک چیز سمجھ، مانا کہ بہت بدنام ہے یہ

آج کی رات مُرادوں کی برات آئی ہے

آج کی رات نہیں شکوے شکایت کے لئے
آج ہر لمحہ، ہر اک پل ہے محبّت کے لئے
ریشمی سیج ہے، مہکی ہوئی تنہائی ہے
آج کی رات مرادوں کی برات آئی ہے

ہر گناہ آج مقدس ہے فرشتوں کی طرح
کانپتے ہاتھوں کو مل جانے دو رشتوں کی طرح
آج ملنے میں نہ اُلجھن ہے نہ رسوائی ہے
آج کی رات مرادوں کی برات آئی ہے

اپنی زلفیں مرے شانے پہ بکھر جانے دو
اس حسیں رات کو کچھ اور نکھر جانے دو
صبح نے آج نہ آنے کی قسم کھائی ہے
آج کی رات مرادوں کی برات آئی ہے

تم اگر مجھ کو نہ چاہو تو کوئی بات نہیں
تم کسی اور کو چاہوگی تو مشکل ہوگی

اب اگر میل نہیں ہے تو جدائی بھی نہیں
بات توڑی بھی نہیں تم نے، بنائی بھی نہیں
یہ سہارا ہی بہت ہے میرے جینے کے لئے
تم اگر میری نہیں ہو تو پرائی بھی نہیں

میرے دل کو نہ سراہو تو کوئی بات نہیں
غیر کے دل کو سراہوگی تو مشکل ہوگی

تم حسیں ہو، تمہیں سب پیار ہی کرتے ہوں گے
میں جو مرتا ہوں تو کیا، اور بھی مرتے ہوں گے
سب کی آنکھوں میں اسی شوق کا طوفاں ہوگا
سب کے سینے میں یہی درد ابھرتے ہوں گے

میرے غم میں نہ کراہو تو کوئی بات نہیں

پھول کی طرح ہنسو، سب کی نگاہوں میں رہو
اپنی معصوم جوانی کی پناہوں میں رہو
مجھ کو وہ دن نہ دکھانا تمہیں اپنی ہی قسم
میں ترستا رہوں تم غیر کی باہوں میں رہو

تم جو مجھ سے نہ نبھاہو تو کوئی بات نہیں
کسی دشمن سے نبھاہوگی تو مشکل ہوگی

رنگ اور نور کی بارات کِسے پیش کروں ؟
یہ مرادوں کی حسیں رات کِسے پیش کروں ؟

مَیں نے جذبات نبھائے ہیں اصولوں کی جگہ
اپنے ارمان پرو لایا ہوں پھولوں کی جگہ
تیرے سہرے کی یہ سوغات کِسے پیش کروں ؟

یہ میرے شعر، مرے آخری نذرانے ھیں
میں اُن اپنوں میں ہوں جو آپ سے بیگانے ہیں
بے تعلق سی ملاقات کِسے پیش کروں ؟

سُرخ جوڑے کی تب و تاب مبارک ہو تجھے
تیری آنکھوں کا نیا خواب مبارک ہو تجھے
میں یہ خواہش یہ خیالات کِسے پیش کروں ؟

کون کہتا ہے کہ چاہت پہ سبھی کا حق ہے
تو جسے چاہے ترا پیار اُسی کا حق ہے
مجھ سے کہہ دے میں ترا ہات کِسے پیش کروں ؟

نغمہ و شعر کی سوغات کسے پیش کروں، یہ چھلکتے ہوئے جذبات کسے پیش کروں ؟
شوخ آنکھوں کے اجالوں کو لٹاؤں کس پر مست زلفوں کی سیہ رات کسے پیش کروں ؟
گرم سانسوں میں چھپے راز بتاؤں کس کو نرم ہونٹوں میں دبی بات کسے پیش کروں ؟
کوئی ہمراز تو پاؤں، کوئی ہمدم تو ملے دل کی دھڑکن کے اشارات کسے پیش کروں ؟

غصّے میں جو نکھرا ہے، اُس حُسن کا کیا کہنا
کچھ دیر ابھی ہم سے تم یوں ہی خفا رہنا

اس حُسن کے شعلے کی تصویر بنا لیں ہم
اِن گرم نگاہوں کو سینے سے لگا لیں ہم

پل بھر اسی عالم میں اے جانِ ادا رہنا
کچھ دیر ابھی ہم سے، تم یوں ہی خفا رہنا

یہ دہکا ہوا چہرہ، یہ بکھری ہوئی زلفیں
یہ بڑھتی ہوئی دھڑکن، یہ چڑھتی ہوئی سانسیں

سامانِ قضا ہو تم، سامانِ قضا رہنا
کچھ دیر ابھی ہم سے تم یوں ہی خفا رہنا

پہلے بھی حسیں تھیں تم، لیکن یہ حقیقت ہے
وہ حُسن مصیبت تھا، یہ حسن قیامت ہے

اور دل سے تو بڑھ کر ہو خود سے بھی سوا رہنا
کچھ دیر ابھی ہم سے تم یوں ہی خفا رہنا

یہ زلف اگر کھُل کے بکھر جائے تو اچھا
اس رات کی تقدیر سنور جائے تو اچھا

جس طرح سے تھوڑی سی ترے ساتھ کٹی ہے
باقی بھی اسی طرح گذر جائے تو اچھا

دنیا کی نگاہوں میں بُرا کیا ہے بھلا کیا ؟
یہ بوجھ اگر دل سے اُتر جائے تو اچھا

ویسے تو تمہیں نے مجھے برباد کیا ہے
الزام کسی اور کے سر جائے تو اچھا

بابل کی دعائیں لیتی جا، جا تجھ کو سکھی سنسار ملے
میکے کی کبھی نہ یاد آئے، سسرال میں اتنا پیار ملے

نازوں سے تجھے پالا میں نے، کلیوں کی طرح پھولوں کی طرح
بچپن میں جھلایا ہے تجکو، باہنوں نے مری جھولوں کی طرح
مرے باغ کی اے نازک ڈالی، تجھے ہر پل نئی بہار ملے

جس گھر سے بندھے ہیں بھاگ ترے، اُس گھر پہ سدا تر اراج رہے
ہونٹوں پہ ہنسی کی دھوپ کھلے، ماتھے پہ خوشی کا تاج رہے
کبھی جس کی جوت نہ ہو پھیکی، تجھے ایسا روپ سنگار ملے

بیتیں ترے جیون کی گھڑیاں آرام کی ٹھنڈی چھاؤں میں
کانٹا بھی نہ چبھنے پائے کبھی، مری لاڈلی تیرے پاؤں میں
اُس دوار سے بھی دکھ دور رہے، جس دوار سے تیرا دوار ملے
میکے کی کبھی نہ یاد آئے، سسرال میں اتنا پیار ملے

دوہے

کھُلے گگن کے نیچے پنچھی گھُومیں ڈالی ڈالی
مَیں کیا جانوں اُڑنا کیا ہے، میں پنجرے کی پالی

گملے کے اِس پھول کا جیون، میری کتھا سنائے
اسی کے اندر کھِلے بچارا، اسی میں مُرجھا جائے

شیشے کے تابوت میں جیسے مچھلی ماتھا پٹکے
پتھر کے اس بندی گھر میں، میری آتما بھٹکے

بچّے من کے سچّے، سارے جگ کی آنکھ کے تارے
یہ وہ ننھے پھول ہیں جو بھگوان کو لگتے پیارے

خود روٹھیں خود من جائیں، پھر ہم جولی بن جائیں
جھگڑا جس کے ساتھ کریں، اگلے ہی پل پھر بات کریں
اِن کو کسی سے بَیر نہیں، ان کے لئے کوئی غیر نہیں
اِن کا بھولا پن ملتا ہے سب کو بانہہ پسارے

انسان جب تک بچّہ ہے، تب تک سمجھو سچّا ہے
جوں جوں اس کی عمر بڑھے، من پر جھوٹ کا میل چڑھے
کرودھ بڑھے، نفرت گھیرے، لالچ کی عادت گھیرے
بچپن اِن پاپوں سے ہٹ کر اپنی عمر گذارے

تن کومل، من سندر ہیں، بچّے بڑوں سے بہتر ہیں
اِن میں چھوت اور چھات نہیں، جھوٹی ذات اور پات نہیں
بھاشا کی تکرار نہیں، مذہب کی دیوار نہیں
اِن کی نظروں میں اک ہیں مندر، مسجد، گردوارے

پگھلا ہے سونا دور گگن پر، پھیل رہے ہیں شام کے سائے
خاموشی کچھ بول رہی ہے
بھید انوکھے کھول رہی ہے
پنکھ پکھیرو سوچ میں گم ہیں، پیڑ کھڑے ہیں سیس جھکائے
پگھلا ہے سونا دور گگن پر، پھیل رہے ہیں شام کے سائے

دھندلے دھندلے مست نظارے
اُڑتے بادل، مڑتے دھارے
چھپ کے نظر سے جانے یہ کس نے رنگ رنگیلے کھیل رچائے
پگھلا ہے سونا دور گگن پر، پھیل رہے ہیں شام کے سائے

کوئی بھی اس کا راز نہ جانے
ایک حقیقت لاکھ فسانے
ایک ہی جلوہ شام سویرے، بھیس بدل کر سامنے آئے
پگھلا سونا دور گگن پر، پھیل رہے ہیں شام کے سائے

سنسار سے بھاگے پھرتے ہو، بھگوان کو تم کیا پاؤ گے
اس لوک کو بھی اپنا نہ سکے، اس لوک میں بھی پچھتاؤ گے

یہ پاپ ہے کیا، یہ پنیہ ہے کیا، ریتوں پہ دھرم کی مہریں ہیں
ہر یُگ میں بدلتے دھرموں کو کیسے آدرش بناؤ گے

یہ بھوگ بھی ایک تپسیا ہے، تم تیاگ کے مارے کیا جانو
اپمان رچیتا کا ہوگا، رچنا کو اگر ٹھکراؤ گے

ہم کہتے ہیں یہ جگ اپنا ہے، تم کہتے ہو جھوٹا سپنا ہے
ہم جنم بتا کر جائیں گے، تم جنم گنوا کر جاؤ گے

☆

ملے جتنی شراب، میں تو پیتا ہوں
رکھے کون یہ حساب، میں تو پیتا ہوں
ایک انسان ہوں میں فرشتہ نہیں
جو فرشتے بنیں، اُن سے رشتہ نہیں
کہو اچھا یا خراب، میں تو پیتا ہوں
ملے جتنی شراب، میں تو پیتا ہوں
ہوش مجھ کو رہے تو ستم گھیر لیں
کئی دکھ گھیر لیں، کئی غم گھیر لیں
سہے کون یہ عذاب، میں تو پیتا ہوں
ملے جتنی شراب، میں تو پیتا ہوں
کوئی اپنا اگر ہو تو ٹوکے مجھے
میں غلط کر رہا ہوں تو روکے مجھے
کسے دینا ہے حساب، میں تو پیتا ہوں
ملے جتنی شراب، میں تو پیتا ہوں

◎

بانٹ کے کھاؤ اس دنیا میں، بانٹ کے بوجھ اٹھاؤ — جس رستے میں سب کا سکھ ہو، وہ رستہ اپناؤ
اس تعلیم سے بڑھ کر جگ میں کوئی نہیں تعلیم
کہہ گئے فادر ابراہیم

کتے سے کیا بدلہ لینا، گر کتے نے کاٹا — تم نے اگر کتے کو کاٹا، کیا تھو کا کیا چاٹا
تم انسان ہو یارو، اپنی کچھ تو کرو تعظیم
کہہ گئے فادر ابراہیم

جھوٹ کے سر پر تاج بھی ہو تو جھوٹ کا بھانڈا پھوڑو — سچ چاہے سولی چڑھوادے، سچ کا ساتھ نہ چھوڑو
کل وہ سچ امرت ہوگا، جو آج ہے کڑوا نیم
کہہ گئے فادر ابراہیم

تم اپنا رنج و غم اپنی پریشانی مجھے دے دو
تمہیں ان کی قسم، یہ دکھ یہ حیرانی مجھے دے دو

میں دیکھوں تو سہی، دنیا تمہیں کیسے ستاتی ہے
کوئی دن کے لئے اپنی نگہبانی مجھے دے دو

یہ مانا میں کسی قابل نہیں ہوں اِن نگاہوں میں
بُرا کیا ہے اگر اس دل کی ویرانی مجھے دے دو

وہ دل جو میں نے مانگا تھا مگر غیروں نے پایا تھا
بڑی شے ہے اگر اس کی پشیمانی مجھے دے دو

تم چلی جاؤ گی، پرچھائیاں رہ جائیں گی
کچھ نہ کچھ حسن کی رعنائیاں رہ جائیں گی

تم کہ اس جھیل کے ساحل پہ ملی ہو مجھ سے
جب بھی دیکھوں گا یہیں مجکو نظر آؤ گی
یاد مٹتی ہے نہ منظر کوئی مٹ سکتا ہے
دور جا کر بھی تم اپنے کو یہیں پاؤ گی

گھُل کے رہ جائے گی جھونکوں میں بدن کی خوشبو
زلف کا عکس گھٹاؤں میں رہے گا صدیوں
پھول چپکے سے چرالیں گے لبوں کی سُرخی
یہ جواں حسن فضاؤں میں رہے گا صدیوں

اس دھڑکتی ہوئی شاداب و حسیں وادی میں
یہ نہ سمجھو کہ ذرا دیر کا قصّہ ہو تم
اب ہمیشہ کے لئے میرے مقدر کی طرح
ان نظاروں کے مقدر کا بھی حصّہ ہو تم

تم چلی جاؤ گی پرچھائیاں رہ جائیں گی
کچھ نہ کچھ حسن کی رعنائیاں رہ جائیں گی

ہر چیز زمانے کی جہاں پر تھی وہیں ہے
اِک تو ہی نہیں ہے
نظریں بھی وہی اور نظارے بھی وہی ہیں
خاموش فضاؤں کے اشارے بھی وہی ہیں
کہنے کو تو سب کچھ ہے، مگر کچھ بھی نہیں ہے
ہر اشک میں کھوئی ہوئی خوشیوں کی جھلک ہے
ہر سانس میں بیتی ہوئی گھڑیوں کی کسک ہے
تو چاہے کہیں بھی ہو، ترا درد یہیں ہے
حسرت نہیں، ارمان نہیں، آس نہیں ہے
یادوں کے سوا کچھ بھی مرے پاس نہیں ہے
یادیں بھی رہیں یا نہ رہیں کس کو یقیں ہے

دور رہ کر نہ کرو بات، قریب آجاؤ
یاد رہ جائے گی یہ رات، قریب آجاؤ

ایک مدت سے تمنا تھی تمہیں چھونے کی
آج بس میں نہیں جذبات، قریب آجاؤ

سرد جھونکوں سے بھڑکتے ہیں بدن میں شعلے
جان لے لے گی یہ برسات، قریب آجاؤ

اس قدر ہم سے جھجکنے کی ضرورت کیا ہے
زندگی بھر کا ہے اب ساتھ، قریب آجاؤ

مجھے گلے سے لگا لو، بہت اُداس ہوں میں
غمِ جہاں سے چھڑا لو، بہت اُداس ہوں میں
یہ انتظار کا دکھ اب سہا نہیں جاتا تڑپ رہی ہے محبت رہا نہیں جاتا
تم اپنے پاس بلا لو، بہت اُداس ہوں میں

ہر اک سانس میں ملنے کی پیاس پلتی ہے سلگ رہا ہے بدن اور روح جلتی ہے
بچا سکو تو بچا لو، بہت اداس ہوں میں

بھٹک چکی ہوں بہت زندگی کی راہوں میں مجھے اب آ کے چھپا لو تم اپنی بانہوں میں
مرا سوال نہ ٹالو، بہت اداس ہوں میں

بھولے سے محبت کر بیٹھا، ناداں تھا بچارا دل ہی تو ہے
ہر دل سے خطا ہو جاتی ہے، بگڑو نہ خدارا، دل ہی تو ہے

اس طرح نگاہیں مت پھیرو، ایسا نہ ہو دھڑکن رُک جائے
سینے میں کوئی پتھر تو نہیں، احساس کا مارا دل ہی تو ہے

جذبات بھی ہندو ہوتے ہیں، چاہت بھی مسلماں ہوتی ہے
دنیا کا اشارہ تھا، لیکن سمجھا نہ اشارا، دل ہی تو ہے

بیداد گروں کی ٹھوکر سے، سب خواب سہانے چور ہوئے
اب دل کا سہارا غم ہی تو ہے، اب غم کا سہارا، دل ہی تو ہے

تیرے بچپن کو جوانی کی دعا دیتی ہوں
اور دعا دے کے پریشان سی ہو جاتی ہوں

میرے بچے! مرے گلزار کے ننھے پودے
تجھ کو حالات کی آندھی سے بچانے کے لئے
آج پیار کے آنچل میں چھپا لیتی ہوں
کل یہ کمزور سہارا بھی نہ حاصل ہوگا
کل تجھے کانٹوں بھری راہ پہ چلنا ہوگا
زندگانی کی کڑی دھوپ میں جلنا ہوگا
تیرے بچپن کو جوانی کی دعا دیتی ہوں
اور دعا دے کے پریشان سی ہو جاتی ہوں
تیرے ماتھے پہ شرافت کی کوئی مہر نہیں
چند بوسے ہیں محبت کے سو وہ بھی کیا ہیں
مجھ سی ماؤں کی محبت کا کوئی مول نہیں
میرے معصوم فرشتے تو ابھی کیا جانے
تجھ کو کس کس کے گناہوں کی سزا ملنی ہے
دین اور دھرم کے مارے ہوئے انسانوں کی
جو نظر ملنی ہے وہ تجھ کو خفا ملنی ہے
تیرے بچپن کو جوانی کی دعا دیتی ہوں
اور دعا دے کے پریشان سی ہو جاتی ہوں
بیڑیاں لے کے لپکتا ہوا قانون کا ہات
تیرے ماں باپ سے جب تجھ کو ملی یہ سوغات

کون لائے گا ترے واسطے خوشیوں کی برات
میرے بچے! ترے انجام سے جی ڈرتا ہے
تیری دشمن ہی نہ ثابت ہو جوانی تیری
کانپ جاتی ہے جسے سوچ کے ممتا میری
اُسی انجام کو پہنچے نہ کہانی تیری
تیرے بچپن کو جوانی کی دعا دیتی ہوں
اور دعا دے کے پریشانی سی ہو جاتی ہوں

اب کوئی گلشن نہ اُجڑے، اب وطن آزاد ہے
روح گنگا کی، ہمالہ کا بدن آزاد ہے

کھیتیاں سونا اُگائیں، وادیاں موتی لٹائیں
آج گوتم کی زمیں، تلسی کا بن آزاد ہے

دستکاروں سے کہو، اپنی ہنرمندی دکھائیں
انگلیاں کٹتی تھیں جس کی، اب وہ فن آزاد ہے

مندروں میں سنکھ باجیں، مسجدوں میں ہو اذاں
شیخ کا دھرم اور دینِ برہمن آزاد ہے

لُوٹ کیسی بھی ہو اب اِس دیس میں رہنے نہ پائے
آج سب کے واسطے دھرتی کا دھن آزاد ہے

ساتھی ہاتھ بڑھانا

ایک اکیلا تھک جائے گا، مل کر بوجھ اٹھانا

ـــــــ ساتھی ہاتھ بڑھانا

ہم محنت والوں نے جب بھی مل کر قدم بڑھایا
ساگر نے رستہ چھوڑا پربت نے سیس جھکایا
فولادی ہیں سینے اپنے فولادی ہیں باہیں
ہم چاہیں تو پیدا کر دیں چٹانوں میں راہیں

ـــــــ ساتھی ہاتھ بڑھانا

محنت اپنے لیکھ کی ریکھا، محنت سے کیا ڈرنا
کل غیروں کی خاطر کی، آج اپنی خاطر کرنا
اپنا دکھ بھی ایک ہے ساتھی، اپنا سکھ بھی ایک
اپنی منزل، سچ کی منزل، اپنا رستہ نیک

ـــــــ ساتھی ہاتھ بڑھانا

ایک سے ایک ملے تو قطرہ بن جاتا ہے دریا
ایک سے ایک ملے تو ذرہ بن جاتا ہے صحرا
ایک سے ایک ملے تو رائی بن سکتی ہے پربت
ایک سے ایک ملے تو انساں بس میں کر لے قسمت

ـــــــ ساتھی ہاتھ بڑھانا

ماٹی سے ہم لعل نکالیں موتی لائیں جل سے
جو کچھ اس دنیا میں بنا ہے بنا ہے ہمارے بل سے
کب تک محنت کے پیروں میں دولت کی زنجیریں
ہاتھ بڑھا کر چھین لو اپنے خوابوں کی تعبیریں

ـــــــ ساتھی ہاتھ بڑھانا

یہ محلوں، یہ تختوں، یہ تاجوں کی دنیا
یہ انساں کے دشمن، سماجوں کی دنیا
یہ دولت کے بھوکے رواجوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

جوانی بھٹکتی ہے بدکار بن کر
جواں جسم سجتے ہیں بازار بن کر
یہاں پیار ہوتا ہے بیوپار بن کر
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

ہر اِک جسم گھائل، ہر ایک روح پیاسی
نگاہوں میں اُلجھن، دلوں میں اداسی
یہ دنیا ہے یا عالمِ بدحواسی
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

یہ دنیا، جہاں آدمی کچھ نہیں ہے
وفا کچھ نہیں دوستی کچھ نہیں ہے
جہاں پیار کی قدر ہی کچھ نہیں ہے
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

یہاں اِک کھلونا ہے انساں کی ہستی
یہ بستی ہے مردہ پرستوں کی بستی
یہاں پر تو جیون سے ہے موت سستی
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

جلا دو اسے پھونک ڈالو یہ دنیا
مرے سامنے سے ہٹا لو یہ دنیا
تمہاری ہے تم ہی سنبھالو یہ دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

برسو رام دھڑاکے سے
بڑھیا مرگئی فاقے سے
کل جگ میں بھی مرتی ہے، ست جگ میں بھی مرتی تھی
یہ بڑھیا اس دنیا میں سدا ہی فاقے کرتی تھی
جینا اس کو راس نہ تھا
پیسہ اس کے پاس نہ تھا
اس کے گھر کو دیکھ کے لکھمی مڑ جاتی تھی ناکے سے
برسو رام دھڑاکے سے

جھوٹے ٹکڑے کھاکے بڑھیا، تپتا پانی پیتی تھی
مرتی ہے تو مرجانے دو، پہلے بھی کب جیتی تھی؟
جے ہو پیسے والوں کی
گیہوں کے دلالوں کی
ان کا حد سے بڑھا منافع کچھ ہی کم ہے ڈاکے سے
برسو رام دھڑاکے سے

ل: ہم آپ کی آنکھوں میں اِس دل کو بسا دیں تو ؟
ب: ہم موند کے پلکوں کو اِس دل کو سزا دیں تو ؟

ل: اِن زلفوں میں گوندھیں گے ہم پھول محبّت کے
ب: زلفوں کو جھٹک کر ہم یہ پھول گرا دیں تو ؟

ل: ہم آپ کو خوابوں میں لا لا کے ستائیں گے
ب: ہم آپ کی آنکھوں سے نیندیں ہی اڑا دیں تو ؟

ل: ہم آپ کے قدموں پر گر جائیں گے غش کھا کر
ب: اس پر بھی نہ ہم اپنے آنچل کی ہوا دیں تو ؟

ملتی ہے زندگی میں محبت کبھی کبھی　　ہوتی ہے دلبروں کی عنایت کبھی کبھی

شرما کے منہ نہ پھیر نظر کے سوال پر　　لاتی ہے ایسے موڑ پر قسمت کبھی کبھی

کھلتے نہیں ہیں روز دریچے بہار کے　　آتی ہے جانِ من! یہ قیامت کبھی کبھی

تنہا نہ کٹ سکیں گے جوانی کے راستے　　پیش آئے گی کسی کی ضرورت کبھی کبھی

پھر کھو نہ جائیں ہم کہیں دنیا کی بھیڑ میں　　ملتی ہے پاس آنے کی مہلت کبھی کبھی

رات کے راہی تھک مت جانا، صبح کی منزل دور نہیں
دھرتی کے پھیلے آنگن میں پل دو پل ہے رات کا ڈیرا
ظلم کا سینہ چیر کے دیکھو، جھانک رہا ہے نیا سویرا
ڈھلتا دن مجبور سہی، چڑھتا سورج مجبور نہیں
صدیوں تک چپ رہنے والے اب اپنا حق لے کے رہیں گے
جو کرنا ہے کھل کے کریں گے جو کہنا ہے صاف کہیں گے
جیتے جی گھٹ گھٹ کر مرنا اس یُگ کا دستور نہیں
ٹوٹیں گی بوجھل زنجیریں، جاگیں گی سوئی تقدیریں
لوٹ پہ کب تک پہرا دیں گی زنگ لگی خونیں شمشیریں
رہ نہیں سکتا اِس دنیا میں جو سب کو منظور نہیں

جرمِ الفت پہ ہمیں لوگ سزا دیتے ہیں　　کیسے نادان ہیں، شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

ہم سے دیوانے کہیں ترکِ وفا کرتے ہیں　　جان جائے کہ رہے، بات نبھا دیتے ہیں

آپ دولت کے ترازو میں دلوں کو تولیں　　ہم محبت سے محبت کا صلہ دیتے ہیں

تخت کیا چیز ہے، اور لعل و جواہر کیا ہیں　　عشق والے تو خدائی بھی لٹا دیتے ہیں

ہم نے دل دے بھی دیا، عہدِ وفا لے بھی لیا　　آپ اب شوق سے دے لیں جو سزا دیتے ہیں

آنکھ کھلتے ہی تم چھپ گئے ہو کہاں
تم ابھی تھے یہاں
میرے پہلو میں تاروں نے دیکھا تمہیں
بھیگے بھیگے نظاروں نے دیکھا تمہیں
تم کو دیکھا کئے یہ زمیں آسماں
تم ابھی تھے یہاں
اب بھی سانسوں کی خوشبو ہواؤں میں ہے
اب بھی قدموں کی آہٹ فضاؤں میں ہے
اب بھی شاخوں میں ہیں انگلیوں کے نشاں
تم ابھی تھے یہاں
تم جدا ہو کے بھی میری راہوں میں ہو
گرم اشکوں میں ہو سرد آہوں میں ہو
چاندنی میں جھلکتی ہیں پرچھائیاں
تم ابھی تھے یہاں

لاگا چنری میں داغ چھپاؤں کیسے
_____ گھر جاؤں کیسے
ہو گئی میلی موری چنریا
کورے بدن کی کوری چنریا
جاکے بابل سے نجریں ملاؤں کیسے
_____ گھر جاؤں کیسے
بھول گئی سب وچن بدا کے
کھو گئی میں سسرال میں آکے
جاکے بابل سے نجریں ملاؤں کیسے
_____ گھر جاؤں کیسے
کوری چنریا آتما موری میل ہے مایا جال
وہ دنیا مورے بابل کا گھر یہ دنیا سسرال
جاکے بابل سے نجریں ملاؤں کیسے
_____ گھر جاؤں کیسے
لاگا چنری میں داغ چھپاؤں کیسے

جسے تو قبول کر لے، وہ ادا کہاں سے لاؤں؟
ترے دل کو جو لبھائے، وہ صدا کہاں سے لاؤں؟
میں وہ پھول ہوں کہ جس کو گیا ہر کوئی مسل کے — مری عمر بہہ گئی ہے مرے آنسوؤں میں ڈھل کے
جو بہار بن کے برسے وہ گھٹا کہاں سے لاؤں؟
تجھے اور کی تمنا، مجھے تیری آرزو ہے — ترے دل میں غم ہی غم ہے مرے دل میں تو ہی تو ہے
جو دلوں کو چین دیدے وہ دوا کہاں سے لاؤں؟
مری بے بسی ہے ظاہر مری آہِ بے اثر سے — کبھی موت بھی جو مانگی تو نہ پائی اس کے در سے
جو مراد لے کے آئے، وہ دعا کہاں سے لاؤں؟

تم نے کتنے سپنے دیکھے، میں نے کتنے گیت بُنے
اس دنیا کے شور میں لیکن دل کی دھڑکن کون سنے
سرگم کی آواز پہ سر کو دُھننے والے لاکھوں پائے
نغموں کی کِھلتی کلیوں کو چُننے والے لاکھوں پائے
راکھ ہوا دل جن میں جل کر وہ انگارے کون چُنے
تم نے کتنے سپنے دیکھے میں نے کتنے گیت بُنے
ارمانوں کے سونے گھر میں ہر آہٹ بیگانی نکلی
دل نے جب نزدیک سے دیکھا ہر صورت انجانی نکلی
بوجھل گھڑیاں گنتے گنتے صدمے ہو گئے لاکھ گُنے
تم نے کتنے سپنے دیکھے، میں نے کتنے گیت بُنے

پگھلی آگ سے ساغر بھر لے
کل مرنا ہے، آج ہی مر لے
اب نہ کبھی یہ رات ڈھلے گی، اب نہ کبھی جاگے گا سویرا
سوچ ہے کس کی، فکر ہے کس کی، اس دنیا میں کون ہے تیرا
کوئی نہیں جو تیری خبر لے
پگھلی آگ سے ساغر بھر لے

قدرت اندھی، دنیا بہری
کالے پڑ گئے، خواب سنہری
توڑ بھی دے امید کا رشتہ، چھوڑ بھی دے جذبات سے لڑنا
آج نہیں تو کل سمجھے گا، مشکل ہے حالات سے لڑنا
جو حالات کرائیں، کر لے
پگھلی آگ سے ساغر بھر لے

بند ہے نیکی کا دروازہ
آپ اٹھا لے اپنا جنازہ
کوئی نہیں جو بوجھ اٹھالے اپنی زندہ لاشوں کا
ختم ہی کر دے آج فسانہ، ان بے درد تماشوں کا
جانِ تمنّا، جاں سے گذر لے
پگھلی آگ سے ساغر بھر لے

یوں تو حسن ہر جگہ ہے، لیکن اس قدر نہیں
اے وطن کی سرزمین
یہ کھُلی کھُلی فضا　　یہ دُھلا دُھلا گگن
ندیوں کے پیچ و خم　　پربتوں کا بانکپن
تیری وادیاں جواں، تیرے راستے حسیں
اے وطن کی سرزمیں

تیری خاک میں بسی　　ماں کے دودھ کی مہک
تیرے روپ میں رچی　　سورگ لوک کی جھلک
ہم میں ہی کمی رہی ۔ تجھ میں کچھ کمی نہیں
اے وطن کی سرزمیں

نعمتوں کے درمیاں　　بھوک پیاس کیوں رہے؟
تیرے پاس کیا نہیں　　تو اداس کیوں رہے؟
عام ہوگی وہ خوشی، جو ہے اب کہیں کہیں
اے وطن کی سرزمیں

تیری خاک کی قسم　　ہم تجھے سجائیں گے
ہر چھپا ہوا ہُنر　　روشنی میں لائیں گے
آنے والے دور کی برکتوں پہ رکھ یقیں
اے وطن کی سرزمیں

اپنے اندر ذرا جھانک میرے وطن
اپنے عیبوں کو مت ڈھانک میرے وطن

تیرا اتہاس ہے خوں میں لتھڑا ہوا
تو ابھی تک ہے دنیا میں پچھڑا ہوا
تو نے اپنوں کو اپنا نہ مانا کبھی
تو نے انساں کو انساں نہ جانا کبھی
تیرے دھرموں نے ذاتوں کی تقسیم کی
تری رسموں نے نفرت کی تعلیم دی
وحشتوں کا چلن تجھ میں جاری رہا
قتل و خوں کا جنوں تجھ پہ طاری رہا

اپنے اندر ذرا جھانک میرے وطن

تو دراوڑ ہے یا آریہ نسل ہے
جو بھی ہے اب اسی خاک کی فصل ہے
رنگ اور نسل کے دائرے سے نکل
گر چکا ہے بہت دیر اب تو سنبھل
تیرے دل سے جو نفرت نہ مٹ پائے گی
تیرے گھر میں غلامی پلٹ آئے گی
تیری بربادیوں کا تجھے واسطہ
ڈھونڈ اپنے لئے اب نیا راستہ

اپنے اندر ذرا جھانک میرے وطن
اپنے عیبوں کو مت ڈھانک میرے وطن

بِنا سفارش ملے نوکری، بِن رشوت ہو کام اسی کو انہونی کہتے ہیں، اسی کا کل جگ نام

وطن کا کیا ہو گا انجام

بچالے اے مولا، اے رام

رشوت پر چلتے تھے چکر چھوٹے ہوں یا موٹے بند ہوئی یہ رسم تو دھندے ہو جائینگے کھوٹے

گھر گھر میں ماتم ہو گا، دفتر دفتر کہرام

بچالے اے مولا، اے رام

یہی چلا اب ڈھنگ تو یارو، ہونگے بُرے نتیجے بھوکے مریں گے نیتاؤں کے بیٹے اور بھتیجے

جتنی عزت بنی تھی اب تک سب ہو گی نیلام

بچالے اے مولا، اے رام

رشوت سے منہ بند تھے سب کے اب پھوٹیں گے بھانڈے

پتہ چلے گا کس کے کس سے ملے ہوئے تھے ڈانڈے

کون سا ٹھیکہ لے کر کس نے کتنا مال بنایا

کتنی اُجرت دی لوگوں کو کتنا بِل دکھلایا

کون سی فائل کس دفتر سے کیسے ہو گئی چوری

کس نے کتنی غداری کی، کتنی بھری تجوری

کِس مِل مالک کے پیسے نے کتنے ووٹ کمائے۔

کرسی ملی تو دیش بھگت نے کتنے نوٹ کمائے

رشوت ہی سے چھپے ہوئے تھے سب کالے کرتوت

ننگے ہو کر سامنے آئیں گے اب سبھی سپوت

دنیا بھر کے ملکوں میں ہو گا بھارت بدنام

بچالے اے مولا اے رام

بچّو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی
باپو کے وردان کی، نہرو کے ارمان کی
آج کے ٹوٹے کھنڈروں پر تم کل کا دیش بساؤ گے
جو ہم لوگوں سے نہ ہوا، وہ تم کر کے دکھلاؤ گے
تم ننھی بنیادیں ہو جگ کے نئے ودھان کی
بچّو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی

جو صدیوں کے بعد ملی ہے، وہ آزادی کھوئے نہ
دین دھرم کے نام پہ کوئی بیج پھوٹ کا بوئے نہ
ہر مذہب سے اونچی ہے قیمت انسانی جان کی
بچّو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی

پھر کوئی جے چند نہ اُبھرے، پھر کوئی جعفر نہ اُٹھے
غیروں کا دل خوش کرنے کو اپنوں پر خنجر نہ اُٹھے
دھن دولت کے لالچ میں توہین نہ ہو ایمان کی
بچّو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی

بہت دنوں تک اس دنیا میں ریت رہی ہے جنگوں کی
لڑی ہیں دھن والوں کی خاطر فوجیں بھوکے ننگوں کی
کوئی لٹیرا لے نہ سکے اب، قربانی انسان کی
بچّو! تم تقدیر ہو کل ہندوستان کی

رہ نہ سکے اب اس دنیا میں یگ سرمایہ داری کا
تم کو جھنڈا لہرانا ہے محنت کی سرداری کا
ہل ہوں اب مزدوروں کے اور کھیتی ہو دہقان کی
بچّو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی

خدائے برتر! تری زمیں پر، زمیں کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے؟
ہر ایک فتح وظفر کے دامن پہ خونِ انساں کا رنگ کیوں ہے؟

زمیں بھی تیری ہے، ہم بھی تیرے، یہ ملکیت کا سوال کیا ہے؟
یہ قتل و خوں کا رواج کیوں ہے، یہ رسمِ جنگ و جدال کیا ہے؟
جنہیں طلب ہے جہان بھر کی، انہیں کا دل اتنا تنگ کیوں ہے؟
خدائے برتر! تری زمیں پر، زمیں کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے؟

غریب ماؤں، شریف بہنوں کو امن و عزت کی زندگی دے
جنہیں عطا کی ہے تو نے طاقت، انہیں ہدایت کی روشنی دے
سروں میں کبر و غرور کیوں ہے، دلوں کے شیشے پہ زنگ کیوں ہے؟
خدائے برتر! تری زمیں پر، زمیں کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے؟

قضا کے رستے پہ جانے والوں کو بچ کے آنے کی راہ دینا
دلوں کے گلشن اجڑ نہ جائیں، محبتوں کو پناہ دینا
جہاں میں جشنِ وفا کے بدلے یہ جشنِ تیر و تفنگ کیوں ہے؟
خدائے برتر! تری زمیں پر، زمیں کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے؟

یہ دیش ہے ویر جوانوں کا　　البیلوں کا، مستانوں کا
اس دیش کا یارو کیا کہنا　　یہ دیش ہے دنیا کا گہنا

پیڑوں پہ بہاریں جھولوں کی　　راہوں میں قطاریں پھولوں کی
یہاں ہنستا ہے ساون بالوں میں　　کھلتی ہیں کلیاں گالوں میں

یہاں چوڑی چھاتی ویروں کی　　یہاں بھولی شکلیں ہیروں کی
یہاں گاتے ہیں رانجھے مستی میں　　مچتی ہیں دھومیں بستی میں

کہیں دنگل شوخ جوانوں کے　　کہیں کرتب تیر کمانوں کے
یہاں نت نت میلے سجتے ہیں　　نت ڈھول اور تاشے بجتے ہیں

دلبر کے لئے دل دار ہیں ہم　　دشمن کے لئے تلوار ہیں ہم
میداں میں اگر ہم ڈٹ جائیں　　مشکل ہے کہ پیچھے ہٹ جائیں

کون آیا کہ نگاہوں میں چمک جاگ اُٹھی
دل کے سوئے ہوئے تاروں میں کھنک جاگ اُٹھی

کس کے آنے کی خبر لے کے ہوائیں آئیں
جسم سے پھول چٹکنے کی صدائیں آئیں
روح کھِلنے لگی، سانسوں میں مہک جاگ اُٹھی

کس نے یہ میری طرف دیکھ کے باہیں کھولیں
شوخ جذبات نے سینے میں نگاہیں کھولیں
ہونٹ تپنے لگے، زلفوں میں لچک جاگ اُٹھی

کس کے ہاتھوں نے مرے ہاتھوں سے کچھ مانگا ہے
کس کے خوابوں نے مرے خوابوں سے کچھ مانگا ہے
دل مچلنے لگا، آنچل میں دھنک جاگ اُٹھی

بھول سکتا ہے بھلا کون یہ پیاری آنکھیں
رنگ میں ڈوبی ہوئی، نیند سے بھاری آنکھیں
میری ہر سوچ نے، ہر سانس نے چاہا ہے تمہیں
جب سے دیکھا ہے تمہیں تب سے سراہا ہے تمہیں
بس گئی ہیں مری آنکھوں میں تمہاری آنکھیں!
تم جو نظروں کو اٹھاؤ تو ستارے جھک جائیں
تم جو پلکوں کو جھکاؤ تو زمانے رک جائیں
کیوں نہ بن جائیں اِن آنکھوں کی پجاری آنکھیں
جاگتی راتوں کو سپنوں کا خزانہ مل جائے
تم جو مل جاؤ تو جینے کا بہانہ مل جائے
اپنی قسمت پہ کریں ناز ہماری آنکھیں

جیون کے سفر میں راہی ملتے ہیں بچھڑ جانے کو　اور دے جاتے ہیں یادیں تنہائی میں تڑپانے کو

رو رو کے انہی راہوں میں کھونا پڑا اک اپنے کو　ہنس ہنس کے انہی راہوں میں اپنایا تھا بیگانے کو

اب ساتھ نہ گزریں گے ہم لیکن یہ فضا وادی کی　دہراتی رہے گی برسوں، بھولے ہوئے افسانے کو

تم اپنی نئی دنیا میں کھو جاؤ پرائے بن کر　جی پائے تو ہم جی لیں گے مرنے کی سزا پانے کو

میں جب بھی اکیلی ہوتی ہوں تم چپکے سے آجاتے ہو
اور جھانک کے میری آنکھوں میں بیتے دن یاد دلاتے ہو

مستانہ ہوا کے جھونکوں سے ہر بار وہ پردے کا ہلنا
پردے کو پکڑنے کی دُھن میں دو اجنبی ہاتھوں کا ملنا
آنکھوں میں دُھواں سا چھا جانا سانسوں میں ستارے سے کھِلنا
رستے میں تمہارا مڑ مڑ کر تکنا وہ مجھے جاتے جاتے
اور میرا ٹھٹھک کر رک جانا، چلمن کے قریب آتے آتے
نظروں کا ترس کر رہ جانا، اِک اور جھلک پاتے پاتے
بالوں کو سکھانے کی خاطر، کوٹھے پہ وہ میرا آجانا
اور تم کو مقابل پاتے ہی کچھ شرمانا، کچھ بل کھانا
ہمسایوں کے ڈر سے کترانا، گھر والوں کے ڈر سے گھبرانا
رو رو کے تمہیں خط لکھتی ہوں، اور خود پڑھ کر رو لیتی ہوں
حالات کے تپتے طوفاں میں جذبات کی کشتی کھیتی ہوں
کیسے ہو، کہاں ہو کچھ تو کہو، میں تم کو صدائیں دیتی ہوں

میں جب بھی اکیلی ہوتی ہوں، تم چپکے سے آجاتے ہو
اور جھانک کے میری آنکھوں میں بیتے دن یاد دلاتے ہو

سلام حسرت قبول کر لو
مری محبت قبول کر لو

اُداس نظریں تڑپ تڑپ کر تمہارے جلووں کو ڈھونڈتی ہیں
جو خواب کی طرح کھو گئے اُن حسین لمحوں کو ڈھونڈتی ہیں
اگر نہ ہو ناگوار تم کو، تو یہ شکایت قبول کر لو
مری محبت قبول کر لو

تم ہی نگاہوں کی آرزو ہو، تم ہی خیالوں کا مدّعا ہو
تم ہی مرے واسطے صنم ہو، تم ہی مرے واسطے خدا ہو
مری پرستش کی لاج رکھ لو، مری عبادت قبول کر لو
مری محبت قبول کر ا

تمہاری جھکتی نظر سے جب تک نہ کوئی پیغام مل سکے گا
نہ روح تسکین پا سکے گی، نہ دل کو آرام مل سکے گا
غمِ جدائی ہے جان لیوا، یہ ایک حقیقت قبول کر لو
مری محبت قبول کرو

جو بات تجھ میں ہے، تری تصویر میں نہیں

رنگوں میں تیرا عکس ڈھلا، تو نہ ڈھل سکی
سانسوں کی آنچ، جسم کی خوشبو نہ ڈھل سکی
تجھ میں جو لوچ ہے مری تحریر میں نہیں

بے جان حسن میں کہاں رفتار کی ادا
انکار کی ادا ہے نہ اقرار کی ادا
کوئی لچک بھی زلفِ گرہ گیر میں نہیں

دنیا کی کوئی چیز نہیں ہے تری طرح
پھر ایک بار سامنے آجا کسی طرح
کیا اور اِک جھلک مری تقدیر میں نہیں؟

رات بھر کا ہے مہمان اندھیرا
کس کے روکے رُکا ہے سویرا
رات جتنی بھی سنگین ہو گی
صبح اتنی ہی رنگین ہو گی
غم نہ کر گر ہے بادل گھنیرا
کس کے روکے رکا ہے سویرا

لب پہ شکوہ نہ لا، اشک پی لے
جس طرح بھی ہو کچھ دیر جی لے
اب اُکھڑنے کو ہے غم کا ڈیرا
کس کے روکے رکا ہے سویرا

یوں ہی دنیا میں آکر نہ جانا
صرف آنسو بہا کر نہ جانا
مسکراہٹ پہ بھی حق ہے تیرا
کس کے روکے رُکا ہے سویرا

ل: جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا
روکے زمانہ چاہے روکے خدائی تم کو آنا پڑے گا
ترستی نگاہوں نے آواز دی ہے
محبت کی راہوں نے آواز دی ہے
جانِ حیا، جانِ ادا، چھوڑو ترسانا، تم کو آنا پڑے گا

ب: یہ مانا ہمیں جاں سے جانا پڑے گا
پر یہ سمجھ لو، تم نے جب بھی پکارا، ہم کو آنا پڑے گا
ہم اپنی وفا پر نہ الزام لیں گے
تمہیں دل دیا ہے، تمہیں جاں بھی دینگے
جب عشق کا سودا کیا، پھر کیا گھبرانا، ہم کو آنا پڑے گا

ل: سبھی اہلِ دنیا یہ کہتے ہیں ہم سے
کہ آتا نہیں کوئی ملکِ عدم سے
آج ذرا، شانِ وفا، دیکھے زمانہ، تم کو آنا پڑے گا

ب: ہم آتے رہے ہیں، ہم آتے رہیں گے
محبت کی رسمیں، نبھاتے رہیں گے
جانِ وفا، تم دو صدا، پھر کیا ٹھکانا، ہم کو آنے پڑے گا

وہ صبح کبھی تو آئے گی

اِن کالی صدیوں کے سر سے، جب رات کا آنچل ڈھلکے گا
جب دکھ کے بادل پگھلیں گے، جب سکھ کا ساگر چھلکے گا
جب امبر جھوم کے ناچے گا، جب دھرتی نغمے گائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

جس صبح کی خاطر جگ جگ سے، ہم سب مر مر کر جیتے ہیں
جس صبح کے امرت کی دُھن میں ہم زہر کے پیالے پیتے ہیں
اِن بھوکی پیاسی روحوں پر اک دن تو کرم فرمائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

مانا کہ ابھی تیرے میرے ارمانوں کی قیمت کچھ بھی نہیں
مٹی کا بھی ہے کچھ مول مگر انسانوں کی قیمت کچھ بھی نہیں
انسانوں کی عزّت جب جھوٹے سکّوں میں نہ تولی جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

دولت کے لئے جب عورت کی عصمت کو نہ بیچا جائے گا
چاہت کو نہ کچلا جائے گا، غیرت کو نہ بیچا جائے گا
اپنے کالے کرتوتوں پر جب یہ دنیا شرمائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

بیتیں گے کبھی تو دن آخر یہ بھوک کے اور بیکاری کے
ٹوٹیں گے کبھی تو بت آخر دولت کی اجارہ داری کے
جب ایک انوکھی دنیا کی بنیاد اُٹھائی جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

مجبور بڑھاپا جب سونی راہوں کی دھول نہ پھانکے گا

معصوم لڑکپن جب گندی گلیوں میں بھیک نہ مانگے گا
حق مانگنے والوں کو جس دن سُولی نہ دکھائی جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

فاقوں کی چِتاؤں پر جس دن انساں نہ جلائیں جائیں گے
سینوں کے دہکتے دوزخ میں ارماں نہ جلائیں جائیں گے
یہ نرک سے بھی گندی دنیا، جب سورگ بنائی جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

۲

وہ صبح ہمیں سے آئے گی ______
جب دھرتی کروٹ بدلے گی، جب قید سے قیدی چھوٹیں گے
جب پاپ گھروندے پھوٹیں گے، جب ظلم کے بندھن ٹوٹیں گے
اُس صبح کو ہم ہی لائیں گے، وہ صبح ہمیں سے آئے گی
وہ صبح ہمیں سے آئے گی

منحوس سماجی ڈھانچوں میں جب ظلم نہ پالے جائیں گے
جب ہاتھ نہ کاٹے جائیں گے، جب سر نہ اچھالے جائیں گے
جیلوں کے بنا جب دنیا کی سرکار چلائی جائے گی
وہ صبح ہمیں سے آئے گی

سنسار کے سارے محنت کش کھیتوں سے ملوں سے نکلیں گے
بے گھر، بے در، بے بس انساں تاریک بلوں سے نکلیں گے
دنیا امن اور خوشحالی کے پھولوں سے سجائی جائے گی
وہ صبح ہمیں سے آئے گی

آسماں پہ ہے خدا اور زمیں پہ ہم
آج کل وہ اس طرف دیکھتا ہے کم
آج کل کسی کو وہ ٹوکتا نہیں
چاہے کچھ بھی کیجئے روکتا نہیں
ہو رہی ہے لوٹ مار، پھٹ رہے ہیں بم
آسماں پہ ہے خدا اور زمیں پہ ہم
کس کو بھیجے وہ یہاں خاک چھاننے
اِس تمام بھیڑ کا حال جاننے
آدمی ہیں بے شمار دیوتا ہیں کم
آسماں پہ ہے خدا اور زمیں پہ ہم
اتنی دور سے اگر دیکھتا بھی ہو
تیرے میرے واسطے کیا کرے گا وہ
زندگی ہے اپنے اپنے بازوؤں کا دم
آسماں پہ ہے خدا اور زمیں پہ ہم

ا : کشتی کا خاموش سفر ہے، شام بھی ہے تنہائی بھی
دور کنارے پر بجتی ہے، لہروں کی شہنائی بھی
آج مجھے کچھ کہنا ہے

ب : لیکن یہ شرمیلی نگاہیں، مجھ کو اجازت دیں تو کہوں
خود میری بےتاب امنگیں تھوڑی فرصت دیں تو کہوں
آج مجھے کچھ کہنا ہے

ا : جو کچھ تم کو کہنا ہے، وہ میرے ہی دل کی بات نہ ہو
جو ہے مرے خوابوں کی منزل اس منزل کی بات نہ ہو
کہہ بھی دو، جو کہنا ہے

ا : کہتے ہوئے ڈر سا لگتا ہے، کہہ کر بات نہ کھو بیٹھوں
یہ جو ذرا سا ساتھ ملا ہے، یہ بھی ساتھ نہ کھو بیٹھوں
آج مجھے کچھ کہنا ہے

ب : کب سے تمہارے رستے میں میں پھول بچھائے بیٹھی ہوں
کہہ بھی چکو جو کہنا ہے، میں آس لگائے بیٹھی ہوں
کہہ بھی دو، جو کہنا ہے

دل نے دل کی بات سمجھ لی، اب منہ سے کیا کہنا ہے
آج نہیں تو کل کہہ لیں گے اب تو ساتھ ہی رہنا ہے
کہہ بھی دو، جو کہنا ہے
چھوڑو، اب کیا کہنا ہے

زور لگا کے ــــــ ہیّا
پیر جما کے ــــــ ہیّا
جان لڑا کے ــــــ ہیّا

آنگن میں بیٹھی ہے مچھیرن تیری آس لگائے
ارمانوں اور آشاؤں کے لاکھوں دیپ جلائے
بھولا بچپن رستہ دیکھے، ممتا خیر منائے
زور لگا کر کھینچ مچھیرے ڈھیل نہ آنے پائے

ــــــ ہیّا ہیّا
زور لگا کے ــــــ ہیّا
پیر جما کے ــــــ ہیّا
جان لڑا کے ــــــ ہیّا

جنم جنم سے اپنے سر پر طوفانوں کے سائے
لہریں اپنی ہمجولی ہیں اور بادل ہمسائے
جل اور جال ہیں جیون اپنا، کیا سردی کیا گرمی
اپنی ہمت کبھی نہ ٹوٹے، رُت آئے رُت جائے

ــــــ ہیّا ہیّا
زور لگا کے ــــــ ہیّا
پیر جما کے ــــــ ہیا
جان لڑا کے ــــــ ہیّا

کیا جانے کب ساگر امڈے کب برکھا آجائے
بھوک سروں پر منڈلائے منہ کھولے، پر پھیلائے
آج ملا، سو اپنی پونجی، کل کی ہاتھ پرائے
تنی ہوئی باہنوں سے کہہ دو، لوچ نہ آنے پائے

ــــــ ہیّا ہیّا
زور لگا کے ــــــ ہیّا
پیر جما کے ــــــ ہیّا
جان لڑا کے ــــــ ہیّا

تو مرے پیار کا پھول ہے، کہ مری بھول ہے، کچھ کہہ نہیں سکتی
پر کسی کا کیا تو بھرے یہ سہہ نہیں سکتی
میری بدنامی تیرے ساتھ چلے گی
سُن سُن طعنے میری کوکھ جلے گی
کانٹوں بھرے ہیں سب راستے، تیرے واسطے جیون کی ڈگر میں
کون بنے گا تیرا آسرا بے درد نگر میں
پوچھے گا کوئی تو کسے باپ کہے گا
جگ تجھے پھینکا ہوا پاپ کہے گا
بن کے رہے گی شرمندگی، تیری زندگی، جب تک تو جیے گا
آج پلاؤں تجھے دودھ میں، کل زہر پیے گا

نیلے گگن کے تلے، دھرتی کا پیار ملے
ایسے ہی جگ میں، آتی ہیں صبحیں، ایسے ہی شام ڈھلے
نیلے گگن کے تلے

شبنم کے موتی، پھولوں پہ بکھریں، دونوں کی آس پھلے
بل کھاتی بیلیں، مستی میں کھیلیں، پیڑوں سے مل کے گلے
ندیا کا پانی، دریا سے مل کے، ساگر کی اور چلے
نیلے گگن کے تلے
دھرتی کا پیار پلے

زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات
ایک انجان حسینہ سے ملاقات کی رات

ہائے وہ ریشمیں زلفوں سے برستا پانی
پھول سے گالوں پہ رُکنے کو ترستا پانی
دل میں طوفان اٹھاتے ہوئے جذبات کی رات
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات

ڈر کے بجلی سے اچانک وہ لپٹنا اُس کا
اور پھر شرم سے بل کھا کے سمٹنا اُس کا
کبھی دیکھی نہ سُنی ایسی طلسمات کی رات
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات

سُرخ آنچل کو دبا کر جو نچوڑا اُس نے
دل پہ جلتا ہوا اِک تیر سا چھوڑا اس نے
آگ پانی میں لگاتے ہوئے حالات کی رات
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات

میرے نغموں میں جو بستی ہے وہ تصویر تھی وہ
نوجوانی کے حسین خواب کی تعبیر تھی وہ
آسمانوں سے اتر آتی تھی جو رات کی رات
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات

اپنی دنیا پہ صدیوں سے چھائی ہوئی ظلم اور لوٹ کی سنگدل رات ہے
یہ نہ سمجھو کہ یہ آج کی بات ہے

جب سے دھرتی بنی، جب سے دنیا بسی، ہم یوں ہی زندگی کو ترستے رہے
موت کی آندھیاں گھر کے چھاتی رہیں، آگ اور خون کے بادل برستے رہے
تم بھی مجبور ہو، ہم بھی مجبور ہیں
کیا کریں یہ بزرگوں کی سوغات ہے

ہم اندھیری گپھاؤں سے نکلے مگر، روشنی اپنے سینوں سے پھوٹی نہیں
ہم نے جنگل تو شہروں میں بدلے مگر ہم سے جنگل کی تہذیب چھوٹی نہیں
اپنی بدنام انسانیت کی قسم
اپنی حیوانیت آج تک سات ہے

ہم نے سقراط کو زہر کی بھینٹ دی، اور عیسیٰ کو سولی کا تحفہ دیا
ہم نے گاندھی کے سینے کو چھلنی کیا، کینڈی سا جواں خوں میں نہلا دیا
ہر مصیبت جو انسان پر آئی ہے
اس مصیبت میں انسان کا ہات ہے

ہیروشیما کی جھلسی زمیں کی قسم، ناگاساکی کی سلگی فضا کی قسم
جن پہ جنگل کا قانون بھی تھوک دے، ایٹمی دور کے وہ درندے ہیں ہم
اپنی بڑھتی ہوئی نسل خود پھونک دے
ایسی بدذات اپنی ہی اک ذات ہے

ہم تباہی کے رستے پہ اتنا بڑھے، اب تباہی کا رستہ ہی باقی نہیں
خونِ انساں جہاں ساغروں میں بٹے، اس سے آگے وہ محفل، وہ ساقی نہیں
اس اندھیرے کی اتنی ہی اوقات ہے
اس سے آگے اُجالوں کی بارات ہے

جب بھی جی چاہے نئی دنیا بسا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پہ کئی چہرے لگا لیتے ہیں لوگ
یاد رہتا ہے کسے گذرے زمانے کا چلن
سرد پڑ جاتی ہے چاہت، ہار جاتی ہے لگن
اب محبت بھی ہے کیا
اِک تجارت کے سوا
ہم ہی نادان تھے جو اوڑھا بیتی یادوں کا کفن
ورنہ جینے کے لئے سب کچھ بھلا لیتے ہیں لوگ

جانے وہ کیا لوگ تھے جن کو وفا کا پاس تھا
دوسرے کے دل پہ کیا گذرے گی یہ احساس تھا
اب ہیں پتھر کے صنم
جن کو احساس نہ غم
وہ زمانہ اب کہاں جو اہلِ دل کو راس تھا
اب تو مطلب کے لئے نامِ وفا لیتے ہیں لوگ

دھرتی ماں کا مان، ہمارا پیارا لال نشان
نوَیگ کی مسکان، ہمارا پیارا لال نشان

پونجی واد سے دب نہ سکے گا، یہ مزدور کسان کا جھنڈا
محنت کا حق لے کے رہے گا، محنت کش انسان کا جھنڈا
یودھا اور بلوان، ہمارا پیارا لال نشان

اِس جھنڈے سے سانس اکھڑتی چور منافع خوروں کی
جنہوں نے انسانوں کی حالت کر دی ڈنگر ڈھوروں کی
اِن کے خلاف اعلان، ہمارا پیارا لال نشان

فیکٹریوں کے دُھول دھوئیں میں ہم نے خود کو پالا
خون پلا کر لوہے کو اس دیش کا بھار سنبھالا
محنت کے اِس 'پوجا گھر' پر پڑ نہ سکے گا تالا
دیش کے سادھن، دیش کا دھن ہیں جان لے پونجی والا
جیتے گا میدان، ہمارا پیارا لال نشان
دھرتی ماں کا مان، ہمارا پیارا لال نشان

ہم ترقی کے رستے پہ میلوں چلے ___ اِس ترنگے تلے
اور آگے بڑھیں گے ابھی منچلے ___ اِس ترنگے تلے

وہ ہمیں تھے جو اپنے وطن کے لئے سامراجی لٹیروں سے ٹکرا گئے
لب پہ آزاد بھارت کا نعرہ لئے، چڑھ کے پھانسی کے تختوں پہ لہرا گئے
اپنا حق اپنے دشمن سے لے کر ٹلے
اِس ترنگے تلے

دین اور دھرم کے فرق کو بھول کر، اک نئے ہند کی ہم نے تعمیر کی
جس میں سب کو برابر سہولت ملے، ایسی دنیا بنانے کی تدبیر کی
علم و تہذیب کے خواب پھولے پھلے
اِس ترنگے تلے

جب بھی سرحد پہ خونخوار لشکر بڑھے، ملک کی سالمیت کو للکارنے
ایک ہو کر سبھی بھارتی چل پڑے، اپنی دھرتی پہ جسم اور جاں وارنے
طے ہوئے کیسے کیسے کٹھن مرحلے
اِس ترنگے تلے

ہم نے جاگیر داری کو رخصت کیا، اب یہ سرمایہ داری بھی مٹ جائے گی
چند ہاتھوں میں دولت نہ رہ پائے گی، بھوک، بیروزگاری بھی مٹ جائیگی
جاگ اٹھے ہیں دلوں میں نئے ولولے
اِس ترنگے تلے

اپنی منصوبہ بندی سلامت رہے، چور بازار والوں سے نپٹیں گے ہم
آج سنکٹ میں ہے دیش تو کیا ہوا، دیش کے سب سوالوں سے نپٹیں گے ہم
ایسے سنکٹ کئی بار آکر ٹلے
اِس ترنگے تلے

امن و انسانیت اپنا آدرش ہے، اپنے آدرش سے منہ نہ موڑیں گے ہم
سر سے کیسا بھی طوفان گذرے مگر جنگ بازوں سے رشتہ نہ جوڑیں گے ہم
ہم یہ دیکھیں گے نہرو کی جیوتی جلے
اِس ترنگے تلے
باپ کا خواب، بیٹی کے ہاتھوں پھلے
اِس ترنگے تلے

☆

گنگا تیرا پانی امرت، جھر جھر بہتا جائے
یُگ یُگ سے اس دیش کی دھرتی تجھ سے جیون پائے
دور ہمالہ سے تو آئی گیت سہانے گاتی
پربت پربت، جنگل جنگل سکھ سندیش سناتی
تیری چاند جیسی دھارا میلوں تک لہرائے
کتنے سورج اُبھرے ڈوبے گنگا تیرے دوارے
یگوں یگوں کی کتھائیں سنائیں تیرے بہتے دھارے
تجکو چھوڑ کے بھارت کا اتہاس لکھا نہ جائے
اس دھرتی کا دکھ سکھ تو نے اپنے بیچ سمویا
جب جب دیش غلام ہوا ہے تیرا پانی رویا
جب جب ہم آزاد ہوئے ہیں تیرے تٹ مسکائے
گنگا تیرا پانی امرت، جھر جھر بہتا جائے

ایک تمثیل

(پردہ اُٹھنے پر ایک بہت بڑے سائز کا پیسہ اسٹیج کی پچھلی دیوار پر چسپاں نظر آتا ہے)

اناؤنسر: کہتے ہیں اِسے پیسہ بچّو! یہ چیز بڑی معمولی ہے
لیکن اِس پیسے کے پیچھے سب دنیا رستہ بھولی ہے
انساں کی بنائی چیز ہے یہ، لیکن انسان پہ بھاری ہے
ہلکی سی جھلک اس پیسے کی، دھرم اور ایمان پہ بھاری ہے
یہ جھوٹ کو سچ کر دیتا ہے، اور سچ کو جھوٹ بناتا ہے
بھگوان نہیں پر ہر گھر میں بھگوان کی پدوی پاتا ہے

اِس پیسے کے بدلے دنیا میں انسانوں کی محنت بِکتی ہے
جسموں کی حرارت بِکتی ہے، روحوں کی شرافت بِکتی ہے
سردار خریدے جاتے ہیں، دلدار خریدے جاتے ہیں
مٹّی کے سہی پر اس سے ہی اوتار خریدے جاتے ہیں
اِس پیسے کی خاطر دنیا میں، آباد وطن بٹ جاتے ہیں
دھرتی ٹکڑے ہو جاتی ہے، لاشوں کے کفن بٹ جاتے ہیں
عزّت بھی اس سے ملتی ہے، تعظیم بھی اس سے ملتی ہے
تہذیب بھی اس سے آتی ہے تعلیم بھی اس سے ملتی ہے
کہتے ہیں اِسے پیسہ بچّو!

ہم آج تمہیں اس پیسے کا سارا اتہاس بتاتے ہیں
جتنے یُگ اب تک گزرے ہیں اُن سب کی جھلک دکھلاتے ہیں

اِک ایسا وقت بھی تھا جگ میں جب اس پیسے کا نام نہ تھا
چیزیں چیزوں سے تلتی تھیں، چیزوں کا کچھ بھی دام نہ تھا
انسان فقط انسان تھا تب، انسان کا مذہب کچھ بھی نہ تھا
دولت، غربت، عزت، ذلت اِن لفظوں کا مطلب کچھ بھی نہ تھا

(کچھ لوگ جنگلی لباس میں اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں اور اجناس کا تبادلہ کرتے ہیں۔)

اناؤنسر: چیزوں سے چیز بدلنے کا یہ ڈھنگ بہت بیکار سا تھا
لانا بھی کٹھن تھا چیزوں کا، لے جانا بھی دشوار سا تھا

انسانوں نے تب مل کر سوچا، کیوں وقت اتنا برباد کریں
ہر چیز کی جو قیمت ٹھہرے، وہ چیز نہ کیوں ایجاد کریں
اس طرح ہماری دنیا میں، پہلا پیسہ تیار ہوا
اور اِس پیسے کی حسرت میں، انسان ذلیل و خوار ہوا

(جاگیرداری کا زمانہ۔ ایک راجا اپنے وزیروں اور درباریوں کے درمیان بیٹھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔
شاعر، گویّے، پنڈت اور مولوی بھی موجود ہیں۔ راگ درباری کا الاپ اور رقص)

اناؤنسر: پیسے والے اس دنیا میں جاگیروں کے مالک بن بیٹھے
مزدوروں اور کسانوں کی تقدیروں کے مالک بن بیٹھے
جاگیروں پہ قبضہ رکھنے کو، قانون بنے ہتھیار بنے
ہتھیاروں کے بل پر دھن والے، اس دھرتی کے سردار بنے
جنگوں میں لڑایا بھوکوں کو، اور اپنے سر پر تاج رکھا
نردھن کو دیا پرلوک کا سُکھ، اپنے لئے جگ کا راج رکھا
پنڈت اور مُلّا ان کے لئے مذہب کے صحیفے لاتے رہے
شاعر تعریفیں لکھتے رہے، گائک درباری گاتے رہے

(کسان مرد اور عورتیں، کاندھے پر ہل اور کدال لئے داخل ہوتے ہیں اور راجہ کو جھک کر سلام کرتے ہیں۔)

کورس :

مرد اور عورتیں : ویسا ہی کریں گے ہم، جیسا تمہیں چاہیئے
پیسہ ہمیں چاہیئے
ہل ترے جوتیں گے، کھیت ترے بوئیں گے
ڈھور ترے ہانکیں گے، بوجھ ترا ڈھوئیں گے
پیسہ ہمیں چاہیئے

بچّے : پیسہ ہمیں دے دے راجہ، گن ترے گائیں گے
تیرے بچّے بچیوں کی، خیر منائیں گے
پیسہ ہمیں چاہیئے

(کچھ بچوں کو بھیک مل جاتی ہے، باقیوں کو مایوس لوٹنا پڑتا ہے)

(منظر تبدیل ہوتا ہے اور اسٹیج پر مشینی دور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ـــــــ شہر، ملیں، کارخانے اور سرمایہ دار)

اناؤنسر :- لوگوں کی ان تھک محنت نے چمکایا روپ زمینوں کا
بھاپ اور بجلی ہمراہ لئے، آ پہنچا دور مشینوں کا
علم اور گیان کی طاقت نے منہ موڑ دیا دریاؤں کا
انسان جو خاک کا پتلا تھا، وہ حاکم بنا ہواؤں کا
جنتا کی محنت کے آگے قدرت نے خزانے کھول دیئے
رازوں کی طرح رکھا تھا جنہیں، وہ سارے زمانے کھول دیئے

لیکن ان سب ایجادوں پر پیسے کا اجارا ہوتا رہا
دولت کا نصیبہ چمک اٹھا، محنت کا مقدر سوتا رہا

(کچھ مرد، عورتیں اور بچے مشینی دور کے اوزار لے کر سرمایہ دار کے سامنے آتے ہیں)

کورس :

مرد اور عورتیں : ویسا ہی کریں گے ہم، جیسا تمہیں چاہیئے
پیسہ ہمیں چاہیئے

ریلیں بھی بچھائیں گے ، ملیں بھی چلائیں گے
جنگوں میں بھی جائیں گے ، جانیں بھی گنوائیں گے
پیسہ ہمیں چاہیئے

بچّے پیسہ ہمیں دے دے بابو ، گُن ترے گائیں گے
تیرے بچے بچیوں کی خیر منائیں گے
پیسہ ہمیں چاہیئے

(کچھ بچّوں کو بھیک مل جاتی ہے ۔ باقیوں کو مایوس لوٹنا پڑتا ہے ۔)

اناؤنسر :۔ جُگ جُگ سے یوں ہی اس دنیا میں ہم دان کے ٹکڑے مانگتے ہیں
ہل جوت کے ، فصلیں کاٹ کے بھی پکوان کے ٹکڑے مانگتے ہیں
لیکن اِن بھیک کے ٹکڑوں سے کب بھوک کا سنکٹ دور ہوا ؟
انسان سدا دکھ جھیلے گا ، گر ختم نہ یہ دستور ہوا
زنجیر بنی ہے قدموں کی ، وہ چیز جو پہلے گہنا تھی
بھارت کے سپوتو ! آج تمہیں بس اتنی بات ہی کہنا تھی

جس وقت بڑے ہو جاؤ تم ، پیسے کا راج مٹا دینا !
اپنا اور اپنے جیسوں کا ، جُگ جُگ کا قرض چکا دینا !

ایک مکالمہ

بچّے: ہم نے سنا تھا ایک ہے بھارت
سب ملکوں سے نیک ہے بھارت
لیکن جب نزدیک سے دیکھا
سوچ سمجھ کر ٹھیک سے دیکھا
ہم نے نقشے اور ہی پائے
بدلے ہوئے سب طور ہی پائے
ایک سے ایک کی بات جدا ہے
دھرم جدا ہے، ذات جدا ہے
آپ نے جو کچھ ہم کو پڑھایا
وہ تو کہیں بھی نظر نہ آیا

اُستاد: جو کچھ میں نے تم کو پڑھایا، اُس میں کچھ بھی جھوٹ نہیں
بھاشا سے بھاشا نہ ملے تو اس کا مطلب پھوٹ نہیں
اِک ڈالی پہ رہ کر جیسے پھول جُدا ہیں پات جدا
بُرا نہیں گر یونہی وطن میں دھرم جدا ہوں ذات جدا

بچّے: وہی ہے جب قرآن کا کہنا
جو ہے وید پُران کا کہنا
پھر یہ شور شرابہ کیوں ہے؟
اتنا خون خرابہ کیوں ہے؟

استاد: صدیوں تک اس دیس میں بچو! رہی حکومت غیروں کی
آج تلک ہم سب کے منہ پر دھول ہے اُن کے پیروں کی
"لڑواؤ اور راج کرو" یہ اُن لوگوں کی حکمت تھی
اُن لوگوں کی چال میں آنا، ہم لوگوں کی ذلّت تھی

یہ جو بَیر ہے اک دُوجے سے، یہ جو پھوٹ اور رنجش ہے
انہیں بدیشی آقاؤں کی سوچی سمجھی بخشش ہے

بچّے :- کچھ انسان برہمن کیوں ہیں ؟
کچھ انسان ہریجن کیوں ہیں ؟
ایک کی اتنی عزّت کیوں ہے ؟
ایک کی اتنی ذلّت کیوں ہے ؟

استاد :- دھن اور گیان کو طاقت والوں نے اپنی جاگیر کہا
محنت اور غلامی کو کمزوروں کی تقدیر کہا
انسانوں کا یہ بٹوارہ، وحشت اور جہالت ہے
جو نفرت کی شکھشا دے، وہ دھرم نہیں ہے لعنت ہے
جنم سے کوئی نیچ نہیں ہے، جنم سے کوئی مہان نہیں
کرم سے بڑھ کر کسی منش کی کوئی بھی پہچان نہیں

بچّے :- اب تو دیش میں آزادی ہے
اب کیوں جنتا فریادی ہے؟
کب جائے گا دَور پُرانا
کب آئے گا نیا زمانا ؟

استاد :- صدیوں کی بھوک اور بیکاری کیا اِک دن میں جائے گی،
اِس اُجڑے گلشن پر رنگت آتے آتے آئے گی
یہ جو نئے منصوبے ہیں اور یہ جو نئی تعمیریں ہیں
آنے والے دَور کی کچھ دھندلی دھندلی تصویریں ہیں
تم ہی رنگ بھرو گے اِن میں، تم ہی اِنہیں چمکاؤ گے
نَو یُگ آپ نہیں آئے گا، نَو یُگ کو تم لاؤ گے

○ ڈاکٹر راہی معصوم رضا

○ ابراہیم جلیس (مرحوم)

○ کرشن ادیب

تنہائی اور یخ بستہ اُداسی کا شاعر

ڈاکٹر راہی معصوم رضا

ساحر لدھیانوی سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی تھی یہ تو ٹھیک سے یاد نہیں۔ اگر تب یہ معلوم رہا ہوتا کہ ان کے مرنے کے بعد ان پر یہ مضمون لکھنا پڑے گا تو ملنے کا دن تاریخ یاد رکھتا۔ مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ تب وہ دلّی میں ایڈیٹری کر رہے تھے۔ اور ان کا نام چار دانگ عالم میں مشہور ہو چکا تھا۔ لیکن جس نظم پر ان کی مقبولیت ٹنگی ہوئی تھی وہ نظم نہ مجھے ان کی زندگی میں اچھی لگی اور نہ ان کے مرنے کے بعد۔ وہ نظم ہے "تاج محل"۔ اس نظم میں ان کی رومانی اشتراکیت خود اپنی حدوں کو پار کر گئی ہے۔ لیکن صاحبو، یہ اپنی اپنی نظر کی بات ہے۔ اپنے اپنے زاویۂ نظر کی بات ہے۔ اور چونکہ ساحر لدھیانوی ایک جاگیردار گھرانے سے تعلق بھی رکھتے تھے اور اشتراکی یا نیم اشتراکی بھی تھے۔ اس لئے ان کا ذہن زندگی بھر جاگیرداری کو رد کرتا رہا اور ان کی شخصیت کے کندھوں پر زندگی بھر جاگیرداری کی پرچھائیں بیٹھی رہی۔ میرا گھر۔ میرے دوست۔ میرا عشق۔ میری نظر۔

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

یہ انفرادیت کی تلاش نہیں ہے۔ یہ اشتراکیت کا راستہ بھی نہیں ہے۔ یہ دنیا کو رد کرنے کی بات ہے۔ اور یہ کوئی بہت قابل قدر رویہ نہیں ہے۔ لیکن ہر آدمی کو اپنی پسندیدہ یا ناپسندیدہ پرچھائیوں کے ساتھ جینا پڑتا ہے۔ اور پرچھائیوں کے اس سفر سے جو سلامت لوٹ آئے وہی اچھا شاعر ہے۔

تو آئیے ہم ساحر کی یاترا یہاں سے شروع کریں۔

نہ دوستی، نہ تکلف، نہ دلبری، نہ خلوص
کسی کا کوئی نہیں، آج سب اکیلے ہیں

ایک یخ بستہ اُداسی ہے دل و جاں پہ محیط
سایۂ ابرِ گریزاں سے مجھے کیا لینا

یہ تنہائی کا احساس اور یہ یخ بستہ اداسی بڑی ہولناک چیزیں ہیں مگر شاید انہیں دونوں چیزوں سے اس شاعر کا خمیر اٹھا جس نے ایک جاگیر زادے کو ساحر لدھیانوی بنا دیا۔ اس لئے ادب کے طالب علم کے لئے یہ دونوں چیزیں قابلِ قدر ہو جاتی ہیں کیونکہ ایک طرح ساحر اسی تنہائی اور اسی یخ بستہ اداسی کے شاعر تھے۔

مجبور ہوں میں، مجبور ہو تم، مجبور یہ دنیا ساری ہے
اس دور میں جینے کی قیمت یا دار و رسن یا خواری ہے
میں دار و رسن تک جا نہ سکا، تم جہد کی حد تک آ نہ سکیں

یہ ہے وہ نیش عقرب جو ساحر کی زندگی میں زہر گھولتا رہا اور وہ تن تنہا زہر کے اس سمندر کو متھنے کی کوشش کرتے رہے کہ زمانے کو امرت پلا سکیں۔

اس دور میں جینے کی قیمت یا دار و رسن یا خواری ہے

اس نتیجے پر ساحر کے سوا بھی بہت سے لوگ پہنچے۔ بہت سے دار و رسن کی منزلوں کو پار کر گئے۔ بہت سے خواریوں کے صحرا میں بھٹک گئے۔ لیکن یہ ہمت ساحر کے سوا شاید ہی کسی نے کی ہو کر؛

میں دار و رسن تک جا نہ سکا، تم جہد کی حد تک آ نہ سکیں

یہ جو دار و رسن تک نہ جا سکنے کا اعتراف ہے کیا ہم اسے بزدلی کہہ سکتے ہیں؟ میں تو اسے بڑی جیداری کا کام کہتا ہوں اس مصرعہ کا جو دوسرا ٹکڑا ہے وہ تو ترقی پسند ادب - بلکہ انجمن ترقی پسند مصنفین ادب" کی ایک روایت ہے جسے ساحر پر گفتگو کرتے وقت ہم نظر انداز کر سکتے ہیں۔ لیکن دار و رسن تک نہ جا سکنے کے اعتراف کی جرأت ساحر کی رومانی شخصیت اور ان کے رومانی مزاج کی ایک پرت کھولتی ہے! ور ساحر کی نجی اور کٹر ایمانداری کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ اپنے آپ کو ناپسند کرنا بہت مشکل کام ہے اور ان کی یخ بستہ اداسی کی ہتھیلی پر شب چراغ کی طرح یہ انگارہ دہک رہا ہے۔ ۔۔۔ یہ انگارہ ہر شخص کے ہاتھ نہیں آتا۔ یہ انگارہ تو ان فیض احمد فیض کی ہتھیلی پر بھی نہیں جو دار و رسن تک جا کے لوٹ آئے ہیں۔ اور جب ہی سے اپنی سر بلندی کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہیں ——

فیض کا ذکر میں نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ کیونکہ ساحر پر فیض کا رنگ گہرا ہے۔ مگر ساحر اور فیض میں ایک بنیادی فرق بھی ہے۔ دونوں کا موضوعِ سخن محبت ہے۔ لیکن فیض کی شاعری میں یہ محبت نسبتاً کم ہے اور فیض نسبتاً زیادہ ہیں۔ اس کے بالکل برعکس ساحر کی شاعری میں محبت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ اور یہ محبت کئی سطحوں پر ہے۔

تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں
یاس کی تاریکیوں میں ڈوب جانے دے مجھے
اب میں شمعِ آرزو کی لَو بڑھا سکتا نہیں

جب تمہیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال
پھر مری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو
تجھ کو خبر نہیں، مگر اک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے

وغیرہ وغیرہ۔ یہ ریاض خیرآبادی کی وہ خمریاتی شاعری نہیں جو شراب چکھے بنا کی گئی تھی۔ حالانکہ ان شعروں میں سرسری گزرئیے تو یہ روایت ہی کا حصہ نظر آتے ہیں۔ مگر ساحر روایتی شاعر نہیں تھے۔ انہوں نے زندگی کو چکھا تھا پیا تھا، جو سا تھا اور بھگتا تھا۔ اس لئے اس گلی میں کچھ اور آگے چلیئے:

تم میں ہمت ہو تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

یہ کڑواہٹ ساحر کی اپنی ہے اور جس لڑکی سے یہ بات کہی جا رہی ہے وہ اس شعر ہی کی روشنی میں ایک حقیقی، جیتی جاگتی، ڈری ہوئی، گھبرائی ہوئی لڑکی بن کر سامنے آجاتی ہے۔ اور مجھے یہ لڑکی حسرت کی غزل کی اس لڑکی کی قریبی رشتہ دار معلوم ہوتی ہے جو کوٹھے پر ننگے پاؤں آجایا کرتی تھی۔

غیروں کی نظروں سے بچ کر مجھ سے ملنے کے لئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

اور اب یہ دیکھیے کہ یہی وہ لڑکی ہے جو "جہد کی حد تک" بھی نہیں آسکی اور اسی "حد آں حد" کے دھندلکے میں کہیں ان دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔ پھر بھی میں نہ جانے کیوں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ساحر کی زندگی سے یہ لڑکی کبھی نہیں نکلی۔ شاید وہ ہر لڑکی میں اسی لڑکی کی جھلک دیکھتے۔ اور جب وہ پاس جا کر اسے اپنے اصلی روپ میں دیکھتے تو بدک جاتے اور انھیں تعلق روگ دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس تعلق اور روگ کے رشتے میں ایک پہلو اور ہے۔

قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا

ملاقات اگر ٹائم ٹیبل کا حصہ بن جائے۔ ملاقات اگر عادت بن جائے۔ روزمرہ کی زندگی کا ایک حصہ بن جائے تو وہ ملاقات ٹھنڈی چائے کی ایک پیالی ہے۔ روزمرہ کی یک رنگ زندگی کی طرح بے مزہ۔ چاہے اس میں دودھ اور چینی کی ملاقات درست ہی کیوں نہ ہو۔ اور چونکہ ساحر محبت کے مغنی، محبت کے قصیدہ خواں اور رجز خواں تھے اس لئے انہیں محبت کی یہ توہین گوارا نہ تھی۔ کیونکہ محبت تو زندگی کی سب سے زیادہ قابل احترام قدر ہے۔ جو ایسا نہ ہوتا تو ہم اس کی بات ہی کیوں کر رہے ہوتے۔ اس لئے ہم ساحر کی شاعری پر گفتگو کرتے وقت اس لڑکی کو نظرانداز نہیں کر سکتے جسے انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ " ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو"۔

یہ لڑکی کون ہے؟ مجھے نہیں معلوم۔ یہ ہندوستانی ہے یا پاکستانی؟ مجھے نہیں معلوم۔ یہ زندہ ہے یا مر گئی؟ مجھے نہیں

معلوم۔ لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ لڑکی یقیناً رشتہ دار رہی ہوگی۔ جاگیر دارانہ ماحول کی پلی بڑھی ..... ساحر اس سے جدا ہو گئے کیونکہ غالباً اس لڑکی نے جہاں ماں باپ نے کہا وہاں شادی کرلی۔ لیکن ساحر کی یادوں کی دنیا میں وہ برابر موجود رہی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے:

جب دل کو موت آئی نہ تھی
یوں بے حسی چھائی نہ تھی
وہ نازنینانِ وطن
زہرہ جبینانِ وطن
ان میں سے اک رنگیں قبا
کر کے محبت آشنا
میرے دلِ ناکام کو
داغِ جدائی دے گئی

یہ جو "ان میں سے اک رنگیں قبا" ہے کسی کھاتے پیتے گھر کی لڑکی ہے۔ جو ایسا نہ ہوتا تو 'رنگیں قبا' نہ کہی گئی ہوتی اور اس "داغِ جدائی" میں کہیں نہ کہیں سے ایک تہہ خانے میں کوئی چور دروازہ کھلتا ہے۔ جہاں کے اندھیرے میں ساحر کی آواز گونج رہی ہے:

وفا فریب ہے، طول ہوس ہے، کچھ بھی نہیں

اور نتیجہ یہ نکلا کہ:

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

محبت کے لئے ماحول کے خوشگوار نہ ہونے کا یہ احساس بھی عبدالحیٔ خاں کو ساحر لدھیانوی بنانے میں کام آیا کیونکہ جب انہوں نے ماحول کی ناخوشگوار کی چھت سے زندگی کی طرف دیکھا تو انہیں بہت سی چیزیں صاف دکھائی دینے لگیں۔

وہ گاؤں کی ہم جولیاں
مفلوک دہقاں زادیاں
جو دستِ فرطِ یاس سے
عصمت لٹا کر رہ گئیں
ان سے کبھی گلیوں میں اب
ہوتا ہوں میں دو چار جب
نظریں جھکا لیتا ہوں میں
نکلی ہے بنگلے کے در سے

اک مفلس دہقان کی بیٹی
افسردہ، مرجھائی ہوئی سی
جسم کے دکھتے جوڑ دباتی
مٹھی میں ایک نوٹ چھپائے ....

یہ ایک 'مفلس' اور 'مفلوک' دہقان کی بیٹی جب ان کے ساتھ بمبئی آئی اور بمبئی کی بھیڑ کا ایک حصہ بن گئی تو ساحر نے شاید اسی کو اپنی پہچان کا ستون مان لیا اور اپنے آپ کو بمبئی میں اجنبی نہیں محسوس کیا۔ مگر یہ "دہقان زادی" کڑواہٹ کی ایک تہہ بن کر ان کی زبان پر جم بھی گئی۔

مصور، میں ترا شہکار واپس کرنے آیا ہوں
اب ان رنگین رخساروں میں تھوڑی زردیاں بھر دے
مگر یاں، پنچ کے بدلے اسے صوفے پر بٹھلا دے
یہاں میرے بجائے اک چمکتی کار دکھلا دے

یہ صرف دکھے دل کی کڑواہٹ نہیں۔ یہ کار کا عرفان ہے۔ یہ زندگی کے تضاد کا احساس ہے۔ یہ طبقوں میں تقسیم شدہ اسی سماج کی ناانصافی کا مرثیہ بھی ہے اور اس کے خلاف ایک اعلانِ جہاد بھی، کیونکہ جہاں "میری جگہ" "کار" بیٹھ سکتی ہے وہ سماج اسی لائق ہے کہ اسے توڑ کر ایک نئے سماج کی بنیاد ڈالی جائے اور "اس رنگین قبا کو بچایا جائے۔ .... کیونکہ اصل چیز تو وہ "رنگین قبا" ہے جو پگھل کر مستقبل بن جاتی ہے ___ مگر ساحر محبت ہی کے لگے رہے ہیں۔

اور ساحر اپنی اس "رنگین قبا" کی پرچھائیں کے پیچھے دوڑتے دوڑتے جلسہ گاہوں، جلوسوں، لاٹھی چارجوں، نعروں، ہڑتالوں کی دنیا میں چلے گئے۔

جلسہ گاہوں میں یہ دہشت زدہ، سہمے انبوہ
رہ گزاروں پہ فلاکت زدہ لوگوں کے گروہ
یہ فلک بوس ملیں، دل کش و سیمیں بازار
دور ساحل پہ وہ شفاف مکانوں کی قطار
کون انساں کا خدا ہے، مجھے کچھ سوچنے دو

اور جب محبت نے سوچنا شروع کر دیا تو سفر آسان ہو گیا۔ باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔

میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تری فسوں زائی
مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے

ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات بند دریچوں سے بھی گزر آئی

اور جب حیات بند دریچوں سے بھی گزر آئی تو اب کوئی اس سے آنکھ کیسے چرائے۔ حالانکہ جب حیات سامنے آئی تو شاعر تھک سا چلا تھا۔

ظلم سہتے ہوئے انسانوں کے اس مقتل میں
کوئی فردا کے تصور سے کہاں تک بہلے
عمر بھر رینگتے رہنے کی سزا ہے جینا ....
آج لیکن مرے دامنِ چاک میں
گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں

لیکن اس ذہنی حالت میں بھی اٹھ کر اس رنگین قبا پر دل کا دروازہ بند کر دینا تو آسان نہ تھا۔ اس لئے ساحر نے اس رنگین قبا کو غور سے دیکھا جو ہزار آئینے لئے بند دریچوں سے گزر آئی ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ:

جو تیری ذات سے منسوب تھے، ان گیتوں کو
مفلسی جنس بنانے پر اتر آئی ہے
بھوک ترے رخِ رنگیں کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضروری کی تمنائی ہے

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
اور میں اس تباہی کے طوفان میں
آگ اور خون کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہوں
مجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دو

زندگی کے اس موڑ پر ساحر کے لئے کوئی فیصلہ کرنا ضروری تھا کہ ان کی محبت کا تقاضہ یہی تھا۔ اور انہوں نے فیصلہ کیا۔

آج سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے۔

لیکن اے عظمتِ انسان کے سنہرے خوابو
میں تمہارا ہوں، لٹیروں کا وفادار نہیں

ساز شیں لاکھ اڑھاتی رہیں ظلمت کی نقاب
لے کے ہر بوند نکلتی ہے ہتھیلی پہ چراغ
ظلم کی بات ہی کیا، ظلم کی اوقات ہی کیا
ظلم بس ظلم ہے، آغاز سے انجام تلک
خون پھر خون ہے سو شکل بدل سکتا ہے
ایسی شکلیں کہ مٹاؤ تو مٹائے نہ بنے

یہ ہے محبت کے شاعر، تنہائی اور یخ بستہ اداسی کے شاعر، اپنے خیالوں کی پرچھائیوں کے شاعر ساحر لدھیانوی کی محبت کا سفرنامہ۔ یہ سفر "ان میں سے اک رنگین قبا" اور جسم یار کی خوبی سے شروع ہوا تھا۔ چلتے چلتے وہاں آ گیا جہاں " خون پھر خون ہے، سو شکل بدل سکتا ہے۔"

یہ لمبا سفر قابلِ احترام ہے اور اس لمبے سفر پر نکل پڑنے والا شاعر قابلِ احترام ہے۔ میں لکھنؤ کا رہا ہوتا تو ساحر کی پنجابی اردو میں ہزاروں کیڑے نکالتا۔ محاورے کی غلطیاں، روزمرہ کا عیب، مگر شاعری زبان کے مدکچیوں کے لئے نہیں ہے اس لئے میں زبان و بیان کی خامیوں کو نظرانداز کر رہا ہوں۔ زبان کی خامیاں تو خود میرانیس کے یہاں بھی مل جاتی ہیں۔ جن پر " عزیزانِ مصرِ لکھنؤ " کو بڑا ناز ہے۔

میں نے ساحر کی بہت سی مشہور نظموں کو بھی نظرانداز کیا ہے کیونکہ یہ مضمون لکھتے وقت میں ان کے رعب میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ میں ساحر کو پڑھ کر کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہتا تھا۔ تو میں نے ناقدینِ ادب کے ان مضامین کو بھی نظرانداز کیا جو ساحر پر لکھے گئے کیونکہ ناقدین کو اپنی بات منوانے کی دھن ہوتی ہے۔ تو میں نے صرف ساحر کی شاعری پر بھروسا کیا کہ ساحر کے سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد چیز ان کی شاعری ہی ہے۔ اس شاعری کے سوا ان کے بارے میں سب جھوٹ بولیں گے۔ کوئی کم۔ کوئی زیادہ۔

لیکن اگر طالبِ علم صرف کلامِ شاعر پر بھروسہ کر رہا ہو تو ایسے مطالعہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ کلام سلسلہ وار ملے۔ جو مجھے نہیں ملا۔ اس لئے پتہ نہیں میں نے جو سفرنامہ لکھا ہے وہ کہاں تک درست ہے۔ اگر نادرست نکلے تو مجھے دعائے خیر میں یاد فرمائیے۔

عبدالحئی سے......

ابراہیم جلیس
(مرحوم)

انگریزی ادب میں گولڈ اسمتھ کے "دکار آف ویک فیلڈ" کو جتنی شہرت ملی ہے اس سے کہیں زیادہ شہرت اردو ادب میں "ویک فیلڈ گنج" لدھیانہ کے نوجوان شاعر ساحر کو حاصل ہے۔

اب سے کوئی بیس بائیس برس پہلے کی ایک رات ہے۔ لدھیانہ ریلوے اسٹیشن سے قریب ایک ویرانے میں چند نوجوان بیٹھے ہیں۔ ایک دبلا پتلا سا لمبا نوجوان جس کی آنکھیں خوبصورت اور خوابناک ہیں اپنے کالج کی ایک محبوب ساتھی طالبہ کی یاد میں بڑی رومانی فسردہ آواز میں اپنے تازہ اشعار سنا رہا ہے:

چند کلیاں نشاط کی چن کر مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

دوست پھڑک اٹھتے ہیں "واہ وا۔ واہ وا۔ تم شاعر نہیں ساحر ہو۔"

شاید ساحر لدھیانوی ـــ عبدالحئی سے ساحر اسی طرح بنا ہو۔ یا پھر عبدالحئی کے قالب میں "شاعر اور ساحر" دونوں توام بچوں کی طرح ایک ہی ساتھ پیدا ہوئے ہوں۔

دوستوں کا مشورہ ہے کہ "اب پبلک مشاعروں میں اپنا کلام سنایا کرو، ہمارا دعویٰ ہے کہ تمہارے سامنے بڑے سے بڑا شاعر بھی نہیں ٹھہر سکے گا۔"

گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں بہت بڑے پیمانے پر کل ہند مشاعرہ ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض سے بڑے بڑے جغادری شعراء ڈائس پر بیٹھے ہیں اور مائیکروفون کے سامنے کالج کا طالب علم عبدالحئی ساحر اپنی تازہ نظم سنا رہا ہے۔

میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تری فسوں زائی

ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات بند دریچوں سے بھی گزر آئی
کہاں تلک کوئی زندہ حقیقتوں سے بچے
کہاں تلک کرے چھپ چھپ کے نغمہ پیرائی
وہ دیکھ سامنے کے پُر شکوہ ایواں سے
کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ ٹکرائی

تو محفل مشاعرہ میں موجود ہندوستان کے سارے جغادری شاعر دم بخود ساحر لدھیانوی کو دیکھنے لگتے ہیں اور سامعین میں واہ وا کا وہ شور برپا ہے جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ اور جب وہ اپنی نظم 'تاج محل' پڑھتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے دنیا کے سات عجائبات میں سب سے زیادہ خوبصورت عجوبہ 'تاج محل' (آگرہ) ڈھے گیا ہو۔

یا پھر لدھیانے کے اس باغی نوجوان نے شہنشاہ ہندوستان شاہ جہاں کی محبت کی سب سے قیمتی مرمریں یادگار روضۂ تاج محل کو ڈائنا مائیٹ لگا کر اڑا دیا ہے۔

اسی رات سے ہندوستان کی فضاؤں میں ایک اور تاج محل بلند ہوا۔

شاہ جہاں کا تاج محل

ساحر لدھیانوی کا تاج محل

شاہ جہاں کا تاج محل دریائے جمنا کے آئینے ہی میں اپنا منہ دیکھتا رہ گیا۔

اور ساحر لدھیانوی کا تاج محل کی پرچھائیاں دیک فیلڈ گنج لدھیانہ سے درۂ خیبر، جھیل ڈل کے بجروں، سلہٹ کے چائے کے باغات، مالابار کی پہاڑیوں اور راس کماری تک پھیل گئیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور کا کل ہند مشاعرہ، حیدرآباد دکن کی کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس، بمبئی کے باغی جہازیوں کا جلسہ، بنگال کے قحط زدہ مردوں، عورتوں اور بچوں کا اجتماع ..... سارا ہندوستان چیخ رہا تھا۔

"ساحر لدھیانوی۔ ساحر لدھیانوی"

اور یہ آواز مالابار سے ہمالہ تک سارے پہاڑوں سے ٹکرا کر سارے ہندوستان میں گونجنے لگی۔

ساحر لدھیانوی نے عوام کی آواز پر رختِ سفر باندھا۔ اور اپنے نام اور اپنی شہرت کے پیچھے پیچھے بمبئی پہنچ گیا۔ بمبئی میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، ملک راج آنند، خواجہ احمد عباس، سجاد ظہیر اور سبطِ حسن نے "علم" کے لئے اور فلمساز کلونت رائے نے "فلم" کے لئے ساحر لدھیانوی کو روک لیا۔

ساحر سے میری "نصف ملاقات" اس وقت ہوئی تھی جب وہ لدھیانہ سے لاہور چلا گیا تھا اور اس عہد کے مشہور ادبی جریدے "ادب لطیف" کو مرتب کرتا تھا۔ پھر اس سے میری "کل ملاقات" انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس

(۱۹۴۵ء) حیدرآباد دکن میں ہوئی تھی۔ اور اس کانفرنس کے بعد میری خواہش پر ساحر ایک مہینے کے لئے میرا مہمان بن گیا۔

اس ملاقات سے پہلے پتہ نہیں کیوں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بڑے دھوکے میں رکھا تھا۔[1] لیکن اس ملاقات نے ہم دونوں کے درمیان سے جھوٹ کے سارے پردے ہٹا دیے تھے اور میرے سامنے جو اصلی ساحر لدھیانوی تھا وہ لدھیانے کے ایک مشہور جاگیردار کا اکلوتا لخت جگر تھا۔

ساحر کے قریبی رشتہ دار کہتے ہیں کہ ساحر کے والد نے ساحر کا نام عبدالحئی اس لئے رکھا تھا کہ اس کے پڑوس میں اس نام کے ایک بڑے آدمی رہتے تھے جو متحدہ پنجاب میں وزیر تعلیم بھی رہ چکے ہیں۔ ان سے ساحر کے والد کی ناچاقی تھی اور ساحر کے زندہ دل والد نے اپنے گھر کے سامنے بیٹھ کر "عبدالحئی" کو گالیاں دے کر اپنے بچاؤ کا بڑا دلچسپ طریقہ نکال لیا تھا۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے۔

"اوے۔ میں عبدالحئی دا پیوآں۔"

یہ جملہ اظہارِ تضحیک بھی تھا اور اظہارِ حقیقت بھی۔

عبدالحئی نام کے باوجود ساحر لدھیانوی جیسے پیدا ہی ساحر لدھیانوی ہوا تھا۔ ساحر لدھیانوی بچپن ہی سے اس عبدالحئی کا سخت دشمن تھا۔ جو ایک جاگیردار باپ کا بیٹا تھا اور میرا خیال ہے کہ بہت بچپن ہی سے ساحر کے قالب میں کبھی "جاگیردار عبدالحئی" اور "عوامی ساحر" میں بڑی سخت لڑائی ہوئی تھی! اور ساحر نے اپنے اندر عبدالحئی کو ہلاک کر دیا تھا۔

بمبئی میں ابتدا میں ساحر کی زندگی لدھیانے کی زندگی کے بالکل برعکس تھی۔ کہاں لدھیانے کی عافیت گاہ اور کہاں بمبئی کی فلم کمپنی کے دفتر کا ایک چھوٹا سا کمرہ۔۔ جس میں ساحر کے بچپن کا دوست حمید اختر (جو اب امروز کا اسسٹنٹ ایڈیٹر اور فلمساز بھی ہے) اور میں رہتے تھے۔

---

[1] یہ ساحر لدھیانوی اور ابراہیم جلیس دونوں کے عنفوانِ شہرت کے ایام تھے۔ یہ دونوں نادیدہ دوست اس امکان سے بے خبر کہ کبھی ایک دوسرے سے ملاقات بھی ہوگی عجب طرح کی چٹھیاں لکھتے تھے۔ ساحر لکھتا کہ میں اس وقت ایک جھلنگی چارپائی پر اپنے سیہ خانے میں لیٹا ہوں۔ باہر مالک مکان کرائے کے لئے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے اور مجھے کچھ کھائے یہ تیسرا دن ہے۔ ہر کارخانے اور دفتر کا چکر لگا چکا ہوں۔ نوکری کے نام سے ہر طرف سے جواب ملتا ہے۔" ادھر جلیس اپنے گھر کا نقشہ کھینچتا ہے۔ اور لے تیر کے گھر سے جا بھڑتا ہے کہ یہ میرا آخری خط ہے! اندھیری کوٹھری میں ایک رسی لٹک رہی ہے۔ دیا ٹمٹما رہا ہے اور بجھنے کو ہے۔ پولیس کا پیادہ تھوڑی دیر میں مکان کی قرقی کے لئے آنے والا ہے۔

حالانکہ دونوں حضرات کھاتے پیتے آدمی تھے۔ ساحر کا باپ ایک بڑا زمیندار تھا اور لدھیانے میں ساحر صاحب خاصی اللّے تللّے کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ادھر ابراہیم جلیس بھی خوش فکری سے تعلیم ختم کر کے اینڈ رہے تھے۔ دن عید رات شب برات تھی۔ خوشحال ہونا ان دنوں برا سمجھا جاتا تھا لہٰذا دونوں صاحب ایک دوسرے پر اپنی غربت اور افلاس کی دھونس جماتے تھے اور ہر خط میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے۔ ساحر نے حیدرآباد جا کر جلیس کا گھر دیکھا تو چلا کر کہا: "ارے کمینے" اور جلیس کو ساحر کا حال معلوم ہوا تو بولا "بدمعاش، دغو کے باز۔"
(ایک مشترکہ دوست)

ساحر چونکہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا ہے اس لئے وہ فطرتاً ایک لمحے کے لئے بھی اکیلا نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اس نے حمید اختر کو لدھیانے سے اور مجھے حیدرآباد دکن سے بلوا لیا تھا۔ اس کا ایک نصب العین تھا۔ وہ فلموں میں ادٹ پٹانگ تک بند شاعری کے خلاف جہاد کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فلمی شاعری بھی ادبی شاعری کی طرح وقیع ہو جائے۔

اُن دنوں ڈی این مدھوک جیسے تک بند فلمی شاعروں نے ہر اچھے شاعر پر فلمی دنیا کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ اور ساحر لدھیانوی کے نصب العین کے راستے میں بڑی رکاوٹیں تھیں۔

ساحر کے ساتھ جب ہم بمبئی کی سڑکوں پر سے گزرتے تھے اور بوٹ پالش والے لونڈے لہک لہک کر سستے اور بے تکے فلمی گیت گاتے تھے۔

جب تم ہی چلے پردیس لگا کر ٹھیس او پیتم پیارے

دنیا میں کون ہمارا ــــــ!

تو ساحر لدھیانوی کا خون کھول اُٹھتا تھا۔

وہ دور ہم تینوں کی شدید مفلسی کا دور تھا۔ مگر چونکہ سارے ہندوستان میں ساحر کا نام گونجنے لگا تھا اس لئے فلمساز ساحر کو اپنی فلموں کی دعوت دیتے تھے اور پیشگی ہزار دو ہزار روپیہ دینے پر بھی آمادہ ہو جاتے تھے۔ مگر ساحر کی پہلی شرط یہ ہوتی تھی کہ وہ ڈی این مدھوک جیسے سستے اور بے تکے فلمی گیت نہیں لکھے گا۔ اور سرمایہ دار فلمسازوں کو ساحر کی یہ شرط منظور نہیں تھی۔ چنانچہ پیشگی ہزار دو ہزار روپیہ میز پر رکھے کا رکھا رہ جاتا اور ساحر خالی جیب ہی اٹھ کر واپس آجاتا تھا اسے بھوکا رہنا اور پیدل چلنا منظور تھا لیکن:

"میرا بلبل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا"

قسم کے گیت لکھنا ہرگز منظور نہ تھا۔

وہ زمانے کے ساتھ بدلنے کے لئے تیار نہ تھا۔ بلکہ زمانے کو بدل دینا چاہتا تھا

پھر حالات نے مجھے حیدرآباد دکن لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ وکٹوریہ ٹرمنس (بوری بندر) اسٹیشن پر مجھے الوداع کہتے ہوئے ساحر نے مجھ سے کہا۔

اب تم سے جب کبھی ملاقات ہوگی تو میری شاندار کوٹھی میں ہوگی۔ اس کے بعد جب تم میری شاندار کار میں بمبئی کی سڑکوں پر گھومو گے تو تمہیں بمبئی کا ہر شخص ساحر کے فلمی گیت گاتا اور گنگناتا نظر آئے گا۔

اس وقت ساحر لدھیانوی کی جیب میں شاید دس بارہ آنے تھے۔ اور ریلوے پلیٹ فارم پر ایک چائے والا لونڈا بڑی اونچی آواز سے گا رہا تھا۔

او جانے والے بالموا لوٹ کے آ۔ لوٹ کے آ

جائیں نہ تیرا بالموا بے وفا۔ بے وفا

ساحر لدھیانوی نے کھسیانا ہو کر کہا۔ "دُر فٹے منھ"

بمبئی سے حیدر آباد دکن تک میں ساحر کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے جملے میرے ذہن میں گونج رہے تھے لیکن مجھے امید کی ہلکی سی کرن بھی نظر نہیں آرہی تھی کہ ساحر کا یہ دعویٰ کبھی پورا ہوگا۔

ساحر کی ادبی شاعری کی آواز دن بدن تیز ہوتی جارہی تھی۔ ساحر، مشاعروں میں، ساحر ادبی محفلوں میں، ساحر آل انڈیا ریڈیو پر ـــــ

پھر بڑے خوں ریز فسادات ہوئے اور ہندوستان کا بٹوارہ ہوگیا۔

میں جب ہندوستان سے پاکستان آرہا تھا اس وقت آل انڈیا ریڈیو سے ساحر کی آواز آخری بار سنی۔ ساحر جلتے ہوئے گھروں اور مرتے ہوئے انسانوں کے درمیان آل انڈیا ریڈیو کے مائیکروفون کے سامنے کھڑا درد بھرے لہجے میں عوام سے مخاطب تھا۔

ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لئے
آبشاروں بہاروں کے نغمے بنے
آج لیکن مرے دامنِ چاک میں
گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں
میرے سینے میں نغموں کا دَم گھٹ گیا ہے

اس کے بعد برسوں تک ساحر لدھیانوی کی کوئی خیر خبر معلوم نہ ہو سکی۔

پھر اچانک ایک دن ایک اخبار میں میں نے ایک ہندوستانی فلم " نوجوان " کا اشتہار پڑھا، اس میں ساحر لدھیانوی کا نام تھا۔ میں نے احمد ندیم قاسمی صاحب اور حمید اختر سے اس کا ذکر کیا۔ اور ہم سب نے محض ساحر کی خاطر وہ فلم دیکھی ـ یہ دوست نوازی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اس فلم کے گانے ہمیں بالکل اجنبی سے لگے۔ اور ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے سینما ہال میں فلم کی نمائش کے علاوہ ادبی محفل مشاعرہ بھی منعقد ہے۔

اس کے بعد بازی، پیاسا اور درجنوں فلمیں ہم نے دیکھیں۔ جن کے اشتہاروں میں پہلی بار شاعر کا نام ایسے اعزاز کے ساتھ لکھا جانے لگا جیسے نرگس، دلیپ کمار، محبوب اور بمل رائے کا لکھا جاتا ہے۔

فلمی دنیا میں یہ بات بڑی نئی اور حیرت انگیز تھی۔ کہ فلم ڈسٹری بیوٹر فلمساز سے یہ نہیں پوچھتے تھے کہ فلم کا ہدایت کار کون ہے اور اداکار کون کون ہیں؟ ـــ بلکہ وہ یہ پوچھتے تھے۔ اگر ساحر لدھیانوی کے گیت آپ کی فلم میں ہیں تو بس سودا منظور ـ ہمیں کچھ اور نہیں پوچھنا ہے۔

دھن کے پکے ساحر نے بازی جیت لی تھی۔

پچھلے سال اگست ۱۹۶۰ء میں مجھے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔

وہ ساحر لدھیانوی جو بمبئی کے فیشن ایبل علاقے وارڈن روڈ کے تفریحی ساحل بریچ کینیڈی اسکینڈل پوائنٹ کے سامنے پارسیوں کی ایک پرانی وضع کی کوٹھی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا اور مفت لال پارک میں بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کرتا

تھا. اب وہی ساحر لدھیانوی سات بنگلہ اندھیری کے ایک شاندار بنگلے میں رہتا ہے ۔ چمکیلی ہمبن کار میں گھومتا ہے اور اس کی کار میں گھومتے ہوئے میں نے بمبئی کے بیشمار آدمیوں کو ساحر کے فلمی گیت گاتے اور گنگناتے سنا ہے ۔

ساحر اب ہندوستان کا امیر ترین شاعر ہے ۔ لیکن اس کے باوجود اس نے غریب عوام سے اپنے اٹوٹ رشتے کو فراموش نہیں ہے اور اب بھی اس کی آمدنی کا بیشتر حصہ علمی ، ادبی اور عوامی اداروں کی مالی امداد کے لیے وقف ہے ۔

برسوں پہلے جب میں حیدر آباد دکن جا رہا تھا تو ساحر ٹیکسی کار میں مجھے بوری بندر اسٹیشن چھوڑنے آیا تھا ۔ اور اب وہ اپنی کار میں مجھے بمبئی کے پرنسس ڈاک پر سندھیا اسٹیم نیوی گیشن کے جہاز "سرسوتی" میں سوار کرنے آیا تھا ۔

اُس بار بوری بندر اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ایک چار والا لڑکا ڈی این مدھوک کا گیت گا رہا تھا "او جانے والے بالموا ۔ لوٹ کے آ ۔ لوٹ کے آ ۔ اور اب پرنسس ڈاک کا مزدور پیٹھ پر میرا سامان اٹھائے جہاز کی سیڑھی چڑھتے ہوئے گا رہا تھا

ساتھی ہاتھ بڑھانا

ایک اکیلا تھک جائے گا مل کر بوجھ اٹھانا

ساتھی ہاتھ بڑھانا

سرسوتی جہاز بمبئی کے ساحل سے بہت دور نکل آیا ہے ۔ بمبئی شہر روشنیوں کی کمان بنا سمندر کے پانی میں جھلملا رہا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ علم اور فلم ـــــ دونوں دنیاؤں میں اردو زبان کے شاعر کو ساحر لدھیانوی نے کس اعلیٰ اور باعزت مقام پر پہنچا دیا ہے ۔

شہنشاہ شاہ جہاں نے عورت کی محبت کا تاج محل بنایا اور شاعر ساحر لدھیانوی نے اردو شاعری کی عظمت کا تاج محل بنایا ہے ۔

یہ بھی لافانی ہے ، وہ بھی لافانی !

ساحر تک......

ابراہیم جلیس
(مرحوم)

اردو ادب میں ساحر لدھیانوی کا نام بہت بڑا ہے اور بمبئی کی ٹیلیفون ڈائرکٹری میں ساحر لدھیانوی کا نام بہت باریک ہے۔ ڈائرکٹری میں ساحر کا نام دیکھ کر دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ "ساحر لدھیانوی چینائی لواس سات بنگلہ اندھیری ۵۸ ٹیلی فون نمبر ۸۶۸۵۷"

میں نے بڑی بے تابی سے ٹیلیفون کا ڈائل گھمایا "ہیلو کڈ آئی اسپیک ٹو مسٹر ساحر لدھیانوی"

جواب آیا۔ ساحر اسپیکنگ"

میں نے صرف یہ جاننے کے لئے کہ آیا چودہ سال کے بعد بھی ساحر میری آواز پہچانتا ہے یا نہیں۔ اس سے کہا۔

"دیکھئے ساحر صاحب میں آپ کی شاعری کا بڑا مداح ہوں اور آپ سے ملنا....."

ابھی میں نے جملہ مکمل بھی نہ کیا تھا کہ ادھر سے ساحر کی آواز آئی۔ ساحر جیسے چیخ پڑا۔

"اوئے جلیس کے بچے۔"

اُس کے لہجے میں بھی جیسے دل کی دھڑکن تھی۔ وہ بڑی بے قراری سے بولا۔ "تم اس وقت کہاں سے بول رہے ہو حیدرآباد سے یا گلبرگہ سے؟"

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ۱۴ سال کی طویل جدائی کے بعد بھی ساحر نے میری آواز پہچان لی۔ میں نے جواب دیا۔

"نہ تو میں حیدرآباد سے بول رہا ہوں اور نہ گلبرگہ سے۔ یہیں بمبئی سے بول رہا ہوں۔ بلٹن روڈ کے ہوٹل امپریل سے"

ساحر نے کہا۔ "بمبئی آکر ہوٹل میں ٹھہرے تو مجھ سے ملنے کے لئے نہ آنا۔" مگر جلد ہی اسے اپنی یہ شرط یاد نہ رہی اور اس نے کہا۔ "میں اپنی کار بھیج رہا ہوں تم اس کار میں سیدھے شری ساؤنڈ اسٹوڈیو پہنچو۔ میں دوسری کار میں وہاں پہنچ رہا ہوں اور تمہارا رخ زیبا دیکھنے کے لئے بیتاب ہوں۔"

ٹیلیفون بند ہوگیا۔ امپریل ہوٹل سے ۱۸ میل دور اندھیری سے ساحر کی گاڑی آنے والی تھی۔ میں ساحر سے ملنے کے لئے بے تاب ہوگیا مگر ساحر کے انتظار میں ساحر ہی کا گیت گا کر انتظار کی کٹھن گھڑی میں دل بہلا رہا تھا۔

امپریل ہوٹل کے سامنے والے ایرانی ہوٹل کے ریڈیو پر سیلون کا پروگرام ہو رہا تھا اور اس میں ساحر لدھیانوی کے گیت نشر کئے جا رہے تھے۔

زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات

ایک انجان حسینہ سے ملاقات کی رات

گیارہ بجے کے قریب میرے کمرے میں ایک شخص بغیر اجازت کے داخل ہوا۔ اور میں نے ناگواری کے لہجے میں پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ "تکارام"

اور ایک پرچہ میری طرف بڑھا دیا۔ وہ پرچہ ساحر لدھیانوی کا تھا۔ تکارام ساحر کا ڈرائیور تھا وہ کہہ رہا تھا۔

صاحب نے بولا ہے دو بجے تک شری ساؤنڈ اسٹوڈیو لے آؤ۔ صاحب ادھر دو بجے پہنچے گا۔"

دو بجنے میں بہت دیر تھی اس لئے میں نے سوچا کہ دو بجے تک میں کیوں نہ پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز عرف پی آئی اے کے دفتر سے واپسی کے لئے ٹکٹ حاصل کرلوں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ تکارام بولا۔

"صاحب نے یہ بھی بولا ہے آپ کو جہاں بھی جانا ہے ہم آپ کو لے جائے۔"

لے جائے تو پھر لے جائے۔ چلو پھر ذرا ایئرلائنز پی آئی اے کے دفتر۔"

پی آئی اے کے دفتر سے واپسی کا ٹکٹ نہیں مل سکا۔ لیکن پی آئی اے والوں نے بحری جہاز سابرمتی سے میری واپسی کا بندوبست کرا دیا۔ سابرمتی جہاز ۲۰ اگست کو بمبئی سے کراچی جانے والا تھا۔ اور اس دن ۱۳ اگست تھی۔ یعنی مجھے اپنے خوابوں کے شہر بمبئی میں رہنے کے لئے پورے ایک ہفتے کی مہلت مل گئی تھی اور میں بہت خوش تھا کہ ایک ہفتے کے اندر مجھے بمبئی کی ادبی، صحافتی اور فلمی دنیا کو اچھی طرح سے دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔

ڈھائی بجے میں بمبئی کے مشہور فلم اسٹوڈیو شری ساؤنڈ اسٹوڈیو پہنچا۔ کار سے اترتے ہی ایک شخص میری طرف بڑھا اور پوچھا۔ "آپ مسٹر ابراہیم جلیس ہیں؟"

اس شخص کی شکل مشہور فلم ہیرو شیکھر سے ملتی جلتی تھی مگر وہ شیکھر نہیں تھا اردو کا ایک مشہور افسانہ نگار پرکاش پنڈت تھا۔

میں ایک دیوانے کی طرح پرکاش پنڈت سے لپٹ گیا۔ پرکاش پنڈت سے کوئی بارہ برسوں سے میری نہایت بے تکلفانہ خط و کتابت تھی لیکن اس سے دوبدو ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بڑی دیر تک ہمارے دل ایک ساتھ دھڑکتے رہے۔

پرکاش پنڈت نے بتایا کہ شہزادہ (ساحر لدھیانوی اپنے دوستوں میں شہزادے کے نام سے مشہور ہے) اندر پروجکشن

ہال میں ایک فلم کے رشز دیکھ رہا ہے۔ اس فلم کی نمائش سنسر بورڈ نے ممنوع قرار دے دی ہے اور اب بمبئی فلم سنسر بورڈ نے رپورٹ کے لئے یہ فلم بمبئی رائٹرز ایسوسی ایشن کے حوالے کی ہے۔ اور اپنا شہزادہ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا نائب صدر ہے۔

میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ ہندوستان میں فلم رائٹرز یعنی فلم لکھنے والوں کی کتنی عزت ہے۔ بمبئی کا سنسر بورڈ رپورٹ کے لئے ایسی فلم بھی ان کو دکھاتا ہے جس کی نمائش اس نے ممنوع قرار دی ہے۔

پرکاش پنڈت کے ساتھ میں پروجیکشن ہال میں داخل ہوگیا۔ پروجیکشن ہال میں اندھیرا تھا اور سامنے پردۂ سیمیں پر اس فلم کے رشز دکھائے جا رہے تھے۔

اندھیرے میں ساحر لدھیانوی کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن ابھی ساحر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ساحر غالباً اس فلم کے پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کو یہ ہدایتیں دے رہا تھا کہ اس منظر کے یہ حصے کاٹ دیجئے، اس رقص کو نکال دیجئے۔ اس رقص کو فلاں فلاں جگہ سے دوبارہ ایڈٹ کیجئے۔ وغیرہ وغیرہ

میں بڑا متعجب بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ ایک ہم بھی فلم رائٹر ہیں اور ہمارا فلمساز ہماری ہی لکھی ہوئی فلم کے بارے میں ہماری تنقید کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔

فلم ختم ہوئی۔ پروجیکشن ہال میں اجالا ہوا تو میں ساحر کی طرف اور ساحر میری طرف بڑی بے تابی سے بڑھا۔ چودہ سال کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے ملے تھے اور ہم دونوں کی صحت قابل رشک ہوگئی تھی۔ اب سے چودہ سال پہلے ہم دونوں مفلسی اور اردو ادب کے امراض کے باعث نہایت دبلے پتلے تھے۔ اب ساحر بھی کافی موٹا ہو چکا تھا اور اس کے چہرے پر تازگی کی دمک تھی۔

ساحر لدھیانوی کو فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا بہت کام تھا لیکن اس نے اپنے سکریٹری سے کہا "آج میرا چودہ سال پرانا دوست آیا ہے آج میں کوئی کام نہیں کروں گا۔"

ساحر لدھیانوی، پرکاش پنڈت اور میں اس پروجیکشن ہال سے باہر نکلے تو بہت سے ادبی اور فلمی ادیب نئے نغمہ نگار راجہ مہدی علی خاں، قمر جلال آبادی، مکالمہ نگار درجیندر رگوڑ، پروڈیوسر ڈائرکٹر کشور ساہو، ایکٹریس نندا اور سادھنا وغیرہ ملے۔

ساحر اسٹوڈیو میں جدھر سے گزرتا لوگ اسے بڑے ادب سے سلام کرتے۔

فلمی دنیا میں ایک گیت کار کی یہ عزت! میرا دل اندر سے بہت خوش ہو رہا تھا کہ ساحر نے فلمی دنیا میں بھی ادیبوں اور شاعروں کے مقام کو سرمایہ دار فلمسازوں کے ہم پلّہ بنا رکھا ہے۔ چار بج رہے تھے۔ ساحر نے کہا۔

"چلو پہلے تمہاری آمد کی خوشی میں ایک ٹی پارٹی ہو جائے۔" میں نے کہا نہیں۔ پہلے دیو آنند سے ملیں گے پھر چائے پیئں گے۔"

ساحر نے کہا کہ دیو آنند کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے۔ ملنا ہے تو سنیل دت سے مل لو۔ وہ جے دیو کے گھر آنے والا ہے۔

سنیل دت، نرگس کے شوہر سے میری ملاقات نہیں تھی، جے دیو بھی بڑا پیارا آدمی ہے طے یہ ہوا کہ ہم جے دیو کے گھر چلے ہے

ہیں وہیں چائے پئیں اور جے دلیو سے بھی مل لیں۔

جے دیو کا فلیٹ چرچ گیٹ کے علاقے میں ہے ہم وہاں سے چرچ گیٹ روانہ ہو گئے۔

میوزک ڈائرکٹر جے دیو کوئی مشہور میوزک ڈائرکٹر نہیں ہے۔ مگر ساحر لدھیانوی کے بارے میں ہندوستان کی فلم انڈسٹری میں یہ مشہور ہے کہ وہ ہندوستان کی فلمی دنیا کو نئے میوزک ڈائرکٹروں سے روشناس کرواتا ہے۔

یہ انکشاف میرے لئے بڑا عجیب سا تھا۔ ہمارے ملک میں بلکہ ہندوستان میں بھی یہ عام طریقہ ہے کہ فلمساز پہلے میوزک ڈائرکٹر کا انتخاب کرتا ہے اور شاعر کا انتخاب میوزک ڈائرکٹر پر چھوڑ دیتا ہے۔

فلمی دنیا میں بالعموم میوزک ڈائرکٹر کا شاعر سے کہیں زیادہ مقام ہوتا ہے۔ جب کوئی فلم بنتی ہے اور کوئی ڈسٹری بیوٹر یعنی فلم کا تقسیم کار اسے خریدنا چاہتا ہے تو صرف یہ پوچھتا ہے کہ میوزک ڈائرکٹر کون ہے؟

نوشاد ہے؟ ایس ڈی برمن ہے؟ شنکر جے کشن ہے، کون ہے؟

کوئی ڈسٹری بیوٹر یہ نہیں پوچھتا کہ گیت کس نے لکھے ہیں۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطانپوری نے فلمی دنیا کی اس روایت کو بالکل ہی الٹ کر رکھ دیا ہے۔ جس فلم میں ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطانپوری کے گیت ہوتے ہیں تو فلم خریدنے والا یہ نہیں پوچھتا کہ فلم کا میوزک ڈائرکٹر کون ہے۔ ان دونوں کے نام پر ہی فلم گرم کیک کی طرح بک جاتی ہے۔

یہ بات کبھی تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ فلمی دنیا میں شاعر بھی کسی میوزک ڈائرکٹر کے ہم پلہ ہو جائے گا۔ بلکہ شاعر کے آگے اپنی وقعت کھو بیٹھے گا۔

پرکاش پنڈت نے مجھے شاعر کے اس مقام کا بڑا ہی دلچسپ پس منظر بتایا۔ پرکاش نے کہا:

فلم "بازی" میں ساحر کے گیت تھے اور میوزک ڈائرکٹر ایس ڈی برمن تھے۔ جب فلم بازی کے سارے گیت بقول فلم والوں کے ہٹ ہو گئے تو ایک دعوت میں ساحر اور برمن میں چونچیں لڑ گئیں، برمن نے ساحر سے کہا۔

"کیا ہیں تمہارے گیت۔ دراصل میری طرزیں ہیں جن کی وجہ سے گانے مقبول ہوئے۔"

ساحر نے اسی وقت عہد کیا کہ "وہ کسی مشہور میوزک ڈائرکٹر کے لئے گیت نہیں لکھے گا اور فلمی دنیا کو یہ بتادے گا کہ شاعر میوزک ڈائرکٹر سے کہیں بڑا ہوتا ہے۔

چنانچہ اس کے بعد سے آج تک ساحر اپنے عہد پر قائم ہے۔ اس نے نئے میوزک ڈائرکٹروں کو پکڑا اور نہ صرف انہیں فلمی دنیا سے متعارف کرایا بلکہ آج انہیں نوشاد، ایس ڈی برمن، سی رامچندر اور شنکر جے کشن کے مقابلے میں لاکھڑا کیا۔

فلم "بازی" کے بعد ساحر نے کسی سکہ بند قسم کے میوزک ڈائرکٹر کے ساتھ کام نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود ساحر کے گیت ہندوستان میں زبان زد خاص و عام ہیں۔ مثال کے طور پر ساحر کا یہ گیت

"زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات"

ہندوستان اور پاکستان میں جگہ جگہ گونج رہا ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس گیت کا میوزک ڈائرکٹر کون ہے مگر سبھی یہ ضرور جانتے ہیں کہ یہ گیت ساحر لدھیانوی کا لکھا ہوا ہے۔

حتیٰ کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فلم 'برسات کی رات' معیار کے اعتبار سے کوئی قابل ذکر فلم نہیں مگر وہ فلم صرف اسی ایک گیت کے باعث سینما گھر سے اترتی ہی نہیں۔

شاعر کے اس مقام کا ترقی پسند ہدایت کار اور فلمساز گرودت نے عملی اعتراف کے طور پر شاعری بلکہ ساحر کی زندگی پر ایک نہایت کامیاب اور بہت ہی معیاری فلم "پیاسا" کے نام سے بنائی ۔ اور یہ کہنا بھی کسی طرح غلط نہیں کہ فلم "پیاسا" محض ساحر لدھیانوی کی ادبی نظموں کے باعث ایک نہایت کامیاب فلم ہے جو اس حقیقت کا ایک ثبوت ہے کہ آج کل کی ہندوستان کی فلمی دنیا اب پرانے ٹپیکل فلمی گیتوں کے بجائے صرف ایسے گیتوں کی وجہ سے مترنم ہے جو بیک وقت فلمی بھی ہیں اور ادبی بھی۔ آج ہندوستان کی فلمی دنیا میں ؏

او جانے والے بالموا ۔ لوٹ کے آ ۔ لوٹ کے آ

کو کوئی نہیں پوچھتا ۔ آج کے ہندوستان میں اس قسم کے فلمی گیت گونج رہے ہیں ۔

جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کے پیار کو پیار ملا
ہم نے تو جب کلیاں مانگیں کانٹوں کا ہار ملا

کھل گئے راز کئی ، بات کچھ بن ہی گئی ؏
جانے کیا تو نے کہی جانے کیا میں نے سُنی
بات کچھ بن ہی گئی ، جانے کیا تو نے کہی

ساحر اور مجروح جیسے شاعروں سے پہلے فلمی دنیا میں اس بات کی گنجائش ہی نہ تھی کہ ٹھیٹ ادبی نظمیں فلموں میں بھی جگہ پا سکیں ۔ لیکن آج سارے ہندوستان میں ساحر کی مشہور ادبی نظم "چکلے" فلم کے ذریعے گونج رہی ہے ؎

یہ کوچے یہ نیلام گھر دل کشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں

آج ایسی بلند پایہ نظمیں فلمی گیتوں کا قالب اختیار کر کے سنگیت اور شاعری کے معیار کو اوج ثریا تک پہنچائے ہوئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان میں 'مرزا غالب' کی زندگی بھی فلم کا موضوع بن سکتی ہے ۔ آج ہندوستان کا رکشہ والا ، بوٹ پالش والا ، اور گھوڑا گاڑی والا ایسے گیت نہیں گاتا کہ

پیپل کے پیڑ تلے میں بھی ملوں تم بھی ملو
منظور تمہیں؟ .... منظور

بلکہ وہ غالب کی غزل گاتا ہے۔

ادبی شاعری کا فلمی دنیا میں مقام — !!

حیرت ہے — باعثِ رشک ہے!

پرکاش پنڈت نے شاعر اور میوزک ڈائرکٹر کے علاوہ شاعر اور گلوکارہ کی چپقلش کا بھی ایک بڑا ہی دلچسپ واقعہ سنایا۔ لتا منگیشکر آواز کی دیوی ہے اور بلاشبہ وہ برصغیر پاک و ہند میں ساحرلدھیانوی سے کہیں زیادہ مشہور و مقبول ہے۔ ہر فلم ساز کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لتا منگیشکر کے زیادہ سے زیادہ گانے اس کی فلم میں ہوں۔ فلم خریدنے والا سب سے پہلے یہی پوچھتا ہے کہ آپ کی فلم میں لتا منگیشکر کے کتنے گانے گائے ہیں؟"

ہر شاعر کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ اس کا گیت لتا منگیشکر گائے۔

ساحر کی بھی ابتداء میں یہی خواہش تھی اور لتا نے ساحر کے متعدد گانے بڑے شوق اور عقیدت کے ساتھ گائے۔ لیکن ایک دن کسی فلم ساز نے ساحر اور لتا کی موجودگی میں ساحر سے کہا۔

"ساحر صاحب! اگر لتا کی آواز نہ ہو تو آپ کے گیت بھی بے جان ہیں۔"

ساحر — ایک خوددار اور ادبی شاعر — اُسے تاؤ آگیا اور اس نے لتا منگیشکر اور اس فلمساز کے سامنے یہ حلف اٹھایا کہ "جب تک میں یہ ثابت نہ کر دکھاؤں گا کہ اچھی ادبی شاعری لتا منگیشکر کی آواز کی محتاج نہیں ہے۔ لتا منگیشکر میرا ایک گیت بھی نہیں گائے گی۔"

چنانچہ اس کے بعد ساحر کا جس فلم کمپنی سے معاہدہ ہوتا تو وہ پہلی شرط یہ رکھتا کہ:۔

"میرا کوئی گیت لتا منگیشکر نہیں گائے گی۔"

ظاہر ہے کہ کوئی فلم ساز لتا منگیشکر کو نظرانداز کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا وہ ساحرلدھیانوی کو توڑ کا ساجواب دے سکتا تھا لیکن لتا کو کسی قیمت پر بھی نظرانداز نہ کر سکتا تھا۔

مگر ساحرلدھیانوی نے ہمت نہ ہاری اور پورے دو سال تک اس کا کوئی گیت لتا منگیشکر نے نہ گایا۔ لیکن اس کے باوجود ساحر کے گیت سدھا ملہوترہ جیسی غیر معروف گانے والی کی آواز میں انہی اونچائیوں میں گونجتے رہے جہاں تک صرف لتا منگیشکر کی آواز پہنچ سکتی تھی۔

میں بُت بنا فلمی دنیا میں ادبی شاعر کے اس اعزاز پر غور کر رہا ہوں۔ ساحرلدھیانوی کار چلا رہا ہے اور مسکراتے ہوئے کہہ رہا ہے "اب لتا منگیشکر سے میری پھر دوستی ہوگئی ہے اب دوستی صحیح معنوں میں ہوگئی ہے۔ دوستی دراصل دو برابر کے آدمیوں میں ہوتی ہے۔"

ساحر یادوں کے آئینے میں

کرشن ادیب

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب پورے ہندوستان پر فرنگی سامراج کا تسلط تھا۔ انگریز کے کفش برداروں کو رائے بہادر، خان بہادر اور سر کے خطابات سے نوازا جاتا تھا۔ اور جدوجہد آزادی کا صلہ قید و بند کی صعوبتیں اور رسن و دار کے لمبے سلسلے تھے۔ لیکن اس کے باوجود نوجوانوں میں آزادی حاصل کرنے کی تڑپ تھی۔

اگرچہ پریس کی آزادی محدود تھی تاہم ایسے اخبار باقاعدگی سے نکلتے تھے جن کی اشاعت زیرِ زمین ہوتی تھی۔ انہی اخبارات میں ایک اخبار "کیرتی لہر" ہفتہ وار تھا۔ جو میرٹھ سے چھپ کر دست بدست آتا تھا۔ اس کے مدیر غالباً کامریڈ مبارک ساغر ہوا کرتے تھے۔ میں ان دنوں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ شعر و شاعری سے بھرپور لگاؤ تھا اور فرنگی سامراج سے حقارت کی حد تک نفرت تھی۔ "کیرتی لہر" کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتا تھا۔ منشی احمد دین اور ٹیکا رام سخن اُس میں خصوصی لکھنے والے تھے۔

انہی دنوں ایک نظم "..... جہاں مزدور رہتے ہیں" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ شاعر کا نام تھا اے۔ ایچ۔ ساحر متعلم گورنمنٹ کالج لدھیانہ۔ نظم سے متاثر ہونا فطری تھا۔ میرا شہر پھلور، لدھیانہ ہی کا حصہ محسوس ہوتا ہے۔ خیر اس کے بعد "کیرتی لہر" کے ہر شمارے کا اس لئے بھی انتظار رہتا تھا کہ ساحر کی کوئی نئی نظم پڑھنے کو ملے گی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی بہت سی نظمیں مجھے "کیرتی لہر" کے توسط سے پڑھنے کو ملی تھیں۔ یہ نظمیں ساحر کے کسی بھی شعری مجموعے میں شامل نہ ہو سکیں۔ شاید اس لئے کہ وہ ساحر کی شاعری کا عبوری دور تھا۔ بہر حال ساحر کا شعری لہجہ مکمل باغیانہ تھا۔ جو آنے والے دَور میں ساحر کے عوامی شاعر بننے کی نشاندہی کرتا تھا۔

ساحر لدھیانوی سے ملنے کی خواہش ۱۹۴۳ء میں پوری ہوئی۔ میں اُن دنوں دہلی میں رہتا تھا۔ سال میں دو چار مرتبہ پھلور بھی آتا تھا۔ نہایت اہتمام و سلیقہ سے چائے پینا میری ایک عادت تھی لیکن ان دنوں چائے پینے کا رواج اتنا عام نہ تھا۔ چائے پینا ایک ارسٹو کریٹک شغل سمجھا جاتا تھا۔ عام گھروں میں چائے کی پتی ڈھونڈے سے نہیں ملتی تھی۔ میرا گھر بھی کچھ اسی قسم کا تھا لہذا میں ہر شام محض چائے پینے کی غرض سے لدھیانہ ساحر کے پاس آتا تھا۔ جہاں ساحر کی امی میرے لئے نہایت خلوص سے بھرپور نفیس چائے اور کھانے کے لئے بسکٹ بھیجتی تھیں۔ میں اُن دنوں نہ تو ساحر کا ہم عصر تھا اور نہ ہی دوست۔ میری حیثیت ایک ایسے مداح کی تھی جو اپنے محبوب شاعر کو دیکھنا اُس سے ملنا اور باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اور واقعی ساحر میرا محبوب شاعر بھی تھا اور میرا آئیڈیل بھی۔ رفتہ رفتہ میں اس کے حلقۂ احباب میں بھی شامل ہوتا گیا۔

ساحر کے دوستوں میں کامریڈ مدن لعل دویدی، مرتضےٰ، حافظ لدھیانوی، احمد ریاض، حمید اختر، عجائب چترکار اور ہری کرشن آرٹسٹ ہوا کرتے تھے۔ جن کی اکثر نشستیں ساحر کے مختصر مکان کے الگ کمرے میں ہوتی تھیں۔

ساحر کا حساس دل اپنے ماحول کے گرد و پیش کو دیکھتا اور سوچتا کہ آخر معاشرے میں اس قدر بدعنوانی کیوں ہے؟ سماج میں عورت پر ظلم کیوں ڈھایا جاتا ہے؟ یہ دولت کی نامناسب تقسیم کس لئے ہے؟ اسے اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر جاگیردارانہ ماحول سے نفرت ہو گئی تھی کیونکہ یہ ماحول برٹش سامراج کا پیدا کردہ تھا۔ لہذا کالج کے دنوں میں اس کے اندر کا شاعر ساحر لدھیانوی بن کر بیدار ہوا۔ جس نے برٹش سامراج اور مروجہ فیوڈل سسٹم کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتے ہوئے انقلابی نظمیں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ اس کی نظموں میں شدت سے عوامی اپیل ہوتی تھی۔ لہٰذا وہ جلد ہی سارے کالج کا ہیرو بن گیا۔

ساحر کی شاعری روایتی شاعری سے قطعاً مختلف تھی۔ وہ اپنے احساس و تجربات کو مارکسی فلسفے میں سمو کر شعر کہنے کا فن جانتا تھا۔ اس نے جمہور اور دخترانِ جمہور کے حقوق کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو اور اپنے قلم کو وقف کر دیا۔ اور کہا

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر کی نظم "تاج محل" نے تو ایوان شاعری میں تہلکہ سا مچا دیا تھا۔ جب یہ نظم ماہنامہ "آج کل" میں اشاعت پذیر ہوئی۔ تو دقیانوسی مسلم اخباروں نے ساحر سے متعلق ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ساحر کے خلاف اداریے لکھے گئے۔ کہ ایک لادین شاعر ساحر لدھیانوی نے تاج محل نظم لکھ کر مسلم بادشاہ شاہجہاں کی توہین کی ہے۔ لیکن ان دنوں ساحر بہت خوش نظر آتا تھا کیونکہ اس کی نظم کا شدید نوٹس لیا جا رہا تھا خواہ وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ تھا۔ دوسری طرف ترقی پسند حلقوں میں نظم "تاج محل" کو بہت سراہا جا رہا تھا۔ میں نے جب ساحر سے پوچھا کہ آپ نے "تاج محل" نظم لکھی ہے۔ ظاہر ہے آپ آگرہ بھی گئے ہوں گے تو راستے میں دہلی میں قیام کیوں نہ کیا۔ اس بہانے ملاقات ہی ہو جاتی۔ لیکن ساحر کا جواب نہ تھا۔

بڑی سادگی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یار! میں نے آج تک تاج محل نہیں دیکھا۔ اور نہ کبھی آگرہ گیا ہوں۔ میں نے حیران ہو کر کہا" تو پھر نظم کیسے کہہ ڈالی؟"

"دراصل میں نور جہاں کے مزار پر نظم کہنا چاہتا تھا لیکن بات کچھ بن نہیں رہی تھی۔ میں نے "تاج محل" کہہ دی۔ اس کے لئے آگرہ جانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ مارکس کا فلسفہ پڑھا ہوا تھا اور جغرافیہ بھی یاد تھا۔ یہ بھی پتہ تھا کہ تاج محل جمنا کے کنارے شاہجہاں نے اپنی بیگم ممتاز محل کے لئے بنوایا تھا۔"

بہر حال ساحر کی یہ نظم تاج محل ہر خاص و عام میں آج بھی اتنی مقبول ہے جتنی آج سے تیس چالیس سال پہلے تھی۔ اس کے علاوہ "فنکار"، "چکلے"، "کبھی کبھی"، "جاگیر"، "مادام" اور "میرے گیت تمہارے ہیں" جیسی نظمیں خاص و عام کے دلوں میں گھر کر گئی تھیں۔ مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ ساحر کی شاعری کے مطالعے کے بعد ہزاروں نوجوان وطنِ عزیز کو آزاد کرانے کے لئے جلسوں میں ساحر کی نظمیں گاتے تھے۔

جن دنوں ساحر کی شاعری کا آغاز ہوا تھا وہ زمانہ شاعری میں احسان دانش، جوش ملیح آبادی جیسے شاعروں کا تھا۔ جوش شاعر انقلاب تھے اور احسان شاعر مزدور کہلاتے تھے۔ دونوں انقلابی نظمیں کہنے میں اپنا جواب آپ تھے۔ لیکن ان کی نظموں کا

لب و لہجہ قطعاً جذباتی اور غیر فکری ہوتا تھا۔ شعروں سے کسی خونی انقلاب کی پُرشور، ہنگامہ برپا کرنے والی آواز سنائی دیتی تھی جو قدرے خوفناک محسوس ہوتی تھی۔ اس کے برعکس بعد میں آنے والے شعراء فیض، جاں نثار اختر اور ساحر لدھیانوی کی شاعری پڑھے لکھے فلسفہ و فکر رکھنے والوں کی شاعری تھی۔ ان شعراء کی تخلیقات میں غمِ جاناں و غمِ دوراں کا امتزاج نہایت خوبصورت محسوس ہوتا تھا۔ محض بڑھے چلو، بڑھے چلو، بڑھے چلو والی شاعری نہیں تھی۔ کارل مارکس کے فلسفے کی قندیل لے کر ظلمتِ شب کا سفر کرنے والے یہ شعراء اپنے قارئین کو منزلِ صبح کا بھی نشان دیتے تھے۔ فیض کی طرح ساحر کا بھی شعری لہجہ مدھم مدھم، دھیما دھیما دل میں اتر جانے والا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فیض احمد فیض کے بعد اگر کوئی اردو زبان و ادب میں مقبول شاعر ہے تو وہ ہے ساحر لدھیانوی۔ جسے فلم کی دنیا سے باہر شعری ادب میں مقام خصوصی حاصل تھا۔ وہ ان شعراء کی صف میں آتا ہے جو کم لکھتے ہیں لیکن سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ اپنے فکری احساس کو نہایت خوب صورت شعروں میں ڈھالتے ہیں۔

ساحر برصغیر ہند و پاک کا انتہائی مقبول ترین شاعر تھا جس کو سننے، دیکھنے اور ملنے کے لئے لوگ بے تاب رہتے تھے۔ ساحر سے ملنا خوش نصیبی سمجھا جاتا تھا۔ وہ جب بھی کبھی مشاعروں میں آتا تو اس کی پذیرائی کے لئے شہر کا شہر امنڈ آتا تھا۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ ساحر کی نظموں میں کیا خوب صورتی ہے؟ کیا افادیت ہے؟ یہ سب کچھ میں شعر کے ناقدوں پر چھوڑ دیتا ہوں۔ یوں بھی میں نہ تو نقاد ہوں اور نہ ہی کوئی نثر نگار۔ میں تو فقط اتنا جانتا ہوں کہ پچھلے چھتیس برس سے ساحر نے مجھے بے حد پیار سے نوازا تھا۔ لدھیانہ، دہلی، بمبئی میں ہر شہر میں اس کا مہمان ہوا کرتا تھا اور وہ میرا میزبان۔ یہ اُن دنوں کی باتیں ہیں جب میری آوارگی کے قصے جہان بھر کی زبان پر ہوا کرتے تھے اور میں خود کو سلطنتِ بیکاری و بیروزگاری کا شہنشاہ سمجھا کرتا تھا (سچ تو یہ ہے کہ میری ان آوارگیوں کا کفیل خود ساحر لدھیانوی تھا جو مجھے اکثر بمبئی سے چلتے وقت کرائے کے علاوہ اچھا خاصہ سفر خرچ بھی دیا کرتا تھا)

آج جبکہ ہمارے ہاں اردو زبان لمحہ بہ لمحہ دم توڑتی جا رہی ہے۔ اس زبان کے پڑھنے اور سمجھنے والے بھی کم ہوتے جا رہے ہیں اور ادھر میرے شہر لدھیانہ کے بڑے بڑے "صنعتی سخن فہم" ساحر کی عظمت کا قد اس کی فلمی شاعری کی مقبولیت سے ناپتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ فلم نے ساحر کو بلند مرتبہ نہیں دیا بلکہ ساحر نے فلمی شاعری کی آبرو میں اضافہ کیا ہے۔ اس نے فلمی گیت کو ایک اچھی ادبی نظم کا مرتبہ عطا کیا تھا۔ جس کی گواہی اس کے فلمی گیتوں کا مجموعہ "گاتا جائے بنجارہ" دیتا ہے۔ جس کے اردو ہندی میں بے شمار ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ آرزو لکھنوی کے بعد ساحر پہلا نغمہ نگار تھا جو فلم اور ادب کی کسوٹی پر بھی کھرا سونا ثابت ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے "مہاکوی، مدھوک اور سنتوشی جیسے نغمہ نگار ہوا کرتے تھے۔ جن کے گیتوں میں سوائے شاعری کے سب کچھ ہوا کرتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان لوگوں کے گیت بھی باکس آفس پر کامیابی حاصل کرتے تھے۔ لیکن یہ گیت میوزک ڈائرکٹر کی دھنوں کے مرہونِ منت ہوتے تھے۔ اس کے برعکس ساحر کے گیتوں کے بول میوزک ڈائرکٹروں کی دھنوں پر دستِ احسان رکھتے تھے۔ خیر یہ ذکر وضاحت سے آئندہ صفحات میں کروں گا۔ فی الحال مہاکوی مدھوک سے متعلق ایک دو لطیفے یاد آ گئے ہیں وہ سُنئے۔ ایک مرتبہ ساحر نے مدھوک صاحب سے کہا کہ آپ کا ایک گیت سنا تھا۔ بول تھے۔

ایک تھی لیلےٰ، ایک تھا مجنوں
ہو گئے پھر دونوں میں یوں یوں

یہ مجنوں اور پھر لیوں لیوں کا قافیہ کیا ہوا؟
مدھوک نے جواب دیا۔ "ساحر صاحب، یہ یوں یوں والی بات چھوڑیئے۔ آپ اپنی اور میری چیک بک دیکھئے۔ کون سی چیک بک بھاری ہے؟" یہ جواب سن کر ساحر چپ سا ہو کر رہ گیا۔ لیکن جب ساحر لدھیانوی چیک بک کے لحاظ سے سب نغمہ نگاروں سے بلند ہو گیا تب بھی ساحر کے گیت اس کی چیک بک سے بلند تھے اور بلند ہی گے۔ کیونکہ ساحر جذبات واحساسات کا سچا شاعر تھا۔ وہ فلمی دنیا میں گیت فروخت کرتا تھا لیکن اپنے گاہکوں کو زعفران کی بجائے گھاس نہیں دیتا تھا۔ اسی لئے فلم انڈسٹری اس پر آج بھی ناز کرتی ہے اور کل بھی اسے یاد کرے گی۔

ساحر کے جانے کے فوراً بعد اچانک ایک دن میں بھی بمبئی پہنچ گیا۔ کیونکہ اُن دنوں ایک چکر تھا میرے پاؤں میں، زنجیر نہ تھی۔ ساحر ورسوا (اندھیری) کرشن چندر کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ امی وہیں تھیں۔ ساحر جدوجہد میں مصروف تھا۔ وہ اسٹوڈیوز میں جاتا پروڈیوسر، ڈائرکٹر احتراماً کرسیوں سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔ لیکن جب فلم کے گیتوں کی بات چلتی۔ سب یہی کہتے کہ "ساحر صاحب! آپ برصغیر ہند و پاک کے عالی مرتبہ شاعر ہیں اور ہم آپ کا اور آپ کی شاعری کا بے حد احترام کرتے ہیں بلکہ ہم آپ کے دیرینہ مداح ہیں۔ لیکن فلم آٹھ لاکھ روپے میں مکمل ہوتی ہے (اُن دنوں فلم آٹھ لاکھ روپے میں بن جاتی تھی) اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک اچھا ادبی شاعر فلم میں اچھا نغمہ نگار بھی ثابت ہو سکے اور گانوں کی وجہ سے فلم فلاپ بھی ہو سکتی ہے۔

یہاں تک کہ شاہد لطیف جو عصمت چغتائی کے شوہر کے علاوہ کامیاب پروڈیوسر، ڈائرکٹر بھی تھے: "ضدی" اور "آرزو" جیسی ہٹ فلمیں بنا چکے تھے۔ ایک دن ساحر سے کہا
"ساحر صاحب! آپ کی شعری اور ادبی صلاحیتوں سے ہمیں انکار نہیں۔ دنیائے سخن میں آپ کا امتیازی مقام ہے تاہم آپ سے فلم کے گانے لکھوانا ایک بہت بڑا خطرہ مول لینے کے مترادف ہے۔ اگر آپ کے اقتصادی حالات خوشگوار نہیں ہیں تو آپ بلا تکلف ہمارے ہاں دونوں وقت کھانا کھا سکتے ہیں۔"
ساحر کو یہ بات بہت ناگوار لگی۔ کیونکہ ساحر نے زندگی بھر لوگوں کو کھلایا تھا کھایا نہیں تھا۔

ساحر کی فلمی جدوجہد کے ایام طویل اور کڑے ہوتے جا رہے تھے۔ ان دنوں اس کے بے شمار گانے مختلف میوزک ڈائرکٹروں کی دھنوں سے آراستہ ہوتے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے فلمائے نہیں جاتے۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ ساحر کو اپنی امی کی سونے کی چوڑیاں بھی فروخت کرنا پڑیں تاکہ بجلی اور پانی کے بل دیئے جا سکیں۔ اور پھر ان دنوں اسے کرشن چندر کی کہانیوں کو خوشخط لکھنے کا کام بھی کرنا پڑا۔ جس کا معاوضہ غالباً اسے ڈیڑھ سو روپے ملتا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان دنوں بھی وہ گھر پر آنے والے دوستوں اور مہمانوں کی مدارات پر خلوص ڈھنگ سے کرتا تھا۔

ساحر اُن دنوں بس میں یا لوکل ٹرین میں سفر کرتا تھا۔ میں بھی اکثر اس کا ساتھ دیتا۔ ساحر کا مقصد فلم لائن میں کامیابی حاصل کرنا تھی اور میرا مقصد محض آوارگی شب و روز تھا۔ لہٰذا میں یونہی بے وجہ کبھی اکیلا اور کبھی ساحر کے ساتھ اندھیری سے چرچ گیٹ تک فضول گھومتا رہتا تھا۔ بھوک لگنے پر ساحر مجھے کھانا کھلاتا، چائے پلاتا اور کوئی کتاب یا رسالہ خریدنے کے لئے پیسے دیدیتا۔ اور میرے لئے

اتنی آسودگی بہت ہوتی تھی۔ دراصل ان دنوں میرے اندر ایک عجیب آوارگی* کا آسیب رہتا تھا جو مجھے گلیوں گلیوں، شہروں شہروں خشک پتے کی مانند اڑائے پھرتا تھا۔ بہرحال میں بات ساحر کی کر رہا تھا۔ کہ وہ ان دنوں انتہائی بحران سے گزر رہا تھا۔ ساحر کہ جس کی صبح کا آغاز ہمیشہ دن کے گیارہ بارہ بجے ہوتا تھا۔ اب بمبئی میں وہی ساحر صبح سات بجے بیدار ہوتا اور نہا دھو کر، ناشتے سے فارغ ہو کر اسٹوڈیوز کے طواف کرنا شروع کر دیتا۔ لیکن اسے کہیں کام نہ ملتا۔ البتہ کام کے وعدے بہت ملتے۔ مگر ساحر نے حالات کے ہاتھوں ہار نہیں مانی۔ میں نے اُسے کبھی دل شکستہ اور اداس نہیں دیکھا تھا۔ وہ اُسی طرح قہقہے لگاتا، دنیا بھر کی باتیں سناتا، اور ہر ناکامی کو مسکرا کر برداشت کرتا تھا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ ان دنوں اُس نے کچھ گانے ضرور لکھے تھے جو ریکارڈ بھی ہوئے، فلموں میں ہٹ بھی ثابت ہوئے۔ لیکن ریکارڈ پر نغمہ نگار کے طور پر ساحر کے نام کی بجائے کسی دوسرے شاعر کا نام ہوتا تھا۔ وہ ساحر کو پانچ سو روپے دیتا تھا۔

ساحر کی جدوجہد کا عرصہ ڈیڑھ سال کے لگ بھگ ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی تک "ہنوز دلّی دور است" والی بات تھی۔ تاہم اس میں بے پناہ خود اعتمادی تھی۔ وہ خود ان دنوں کہا کرتا تھا۔ "یار یہ بمبئی شہر ہے جو باہر سے آنے والوں سے کم از کم دو سال تک لازماً جدوجہد مانگتا ہے اور اس کے بعد بڑے پیار سے اپنے گلے لگا لیتا ہے۔ بس جلد ہی وقت آنے کو ہے۔ مجھے فلمیں ہی فلمیں ملیں گی۔" اُدھر امی کہا کرتیں۔ "بیٹے! مجھے یہ فلم کے گیت لکھنے کا کام بالکل پسند نہیں۔ میں تو ساحر سے روز کہتی ہوں کہ بمبئی چھوڑ کر لدھیانہ چلا جائے اور کوئی خوب صورت سا ادبی پرچہ نکال لے آخر فلم میں رکھا ہی کیا ہے۔ بے چارہ ساحر رات دن گھومتا ہے مگر کوئی چانس دیتا ہی نہیں۔ یہ محض ماں کی ممتا تھی۔ ورنہ امّی کو بھی یقین تھا کہ اس کا بیٹا ساحر، فلم ہو یا ادب دونوں میں اپنا پرچم بلند رکھے گا۔ لہٰذا وہ ساحر کی کامیابی کے دنوں کا انتظار بہت تحمل سے کر رہی تھیں۔

اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ایک دن ماٹونگا میں موہن سہگل کے گھر پر میں اور موہن سہگل کیرم کھیل رہے تھے اور ساحر ہم دونوں سے بے نیاز کچھ اپنی ہی سوچ میں نیم دراز تھا کہ موہن سہگل نے اسے رائے دی۔ "ساحر! تم ایک کام کرو۔ ان دنوں فلم میں ایس۔ ڈی برمن میوزک ڈائرکٹر کی بہت مانگ ہے لیکن اسے کوئی ڈھب کا گیت لکھنے والا شاعر نہیں ملتا۔ تم کل صبح اس سے ملو، وہ نئی صلاحیتوں کی قدر کرتا ہے۔ اگر تم نے اس کی مرضی کے مطابق پسند کا گانا لکھ دیا تو یقیناً تم سے پوری فلم کے گانے لکھوائے گا۔"

موہن سہگل کی بات ساحر کے دل میں اتر گئی اور وہ دوسرے دن برمن سے ملنے گرین ہوٹل کھار چلا گیا۔ برمن کے کمرے کے باہر مستقلاً لکھا ہوا رہتا تھا Please Don't Disturb لیکن یہ تحریری جملہ ویسا ہی تھا جیسا کافی ہاؤس کے ایک کونے میں تختی پر لکھا ہوتا ہے Please Don't make noise تختی کی تحریر سے بے نیاز ہر کوئی شور و غل مچانے اور قہقہے لگانے میں مصروف رہتا ہے۔ ساحر بھی اس تحریر کو نظر انداز کر کے برمن کے کمرے میں چلا گیا اور اپنا تعارف کرایا۔ ملنے کی وجہ بتائی۔ ایس۔ ڈی۔ برمن چونکہ بنگالی تھا لہٰذا وہ ساحر کے ادبی مرتبے سے قطعاً بے خبر تھا۔ تاہم اس نے ساحر کو خوش آمدید کہا اور فلم کے گانے کی دھن اور سچویشن سمجھائی۔

فلمی دنیا میں یہ عام رواج ہے کہ نغمہ نگار سے پہلے موسیقار سے کنٹریکٹ کیا جاتا ہے۔ اس کے گیتوں کی مختلف دُھنیں سن لی جاتی ہیں اور جو دھنیں پروڈیوسر، ڈائرکٹر کو پسند آ جاتی ہیں۔ انہیں باقاعدہ ایگریمنٹ کر کے اپنی فلم کے لئے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔

دھنوں کے بعد مسئلہ گیت کے بولوں اور سچوایشن کا ہوتا ہے۔ کس سچوایشن پر کون سی دُھن فٹ کی جائے! اور اسی دھن اور سچوایشن پر نغمہ نگاروں سے بول تیار کرائے جائیں۔ شاعر کے لئے یہ خاصا سخت مقام ہوتا ہے۔ یہاں شاعر کو اپنی شاعری کے علاوہ ایک Sense of Music ہونا بھی ضروری ہے۔ اور یہ لازم نہیں کہ ایک اچھا شاعر اپنے ذہن میں مکمل فلمی دھن بسالے اور اچھا خوبصورت گیت لکھ سکے۔ بسا اوقات ایک ادبی شاعر لیکن گیت کی طرز کو سمجھنے والا ابھی تک بندی کر لیتا ہے۔ چونکہ ساحر کے کان موسیقی کی دھنوں کو اپنے میں بسا لیتے تھے لہٰذا اس نے انہی طرزوں اور کہانی کے مطابق خوبصورت گیت لکھے تھے۔ خیر۔ ساحر نے برمن دادا سے فرمائش کی کہ ذرا ایک مرتبہ دھن پھر سنایئے۔ برمن ہارمونیم پر دھن سنا رہے تھے۔ ساحر ساتھ ساتھ گانا لکھے جا رہا تھا۔

ٹھنڈی ہوائیں، لہرا کے آئیں

رُت ہے حسیں

تم ہو کہیں

کیسے بھلائیں، ٹھنڈی......!

برمن نے گانے کے بول سُننے اور بہت خوش ہوئے اور ساحر کو لے کر وہ کاردار اسٹوڈیوز روانہ ہو گئے تاکہ وہ جلد از جلد اپنی نایاب دریافت کو فلم پروڈیوسر اور ڈائرکٹر اے۔ آر۔ کاردار سے متعارف کرا سکیں۔ اسٹوڈیو پہنچے، وہاں اے۔ آر کاردار کے علاوہ شکیل بدایونی اور راجندر کرشن بھی تشریف فرما تھے۔ دونوں صفِ اول کے نغمہ نگار تھے لیکن وہ ساحر کو دیکھ کر اپنی اپنی کرسیوں سے احتراماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ برمن بے چارے کو تعارف کرانے کا بھی شرف حاصل نہ ہوا تھا کہ شکیل، ساحر سے کہنے لگے "ساحر صاحب! کمال ہیں آپ بھی، میری کتاب کا دیباچہ ابھی تک نہیں لکھا۔" ساحر معذرت کرتے رہے اور جلد ہی دیباچہ لکھنے کا وعدہ کرتے رہے۔ اُدھر کاردار صاحب سب کو اپنا اپنا کلام سنانے کی دعوت دیتے رہے۔ راجندر کرشن کہہ رہے تھے۔ ساحر صاحب شاعر تو آپ ہیں۔ آپ ہی سنایئے کوئی نظم یا غزل اور یا پھر شکیل صاحب سنائیں۔ ہم تو یونہی زبردستی سے شاعر بن گئے ہیں۔"

ساحر کہنے لگے: "وہ کیسے؟"

بات یوں ہے ساحر صاحب۔ ہم جب بمبئی آئے تو سوچا کہ اس شہر میں رہ کر فلم کے لئے کوئی کام کیا جائے۔ موسیقی سے بھی شغف رہا ہے اور تمام اساتذہ کا کلام بھی پڑھا ہوا تھا، اچھی بری شاعری کی پہچان بھی آتی تھی۔ لہٰذا ہم نے فلموں کی دھنوں پر بول فٹ کرنے کو پیشہ بنا لیا۔ اب اگر ہم سنائیں گے تو یہی سنا پائیں گے۔

گورے گورے، او بانکے چھورے

میری گلی آیا کرو! (فلم سمادھی)

اس کے بعد شکیل بدایونی اور ساحر تادیر اپنا اپنا کلام سناتے رہے اور کاردار صاحب سے داد وصول کرتے رہے۔ بہر حال برمن دادا کو یک گونہ مسرت کا احساس ہو رہا تھا کہ اُن کا انتخاب کردہ نغمہ نگار ساہتیہ میں بھی جہان کوی ہے۔ بعد ازاں برمن اور ساحر کا ایسا گروپ بنا جو کہ فلم انڈسٹری پر چھا گیا۔ اور جس نے فلم انڈسٹری کو بہترین گیتوں اور خوبصورت دھنوں سے روشناس کرایا۔

اب ساحر میں بلا کی خود اعتمادی آچکی تھی۔ فلم 'نوجوان' کے ساتھ فلم 'بازی' (ڈائرکٹر چیتن آنند، ہیرو دیو آنند اور ہیروئن کلپنا کارتک) مکمل ہونے کے قریب تھی کہ نوکیتن گروپ کے کسی فرد نے ساحر سے کہا۔ "ساحر صاحب! یہ بھی فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ آپ کا اسکرین پر نام دیا جائے۔"

ساحر کہنے لگا۔ "ضرور نام دیجئے۔ اگر میرے نام سے آپ کی فلم کامیاب ہو سکے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ دراصل ساحر کو ہمہ وقت یہ احساس رہتا تھا کہ اس کا نام اردو شاعری کا مقبول ترین نام ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ ساحر اور برمن نے بہترین گیتوں کا تحفہ دیا۔ ایسے گیت عوام نے پہلی مرتبہ سنے تھے۔

تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنا لے　　اپنے پہ بھروسہ ہے تو یہ داؤ لگا لے

تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے　　ہم بھری دنیا میں تنہا ہو گئے

جیون کے سفر میں راہی　　ملتے ہیں بچھڑ جانے کو
اور دے جاتے ہیں یادیں　　تنہائی میں تڑپانے کو

اور ان کے علاوہ بہت سے گیت ساحر اور برمن نے پیش کئے جو کہ اپنے عہد کے مقبول ترین گیت سمجھے گئے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ساحر کے گیت فلمی اور عوامی ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت اعلیٰ پایہ کے ادبی شاہکار ہوتے تھے۔

اب ساحر کو اپنا فلمی مستقبل درخشاں نظر آرہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن ساحر مجھ سے کہنے لگا۔ "آؤ کرشن ادیب تمہیں نیم عریاں لڑکیوں کا رقص دکھا لاؤں۔"

میں نے کہا۔ "کس جگہ؟"

کہنے لگا۔ آج فلم 'بازی' کے لئے میرا گیت 'سنو گجر کیا گائے' "گیتا بالی پر فلمایا جا رہا ہے۔ اس کی کاسٹیوم کچھ نیم قسم کی ہوگی چلو فیمس سائن میں شوٹنگ ہو رہی ہے۔ دو گھڑی دیکھ کر پھر ہم انجمن ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ میں چلیں گے۔ جہاں تمہیں جان نثار اختر سے ملواؤں گا۔"

ہم دونوں اس طے شدہ پروگرام کے تحت گھر سے چل دیئے۔ اور اسی شام واپسی میں ساحر سے شاہد لطیف صاحب سے ملاقات ہو گئی کہنے لگے۔ "ساحر صاحب، آپ ہمارے ہاں کیوں نہیں آتے؟ کیا کوئی ناراضگی ہے؟"

ساحر کے ذہن میں پرانی تلخی تھی۔ جواب دیا۔ "شاہد صاحب، آپ کے ہاں کوئی باغیرت آدمی کار کے بغیر نہیں آسکتا۔ میں اس سال کے آخر میں کار خرید رہا ہوں، پھر ضرور آؤں گا۔"

"بازی" باکس آفس کے اعتبار سے نہایت کامیاب ثابت ہوئی۔ ہندوستان کے گلی کوچوں، محفلوں میں 'بازی' فلم کے گیت گائے جاتے لگے! اور ساحر کا نام خاص و عام کی زبان پر تھا اور اس کے پاس کار بھی آگئی۔ اب وہ کرشن چندر کے

بنگلے کو چھوڑ کر " درسوا چنائی نواس " میں منتقل ہو گیا۔ فلم انڈسٹری ساحر سے گیت لکھوانا اپنی فلموں کی کامیابی سمجھنے لگی تھی۔

انہی دنوں مشہور میوزک ڈائرکٹر روشن ساحر کے پاس آئے اور اصرار کیا کہ ساحر اُن کے ساتھ فلم کے گانے لکھے لیکن ساحر نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا۔

" روشن صاحب، معاف کیجئے گا۔ میں فی الحال ایس۔ ڈی۔ برمن کے سوا کسی اور میوزک ڈائرکٹر کے ساتھ گانے نہیں لکھ سکتا۔"

روشن مایوس ہو کر چلے گئے۔ میں نے ساحر سے کہا۔ " بھائی جان! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ روشن صاحب کی بات نہیں مانی۔ اتنی عمدہ پیشکش کو خواہ مخواہ ٹھکرا دیا۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ روشن بھی بہت کامیاب میوزک ڈائرکٹر شمار ہوتے ہیں، بڑا نام ہے ان کا انڈسٹری میں۔ خیر آپ کی مرضی؟"

ساحر جو بہت نبض شناس اور زمانہ شناس تھا کہنے لگا۔ " ہاں ٹھیک ہے نوجوان، روشن کا بہت نام ہے اور وہ کامیاب موسیقار ہیں لیکن شاید تم یہ نہیں جانتے کہ برمن ان سب سے زیادہ کامیاب اور نمایاں ہے اِس وقت ہر تیسری فلم کا میوزک ڈائرکٹر ایس۔ ڈی۔ برمن ہے۔ اب جبکہ برمن کو پتہ چلے گا کہ ساحر نے برمن کی وجہ سے روشن کو انکار کیا ہے تو وہ بھی یہی کہے گا کہ " میں فقط ساحر کے ساتھ ہی میوزک دوں گا۔" میں نے دل ہی دل میں ساحر کی اس کاروباری سوجھ بوجھ کی داد دی۔

اور پھر ہوا بھی یوں، کہ جب ایس۔ ڈی۔ برمن کو پتہ چلا کہ ساحر نے تمام میوزک ڈائرکٹروں کو میرے نام سے رد کر دیا ہے تو برمن نے بھی فلمسازوں پر شرط عائد کر دی کہ " میں ساحر کے سوا کسی دوسرے گیت کار کے ساتھ موسیقی نہیں دوں گا۔" لہٰذا ساحر اور برمن کی جوڑی بہت کامیاب اور مثالی ثابت ہوئی۔ ان کی ہر فلم کے گیت اور میوزک " سپر ہٹ " ہوتے گئے۔ ساحر شہرت کی بلندیوں پر اُڑنے لگا اور اپنی ہر شرط پروڈیوسروں سے منوانے لگا۔

ساحر خوب جانتا تھا کہ یہ بمبئی شہر ہے یہاں روپیہ پیسہ ہواؤں میں اڑتا پھرتا ہے۔ فقط آدمی کو اتنی سوجھ بوجھ ہونی چاہیے کہ اس روپے کو گرفت میں کیوں کر لایا جا سکتا ہے۔ اس شہر میں کوئی کسی کا دوست نہیں۔ یہ تو محض ایک کاروباری منڈی ہے۔ گیت ہوں یا موسیقی، اداکاری ہو یا ہدایت کاری، سب مال برائے فروخت ہے جس کا جتنا نام، اتنے کے اتنے اونچے دام!

میں نے خود اپنی ان آنکھوں سے بہت پیارے پیارے دوستی کے رشتوں کو کاروبار میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔

برمن کے زمانے میں جو بھی دوسرے کامیاب میوزک ڈائرکٹر تھے۔ ان میں مدن موہن، روشن اور او۔ پی نیّر صف اول کے موسیقار کہلاتے تھے۔ اِدھر ساحر کا نام کھرے سکے کی طرح چلنے لگا تھا۔ ہدایت کار بی۔ آر۔ چوپڑہ کی فلم " نیا دور " کا آغاز ہوا تو ساحر پہلی مرتبہ او۔ پی نیّر کے ساتھ گانے لکھنے پر آمادہ ہوا۔ فلم کی کاسٹ میں دلیپ کمار اور وجینتی مالا تھے۔ کہانی دلچسپ تھی۔ فلم ہر شہر کے سینما گھروں پر کامیاب ہوئی ساحر کے گیت بے حد مقبول ہو کر ہر خاص و عام کی زبان پر آ گئے۔ ایس۔ ڈی۔ برمن میوزک ڈائرکٹر سے الگ ہو کر اس نے اپنی فنی صلاحیتوں کا اظہار " نیا دور " فلم کے گیتوں میں کیا۔ یہ گیت آج بھی اتنے سال گزرنے پر بھی شاداب و تازہ لگتے ہیں۔

" نیا دور " کی کامیابی کی ضمانت بھی اس فلم کے گیت تھے اور نغمہ نگار ساحر لدھیانوی۔ لیکن یہ سارا کریڈٹ او۔ پی نیّر

لینا چاہتے تھے۔

او۔پی نیر بذاتِ خود بہت انا پرست تھے۔ ایک مرتبہ لتا منگیشکر نے ان کی فلم میں گانے سے انکار کر دیا تو اس کے بعد نیر نے عہد کیا کہ میں آئندہ زندگی میں لتا منگیشکر کے بغیر موسیقی دوں گا۔ لہٰذا اس کی کسی فلم میں لتا منگیشکر کا دخل نہیں۔ اب نیا دور کی کامیابی پر وہ سب سے کہنے لگے کہ یہ میرا میوزک ہی ہے جو فلم کا حاصل ہے اُدھر ساحر کو ضد تھی کہ نہیں، یہ میرے گانوں کا اعجاز ہے کہ فلم ہٹ ثابت ہوئی۔ ورنہ میوزک تو فلم کی کامیابی میں محض ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کشاکش میں ساحر اور او۔پی۔ نیر بھی الگ ہو گئے۔ لیکن فلمساز بی۔ آر۔ چوپڑہ کا مستقل نغمہ نگار ساحر لدھیانوی ہی رہا۔

ساحر نے فلم لائن میں اپنی انا کو تسلیم کروا لیا۔ اب اس نے تمام پروڈیوسروں پر یہ بھی شرط عائد کر دی کہ جو معاوضہ وہ میوزک ڈائرکٹر کو دیتے ہیں میں اس سے بیس ہزار روپے زیادہ لوں گا۔ اور اس نے یہ شرط منوائی بھی۔

برمن، نیر، روشن کا شمار اُن بڑے میوزک ڈائرکٹروں میں ہوتا تھا جنہیں فلم والے 'اے' کلاس دیتے ہیں۔ اُن کا معاوضہ بھی دو دو، تین تین لاکھ روپے ہوتا تھا۔ لیکن دوسری طرف ساحر اب فلم انڈسٹری کی اہم ضرورت بن چکا تھا۔ فلم پروڈیوسر ساحر سے گانے لکھوانا بھی چاہتے تھے۔ لیکن ساحر کی شرائط پوری کرنے سے بھی قاصر تھے۔ لہٰذا انہوں نے اے کلاس میوزک ڈائرکٹروں کو نظر انداز کر کے بی کلاس موسیقاروں کو سائن کرنا شروع کر دیا اور ساحر کو ان کے معاوضے سے بیس ہزار روپے زیادہ دیا۔ یہ تھے میوزک ڈائرکٹر روی، این دتہ، خیام وغیرہ۔ ساحر نے ان سب کے ساتھ گانے لکھے۔ اور جب فلمیں ریلیز ہوئیں تو سب اپنے گانوں کی وجہ سے کامیاب ہوئیں حتےٰ کہ ساحر کے گانوں نے بیشتر میوزک ڈائرکٹروں کو فلم لائن میں مستحکم بنا دیا۔

چونکہ ساحر نے اپنے ابتدائی ایام میں جدوجہد کرتے ہوئے انہی پروڈیوسروں کے ہاتھوں تذلیل سہی تھی۔ اب ساحر کا وقت آگیا تھا کہ وہ ہر پروڈیوسر سے انتقام لے سکے۔ ساحر جانتا تھا کہ بمبئی کے کسی بازار میں دوستی، پیار، وفا کا کوئی رشتہ نہیں۔ صرف جنس کا رشتہ ہے۔ آپ کے پاس کیا ہے؟ اس کی قیمت کیا ہے؟ اگر قوتِ خرید ہے تو خرید لو ورنہ چپ چاپ آگے بڑھ جاؤ۔

جس شہر میں زندگی کی قدریں اس قدر بیکاروباری ہوں تو وہاں ساحر کا ہر فیصلہ قابلِ تحسین ہے۔ بہت سال پہلے کسی پروڈیوسر نے ساحر سے گانا لکھوایا۔ لیکن ساحر کو ہر روز اس پروڈیوسر کے پاس اس لئے جانا پڑتا کہ اگر گانا ناپسند ہے تو معاوضہ دیا جائے۔ لیکن ہر مرتبہ پروڈیوسر یہ کہتا: "معاف کرنا، آج ڈائرکٹر صاحب نہیں آئے، آپ کبھی پھر آیئے گا"۔

ساحر پھر کسی روز جاتا تو جواب ملتا۔ "معاف کرنا، وہ ذرا میوزک ڈائرکٹر نہیں آئے۔ کل فیصلہ ہو جائے گا"۔

ایک دن ساحر نے تنگ آکر اپنا گانا یہ کہہ کر پھاڑ کر پھینک دیا: "کیا میرا گانا آپ یو۔این۔او (U.N.O.) میں فیصلہ کرانے کے لئے بھیج رہے ہیں؟"

ساحر کے تلخ تجربات نے اسے قطعاً غیر جذباتی بنا دیا تھا۔ اب اسے اپنی مارکیٹ ویلیو کا شدید احساس تھا اُدھر پروڈیوسروں نے ساحر کے نغمات حاصل کرنے کے لئے بی کلاس میوزک ڈائرکٹروں کو سائن کرنا شروع کر دیا تاکہ وہ ساحر کو بآسانی موسیقار کے معاوضہ سے بیس ہزار روپے زیادہ دے سکیں۔ فلم شگون کا میوزک ڈائرکٹر خیام تھا اور نغمہ نگار ساحر

لدھیانوی، فلم باکس آفس پر ناکام ثابت ہوئی۔ لیکن اس کے گانے نہایت مقبول ہوئے۔ خصوصاً یہ گیت آج بھی کانوں میں رس گھولتا ہے۔

پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا ہے
سرمئی اُجالا ہے، چمپئی اندھیرا ہے

ساحر جب فلم لائن میں عروج پر تھا، اُن دنوں بمبئی کے کاردار اسٹوڈیو میں بی۔ آر۔ چوپڑہ کا ایرکنڈیشن دفتر تھا۔ جس کے باہر، بدن میں سے موبل آئل نکال لینے والی گرمی میں، ایک دبلا پتلا چپراسی نما آدمی بنچ پر بیٹھا تھا اور پاس سے گزرنے والے ہر ایرے غیرے یہاں تک کہ نتھو خیرے تک کو اُٹھ اُٹھ کر بڑے تپاک سے سلام کر رہا ہے۔ کوئی سر کو ذرا سا ہلا کر اس کے سلام کا جواب دے دیتا تھا اور کوئی اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ پرکاش پنڈت کو یہ دیکھ کر تب تعجب ہوا جب اس آدمی نے ساحر لدھیانوی کو بھی کھٹاک سے سلام کیا! اور ساحر نے سر ہلانے یا نہ ہلانے کی بجائے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور نہایت محبت سے پوچھا:

"کیسے ہیں آپ؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"گھر میں سب خیریت ہے؟"

"بس اللہ کا شکر ہے۔"

اللہ کا تین چار شکریوں کے بعد جب ساحر اور پرکاش پنڈت ایرکنڈیشن دفتر میں پہنچے تو وہاں یہ بحث چل رہی تھی کہ باقی تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن قوالی کے سین میں کیا وہ شخص ہونٹوں کو جنبش یعنی (Movement دینا) دے سکے گا۔ پتہ چلا کہ وہ شخص یعنی بدن سے موبل آئل نکالنے والی گرمی میں بنچ پر بیٹھا، ہر ایرے غیرے کو سلام پر سلام ٹھوکنے والا شخص ماسٹر نثار تھا۔

ماسٹر نثار، اپنے زمانے کا مشہور گانے والا فلم اسٹار تھا جس کی مس کجن کے ساتھ جوڑی، اپنے آپ میں ایک مثال تھی۔ دیسی جوڑی دلیپ کمار، کامنی کوشل۔ راجکپور، نرگس۔ دیوآنند، ثریا۔ دھرمیندر، ہیمامالنی بھی نہیں بنا سکے۔ اور یہ وہی ماسٹر نثار تھا جس کے دیدار کے لئے اسی کاردار اسٹوڈیو میں لنچ بریک کے وقت لوگوں کی لائن لگ جاتی تھی! اور مٹھائی کے ڈبے، پان، ناریل کے ساتھ ساتھ اُسے ایک ایک اشرفی بھینٹ کی جاتی تھی۔ اور بذاتِ خود ساحر لدھیانوی کو اس کی فلموں کے ڈائیلاگ آج بھی یاد تھے۔ ساحر بچپن سے اس کی فلمیں دیکھتا آیا تھا اور اس کے فن کا انتہائی مداح تھا۔ آج اسی ماسٹر نثار کے بارے میں بحث ہو رہی تھی کہ باقی تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن کیا وہ کسی اور کی گائی ہوئی قوالی کے بولوں پر ہونٹ ہلا سکتا ہے۔

پرکاش پنڈت نے ساحر کو ہوش و حواس کی کیفیت میں کبھی گندی گالیاں بکتے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس دن اس نے چوپڑہ برادرس اور اُن کے چمچوں کی شان میں ایسی چھے دار گالیاں دیں کہ طبیعت خوش ہو گئی۔

"پیاسا" فلم کے گیتوں کی غیر معمولی کامیابی کے باعث، ساحر کا ان دنوں نام بکتا تھا۔ لہٰذا اگر وہ چاہتے تو ساحر اور ان کی اگلی فلم کے ڈائیلاگ رائٹر پرکاش پنڈت کو دھکے دے کر باہر پھنکوا سکتے تھے لیکن اب ان کی آنکھ کے اشارے پر سب لوگوں

کو فرج کا ٹھنڈا کوکا کولا پلایا گیا۔ اور ایک کوکا کولا باہر بیٹھے ماسٹر نثار کے لئے اس خوش خبری کے ساتھ بھیجا گیا کہ کل گیارہ بجے وہ ریہرسل کے لئے تشریف لے آئیں۔

ساحر اور پرکاش پنڈت کوئی دو گھنٹے اُس ایئر کنڈیشن آفس میں گپ بک اور آرام کرنے کے بعد جب باہر نکلے تو خلاف توقع ماسٹر نثار کو اُسی طرح بنچ پر بیٹھے دیکھا۔

اِس بار ماسٹر نثار نے سلام نہیں کیا بلکہ آنکھوں میں آنسو بھر کر ساحر کے پاؤں پکڑ لئے۔ ساحر نے اٹھا انہیں چھاتی سے لگایا۔ پھر بغل میں ہاتھ دے کر اپنی گاڑی تک لے گیا۔ اور کہا کہ چلیئے، جہاں آپ کو جانا ہے۔ میں چھوڑے دیتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے کہ ساحر ان کے لئے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولتے، ماسٹر نثار لپک کر اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اور پھر ماہم کے علاقے میں ایک جگہ بہانہ کیسے کہ گھر چلیئے کچھ چائے پانی ہو جائے۔ محض سلام کہہ کر اتر گئے۔ غالباً ماسٹر نثار ہمیں اپنے شاندار بنگلے میں نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ جس کا نام بمبئی کی زبان میں "کھولی" ہوتا ہے۔

گاڑی میں ماسٹر نثار کے بیٹھنے اور اترنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کار میں بیٹھے ہوں۔ ماہم میں انہیں اتار کر گاڑی آگے بڑھی تو ساحر نے بتایا کہ کبھی اس شخص کے پاس دنیا کی سب سے بہترین کار "رولس رائس" ہوا کرتی تھی۔

یہ محض ایک واقعہ نہیں ہے اور بھی سینکڑوں واقعات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ساحر کے دل میں دبے کچلے انسانوں کے لئے کتنی محبت تھی۔ جدوجہد کرتے فنکاروں سے بے حد عملی ہمدردی رکھتا تھا۔ انہیں فلموں میں کام دلانے کے لئے کوشاں رہتا۔ انہیں کھانے کھلاتا۔ سگریٹ پلاتا اور اپنی گاڑی میں لے کر اسٹوڈیوز میں پروڈیوسروں سے ملواتا تھا۔

ایسے ہی ایک دن ایک صاحب آئے جنہیں ساحر قطعاً نہیں جانتا تھا لیکن تعارف ہونے کے بعد انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ کہنے لگے۔

"ساحر صاحب! آپ کا تو فلم لائن میں سکہ چلتا ہے، آپ چاہیں تو مجھے کوئی کام دلوا سکتے ہیں؟"

ساحر نے پوچھا کہ "آپ کیا کام جانتے ہیں؟"

انہوں نے کہا" کام تو کوئی نہیں جانتا، البتہ میوزک سے تھوڑی بہت دلچسپی ہے۔"

"کیا کوئی ساز بجانا جانتے ہو؟"

"نہیں"

"خیر، آؤ میرے ساتھ، آج میرے ایک گانے کی ریکارڈنگ ہونے والی ہے۔ تم محض دلہن پہ "گڑوا" (گاگر) بجانا۔ تمہیں پانچ سو روپے دلوا دوں گا۔"

وہ شخص حیران کہ "گڑوا" کون سا ساز ہے۔ جبکہ اُسے سرے سے کوئی ساز بجانا آتا ہی نہیں۔"

ساحر نے اس کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے کہا۔" فکر نہ کرو۔ میں جو حکم دوں گا، وہی ہوگا۔ جب ریکارڈنگ شروع ہو جائے

تو تم وقفے وقفے سے محض گڑوے پر ہاتھ مارنا۔ محض ہلکی سی ٹن کی آواز آنی چاہیے۔"

ساحر اُسے لے کر ریکارڈنگ کے لئے پہنچ گیا۔ میوزک ڈائرکٹر سے ملاقات کرائی۔ اب میوزک ڈائرکٹر کے حیران ہونے کی باری تھی۔ کیونکہ آرکسٹرا میں "گڑوا" نام کا کوئی ساز نہیں تھا اور نہ ہی اسے بجانے کی گنجائش۔ لیکن ساحر کو ناراض کرنا بذات خود ایک مصیبت مول لینے والی بات تھی۔ لہٰذا گانا ریکارڈ ہوا۔ وقفے وقفے سے اس شخص نے گڑوے سے ٹن کی آواز نکالی اور ریکارڈنگ ختم ہونے کے بعد اسے پانچ سو روپے دیدیئے گئے۔

ساحر اُن دنوں عادتاً تو نہیں البتہ مزاجاً آغا حشر کاشمیری بنا ہوا تھا۔ آغا حشر ایک ڈرامے کا پیشگی پانچ پانچ ہزار روپیہ لے لیتے تھے اور جب ڈرامہ مکمل ہوتا تو آغا صاحب پندرہ بیس ہزار سے زیادہ وصول کر چکے ہوتے تھے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ساحر کی طرح آغا حشر صاحب کی مالکان تھیٹر پر اتنی گرفت مضبوط ہوتی تھی کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ جو چاہتے تھے منواتے تھے، یہ سیٹھوں کو دھکے دیتے مگر وہ ڈرامہ آغا حشر ہی کا حاصل کرتے۔

آغا حشر کی طرح ساحر نے فلم لائن میں کامیاب ہونے کے بعد اپنی ہر شرط منوائی۔ جہاں اس نے نغمہ نگاروں کو فلم لائن میں قابل توقیر، امتیازی مقام دلوایا، وہاں اس نے گیتوں کا معیار بھی بہت بلند کیا۔

سب کو یاد ہو گا کہ ساحر سے پہلے بھی ریڈیو سے فلمی گانے نشر ہوتے تھے لیکن اناؤنسر فقط گلوکار اور موسیقار کا نام نشر کرتا تھا، نغمہ نگار کا نہیں۔ لہٰذا لوگوں کو یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ آخر خالق نغمہ کون ہے؟ ساحر فلمی دنیا کا پہلا شاعر تھا جس نے آل انڈیا ریڈیو کے منتظمین سے منوایا کہ موسیقاروں، گلوکاروں کے نام کے ساتھ نغمہ نگار کا نام بھی نشر ہوا کرے۔

ساحر اور ساحر کی فلمی شاعری کی مقبولیت کا اندازہ ایک اور واقعہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے جس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے۔

بہت پہلے سنیل دت نے ایک فلم بنائی تھی "مجھے جینے دو" اس فلم کا نغمہ نگار ساحر لدھیانوی تھا۔ میوزک ڈائرکٹر جے دیو۔ فلم کی کہانی وادی چنبل کے ڈاکوؤں سے متعلق تھی۔ گوالیار سے لے کر شیوپوری اور گنا تک ڈاکو مختلف گروپوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مان سنگھ ڈاکو کی شہرت تمام ہندوستان میں تھی۔ دن رات پولس کے ساتھ مقابلے ہوتے تھے۔ سنیل دت نے فلم کی بیشتر شوٹنگ ان علاقوں میں کی تھی تاکہ کہانی میں حقیقت کا رنگ آسکے۔ ساحر نے بہت خوبصورت گیت لکھے تھے۔ یہ گیت آج بھی مقبول عام ہے۔

رات بھی ہے کچھ بھیگی بھیگی
چاند بھی ہے کچھ مدھم مدھم
تم آؤ تو آنکھیں کھولے
سوئی ہوئی پائل کی چھم چھم

تپتے دل پر یوں گرتی ہے
تیری نظر سے پیار کی شبنم

جلتے ہوئے جنگل پر جیسے
برکھا برسے ،رک رک تھم تھم

اس فلم کے لئے ساحر نے ایک لوری لکھی تھی۔ جس کا پس منظر ایک ننھا معصوم بچہ ہے اور اس بچے کا باپ علاقے کا مشہور و معروف خطرناک ڈاکو ہے۔ ماں لوری گاتی ہے۔ یہ لوری عام لوریوں سے بہت حد تک الگ اور منفرد ہے۔ ماں کے دل میں بار بار اپنے بچے کے مستقبل کا دھیان آتا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ کل جب میرا ننھا معصوم بچہ جوان ہوگا تو کیا وہ بھی اپنے باپ کی طرح ڈاکے ڈالے گا؟ کیا اس کے تعاقب میں بھی ہر وقت ہتھکڑیاں اور پولس رہا کرے گی۔ وہ نہیں چاہتی اس کا لاڈلا جوان ہوکر اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر ڈاکو بنے۔ لیکن کیا معاشرہ اُسے باعزت زندگی دے سکتا ہے؟ وہ دل سے چاہتی ہے کہ میرا بیٹا بڑا ہو کر ایک اچھا شہری بن سکے لیکن ایک ڈاکو کے بیٹے کے ہمراہ، اس کے باپ کی بدنامیاں بھی سفر کرتی ہیں بس اس قسم کی سچویشن پر ساحر لدھیانوی نے نہایت خوبصورت لوری لکھی تھی۔ جس کے ہر مصرعے میں ماں کا دل دھڑکتا ہے۔ وہ گاتی ہے:

تیرے بچپن کو جوانی کی دعا دیتی ہوں
اور دعا دے کے پریشان سی ہو جاتی ہوں
میرے بچے، میرے گلزار کے ننھے پودے
تجھ کو حالات کی آندھی سے بچانے کے لئے
آج میں پیار کے آنچل میں چھپا لیتی ہوں
کل یہ کمزور سہارا بھی نہ حاصل ہوگا
کل تجھے کانٹوں بھری راہ پہ چلنا ہوگا
زندگانی کی کڑی دھوپ میں جلنا ہوگا
تیرے بچپن کو جوانی کی دعا دیتی ہوں
اور دعا دے کے پریشان سی ہو جاتی ہوں

"مجھے جینے دو" ریلیز ہوئی تو وادی چمبل کے سب ڈاکوؤں نے فلم دیکھی۔ فلم کی کہانی انہیں اپنی محسوس ہوئی۔ ساحر کے گیتوں میں ان کا اپنا دل دھڑک رہا تھا اور پھر ایک مرتبہ جب ساحر اپنی امی اور بہن انور کے ساتھ لدھیانہ آرہا تھا تو گوالیار شوپوری کے قریب ساحر کی کار کو روک لیا گیا۔ روکنے والا علاقہ کا بہت مشہور ڈاکو تھا۔ اس نے ساحر سے چھوٹتے ہی کہا۔

"کیا آپ جانتے ہیں میں کون ہوں؟"

ساحر نے انکار میں سر ہلایا۔ تب اس نے کہا کہ میرا نام سب جانتے ہیں۔ میں اس علاقے کا وہ ڈاکو ہوں۔ جس کے نام سے بڑے بڑے سیٹھ تو کیا پولس بھی کانپتی ہے۔ ہمارے آدمیوں نے ہمیں اطلاع پہلے سے دی تھی کہ آپ ساحر لدھیانوی ہیں۔

جنہوں نے "مجھے جینے دو" کے گانے لکھے ہیں۔ ساحر پریشان سا ہوگیا۔ امّی بھی گھبرا گئیں۔ (ساحر کے ساتھ کرشن چندر بھی تھے جنہوں نے بعد میں ایک ناول "چمبل کی چمیلی" بھی لکھا تھا) اور آپ کی اطلاع ہمیں بہت پہلے سے مل گئی تھی۔ اب آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ ہم مدت سے آپ سے ملنے کے خواہاں تھے۔ آیئے۔ سوچیئے مت۔ بے فکر آج ایک رات آپ ہمارے اڈّے پر گزاریں۔ ساحر کے کہنے کے مطابق وہ شخص قطعاً ڈاکو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بہت دلفریب، اسمارٹ اور پڑھا لکھا نوجوان محسوس ہوتا تھا۔ جس کے جسم پر قیمتی سوٹ تھا۔ تاہم وہ ساحر وغیرہ کو لے کر اپنے اڈّے پر چلے گئے۔ جہاں دوسرے ڈاکو بھی موجود تھے۔ ہر طرف بندوقیں اور کارتوسوں کی پیٹیاں لٹک رہی تھیں۔ بہت خوفناک اور مجرمانہ فضا تھی۔ لیکن ان ڈاکوؤں نے ساحر کا بہت پُرتپاک خیرمقدم کیا۔ رات بھر محفل رقص وسرود جاری رہی۔ وہ لوگ ساحر سے اس کی ادبی نظمیں اور فلمی گیت بڑے خلوص سے سنتے رہے۔ صبح کے ساتھ ان ڈاکوؤں نے پھر ملنے کا وعدہ لے کر بڑے احترام کے ساتھ ساحر کو رخصت کیا۔ اس غیر معمولی واقع سے پتہ چلتا ہے کہ ساحر کی مقبولیت کیسے کیسے لوگوں میں تھی۔

آج ساحر ہمارے درمیان نہیں ہے۔ اُسے ہم سے جدا ہوئے تین سال ہو گئے۔ لیکن آج بھی من موہن رنگ کی دوکان پر آویزاں ساحر کی فوٹو دیکھ کر اس کے مداحوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ ساحر کے کوئی ذاتی مراسم نہیں رہے وہ اسے فلموں کی نسبت سے جانتے ہیں اور مجھے بذات خود ساحر کے ساتھ گئے گزرے زمانے کی باتیں یاد آرہی ہیں۔

غالباً ۷۵ء کی بات ہے کہ ہمارے ایک صاحبِ ذوق دوست مسٹر ٹی۔ این۔ گپتا سمن ایڈیشنل سشن جج جالندھر شہر میں ایک مشاعرہ زیش کمار شاد کی یاد میں منعقد کرنا چاہتے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ کم از کم مشاعرے کے ذریعہ پانچ ہزار روپے اکٹھا کر کے شاد کی بیوی درشنا کو دیا جائے۔

اس سلسلے میں انہوں نے آل انڈیا مشاعرے کے شعراء کی فہرست مرتب کی۔ بیکل اتساہی۔ زبیر رضوی۔ بشیر بدر جاں نثار اختر اور دیگر تمام مقبول شعراء کے ناموں کے اوپر ساحر لدھیانوی کا نام تھا۔ لیکن ساحر کو جالندھر مشاعرے میں مدعو کرنا تو آسان تھا، لیکن ساحر کا آجانا واقعی ناممکن سا لگتا تھا۔ ایک تو بمبئی سے جالندھر تک کا سفر ویسے بھی بہت طویل ہے اور ساحر ہوائی جہاز کے سفر سے خوف کھاتا تھا۔ ویسے بھی ان دنوں مشاعروں میں کم شرکت کرنے لگا تھا۔ لہذا ٹی۔ این۔ گپتا صاحب مجھ سے کہنے لگے۔

"یار کرشن ادیب، لوگوں کے لئے مشاعرے میں کشش محض ساحر کی وجہ سے ہے اور مطلوبہ رقم بھی اس کے نام پر اکٹھی ہو سکتی ہے۔ تم اگر تعاون کرو تو یقیناً ساحر آسکتا ہے۔"

میں ٹی۔ این۔ گپتا سمن کے خلوص کا معتقد تھا اور ان کے ادبی ذوق کا بے حد معترف۔ میری بھی یہ دلی خواہش تھی کہ ساحر کسی طور یہاں شریکِ مشاعرہ ہو سکے۔ بہت سوچنے کے بعد میں نے انہیں مشورہ دیا کہ "گپتا جی، فی الحال آپ مشاعرہ کی تاریخ ملتوی کر دیں۔ ساحر بمبئی سے جالندھر محض مشاعرہ پڑھنے نہیں آئے گا۔ البتہ ادھر لدھیانہ گورنمنٹ کالج کی گولڈن جوبلی کا اہتمام ہو

رہا ہے۔ چونکہ ساحر اسی کالج کا طالب علم تھا اور ہری کرشن آرٹسٹ بھی یہیں کا تعلیم یافتہ ہے۔ لہذا کالج کے منتظمین ان دونوں فنکاروں کو گولڈ میڈل دے کر نوازنا چاہتے ہیں۔ یہ سارا اہتمام پروفیسر بلجیت سجاد کے ایما پر ہو رہا ہے۔ سجاد خود بھی شاعر ہیں اور ساحر کے مداحوں میں سے ہیں۔ لہذا میں ان سے بات کروں گا۔ ساحر کالج کی تقریبات سے فارغ ہو کر یہاں ضرور آجائے گا فی الحال آپ اپنے مشاعرے کی تاریخ ملتوی کر دیں۔"

ٹی۔ این۔ گپتا صاحب کو میری بات معقول لگی، لہذا انہوں نے اپنے مشاعرے کی تاریخیں کئی مرتبہ ملتوی کیں۔ کیونکہ گولڈن جوبلی کی تاریخ طے نہیں پا رہی تھی۔ بہرحال گورنمنٹ کالج کی اس تقریب خصوصی پر ساحر بمبئی سے لدھیانہ آگیا۔ ان کے ہمراہ موہن سہگل جاں نثار اختر اور پریم دھون بھی تھے۔

اُن دنوں تمام شہر میں ساحر کی آمد پر مسرت کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ گھروں، کلبوں اور نجی محفلوں میں ساحر کو مدعو کیا جا رہا تھا۔

ہماری زرعی یونیورسٹی کے ڈین ڈاکٹر اے۔ ایس۔ اٹوال بھی فنِ لطیف میں دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ بھی ساحر کے مداح تھے انہوں نے فقط ساحر کا نام سنا تھا، کلام پڑھا تھا۔ لیکن ساحر کے ساتھ مل بیٹھ کر ایک شام گزارنا چاہتے تھے لہذا میں اٹوال صاحب کے ایما پر دوسرے دن ساحر کو ان کی کوٹھی پر لے آیا۔

اگرچہ یہ محفل نہایت مختصر تھی لیکن بے حد اہم! صاحب خانہ کے علاوہ ساحر، جاں نثار اختر، ہری کرشن آرٹسٹ، راحت اور پنجابی کے مقبول ترین شاعر شو کمار بٹالوی بھی شامل تھے۔

میں نے ڈاکٹر اٹوال سے درخواست کی آج جیسی شعرا کی نشست شاید آپ کو پھر کبھی دوبارہ نصیب نہ ہو۔ لہذا بہتر ہوگا کہ آپ فقط ان سب کا کلام ہی نہیں بلکہ اول تا آخر تمام گفتگو جو بے تکلفانہ ماحول میں ہو رہی ہے ریکارڈ کریں۔

آج جاں نثار اختر، شو کمار اور ساحر ہم سے جدا ہو چکے ہیں لیکن ڈاکٹر اٹوال کے پاس اس شام کی پوری کارروائی یعنی ان شعرا کی آواز، کلام، لطیفے اور ذاتی قسم کی بے حجابانہ نشیلی باتیں ٹیپ میں محفوظ ہیں۔ یقیناً یہ ٹیپ بیش قیمت ادبی دستاویز ہے۔

اسکاچ کا دور چل رہا تھا۔ ساحر، جاں نثار اختر، شو کمار اپنے اپنے کلام سے محظوظ کر رہے تھے کہ ڈاکٹر اٹوال صاحب نے مجھے بھی کچھ سنانے کے لئے کہا۔ میں نے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا "چھوڑیئے اٹوال صاحب، میں تو ہر روز آپ کو سناتا رہتا ہوں۔ آج آپ محض اِن سے سنئے جن کے لئے یہ بزم آرائی کی گئی ہے۔"

ساحر نے مسکراتے ہوئے خوبصورت جملہ کہا۔" ہاں، ہاں کرشن ادیب، آج تم اپنا کلام کیوں کر سناؤ گے یقیناً تمہیں روز سامعین اچھے ملتے ہوں گے۔ غالباً ہم تمہارے لئے شاید معیاری سامعین نہیں ہیں۔"

ساحر کے اس جملے کا سب نے لطف اٹھایا اور میں نے اپنے کلام کا آغاز کیا۔

دوسرے دن گورنمنٹ کالج لدھیانہ کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں مشاعرہ تھا۔ اردو، پنجابی دونوں زبانوں کے نامور شعراء آئے ہوئے تھے۔ شو کمار، موہن سنگھ، امرتا پریتم کے علاوہ اردو زبان کے مقبول شعراء زبیر رضوی، بشیر بدر

جان نثار اختر وغیرہ اپنا اپنا کلام سنا رہے تھے۔ لیکن مشاعرے کی بنیادی کشش فقط ایک نام تھا۔ وہ تھا ساحر لدھیانوی، کالج کے وسیع لان میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ حتیٰ کہ اسٹیج پر بھی شعراء کے ساتھ ساتھ سامعین بیٹھے ہوئے تھے۔

لوگ ساحر کو اک نظر دیکھنا اور سننا چاہتے تھے۔ ہر طرف سے آوازیں آرہی تھیں، ساحر، ساحر، اور ساحر اپنی مخصوص مسکراہٹوں سے عوام کی محبت کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ مشاعرہ رات گئے تک کامیابی سے چلتا رہا۔ اس مشاعرے کی تصویریں میرے پاس محفوظ ہیں۔ لیکن جی کو دکھ ہوتا کہ شوکمار، پروفیسر موہن سنگھ، جان نثار اختر، ساحر لدھیانوی ایک ایک کرکے جدا ہو گئے ہیں۔ شوکمار کو آتش سیال نے چھین لیا۔ اور موہن سنگھ، جان نثار اختر اور ساحر دل کے ہاتھوں مارے گئے۔

ہو گئے ہم سے جدا یار پرانے کب کیا

ساحر اور ہری کرشن آرٹسٹ کو گولڈ میڈل سے نوازا جا چکا تھا۔ مشاعرہ بھی ہو چکا تھا۔ لیکن ساحر اپنے مداحین کے حلقے میں گھرا ہوا تھا۔ ادھر ٹی۔ این گپتا کے فون پر فون آرہے تھے کہ کرشن ادیب، ساحر صاحب کو لے کر فوراً جالندھر آجاؤ مشاعرہ شروع ہونے والا ہے۔

آخر بڑی مشکلوں سے ساحر کو ان کے چاہنے والوں سے فراغت دلا کر رات کے سوا نو بجے جالندھر پہنچے۔ گپتا صاحب نے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔

ساحر صاحب آپ کی تشریف آوری ہمارے لئے خوشی کا باعث ہے۔ ہمارا اخلاقی فرض تو یہ تھا کہ آپ کو تھوڑا آرام کرنے کا موقع دیتے لیکن ادھر پنڈال میں سامعین شدت سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ یوں بھی مشاعرے کی شمع آپ روشن کریں گے۔ لہٰذا آپ کو زحمت تو ہوگی۔ لیکن ہماری خواہش ہے کہ آپ فوراً چلیں۔"

ساحر بھی بغیر حیل و حجت اور نخرے کے چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ مشاعرے میں جب ساحر کی آمد کا اعلان ہوا تو تالیوں اور ساحر زندہ باد کے سوا کوئی اور آواز نہیں آتی تھی۔ سامعین کے جوش محبت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

ساحر نے نریش کمار شاد کی تصویر کی گلپوشی کی اور شمع بزم روشن کی۔ مشاعرے کا آغاز ہوا۔ سب شعراء اپنے اپنے مقام کی مناسبت سے کلام سنا رہے تھے۔ اور میں کیمرہ لئے تصویر کشی میں مصروف تھا شعرائے کرام کی فوٹو کھینچنا میرا اہم شغل اس لئے بھی ہے کہ جانے کس وقت کہاں ان تصویروں کی ضرورت پڑ جائے۔ آج نریش کمار شاد، ساحر لدھیانوی جاں نثار اختر، فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ لیکن میرے پاس ان سب ممتاز شاعروں کے نگیٹوز محفوظ ہیں۔

خیر! مشاعرہ نہایت خوش اسلوبی سے چل رہا تھا کہ ساحر نے اپنا کلام سنانے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا لیکن ایک فرقہ پرست سامع نے بہ آواز بلند چیخ کر کہا کہ ہم نہیں سنیں گے۔ ساحر لدھیانوی کمیونسٹ پارٹی کا شاعر ہے۔ ایک ہنگامہ سا ہو گیا۔ چند لمحوں کے لئے ساحر نے بھی پڑھنا بند کر دیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد پھر آوازیں آنا شروع ہوئیں۔

دل تڑپ کی حیوانگی طرح

"ساحر صاحب پڑھیئے۔ اپنا کلام اطمینان سے سنائیے، ہم اس کمبخت کو پنڈال سے باہر پھینک آئے ہیں۔ سنائیے، جی بھر کر سنائیے۔"

ساحر نادیر اپنا کلام سناتا رہا اور لوگ دل کھول کر داد دیتے رہے۔ اور ساحر کے ساتھ فوٹو کھنچواتے رہے۔

مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔ نریش کمار شاد کی بیگم ورشارانی کو پانچ ہزار روپے سے نوازا گیا۔ آج بھی اہلِ جالندھر اس عظیم مشاعرے کو یاد کرتے ہیں۔

اب ذرا ساحر کی شاعری اور فلمی نغمہ نگاری سے ہٹ کر بھی کچھ باتیں ہو جائیں۔

ساحر لدھیانوی کی شخصیت بہت دلچسپ اور پُرکشش تھی۔ قد لمبا، چہرے پر ہلکے چیچک کے داغ، ماتھا چوڑا اور سر کے بال لمبے اور قدرے بے ترتیب ہوتے تھے۔ وہ باتیں کرنے کا فن جانتا تھا۔ جب ہنستا تھا تو اس کا چہرہ لڑکیوں کی طرح حیا آلود ہو جاتا تھا۔ دبے دبے قہقہوں میں دلچسپ جملے کہنا اس کی عادت تھی۔

ایک مرتبہ اپنے لاہور کے قیام کا واقعہ سنا رہا تھا۔ کہنے لگا:

کرشن ادیب، جب چودھری نذیر نے "سویرا" رسالے کا اجرا کیا تو پہلے صفحے پر ہمارے نام کچھ یوں لکھے:

ادارہ

احمد ندیم قاسمی

ساحر لدھیانوی

چونکہ سویرا ترقی پسند مصنفین کا جریدہ تھا اور انجمن کی سرگرمیاں پاکستانی حکومت کے مزاج کے مطابق نہیں تھیں لہٰذا ہر ترقی پسند شاعر اور ادیب پر حکومت کا عتاب نازل ہو رہا تھا۔ ظہیر کاشمیری، حمید اختر وغیرہ کو گرفتار کر کے جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔ انہی دنوں خفیہ پولس کا ایک آدمی چودھری نذیر کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"چودھری جی میں تو پریشان ہو گیا ہوں تلاش کرتے کرتے۔ وہ جس کے چہرے پر زخم کا نشان بھی ہے اور عینک لگاتے ہیں، اُن کا پتہ چل گیا ہے کہ وہ احمد ندیم قاسمی ہیں اور جن کے چہرے پہ ہلکے چیچک کے داغ ہیں وہ ساحر لدھیانوی ہیں لیکن اتنے دن ہو گئے ہیں تلاش کرتے ہوئے، یہ کم بخت "ادارہ" نہیں ملتا۔

چودھری نذیر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ جناب 'ادارہ' کسی آدمی کا نام نہیں، بلکہ ایک لفظ ہے جس کے معنے ہیں۔ "ایڈیٹروں کا بورڈ"۔

خفیہ پولس کا آدمی اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔

ساحر رات بارہ ایک بجے تک جاگتا رہتا اور صبح گیارہ بجے سو کر اٹھتا تھا۔ دہلی پُل بنگش پر رہتا تھا۔ جوش ملیح آبادی صاحب کی رہائش بھی نزدیک ہی تھی۔ شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی شاعرِ فطرت بھی تھے۔ کوئی بھی موسم کیوں نہ

ہو۔ صبحدم چار بجے نہا دھو کر بیگم کے ساتھ سیر کو نکل جانا ان کا معمول تھا۔ صبح کے سورج کا نمودار ہونا انہیں اچھا لگتا تھا۔

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے
صبح کافی تھی اگر رسول نہ ہوتے (جوش)

ایک دن صبح دس بجے کے قریب جوش صاحب ساحر کے ہاں آگئے۔ پوچھا

"ساحر کہاں ہے؟"

"سو رہے ہیں۔"

"سو رہے ہیں جگاؤ انہیں۔"

ساحر کو جگا کر بتایا کہ جوش صاحب آئے ہیں تو ساحر پریشان سا آنکھیں ملتا باہر آیا۔

جوش صاحب نے چھوٹتے ہی کہا۔ "ساحر، تم کیسے شاعر ہو جو طلوعِ آفتاب کا منظر نہیں دیکھتے۔ اگر میرے ہاتھ میں عنانِ حکومت آجائے تو تم جیسے شاعروں کو سات سال کی سزا دوں۔"

ساحر حسب معمول شرمائے شرمائے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ جوش صاحب، شاعر تو آپ ہیں ہم کوئی شاعر وائر نہیں ہیں۔

جوش صاحب کے جانے کے بعد ساحر کہنے لگا۔ یار، اب جوش صاحب کو کون سمجھائے کہ میں رات کے دو بجے تک مطالعہ کرتا ہوں، پھر کہیں جا کر سوتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں گیارہ بجے سے پہلے کبھی اٹھا نہیں ہوں۔

خیر، یہ تو قبلہ جوش صاحب تھے جن کا ساحر کے دل میں بہت احترام تھا۔ ورنہ یہ بات سب جانتے تھے کہ ساحر کو سوتے سے جگانا بہت حوصلے کا کام ہے۔

کپڑے پہننے کا انتخاب ساحر کی پرابلم ہوتا تھا۔ اپنے دوستوں کے مشورے پر وہ انہی کی پسند کا لباس زیب تن کرتا۔ اور اپنی کار لے کر بمبئی کی سڑکوں پر نکل جاتا۔ اور شام گئے کچھ مخصوص دوستوں کے ہمراہ واپس آتا۔ محفلیں سجاتا اور اپنے مخصوص لہجے میں گفتگو کی پھلجڑیاں چھوڑتا۔ اسے اپنی ذات سے عشق تھا۔ بات خواہ وہ کیسی بھی کرے، کسی کی کرے مگر مرکزِ گفتگو بذاتِ خود ساحر لدھیانوی ہوتا تھا۔ اپنی شخصیت کی فنکارانہ انداز میں پبلسٹی کرتے رہنا اس کی ہابی تھی۔ جتنے لطیفے سناتا وہ سب اس کی ذات سے منسوب ہوتے تھے۔ خیر، یہ کوئی عیب بھی نہیں۔ ہر شخص تھوڑا بہت خود پسند بھی ہوتا ہے۔

ساحر جب فلم لائن میں آگیا تو انجمن ترقی پسند مصنفین کو ساحر کا یہ اقدام اچھا نہیں لگا۔ کیونکہ ان کے خیال میں شاعر اور ادیب فلم لائن میں جا کر عوامی مسائل سے دور ہو کر سرمایہ کمانے کی دھن میں لگ جاتے ہیں۔

سردار جعفری جو خود بھی بعد میں فلموں میں گیت لکھنے لگ گئے تھے۔ ایک دن ساحر سے کہنے لگے۔ "ساحر، دیکھنا کوئی ترقی پسند شاعر اب تمہارے جنازے میں شریک نہیں ہوگا۔"

ساحر نے اپنے مخصوص انداز میں طنزاً جواب دیا۔ "کوئی بات نہیں سردار، میں تو سب کے جنازے میں شریک ہوں گا۔"

ساحر بیشک بہت مقبول اور ہر دلعزیز شاعر تھا لیکن اگر اس کی جملہ بازیوں کو نظرانداز کر دیا جائے تو اس کی

شخصیت قدرے غیر دلچسپ اور ادھوری سی لگے گی۔ وہ بات میں بات پیدا کرنے کا فن جانتا تھا۔ اس کی باتیں حاصل محفل ہوتی تھیں جنہیں یار لوگ مہینوں ہر محفل میں دہراتے رہتے تھے۔ آج میں بھی انہیں باتوں کو سنا رہا ہوں جن سے ساحر کی شخصیت کے کئی دلچسپ پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یوپی کے شعرا ساحر پر یہ الزام لگاتے تھے کہ ساحر کے کلام میں پنجابیت کا دخل زیادہ ہے اُسے اردو زبان کا ٹھیک استعمال نہیں آتا۔

انہیں دنوں کچھ ادبا، شعرا، ہندوستان کی تقسیم اور دلی کی بربادی پر تبصرہ کر رہے تھے کہ سردار جعفری نے کہا:

"یار ساحر، دلی جتنی مرتبہ اجڑی ہے اسے پنجابیوں نے آباد کیا ہے۔"

ساحر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں سردار بھائی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ دہلی جتنی مرتبہ بھی اجڑی اُسے پنجابیوں نے آباد کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے پچاس سال بعد کہنا شروع کر دیا کہ پنجابیوں کو اردو نہیں آتی۔"

ہندوستان کا مشہور و معروف مصور ہری کرشن آرٹسٹ میرا دوست ہے اور ساحر کا پیدائشی یار اور ہم جماعت و ہم وطن بھی ہے۔ دونوں ایک ساتھ پلے بڑھے تھے۔

میں ایک مرتبہ لدھیانہ سے بمبئی گیا تو ساحر نے ہری کرشن کی خیر و عافیت پوچھنے کے بعد کہا:

"کیا ہری کرشن نے شادی کر لی ہے؟"

میں نے کہا "نہیں" وہ کہتا ہے کہ میں اور ساحر ایک ہی شہر میں، ایک ہی تاریخ اور ایک ہی وقت میں پیدا ہوئے ہیں ہمارے ستارے مشترک ہیں۔ اگر ساحر کی شادی ہوگی تو یقیناً میری بھی ہوگی۔ ورنہ دونوں کنوارے رہیں گے۔"

ساحر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"نوجوان، یہ بات نہیں۔ دراصل ہری کرشن بہت بڑا آرٹسٹ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی ہونے والی بیوی انٹلکچول بھی ہو اور کنواری بھی۔ بدقسمتی یہ ہے کہ جو انٹلکچول ہوتی ہے وہ کنواری نہیں ہوتی اور جو کنواری ہوتی ہے وہ انٹلکچول نہیں ہوتی۔"

مجھے ساحر کا یہ لطیفہ پسند آیا اور میں دیر تک ہنستا رہا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ساحر عمر بھر کنوارا رہا اور ہری کرشن آرٹسٹ بھی آج تک کنوارا ہے۔ دونوں کے ستارے مشترک ہیں۔ ساحر اپنے فن شعر کی بدولت بہت بلندیوں پر پہنچا اور ہری کرشن فن مصوری میں بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ آرٹسٹ سر شام بادہ و جام میں کھو جاتا ہے اور ساحر آخری دم تک اپنی ان حسرتوں کو گیتوں اور شعروں کے پیکر عطا کرتا رہا ۔

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لئے
تو اب سے پہلے ستاروں میں بس رہی تھی کہیں

تجھے زمیں پہ بلایا گیا ہے میرے لئے
کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
سہاگ رات ہے گھونگھٹ اٹھا رہا ہوں میں
سمٹ رہی ہے تو شرما کے میری بانہوں میں
میں جانتا ہوں یہ تو غیر ہے مگر یوں ہی
کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے

ساحر سے ملے، اسے دیکھے ایک سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اس دوران امی انتقال کر گئیں۔ ساحر خود کو اکیلا محسوس کرنے لگا تھا۔ ساحر (اردو شاعری کا معتبر نام) ساحر (فلمی گیتوں کا شہنشاہ) ساحر (پرچھائیاں جیسی خوبصورت کتاب اور عظیم الشان بلڈنگ کا مالک) مگر ساحر اکیلا تھا۔ امی کے علاوہ مکیش، جاں نثار اختر، مہندر ناتھ، کرشن چندر رفتہ رفتہ سبھی رخصت ہو گئے۔ رام پرکاش اشک جو کہ ساحر کا دیرینہ دوست تھا اسے جب کینسر ہوا تو ساحر نے اسے اپنے خرچ پر امریکہ برائے علاج بھیجا لیکن وہ پھر بھی بچ نہ سکا۔ ساحر ان تمام جذباتی صدموں سے دوچار ہو کر ایک دن خود بھی ہسپتال پہنچ گیا۔

پھر ایک دن مجھے ساحر کا خط ملا جس میں اس نے اپنی صحت سے متعلق اطلاع دی تھی۔ وہ ہسپتال سے گھر آگیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے فقط لائٹ لٹریچر پڑھنے اور خط لکھنے کی اجازت دی تھی۔ خط پڑھتے پڑھتے مجھے بمبئی کی ایک شام یاد آگئی۔

میں، عجائب چترکار اور بینیٹ باوری ایک پنجابی رائٹرز کانفرنس کے بہانے بمبئی گئے۔ چترکار ساحر کا بہت پرانا دوست تھا۔ وہ ساحر سے ملنا چاہتا تھا لیکن اسے کانفرنس کی مصروفیات نے اتنی فرصت نہ دی کہ وہ ساحر سے مل سکے۔ ادھر بینیٹ باوری بھی ساحر کے حلقۂ احباب میں مدتوں رہا تھا۔ اسے ساحر سے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں ملنا تھا۔

کانفرنس کے اختتام پر ان دونوں کے ایما پر میں نے ساحر کو فون کیا۔ انور بہن بول رہی تھیں کہنے لگیں۔

بھائی جان، ساحر صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ لوگ شام ساڑھے سات بجے آجائیں میں گھر پر انتظار کروں گا۔

ہم لوگ قدرے دیر سے "چینائی لواس" پہنچے۔ ابھی باعث تاخیر بتانا ہی چاہتے تھے کہ ساحر نے سب کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "چھوڑو، فضول کی باتیں۔ اپنے اپنے گلاس اٹھاؤ۔ وہسکی پیو، گزرے زمانہ کی باتیں کرو کہ بہت سالوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔

جام اٹھائے گئے، ہر گھونٹ کے ساتھ پرانی ملاقاتوں کا اعادہ ہونے لگا۔ اسکاچ وہسکی نے ساحر کی گفتگو کو اور بھی دو آتشہ کر دیا۔ ساحر اس ملاقات پر اتنا خوش اور جذباتی تھا کہ اس کیفیت کو بیان کرنا مشکل ہے۔ ہم سب گئے گزرے زمانے کی باتیں کر رہے تھے اور ساحر ادیبوں، شاعروں، ایکٹروں، ایکٹریسوں سے متعلق دلچسپ باتیں سنا رہا تھا۔ باتوں باتوں میں پرکاش پنڈت کا ذکر آگیا۔ پرکاش پنڈت ساحر کا جگری، بے تکلف اور منہ پھٹ دوست ہے۔

ساحر کہنے لگا۔ کرشن تمہیں خبر ہے کہ میں پچھلے دنوں دہلی گیا ہوا تھا۔ پرکاش پنڈت سے ملنے اس کے گھر گیا تو پرکاش

کی بیوی کو بہت خفا خفا پایا۔ پوچھنے پر کہنے لگی :

"ساحر صاحب، آپ کے دوست پرکاش بھی عجیب آدمی ہیں۔"

"کیوں ایسی کون سی بات ہو گئی ؟"

جواب دیا۔" ساحر صاحب، ہمارا لڑکا جوان ہو گیا ہے۔ اس کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ میں نے پرکاش جی سے کہا کہ اس سے پہلے کوئی بات پکی کی جائے آپ ذرا خود لڑکی دیکھ آئیں۔ پھر پتہ کیا ہوا۔ گھر سے تو لڑکی کو دیکھنے چلے گئے لیکن جب واپس آئے تو انہیں اپنے آپ کا بھی ہوش نہیں۔ بیحد پی رکھی تھی۔ اب میں ان سے جھگڑا نہ کروں تو اور کیا کروں ؟"

پھر میں نے پرکاش پنڈت سے کہا۔ اے نوجوان یہ کیا معاملہ ہے آخر ایسا کیوں ہوا ؟"

پرکاش پنڈت جو گفتگو کرنے میں فطرتاً بے باک اور بے حد دلچسپ واقع ہوا ہے۔ ہنستے ہنستے کہنے لگا۔ چھوڑ یار ساحر تم بھی کونسا قصہ لے بیٹھے۔ میں واقعی لڑکی دیکھنے گیا تھا۔ کم بخت اتنی خوب صورت تھی کہ میں ہی کیا کوئی بھی شخص اسے دیکھ کر شراب خانہ جا سکتا تھا۔"

میں نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا۔" لیکن ساحر۔ میں پرکاش کی بیوی کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ خود بھی انتہائی خوبصورت عورت ہے۔ شاید پرکاش کو اس سے بہتر کوئی لڑکی نہ ملتی۔"

ساحر نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ٹھیک ہے کرشن ادیب، جب پرکاش پنڈت کی شادی کی بات طے ہوئی ہوگی تو پھر پرکاش کا باپ شراب خانے گیا ہوگا۔"

ہم بڑی دیر تک پیتے رہے اور ان باتوں پر ہنستے رہے اور آج بھی یہ باتیں یاد آتی ہیں۔ کل بھی آئیں گی۔ کیونکہ ان کا تعلق ساحر سے ہے۔ ساحر جو میرا بھائی بھی تھا اور دوست بھی۔ لیکن آج دنیائے ادب و فلم کا لاڈلا شاعر ساحر ہم سب کو الوداع کہہ کر سوگوار چھوڑ گیا ہے۔ ہر کوئی اس کے مرنے پر نوحہ کناں ہے۔

ساحر کی موت کے بعد پینٹر باندری ملا۔ بہت اداس تھا بے چارہ۔ کہنے لگا۔

"کرشن ادیب، پہلے جب ساحر لدھیانہ آتا تھا تو میں اس کے خیر مقدم میں کپڑے کے بینر تیار کرتا تھا اور لکھتا تھا۔۔۔ "ساحر لدھیانوی۔ خوش آمدید" لیکن آج کتنا بڑا المیہ ہے کہ مجھے ساحر کی موت پر لکھنا پڑا۔ "آہ ۔۔۔ ساحر لدھیانوی"

وہ دیر تک ساحر کی باتیں جذباتی لہجے میں کرتا رہا۔ پینٹر باندری جسے عمر بھر یہ خوش فہمی رہی کہ "ساحر اس کا قریبی دوست ہے۔ حالانکہ کئی بار وہ ساحر کے ہاتھوں خاصا ذلیل بھی ہوا تھا۔ بارہا وہ ساحر کو برا بھلا بھی کہا کرتا تھا۔ تاہم ساحر کی موت نے اس کے تمام اختلافات دور کر دیئے اور آج اسے احساس ہوتا ہے کہ موت نے اس سے اس کا نہایت جگری یار چھین لیا ہے۔ اب وہ کسے گالیاں دے گا اور کس سے گالیاں کھائے گا" خلیل جبران نے سچ ہی تو کہا ہے کہ محبت اپنی گہرائیوں سے اس وقت واقف ہوتی ہے جب اس میں جدائی آجاتی ہے۔"

ساحر سے جدا ہو کر پینٹر باندری کو فقط اس کا خلوص اور محبت آمیز سلوک یاد رہا۔ وہ بھول گیا کہ ممبئی سے اُسے

کس عالم میں لوٹنا پڑا تھا۔ آج باوری ساحر کو رگ جاں سے بھی زیادہ قریب محسوس کرتا ہے۔ اب بھی کبھی کبھی میں، عجائب جیز کالہ ہر شام ٹینیٹر باوری کے اسٹوڈیو میں بیٹھتے ہیں۔ وہسکی کے ہلکے ہلکے گھونٹ پیتے ہوئے ساحر کا ذکر آجاتا ہے اور پھر نادیر اس کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس کی اچھائیاں، برائیاں، کمزوریاں، خوبیاں زیر بحث آجاتی ہیں۔ پینے کے بعد ہم سبھی محسوس کرتے ہیں کہ اب کبھی بمبئی نہیں جا پائیں گے۔ ساحر کے بعد بمبئی شہر میں کوئی کشش نظر نہیں آتی

ایک ہم تینوں یاروں پر ہی موقوف نہیں، ساحر کی موت کی خبر سن کر تمام لدھیانہ شہر اداسی میں ڈوب گیا تھا ہندی، اردو، انگریزی اور پنجابی سبھی زبانوں میں اس سے متعلق تحریریں منظر عام پر آرہی تھیں۔ یہ یقیناً اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ساحر ہر کس وناکس کے دل میں جگہ بنائے ہوئے تھا۔ چونکہ ساحر میرا ذاتی دوست تھا اور یہ دوستی کا رشتہ پچھلے چھتیس برس پر مشتمل تھا جسے وہ ایک ہی جھٹکے میں توڑ کر چل دیا جس کا مجھے بے حد رنج ہے ایک مسلسل غم ہے جو کسی صورت کم نہیں ہوتا۔ ہر لمحہ دھیان ساحر کی طرف جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ حکومت ہند نے جب ساحر کو "پدم شری" کے خطاب سے نوازنے کا پروگرام بنایا۔ مجھے ساحر کا خط آیا کہ کلچرل فورم کی طرف سے چیمسفورڈ کلب میں مشاعرے اور کلچرل پروگرام کا بھی اہتمام کیا جارہا ہے۔ مشاعرے کی صدارت دلیپ کمار کریں گے۔ ان کے علاوہ میوزک ڈائرکٹر روی، مہندر کپور، مکیش اور مینو پرشوتم وغیرہ بھی آئیں گے۔ تم اپنے وعدے کے مطابق دہلی آجاؤ۔ میرے ہوٹل کا پتہ بنے بھائی (سجاد ظہیر) سے فون کر کے معلوم کر لینا۔

میں دہلی گیا۔ ساحر امپیریل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں سیدھا وہاں پہنچا۔ کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ساحر، جاں نثار اختر، امروز اور امرتا پریتم بیٹھے ہوئے ہیں۔ سب کے ہاتھوں میں وہسکی کے گلاس تھے۔ میں پہلے کبھی امرتا پریتم سے نہیں ملا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی رسمی تعارف کا مرحلہ پیش آئے میں نے بوتل سے وہسکی اپنے گلاس میں انڈیلتے ہوئے امرتا پریتم سے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔ میں جانتا ہوں آپ امرتا پریتم ہیں اور میرا نام کرشن ادیب ہے۔

ابھی میں نے دو ہی پیگ پئے تھے۔ امرتا کے ساتھ ذرا باتیں کرنے کے موڈ میں تھا کہ انہیں فون موصول ہوا۔ "امرتا جی آپ نانی بن گئی ہیں، ہسپتال آجائیے۔"

امرتا معذرت کر کے چلی گئیں۔ ہمارا وہسکی کا دور چلتا رہا۔ ساحر کہنے لگا۔ جاں نثار اختر یہ کرشن ادیب ہے جس نے مجھے لدھیانہ مشاعرے کی تصویریں بھیجی تھیں اور امرتا پریتم کی تصویر پر اس نے میرا ایک شعر بھی لکھا تھا۔

سرمگیں آنکھوں میں یوں حسرتیں لو دیتی ہیں
جیسے ویران مزاروں پہ دیئے جلتے ہیں

جانتے ہو جاں نثار اختر۔ یہ نظم میں نے امرتا کے لئے لکھی تھی۔ اس کے بعد ساحر پیتا گیا اور جذباتی ہوتا گیا۔

اس دوران اس نے اپنی ایک تازہ، نہایت خوبصورت غیر مطبوعہ غزل سنائی۔ اتنے میں امی آگئیں۔ کہنے لگیں:

"ساحر بیٹے، کھانا کھانے کہاں چلنا ہے؟"

"چلتے ہیں ماں جی۔ ابھی چلتے ہیں۔ کھانا موتی محل میں کھائیں گے۔ ماں جی یہ امرتیا تھیں جانتی ہو نا؟ یہ آپ کی بہو بھی بن سکتی تھیں۔"

"بیٹے، بہو بناؤ تو سہی کسی کو۔"

ساحر جذباتی موڈ میں کہنے لگا۔ چھوڑو ماں جی سب باتیں، چلو، اسلم سے کہو گاڑی اسٹارٹ کرے، کھانا کھانے چلتے ہیں۔ موتی محل میں۔ آج تیتر کھائیں گے۔

میں نے ساحر کو پہلی مرتبہ اس قدر شدت سے جذباتی ہوتے دیکھا تھا ظاہر ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ لیکن یہ پیار بھی شادی کا روپ اختیار نہیں کر سکا۔ کچھ مجبوریاں رہی ہوں گی۔ بہر حال امرتیا نے "سنہڑے" لکھی جو کہ ساحر کے لئے تھی اور ساحر نے بھی بے شمار خوبصورت نظمیں لکھیں جو کہ امرتیا کے لئے تھیں۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ساحر محبتوں کے نبھانے میں یقین نہیں رکھتا تھا اسے اپنی ناکامیوں سے عشق تھا۔ محبوبہ سے الگ ہو کر نظم کہنے کی خواہش دل میں رہتی تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ ساحر کو ابدی طور پر زندہ رکھنے والی اس کی نظمیں ہیں۔ دگرنہ محبت کرنے کے بعد شادی تو کوئی بھی کر سکتا ہے اور ہر شادی کا ردعمل بچے تو ہو سکتے ہیں خوبصورت نظمیں نہیں۔ ساحر کے بچے بچیاں اس کے نغمے اس کی نظمیں ہیں جنہیں تخلیق کرتے سمے وہ یقیناً دردِ زہ سے گزرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تخلیقات سے برصغیر کے عوام و خواص استفادہ کرتے ہیں۔

بہر حال آمدم بر سر مطلب، ساحر نے شادی نہیں کی۔ اس کی تمام خوشیوں کا مرکز فقط ماں کی محبت تھی۔ خود کہا کرتا تھا۔ میں تو شرون کمار ہوں۔ اپنی ماں کی بہنگی اٹھائے پھرتا ہوں۔

امی کی وفات کے بعد ساحر کی دیکھ بھال کی ساری ذمہ داری انور بہن پر آگئی۔ لیکن انور بھی اس خلا کو بھر نہ سکیں جو امی کے بعد پیدا ہو گیا تھا۔ ساحر لمحہ بہ لمحہ دوستوں سے، زندگی سے اور خود اپنے آپ سے دست کش ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ایک ایسا فاتح تھا جس نے تمام دنیا کے دلوں پر حکمرانی کی لیکن اپنے دل کے ہاتھوں مات کھا گیا۔

آج جبکہ اس کو ہم سے رخصت ہوئے تین سال ہونے کو ہیں۔ سب لوگ اسے رو پیٹ کر چپ سے ہو گئے ہیں۔ لیکن مجھے اپنا غم تازہ لگتا ہے۔ شاید یہ غم عمر بھر رہے کیونکہ میں نے خود کو ہمیشہ ساحر کا دوست کم اور چھوٹا بھائی زیادہ محسوس کیا تھا۔ آج جس وقت وہ دور، کا معنویت کے دشت میں کھو گیا ہے۔ میری بھیگی آنکھوں میں اس کے ہزاروں عکس رقص کرتے نظر آتے ہیں۔

لگے ہاتھوں ایک واقعہ اور سن لیجیے:۔

ایک مرتبہ سردار جعفری ساحر سے کہنے لگے۔ "ساحر، تم محض کالج کے لڑکے، لڑکیوں کے شاعر ہو۔ تمہاری مقبولیت بہت وقتی ہے۔"

ساحر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "سردار، کالج بھی ہمیشہ رہیں گے اور لڑکے لڑکیاں بھی، مجھے ہر دور میں پڑھا

جائے گا۔"

یہ بہت حد تک سچ بھی ہے کہ پچھلے پینتیس چالیس سال سے کالج کے لڑکے لڑکیوں کا مقبول شاعر فقط ساحر لدھیانوی ہے۔ آج بھی ساحر کا نام بکتا ہے۔ یہ لڑکے لڑکیاں مجھے خط لکھ کر ساحر کے فوٹو کا تقاضا کرتی ہیں۔

آج ساحر ہمارے درمیان نہیں ہے۔ اس کے مرنے کی خبر لاکھوں کروڑوں دلوں پر برق گرا کر چلی گئی ہے برصغیر ہند و پاک کے اردو، ہندی زبان جاننے والوں کے دلوں میں صف ماتم بچھ گئی ہے۔ ادھر ساحر کے خصوصی یار پرکاش پنڈت، صابر دت، چتر کار، پینٹر باؤری اور ہری کرشن آرٹسٹ۔ اُدھر پاکستان میں قتیل شفائی، حمید اختر، احمد ندیم قاسمی جو ساحر کے پرانے دوست تھے ان سب کے دکھ کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ان میں لاکھوں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے ساحر کی شاعری کا محض مطالعہ کیا تھا۔ اور اسے وحی کا درجہ دیا تھا۔ وہ ساحر کو اک نظر دیکھنا زندگی کا حاصل سمجھتے تھے۔

ساحر کی عظمت کی دلیل یہ بھی ہے کہ اس کی موت کی خبر سنتے ہی "دوردرشن" جالندھر اسٹیشن نے فوراً ایک طویل مختصر دستاویزی فلم تیار کی۔ جس میں ساحر کا مکان، اسکول اور وہ کالج جہاں سے وہ نکالا ہوا تھا کی شوٹنگ کی۔ پس منظر میں ساحر کی نظم تیری آواز اور پرچھائیاں پڑھی گئیں۔ فلم پیاسا کے شاٹ دکھلائے گئے۔ اور ساحر کے ذاتی دوستوں کے تاثرات ریکارڈ کئے گئے۔

منوہن سنگھ نے ریکارڈنگ کراتے وقت کہا۔ میں ساحر صاحب کو ذاتی طور پر کم جانتا ہوں۔ میرے تاثرات محض لدھیانہ کے ایک شہری کے ہیں۔ ساحر کے مرنے کی خبر سن کر تمام شہریوں کا کیا ردعمل تھا یہ بتانا مشکل محسوس ہوتا ہے۔ ہر شخص اداسی میں ڈوبا ہوا تھا۔

لدھیانہ شہر کی شہرت کا مدار دو ناموں پر ہے۔ پہلا ہوزری کی صنعت اور دوسرا نام ساحر لدھیانوی۔ ساحر لدھیانوی اسی دھرتی کا پیارا بیٹا تھا۔ جس کے نام پر اہل لدھیانہ فخر کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ آج وہ شہر کا لاڈلا بیٹا ہماری آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گیا ہے۔

میں نے ساحر کو بطور شاعر پڑھا بھی ہے، مشاعروں میں سنا بھی ہے اور دیکھا بھی ہے لیکن اس وقت میں ساحر کی شاعری سے ہٹ کر اس کی انسان دوستی کے ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔ جس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے۔

انسان دوست

ہمارے شہر لدھیانہ میں ایک ملنگ ہوا کرتا تھا۔ نام تھا جگا۔ پیشہ بھیک مانگنا اور وہ بھی زبردستی۔ اکثر چلتی ٹرکوں کو روک لیتا اور اپنی مرضی کے مطابق اور ضرورت کے تحت ان سے پیسے وصول کرتا اور وہ لوگ بھی ہنسی خوشی چھوٹی موٹی رقم ادا کر دیتے۔ لوگ اسے کوئی پہنچا ہوا فقیر سمجھتے تھے۔ لیکن اس میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ محض ایک بھک منگا تھا جو بڑے ٹھسے سے بھیک وصول کرتا تھا۔ وہ شہر کے بڑے بڑے لوگوں کو جانتا تھا جن سے وہ راہ چلتے روپیہ دو روپیہ حاصل کر لیتا تھا۔ اس کی آنکھیں اچھی بھلی تھیں لیکن وہ ٹرین میں مفت سفر کرنے کی خاطر ایک اندھے کا روپ دھارن کر لیتا تھا۔

ساحر لدھیانوی کو وہ ذاتی طور پر جانتا تھا۔ کبھی کبھی موڈ آنے پر وہ بمبئی ساحر سے ملنے چلا جاتا تھا۔ میلے کچیلے کپڑے جسم پر میل، باتیں عامیانہ، لیکن ساحر ہمیشہ اس سے بہت پیار سے ملتا۔

ایک مرتبہ ساحر لدھیانہ تشریف لائے۔ چوک گھنٹہ گھر کے پاس جاتے ہوئے انہوں نے ایک شارٹ ہینڈ ٹائپ سکھانے والے اسکول کے باہر جگا کی بہت بڑی پینٹنگ دیکھی جس میں جگا کو ٹائپ کرتے دکھایا گیا تھا۔ وہ تصویر آج بھی اس اسکول کے باہر رکھی ہے۔ شاید اس لئے کہ مالک اسکول اس کو اپنی کامیابی کا شبھ شگون سمجھتا ہوگا۔ خیر جگا کی تصویر دیکھ کر ساحر صاحب وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔ پوچھا۔ "جگا آج کل کہاں ہے؟"

"صاحب، جگا مر گیا۔"

جگا مر گیا۔ اُف۔ کب۔ کیسے مر گیا؟ ساحر کے لئے جگا کی موت کا صدمہ ایک عزیز دوست کی موت کا صدمہ تھا۔ جگا جو کہ قطعاً ان پڑھ تھا۔ گداگر تھا۔ بھک منگوں کی زندگی گزارتا تھا۔ لیکن جگا جو کہ ساحر کو ذاتی طور پہ ملنے کے لئے بمبئی کا طویل سفر کیا کرتا تھا۔ وہ جگا مر گیا۔ ساحر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس جگا کے لئے جس نے پرچھائیاں، تلخیاں، گاتا جائے بنجارہ، کچھ بھی نہیں پڑھا تھا۔ وہ محض ساحر کے سلوکِ محبت کو پڑھتا تھا۔

اس کے بعد پینٹر باوری، عجائب چترکار اور میں نے اپنی اپنی یادیں ریکارڈ کرائیں۔

ریکارڈنگ اور شوٹنگ کے بعد ہم سب لوگ اسٹوڈیو سے باہر نکلے سبھی خاموش تھے۔ سب کے سینوں میں اُداسی نوحہ کناں تھی۔ قریب ہی وہسکی کی دوکان تھی۔ میرے اصرار پر وہسکی کا پروگرام طے ہوا۔ لہٰذا وہسکی پیتے پیتے ساحر کی یاد تازہ کرتے رہے۔

چترکار کہنے لگا۔ ادیب تم بھی اپنی اور اپنے گھر کی تصویریں بنالو۔ کیونکہ تمہارے مرنے کے بعد بھی ایسی ہی دستاویزی فلم بنے گی اور تصویریں ٹی۔ وی پر دکھائی جائیں گی۔"

میں نے جواب دیا۔ چترکار میری تصویریں تو نہیں البتہ ایکسرے ضرور ــــــ ٹیلی کاسٹ ہو سکتے ہیں۔ جو کہ پنجاب کے مختلف ہسپتالوں میں موجود ہیں۔ ــــــــ پھر میں نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے کہا۔

"عجائب چترکار۔ اگر مجھے واقعی اس کا یقین ہو جائے کہ میرے مرنے کے بعد مجھے اتنا بڑا اعزاز ملے گا یا میرے مرنے پر لاکھوں دلوں میں سوگ کی لہر دوڑ جائے گی۔ تو خدا گواہ ہے میں ابھی اسی وقت مرنے کے لئے تیار ہوں۔" "پیارے ہم تو مرنے کے بعد محض اخباروں کی ــــ کالمی سرخی ہوں گے اور دوسرے دن اک حرفِ فراموش ہو جائیں گے۔

ایک رات چترکار اور میں گھر آئے۔ رات کے ۱۱½ بجے ہوں گے۔ بیوی بچے سو رہے تھے۔ دروازہ کھلوایا۔ میرے گھر کی کھانے کی میز کے پاس ایک اور چھوٹی سی میز پر میری ننھی بچی رخشی نے اپنے تمام کھلونے، گڑیاں، پھول پتے اور نہ جانے کیا کیا سجا رکھا تھا اور خود بڑے آرام سے سو رہی تھی۔ میں نے چترکار سے کہا۔ "چترکار، ساحر کبھی نہ مرتا۔"

کہنے لگا۔ "وہ کیسے؟"

"ساحر کو دنیا بھر کی نعمتیں ملی تھیں۔ دولت، شہرت، عزت اس کی کنیزیں تھیں۔ پرچھائیاں جیسی عظیم الشان بلڈنگ

کا مالک تھا۔ تلخیاں، گاتا جائے بنجارہ۔ "آؤ کہ کوئی خواب بنیں" کا مصنف تھا۔ ایک گانا لکھنے کا معاوضہ دس ہزار روپے لیتا تھا۔ لیکن اسے زندگی میں کھلونوں سے سجی یہ چھوٹی سی میز اور ایسی ننھی سی بچی نہیں ملی تھی۔ ساحر کی حالت گوہر جان کلکتہ والی کی تھی۔ جس سے متعلق اکبر الہ آبادی نے کہا تھا ؎

کوئی خوش حال نہیں دہر میں گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

ایسے لگتا ہے چترکار، اپنے آخری دنوں میں اُسے زندگی لایعنی محسوس ہونے لگ گئی تھی۔ ورنہ ساحر کو جینا تھا، بہت جینا تھا۔ خیر یار چھوڑو۔ گلاس اٹھاؤ۔ پیو اور اپنے یار کی باتیں کرو۔"

ہم دونوں اپنے اپنے دکھ کا احساس لئے دیر تک پیتے رہے۔ عجائب چترکار کہنے لگا
"ادیب۔ ساحر کی شاعری زندگی کا بھرپور پیغام دیتی ہے۔"

ٹھیک ہے چترکار۔ اس کی شاعری یقیناً پیغام حیات دیتی ہے۔ لیکن تم ساحر سے سالہا سال دور رہے ہو۔ تم اس کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ نہیں کر سکتے۔ ساحر خود بھی زندگی سے محبت کرتا تھا۔ لیکن اندر اندر وہ ہر لمحہ موت سے خوفزدہ رہتا تھا۔ ساحر زندہ رہنے کا فن نہیں جانتا تھا۔"

زندہ رہنے کے لئے چینی فلاسفر لن۔ یو۔ تانگ کی بات بھلی معلوم ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "آدمی کی طبعی عمر سو سال ہے لیکن وہ پہلے بھی مر جاتا ہے لہذا زندگی میں ہر خوبصورت لمحے کا رس نچوڑ کر پی جانا چاہئے۔ اور جب موت آئے تو اس کا مسکراتے ہوئے خیر مقدم کرنا چاہئے۔ کیونکہ موت ایک صداقت ہے جسے لازماً آنا ہے۔"

بس یہی زندگی کا راز ہے جس سے ساحر آگاہ نہ تھا۔ ورنہ اس نے کیا کچھ نہیں پڑھا تھا۔ ٹالسٹائی، گورکی، مارکس، ہیگل اینجل اس کے محبوب مصنفین تھے۔ پبلو نرودا۔ مائیکووسکی کو تو اس نے اردو زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ لیکن یہ زندہ جاوید مصنفین بھی اسے زندہ رہنے کا فن نہیں سکھا سکے۔

حمید اختر نے ساحر کی موت کے بعد مجھے لکھا "کرشن ادیب ۔ یار، ہمارا دوست مر گیا اور ہم گلے مل کر رو بھی نہیں سکے۔ اس کے مرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ کتنا بڑا شاعر تھا اور لوگ اسے کتنا چاہتے تھے۔ پاکستان کی نئی نسل تو اس کی دیوانی ہے۔ اگر اس کو ذرا سا بھی اندازہ ہوتا تو شاید وہ بھی مرنے سے انکار کر دیتا۔ یہاں کے لوگوں نے آٹھ دس دن میں ہی "کلیات ساحر" کے نام سے اس کی نظمیں، گیت غلط سلط چھاپ کر ہزاروں روپے کمائے۔ بے شمار مضامین لکھے گئے اور بہت سے لوگ بہت روئے۔"

رسائل کے "ساحر نمبر" بہت نکل رہے ہیں۔ بہت نکلیں گے۔ ساحر کی یاد میں ہر سال مشاعرے بھی ہوں گے۔ لوگ ساحر کو کبھی نہیں بھولیں گے۔ شاعر، ادیب خراج محبت ادا کرتے رہیں گے۔ کیونکہ ساحر ان میں سے ایک تھا۔ لیکن ساحر کے لئے ایک ناقابل فراموش خراج عقیدت ہماری ایگریکلچرل یونیورسٹی کے سائنسداں ڈاکٹر راجے پال سہگل (جو پھولوں پر اتھارٹی ہیں) نے پیش کیا۔ جو تاریخ گلستاں میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

انہوں نے ساحر کے مرنے کے بعد گلِ داؤدی" کی دو قسموں کو ملا کر ایک اور نیا پھول پیدا کیا جس کا رنگ نہایت چمکدار گہرا زرد ہے۔ مزید خوبی یہ ہے کہ شہد کی مکھیاں سب پھولوں کو چھوڑ کر اسی نئے پھول پر اکٹھی ہو کر اپنے لئے رس حاصل کرتی ہیں۔ ڈاکٹر گل نے مرگلِ داؤدی کے نام کی مناسبت کے ساتھ اس پھول کا نام "گلِ ساحر" رکھا ہے۔ حضرت داؤد فن موسیقی کے پیغمبر تھے اور ساحر گیتوں کا بادشاہ تھا۔ گل داؤدی کی طرح "گلِ ساحر" وہ پھول ہوگا جس کی خوشبو گلشن گلشن پھیلے گی۔

یہ ہیں ساحر کی مقبول اور مقناطیسی شخصیت کی کچھ جھلکیاں۔ جنہیں لکھتے لکھتے میرے ہاتھ بھی تھک گئے ہیں۔

اب میں آخر میں ایک واقعہ اور سنانا چاہوں گا۔ کچھ سال پہلے کی بات ہے۔ ساحر بمبئی سے پٹھانکوٹ ایک مشاعرے میں گیا۔ واپسی پر لدھیانہ آگیا۔ وہ ہمارے مشترک دوست بلجیت سجّاد کا مہمان تھا۔ میں نزدیک ہی ایگریکلچرل یونیورسٹی میں مقیم تھا۔ ایک صاحب دوپہر کو آئے۔ کہنے لگے۔ "ادیب صاحب، ساحر صاحب آئے ہیں"۔

"ضرور آئے ہوں گے۔ میں انہیں یہاں آنے سے منع تو نہیں کر سکتا۔ ان کا شہر ہے۔ جب چاہے آئیں اور جب چاہے چلے جائیں۔"

"لیکن انہوں نے آپ کو یاد فرمایا ہے"۔

"یقیناً فرمایا ہوگا۔ لیکن اُن سے کہئے کہ میں نہیں آسکتا۔ یہ بمبئی نہیں، لدھیانہ ہے۔ انہیں خود میرے گھر مجھ سے ملنے آنا چاہئے تھا۔ اگر وہ میرے پاس آتے، میں بہ خلوص تمام ان کا خیر مقدم کرتا۔ لیکن اب مجھے ساحر سے ملنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں بمبئی جاؤں تب بھی ان کا مہمان بنوں۔ وہ یہاں آئیں تب بھی حیثیت ساحر صاحب کے مہمان کی بنے۔ مجھے یہ بات قطعاً پسند نہیں ان سے کہئے میں نہیں آسکتا۔" خیر میں ساحر صاحب سے کہہ دوں گا کہ ادیب صاحب گھر پر نہیں تھے (وہ صاحب یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی شخص ایسے بھی کہہ سکتا ہے)

"حضور، آپ ساحر صاحب سے وہی کہئے جو میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ ساحر سے میرے تعلقات قطعاً رسمی نہیں ہیں وہ میرے دوست بھی ہیں، بھائی بھی ہیں۔ لیکن آج ان سے مجھے بے پناہ شکایت ہے۔ آپ بلاتکلف ساحر صاحب سے وہی کہئے جو میں نے آپ سے کہا ہے۔"

بہر حال وہ صاحب چلے گئے اور میں ساحر سے ملنے نہیں گیا۔ دوسرے دن صبح ساحر، امی، انور، صابر دت کے ہمراہ میرے ہاں تشریف لائے۔ ساحر نے بہ خلوص تمام معذرت کا اظہار کیا۔ اور اپنے نہ آنے کی وجہ بتائی۔ وعدہ کیا کہ آئندہ میں جب بھی آؤں گا۔ سیدھا تمہارے گھر آؤں گا۔ پھر نوجوان، تم جی بھر کے مجھ پر خرچ کرنا"۔

اس کے بعد ساحر چلا گیا۔ پھر وہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ اس کے وعدوں کے پھول شاخِ دل سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرے اور مرجھا گئے۔ میرا مختصر سا گھر آج بھی اس کا منتظر ہے۔

وہ ہم سے جدا ہو کر بھی جدا نہیں ہو پایا۔ اُس کی شخصیت، اس کی باتیں، ایک ایسا طلسم ہے جسے توڑنے کیلئے ہمارے پاس کوئی اسم نہیں ہے۔

صحبتِ ساحر سے روشن زندگی کے تھے چراغ
اب تو سارے راستے ہیں یاس کے ظلمت کدے

نثار نیپالی

اور اس نے بہت پہلے یہ نظم کہہ کر اپنے کوچ کی طرف اشارہ کردیا تھا۔

میں پل دو پل کا شاعر ہوں، پل دو پل میری کہانی ہے
پل دو پل میری ہستی ہے، پل دو پل میری جوانی ہے
مجھ سے پہلے کتنے شاعر آئے اور آکر چلے گئے
کچھ آہیں بھر کر لوٹ گئے، کچھ نغمے گا کر چلے گئے
وہ بھی اک پل کا قصہ تھے، میں بھی اک پل کا قصہ ہوں
کل تم سے جدا ہو جاؤں گا، گو آج تمہارا حصہ ہوں
پل دو پل میں کچھ کہہ پایا، اتنی ہی سعادت کافی ہے
پل دو پل تم نے مجھ کو سنا، اتنی ہی عنایت کافی ہے
کل اور آئیں گے، نغموں کی کھلتی کلیاں، چننے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے، تم سے بہتر سننے والے
ہر نسل ہے اک فصل اس دھرتی کی، آج اگتی ہے کل کٹتی ہے
جیون وہ مہنگی مدرا ہے جو قطرہ قطرہ بٹتی ہے
ساگر سے ابھری لہروں میں، ساگر میں پھر کھو جاؤں گا
مٹی کی روح کا سپنا ہوں، مٹی میں پھر سو جاؤں گا
کل کوئی مجھ کو یاد کرے، کیوں کوئی مجھ کو یاد کرے
مصروف زمانہ میرے لئے کیوں وقت اپنا برباد کرے
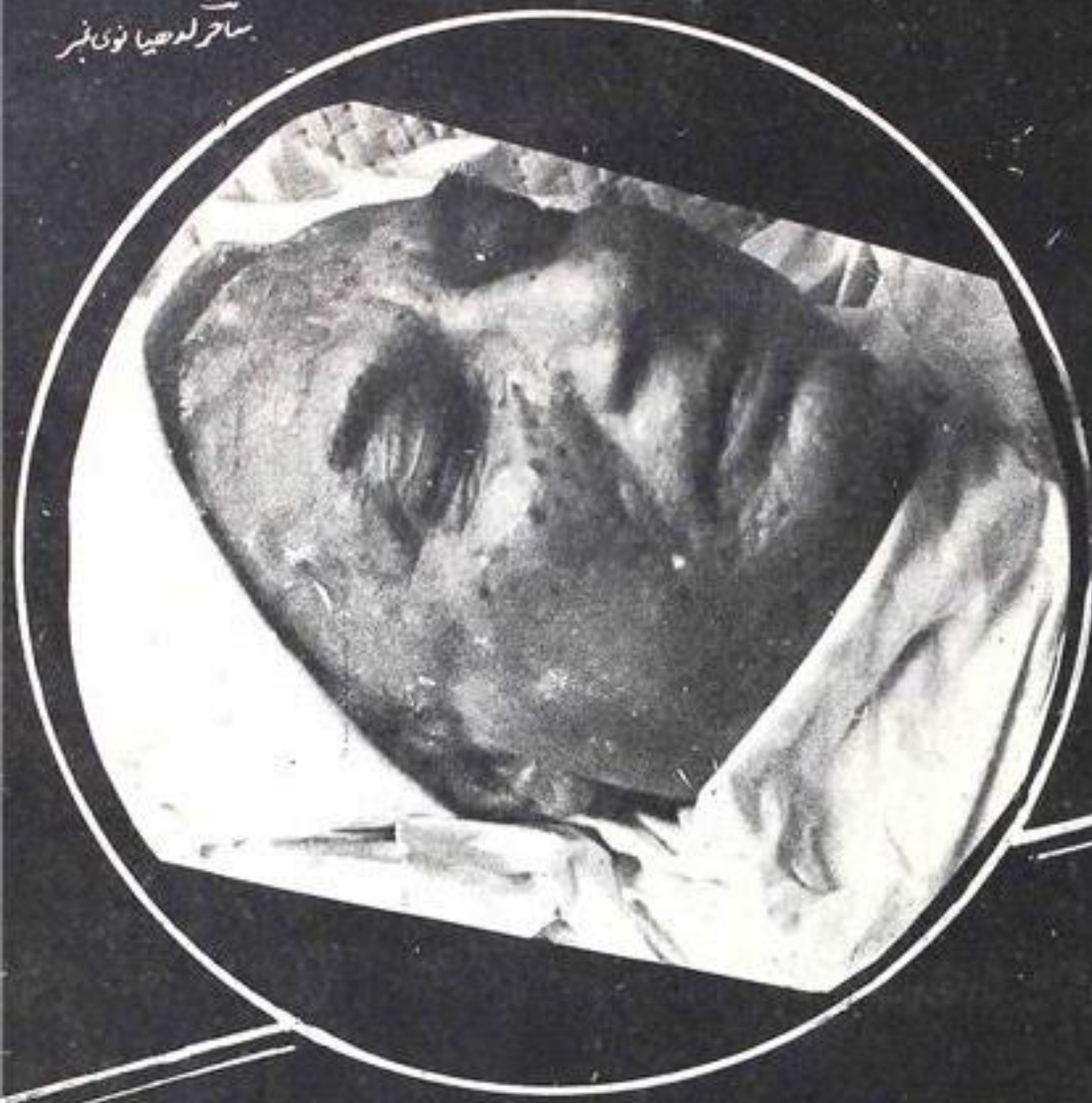
الوداع ساحر

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

آمد:- ۸/ مارچ سنہ ۱۹۲۱ء لدھیانہ (پنجاب)
رخصت:- ۲۵/ اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ء بمبئی

"ساحر کو مرنے کا کوئی حق نہیں تھا" کیفی اعظمی

اسماعیل یوسف کالج میں یادِ ساحر

श्रद्धांजलि !

कभी-कभी ईश्वर से शिकायत करने को दिल चाहता है, कि ऐ खुदा, यह दुनिया तो तूने बनायी नेकी के लिए, बुलंदी के लिए—फिर नेकी और बुलंदी की राह पर चलते इंसानों के लिए मौत का सरंजाम तूने क्यों कर दिया—कौन-सा कसूर था उन बेचारों का—जो अपनी मेहनत से तुम्हारे गुलिस्तां को रंग दे रहे थे! ऐसी ही टीस उठी पिछले दिनों, जब अदब की हस्तियों—साहिर लुधियानवी और हंसकुमार —को रुंधे कंठ से अलविदा कहना पड़ा.

Life and Death

Dedicated to Sahir

Sooner or later, finalising terms
With death, life cancels forms along with names.
We are invitees to a feast of worms,
Guests at the final festival of flames.

*

The eyes once sealed, shut out to outer sights
Gazing even beyond the Great Within,
Behold a mystic Festival of Lights
Which, at each end of life, must needs begin.

*

Sahir laid to rest

By A Staff Reporter

'शब्दों का जादूगर

आदमी सब अच्छे हैं
वक्त बुरा होता है

Sahir Ludhianvi is dead

SAHIR Ludhianvi, the well-known poet and film lyricist, died in Bombay on October 25 after collapsing after a massive heart

People in the industry were shocked to hear the news and a large number of people, friends and well-wishers paid their respects before his mortal remains were taken to the Muslim cemetery at Santa Cruz, Bombay. Mourners at the cemetery headed by the Sheriff of Bombay, Mr. Dilip Kumar, and a very large number of writers, lyricists (old and young), music directors, film-makers and friends. Conspicuous by their absence were the stars — Dilip Kumar, Chandrashekhar, Walker, and Murad were the only ones present. There was an incident at the cemetery when writers both of began a heated discussion on Urdu literature in the middle of the solemn funeral.

WON MANY

Sahir was a well-known poet even before he joined films. "Talkhiyan" and "Parchhaiyan", two collections of his poems. Some of his poems have been translated in a number of languages (including English). He was a founder member of the Progressive Writers won a number

Sahir Ludhianvi

attack. He was fifty-nine years old and a bachelor.

Sahir was "in the best of health" just two days before his death, according to B. R. Chopra, one of his oldest friends in films for whom he wrote songs for all his films. Chopra had recorded a song with him. It was discussed further on Monday (October 27). Sahir later went to his old residence in where he spent time with

THE INQUILAB

انقلاب

۲۸ / اکتوبر ۱۹۸۰ء

فکر امروز

ساحر کو آخری سلام

اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعر جناب ساحر لدھیانوی ۲۵ / اکتوبر کو اس دنیا سے چل بسے

اللہ کو پیارے

ناقابلِ تلافی نقصان

फिल्मी

साहिर

का निधन

साहिर लुधियानवी

चल बसे'

جمعہ مورخہ ۳۱ / اکتوبر ۱۹۸۰ء

ساحر لدھیانوی، ابراہیم جلیس
قمر جلالوی اور رئیس احمد جعفری

ساحر کا آخری سفر

سوئے مرقد
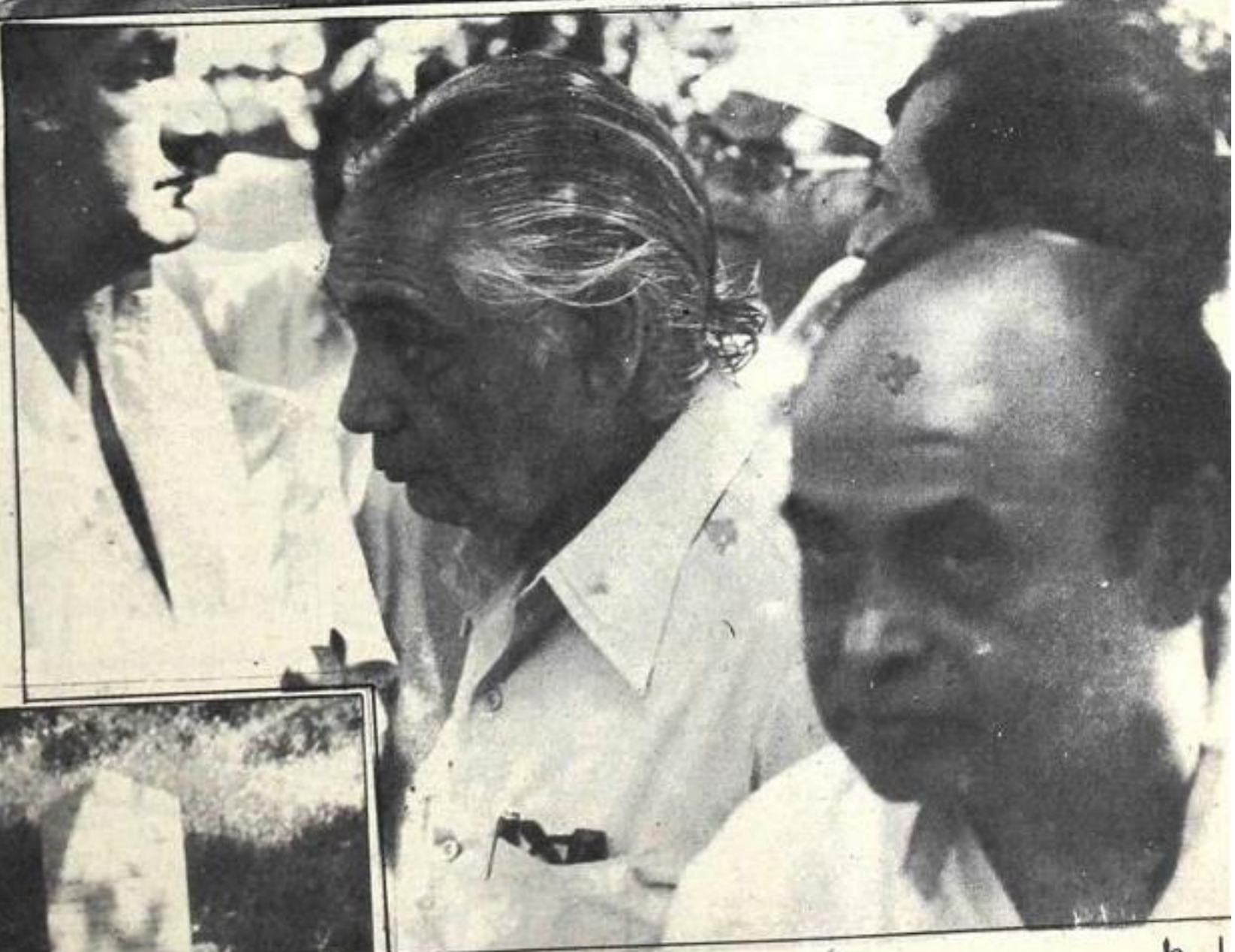
مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

سی ایل۔ کاوش اور رامانند ساگر

No. 529/PS/G/80

RAJ BHAVAN
BOMBAY 400 035

27 October 1980

Dear Anwar Sahiba,

I am deeply distressed to learn that the poet Sahir Ludhianavi has passed away. His death is a national loss. It is a great tragedy for the film world. Urdu literature also loses one of its creative writers. It is a great pity that he should have fallen a victim of heart trouble when he was still vigorous in mind and spirit. May I convey to you and other members of the family our deep sympathy and condolences in your grievous bereavement.

Yours sincerely,

Sadiq Ali
(Sadiq Ali)

Miss Anwar,
Parchaiyan, Royal Turner Lane,
Juhu, Bombay 400 054.

AMBASSADOR OF INDIA
USSR

MOSCOW

November 4, 1980.

My dear Shri Dutt Ji,

I have been shocked to learn about Sahir Ludhiyanvi's sad demise. I knew that he was not keeping good health but never did I think he will leave us all at such an early age. Of course, world of literature has lost a great doyen and I have lost an age-old friend. I do not know where Sahir's sister is but if you could kindly convey my condolences to her, I will be grateful.

I hope by now you have received my letter of 13th October. In the meantime, I have heard back from Shri Vasant Sathe, Minister of Information & Broadcasting that your request for advertisement is receiving his attention.

With kind regards and good wishes,

Yours sincerely,

(I.K. Gujral)

Shri Sabir Dutt,
Editor,
'Fann Aur Shakhsiyat',
Post Box No. 1397,
BOMBAY-400001

I HAVE ONLY JUST LEARNED OF THE SORRYFUL PASSING AWAY OF OUR E
SAHIR SAHEB BECAUSE ENOULFED AS I WAS IN MY OWN ORDEAL I HOPE YOU
SHALL FORGIVE FOR GIVE MY DELAYED EXPRESSION OF SORROW WHICH IS
INDEED DEEP AND PAINFUL = SUNIL DUTT =

Qateel Shifai
GHALIB COLONY
SAMANABAD
LAHORE - (Pakistan)
Phone: 412888

انور بہن۔

سلام مسنون

ساحر کی جدائی کا جو دکھ تمہیں ہو سکتا ہے
وہ دوسرے کسی کو کیا ہو گا لیکن دور دور تک
پھیلے ہوئے ساحر کے دوست بھی اس دکھ
میں برابر کے شریک ہیں۔
[illegible]

قتیل شفائی

Received on 13/12/80

8+187 LT QN45 A BDR Q661 TF FORESTHILLS NY JAN 31 OCS RA BY VPL

This form must accompany any enquiry respecting this telegram.

X 1615 42 SRINAGAR KCR 28 34

=== SHOCKED BY THE SAD NEWS STOP MAY GOD GRANT YOU STRENGTH TO BEAR THIS TRADDY OUR THOUGHTS ARE WITH YOU == MR AND MRS YASH CHOPRA

== LN 425 42 ANWAR PATCHAIN TRADDY RPT TRADDY AS ERE

ساحر کے لئے

آل انڈیا ریڈیو نے ساحر کے بچھڑ جانے کی خبر دی تو آنکھ بھر آئی ۔ پچھلے دسمبر میں اس سے ملاقات کے لئے ہی بمبئی گیا تھا جن میں ایک ساحر بھی تھا۔ چونکہ ساحر میرے عزیز ترین دوستوں میں سے تھا۔ اس لئے اس کی زندگی کا ہر گوشہ میری نظر میں ہے ۔ اس کی زندگی بظاہر ایک فاتح کی زندگی تھی لیکن وہ اندر سے ٹوٹا پھوٹا انسان تھا۔ پھر بھی انسان دوستی اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں پر وہ ہمیشہ فریفتہ رہا۔ اس کی شاعری عوام کے لئے تھی جو اس کے فن سے پیار کرتے تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی عوامی پیار نے اس کی تنہا زندگی کو پُر بہار بنائے رکھا۔ اس کی موت ہم سب کے لئے کبھی نہ بھولنے والا صدمہ ہے ۔

قتیلؔ شفائی

یہ اُس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

وہ ایک بیمارِ غم جو زندگی بھر کم سے کم سویا
نہ وہ جی بھر کے خود سویا نہ کوئی اس کا غم سویا
جو سویا بھی تو گویا دو گھڑی لینے کو دم سویا
مگر اب کے وہ اپنے درد کی کھا کر قسم سویا
کبھی پہلے نہیں تھی بے قراری جو اسے اب تھی
یہ اس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

جو باقی مے تھی اس کی زندگی کے آبگینے میں
وہ مے اس نے ملا دی موت کے ٹھنڈے پسینے میں
پھر اس کے بعد جا بیٹھا وہ ایک ٹوٹے سفینے میں
اترنا تھا اسے دریا کے ناہموار سینے میں
وہ دریا چند برسوں سے روانی جس کی بے ڈھب تھی
یہ اس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

اُسے معلوم تھا اس کا لہو ہے سرد ہونے کو
کھلا تھا اس کا چہرہ آج کی شب زرد ہونے کو
دوا تھی منتظر اس کی سراپا درد ہونے کو
نہ وہ خاطر میں لایا حسرتوں کے گرد ہونے کو
بھلا حسرت کوئی اس ناتواں پر مہرباں کب تھی
یہ اس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

غزالاں خوب واقف ہیں کہ ماتم ہو رہا ہو گا
دِوانہ مر گیا ، ویرانہ اس کو رو رہا ہو گا
وہ خود ہی جانتا تھا جو بھی غم اُس کو رہا ہو گا
مگر اب چین سے اپنی لحد میں سو رہا ہو گا
سنا ہے جب وہ سویا مسکراہٹ زینت لب تھی
یہ اس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

نذرِ ساحر

یزدانی جالندھری

کچھ اعتبار نہیں کارگاہِ ہستی کا — کہ موت ٹھہری ہے انجامِ عالمِ فانی
ہوا جہاں سے یوں ساحر بھی رخصت — دلوں میں کرتی تھی گھر جس کی زمزمہ خوانی
نہ ہوگی اب کبھی روشن وہ شمعِ موسیقی — پتنگے غم میں کریں لاکھ اشک افشانی
بنی ہے "سوز" اسی غم میں آج شہنائی — "وہ آئی نغموں کے انداز میں عزا خوانی"
میں غرقِ فکر تھا تاریخ سالِ رحلت میں — اس ایک نکتے پہ تھی مرتکز پریشانی

ندائے ہاتفِ غیبی یہ ناگہاں آئی
"غمِ ساحر" ہے وفاتِ یزدانی

○

نسیم افضل

محنت کشوں کے دل کی دھڑکنوں کا وہ مکیں — مزدور کا وہ ساتھی وفادار چل بسا
اس جیسا دوسرا کوئی آئے گا اب کہاں — وہ خوش خصال صاحبِ کردار چل بسا
ظالم پہ اور ظلم پہ کرتا رہا جو وار — مظلوم کا رفیق و مددگار چل بسا
بوئے محبتوں کے ہمیشہ ہی جس نے بیج — وہ باوفا، خلیق، ملنسار چل بسا
"تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم" — کہتا تھا ایسے ایسے جو اشعار چل بسا
"لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید" — لکھا تھا گاہے جس نے یہ اک بار چل بسا
وہ جس کا "ساتھی ہاتھ بڑھانا" پیام تھا — ہم سے چھڑا کے ہاتھ وہ غم خوار چل بسا
"بنگال" اور "تاج محل" اور "کبھی کبھی" — جس کی ہیں اور نظمیں بھی شاہکار چل بسا
دامن میں اپنے بھر کے زمانے کی 'تلخیاں' — 'پرچھائیاں' کا خالقِ خوددار چل بسا
تا حشر گاتا جائے گا 'بنجارا' جس کے گیت — وہ گیت کار اونچا قلم کار چل بسا

اوروں کا دکھ بھی جس کا تھا اپنا ہی دکھ نسیم
وہ زندگی کا سچا پرستار چل بسا

ساحر لدھیانوی کے نام!

رعنا سحری

جب بھی کوئی غریب کی بیٹی
زر پرستوں میں بیچی جائے گی
جب بھی مفلس کسان کی کھیتی
قرض کے بدلے چھینی جائے گی

جب بھی دو پیار کرنے والوں کو
رسم دنیا نہ راس آئے گی
جب بھی الفت کے بے قراروں کو
شامِ تنہائی بخشی جائے گی

جب بھی اُبھرے گا انقلاب کوئی
جب بھی جاگیں گے ظلم کے مارے
جب بھی اُٹھے گا بے کسوں کا ہجوم
اور بدلے گا وقت کا دھارا

سُرخ پرچم اٹھائے ہاتھوں میں
تم کو اپنے قریب پائیں گے
سب تمہارے ہی گیت گائیں گے

☆

ساحر لدھیانوی

عبدالعزیز خالد۔ لاہور

ہو گیا چُپ مغنّیِ خوباں — وہ مرقع نگارِ سحرِ بیاں
خامہ جس کا حریفِ تیغِ اصیل — شعر جس کا مثالِ آبِ رواں
رنگ و آہنگ جس کا سب سے الگ — ہے جدا سب سے جس کی طرزِ فغاں
جس کی آواز ہے عجب پُر سوز — جیسے اٹھتا ہو گلستاں سے دھواں
جیسے صیدِ بخوں تپیدہ کوئی — جیسے مرغِ اسیر نغمہ چکاں
رس بھی لہجے میں ہے کسک بھی ہے — ہوس و شوق حسرت و حرماں
لے میں للکار بھی پکار بھی ہے — شدّتِ یاس حدّت و ارماں
گیت بنجارے کے ادھورے رہے — دے کسی کو اماں نہ دورِ زماں
ابدی نیند سو گیا ساحر — زندگی جس کی تھی فسوں ساماں
جس کا ہر بزم ناز میں چرچا — جس کا مسحور و کشتہ ایک جہاں

طعنہ تر دامنی کا دو نہ اُسے — تھا اک انساں وہ اول و آخر
نفرت و جبر و جور کا دشمن — بر خلافِ ہر آمر و قاہر
جس کی 'پرچھائیاں' کے جادو کا — کلمہ پڑھتا ہے ہر بُتِ کافر
لذّت آگیں ہیں 'تلخیاں' جس کی — باطن اندوہ، سرخوشی ظاہر
ذہن کے لف و نشر کا نبّاض — ہے جو دل کی زبان کا ماہر
جس کو آتا ہے فنِ تکلّم کا — وہ عوام و خواص کا شاعر
گیت ہو قطعہ ہو کہ نظم و غزل — جو کسی صنف میں نہیں قاصر
ہے جو صاحب قرانِ فلم و ادب — وصل لفظ و خیال پر قادر
اثر اس کا مشاہَد و محسوس — کون اس کے کمال کا منکر

یونہی لفظوں کا انتخاب کریں
ہنس اپنی غذا کو جیسے چنیں
چھانیں پھٹکیں حقیقتوں کو یونہی
دُھنئے روئی کو جس طرح کہ دُھنیں
جو سخن سنج و اہلِ ذوق ہیں وہ
کیوں نہ سر اس کی گفتگو پہ دُھنیں

تھا وہ اک طرح میرا ہمسایہ
گو کبھی بالمشافہہ نہ مِلا
میرا مولد ہے ارض جالندھر
لدھیانے میں وہ ہوا پیدا
اِشتراکِ زباں، زمیں کا ربط
اس سے نسبت دوگونہ ہے گویا
وہ مغاں شیوہ جس نے کام لیا
کوزۂ گِل سے ساغرِ جم کا
کر گیا مر کے اہلِ دل کو اُداس
دوں خراج اس کو چشمِ پُرنم کا
سوچتا ہوں کہ کس کو پُرسہ دوں
لوں پتہ کس سے اس کے محرم کا
ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے
ہے بلا وجہ شورِ ماتم کا
جسمِ خاکی تھا جزوِ خاک ہوا
ساتھ ناپائدار ہے دم کا
حرف کو موت آ نہیں سکتی
حرف تو جزو ہے اسمِ اعظم کا
ہاں اگر تعزیت ضروری ہے
کہ ہے دستور اہلِ عالم کا
اس کے عشاق میں سرِ فہرست
نام ہے امرتا پریتم کا
چشمِ میگوں ہو کیوں نہ خوں بستہ
سر پہ ٹوٹا پہاڑ اِک غم کا
وقفِ رنج و الم ہیں لوح و قلم
خم و مینا و جام ہیں محزوں
ساحرِ لدھیانوی کے لئے
دیدہ خوننابہ بار، دل پُر خوں
شہر شہر احترام میں اُس کے
پرچم اردو زبان کا ہے نگوں
صرف برِّصغیر ہی میں نہیں
ہے گراں تاگراں یہی مضموں
ایک جمِ غفیر کے ہمراہ
سوگواروں میں اُس کے میں بھی ہوں

فکر مندِ جہاں دماغ اس کا
بادۂ خم سے پُر ایاغ اس کا
آندھیوں میں جلے چراغ اس کا
اہلِ وحشت کا رمنہ باغ اس کا
بوئے مے سے ملے سراغ اس کا
گیت گاتا رہا وہ ساری عمر
امن کے، حُسن کے، محبّت کے
جذبِ صادق کے صدق الفت کے
دل پُر آرزو کی حسرت کے
جانگسل کاو کاوِ فرقت کے
روشنی کے شکستِ ظلمت کے
آمدِ صبح کی بشارت کے
عشق و آزادی و بغاوت کے
حضرتِ آدمی کی عظمت کے

اُس کے پروانے شمع رُو کتنے — سوختہ کتنے لالہ رُخ اس کے
سانس رکتے تھے بات پر اس کی — نام پر اس کے دل دھڑکتے تھے
کتنے پھولوں کی یہ تمنّا تھی — کتنے غنچوں نے خواب یہ دیکھے
کاش وہ شاخسار سے اُن کی — توڑ کر زینتِ گلو کر لے
وہ تھا شہزادیوں کا شہزادہ — تھی کمی انگ دان کی نہ اُسے
موجِ سیلاب سے لپٹ کر بھی — اس کے کام و دہن رہے پیاسے
لمسِ دستِ صبا تھا لمس اس کا — حاصلِ دید دور کے جلوے

اہلِ محفل سے اب کہے گا کون — آؤ مل جل کے کوئی خواب بُنیں
سینۂ ساز میں جو لرزاں ہے — گوشِ تخئیل سے وہ لحن سنیں
تیز تر نبضِ شوق ہو جن سے — آؤ ترتیب دیں کچھ ایسی دھنیں

تاج محل کی موت

حبیب جالب - لاہور

یوں وہ ظلمت سے رہا دست و گریباں یارو
اس سے خائف تھے بہت شب کے نگہباں یارو
عمر بھر اس نے کیا عشق غم دنیا سے
اس سا ہوگا نہ کوئی عاشق انساں یارو
اس کی ہر نظم میں دکھ درد ہے انسانوں کا
اس کا ہر شعر ہے انسان پہ احساں یارو
اس نے ہر گام ہمیں حوصلۂ تازہ دیا
وہ نہ اک پل بھی رہا ہم سے گریزاں یارو

اس کو ہر حال میں جینے کی ادا آتی تھی
وہ نہ حالات سے ہوتا تھا پریشاں یارو
اس کو تھی کشمکش دیر و حرم سے نفرت
اس سا ہندو نہ کوئی اس سا مسلماں یارو
اپنے اشعار کی شمعوں سے اجالا کر کے
کر گیا شب کا سفر کتنا وہ آساں یارو
اس نے باطل سے نہ تا زیست کیا سمجھوتہ
دہر میں اس سا کہاں صاحب ایماں یارو
اس کے گیتوں سے زمانے کو سنواریں آؤ
روح ساحر کو اگر کرنا ہے شاداں یارو!

ساحر کی آخری خواہش

امرناتھ
اسٹار پبلیکیشنز۔ نئی دہلی

۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء ــــــ میں امریکہ اور جرمنی کے دو ہفتے کے ٹور کے لئے تیار ہو رہا تھا اور اگلی صبح مجھے دہلی سے روانہ ہونا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلی فون بمبئی سے تھا اور ساحر کی بہن انور نے کہا کہ "ساحر مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" اور دوسرے لمحہ ساحر مخاطب۔

"امرناتھ جی۔ تلخیاں کا ۲۵ واں ایڈیشن چھاپنے کی تیاری کیجے۔ کیوں کہ اس پر ایک فنکشن کرنے کی پیش کش ہے۔ مرکزی وزیر اطلاعات شاید اس کی صدارت کریں گے۔

"تلخیاں کے گزشتہ کئی ایڈیشن میرے ادارہ سے شائع ہوتے تھے۔ اور کافی عرصہ سے کتاب کا سابقہ ایڈیشن نایاب تھا چند روز پہلے ہی انہوں نے کچھ ترمیم و تنسیخ کے ساتھ "تلخیاں" کے نئے ایڈیشن کے لیے مسودہ بھجوایا تھا۔ کتابت جاری تھی۔ ان کی یہ تجویز میرے لیے خوشی کی بات تھی۔ لہٰذا میں نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ۲۵ اکتوبر تک امریکہ سے واپس آنے پر اس پروگرام کی تفصیلات طے کریں گے۔ اور پھر جب میں نے ان سے کہا کہ کیا امریکہ سے کچھ منگانا چاہتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ ان کے لئے خاص کریم کی شیشیاں لے آؤں۔ انہوں نے مجھ سے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ اسی جنوری میں دہلی ضرور آئیں گے۔ اور میرے لڑکے کی شادی کی تقریب میں شامل ہوں گے۔

۲۵ اکتوبر کی دوپہر کو میں امریکہ سے واپس دہلی پہنچا۔ دو گذشتہ راتوں کی بے آرامی تھی۔ لہٰذا آتے ہی اُن کو فون نہ کر سکا ارادہ تھا کہ اگلے روز فون کروں گا۔

لیکن ۲۵ اکتوبر کی آدھی رات کو فون کی گھنٹی بجی میں نے نیند کی حالت میں فون اٹھایا، اور آواز آئی امرناتھ صاحب ایک بڑی خبر ہے۔ ساحر لدھیانوی گذشتہ رات دس بجے انتقال فرما گئے۔ بمبئی سے جے دیو نے مجھے یہ اطلاع آپ تک پہنچانے کے لیے ابھی ابھی فون کیا ہے۔

میری نیند میری بے آرامی ایک دم گُم ہو گئی میں چونک گیا یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ دردناک خبر صحیح ہو گی بہت دیر تک یہی سوچتا رہا کہ ساحر نے تو اپنی تخلیق "تلخیاں" کے سلور جوبلی ایڈیشن کی تقریب کا پروگرام بنایا تھا۔ اس نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے لڑکے کی شادی کے موقعہ پر جنوری میں دہلی ضرور آئیں گے۔ کیا وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکیں گے؟ انھوں نے امریکہ جانے

سے پہلے میری معرفت گلشن نندہ کی صحت یابی کا پیغام بھیجا تھا۔ اور وہ خود اس دنیا میں نہیں رہے۔

میری آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ اور آنکھوں میں گذشتہ بیس بائیس برس کے واقعات گھومنے لگے جن کے دوران میں نے ساحر سے جی بھر کر باتیں کی تھیں۔ بارہا دہلی اور بمبئی میں ان کے ساتھ شامیں گزاری تھیں۔

۱۹۵۳ء میں پہلی بار میری ملاقات ساحر لدھیانوی سے ہوئی تھی۔ جب وہ ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں دہلی آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ جاں نثار اختر اور کچھ اور دوست تھے جب میں ان سے ملنے جامع مسجد کے فلورا ہوٹل میں گیا۔ میں اردو کی پاکٹ سیریز کی اشاعت شروع کرنا چاہتا تھا اور میری خواہش تھی کہ ان کی کسی تصنیف سے اس سیریز کا آغاز کروں۔ اس وقت میرا ارادہ بالکل نیا تھا۔ اور میرے پاس کوئی سفارش نہیں تھی۔ نہ میں رائلٹی کی شکل میں انھیں کوئی رقم پیش کر سکتا تھا۔ اور جب میں نے اپنی خواہش کا اظہار ان سے کیا تو ان کا جواب تھا۔ دوسرے پبلشرز میری تصانیف کو مجھ سے پوچھے بغیر چھاپ رہے ہیں۔ آپ کو اجازت کی ضرورت کیوں ہے۔ ؟" یہ ایک طنز تھا ان پبلشرز پر جو اس وقت ساحر کی غیر معمولی مقبولیت کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ بہرحال انہوں نے مجھے اپنے گیتوں کا مجموعہ "گا تا جائے بنجارہ کو سٹار پاکٹ سیریز" کی پہلی کتاب کے طور پر شائع کرنے کی اجازت دے دی۔ ساتھ ہی اس مجموعہ کے سابقہ ایڈیشن میں کچھ نئے گیتوں کا اضافہ کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ اور چند روز بعد مجھے اضافہ شدہ مجموعہ مل گیا۔

اس وقت اس کتاب کی صرف ایک ہزار جلدیں شائع کی گئیں۔ اور رائلٹی کے طور پر ایک روپیہ قیمت کی اس کتاب پر میں نے انتہائی ہچکچاہٹ کے ساتھ صرف ۶۲ روپے ۵۰ پیسے کا ایک چیک بھجوا دیا تھا۔ یہ حقیر سی رقم بھیجتے وقت ڈر رہا تھا کہ اتنا مقبول شاعر اتنی معمولی رقم کا چیک دیکھ کر خفا تو نہ ہو جائے گا۔ لیکن چند روز بعد ان کا ایک خط ملا تھا آپ پہلے اردو پبلشر ہیں جو مصنف کی رائلٹی بھی دینا جانتے ہیں یہ طنز تھا یا تعریف میں سمجھ نہ سکا۔ لیکن چند ماہ بعد جب میں بمبئی گیا تو وہاں اور ادیبوں سے ملنے کا موقع ملا تو ہر ایک نے کہا ساحر صاحب نے آپ کے ادارہ کی بہت تعریف کی ہے۔ آپ تو رائلٹی بھی دیتے ہیں جو آج کے اردو پبلشرز سے غیر متوقع ہے۔ اور اگلے چند روز تک ساحر نے میری جو خاطر اور مہمان نوازی کی وہ میں آج تک نہیں بھول سکا۔

اپریل ۱۹۷۴ء۔ ہمارے ادارہ کی طرف سے ہندی پاکٹ سیریز کی دسویں سالگرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں جناب اندر کمار گجرال جو اُن دنوں وزیر اطلاعات تھے۔ کی زیر صدارت ایک مشاعرہ کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ اس مشاعرے میں اردو ہندی اور پنجابی کے کئی عظیم شعراء حضرات نے حصہ لیا ان میں ساحر کے علاوہ محترمہ امرتا پریتم، عظیم ہندی شاعر جناب رام دھاری دنکر بھی شامل تھے۔ ساحر خصوصی طور پر اس تقریب کے لئے دہلی تشریف لائے تو کئی روز تک یہاں رہے ان کا زیادہ تر وقت میرے ساتھ گزرتا تھا اس ہفتہ کے دوران وہ کئی بار میرے گھر تشریف لائے ہم نے تقریباً ہر شام کو کوئی نہ کوئی پروگرام رکھا۔ جس میں دہلی کے تمام ممتاز شعراء حضرات اور جرنلسٹ شامل ہوتے رہے یہ چند روز میرے لئے اس قدر خوشگوار تھے کہ ساحر کے باعث مجھے نہ صرف کئی ممتاز ہستیوں کے قریب آنے کا موقع ملا۔ ہر شام ایک الگ سا ماحول ہوتا اور ساحر اپنی کئی تازہ نظمیں سناتے رہے۔

جون ۱۹۷۵ء میں ۔ ساحر دہلی میں تھے اور ان کے اعزاز میں میں نے اپنے گھر پر ایک چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کیا۔ اس میں جناب اندر کمار گجرال، امرتا پریتم، اکشے کمار جین، کرشن موہن اور بہت سے ہندی اور اردو کے مقامی ادباء بھی تشریف لائے بات چیت

اس وقت سیاسی حالات پر مرکوز تھی۔ گجرال صاحب بطور ایک اہم مرکزی وزیر کے سیاسی حالات کو پُر امن بنانے کے لئے ادبا حضرات کے تعاون کی اہمیت پر بات کر رہے تھے۔ ساحر کی کئی باتوں پر وہ ان سے اتفاق کرتے تھے لیکن کئی باتوں پر وہ ان سے متفق نہیں تھے۔ اور انھوں نے بیباکی سے اس وقت کی حکومت کی ایسی چند باتوں سے اپنے اختلاف کا اظہار کیا۔ جو اس ماحول میں شاید ساحر جیسا شخص ہی کر سکتا تھا۔ چند ہی روز میں ایمرجنسی کا اعلان ہو گیا اور ساحر صاحب ایمرجنسی کے خلاف بھی اپنے خیالات بے باکی سے ظاہر کرتے رہے۔

ستمبر ۱۹۸۰ — جناب محمد رفیع کے انتقال کی منحوس خبر ملی۔ اتفاق سے ساحر صاحب سے فون پر بات ہوئی اور میں نے انھیں بتایا کہ محمد رفیع کو ہدیۂ عقیدت کے طور پر ایک مجموعہ کیلئے دیباچہ لکھیں گے اور وہ دیباچہ جو ان کی نثر کی شاید آخری تحریر تھی مجھے دو روز میں دہلی بھجوا دیا گیا۔

اور ایسے کئی واقعات میرے ذہن میں گھومنے لگے ایک مرتبہ رام دھاری سنگھ دنکر صاحب اور ساحر صاحب کے درمیان بات چیت شروع ہوئی پرانے شعراء حضرات پر۔ یہ دونوں عظیم شخص اقبال اور ٹیگور سے بے حد متاثر تھے۔ گھنٹوں تک بات چلتی رہی۔ دو عظیم شعراء اس قدر فراخدلی سے اور بے باکی سے خیالات کا اظہار کریں یہ موقع میرے لئے بے حد غیر معمولی تھا

جب میں کبھی بمبئی جاتا۔ ساحر کے ساتھ ایک شام گذارنا میرے پروگرام کا ایک اہم حصہ ہوتا تھا۔ ان کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان کے بہت سی مایہ ناز ہستیوں سے ملنے کا موقع نصیب ہوا۔ ان چاروں عظیم تصانیف۔ "تلخیاں" "پرچھائیاں"۔ "آؤ کہ کوئی خواب بُنیں" "گاتا جائے بنجارا" کی اشاعت کی وجہ سے میرے ادارہ کو جو مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی وقتاً فوقتاً تجاویز اور مشوروں نے میری جو رہنمائی کی آج وہ سب یاد کر کے میری آنکھیں پُر نم ہو جاتی ہیں۔

ساحر کی دوست نوازی سے شاید ہی کوئی ناواقف ہو۔ وہ ایک لمحہ بھی کسی نہ کسی دوست کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے جب بھی وہ دہلی آئے علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، رام پرکاش اشک۔ اور کوئی نہ کوئی شخصیت ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ اپنے ضرورت مند دوستوں کی جتنی مدد انھوں نے کی اس کی مثال شاید ہی مل سکے۔ رام پرکاش اشک کی صحتیابی کے لئے انہوں نے ہر ممکن امداد دی۔ جب وہ اپنی کوششوں کے باوجود بھی بچا نہ سکے۔ تو یہ سانحہ ان کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ بن گیا۔

ساحر کی نجی زندگی ان کی ماں اور بہن تک ہی محدود تھی۔ اپنی ماں کے لئے جو محبت اور جذبات ان کے دل میں تھے وہ آج کے دور میں ناقابل یقین لگتے ہیں کہتے ہیں جذباتی اور مفکر لوگ مزاح پسند نہ ہو کر انتہائی سنجیدہ ہوتے ہیں۔ لیکن ساحر زندہ دلی اور مزاح پسندی ایسی تھی کہ آپ ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے وقت کے گذرنے کا پتہ نہ چلتا۔

آج ساحر ہمارے درمیان نہیں رہے۔ اس بات کا یقین کرنا آسان نہیں۔ ان کے دوست اور احباب جن کی تعداد سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے برسوں تک ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو نہ بھلا سکیں گے۔ یہ حقیقت سن کر ان کی ایک نظم کا یہ مصرعہ ذہن میں آجاتا ہے۔

میں ابھی مرا نہیں

ادب اور فلم کے لئے ان کے کلام کا Contribution ایک ایسا Contribution

ہے جس کے لیے فلم انڈسٹری اور اردو ادب ہمیشہ ان کا شکرگزار ہوگا۔ اور شاعری کو عوام میں جو مقبولیت انھوں نے دلائی اُس کا شاید ہی کوئی دوسرا شاعر دعویٰ کر سکے گا۔ "پرچھائیاں" کی طویل نظم اور "تلخیاں" کے خوبصورت کلام سے آج ہندوستان اور پاکستان کا کوئی بھی اردو زبان جاننے والا شخص ناواقف نہیں۔

ساحر صاحب کا آخری خط

نوٹ: (ساحر صاحب نے یہ خط امرناتھ جی کو ۲۲ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کو لکھا۔ خدا نے انہیں اس خط کے لفافے پر ٹکٹ لگانے کی مہلت نہیں دی اور یہ خط پوسٹ ہونے سے رہ گیا۔

برادرم امرناتھ صاحب!

کوئی تین ہفتے پہلے آپ نے ہینڈ لیٹرز کے لئے جو کاغذ بھیجنے کو کہا تھا۔ وہ آج یعنی ۲۲ر اکتوبر کو ملا ہے۔ آپ نے یہ بہت اچھا کیا کہ زیادہ کاغذ نہیں بھیجا۔ صرف ڈیڑھ سو لیٹر ہیڈز کا کاغذ بھیجا۔ یہ کاغذ اتنا معمولی ہے کہ اس سے کہیں بہتر کاغذ یہیں مل جاتا ہے۔ میں نے آپ کو اس لیے تکلیف دی تھی کیوں کہ جو بڑھیا کاغذ میں استعمال کرتا ہوں وہ یہاں اس وقت نہیں مل رہا۔ مگر آپ کے بھیجے ہوتے کاغذ سے بہتر کاغذ تو یہاں کافی مل سکتا ہے۔

آپ نے کہا تھا۔ کہ آپ عباس صاحب سے فون پر بات کر کے مجھے رات کو فون پر اطلاع دیں گے، کہ ان سے کیا بات ہوئی۔ مگر آپ کا کوئی فون نہیں آیا۔ خیر اس سلسلے میں ابھی مزید بات کرنے کی ضرورت نہیں۔

ادھر آپ کے بیرونی دوروں کی وجہ سے "تلخیاں" کے نئے ایڈیشن کی کتابت بھی کافی دیر سے مکمل نہیں ہو رہی۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔ تو میں اپنی اردو کتابوں کی اشاعت علیگڑھ سے کرواؤں۔ وہ لوگ کافی دنوں سے اصرار کر رہے ہیں۔ ہندی ایڈیشن آپ چاہیں تو بدستور شائع کر سکتے ہیں پچھلے دنوں آپ نے "آؤ کہ کوئی خواب بُنیں" کا لائبریری ایڈیشن اور پاکٹ بک ایڈیشن شائع کیا تھا۔ اور ساحر کی شاعری کا بھی پاکٹ بک ایڈیشن نکالا تھا۔ براہ کرم مجھے اطلاع دیجیے۔ کہ ایڈیشن کتنی کتنی کاپیوں پر مشتمل تھا اور ان کی کتنی جلدیں بک چکی ہیں۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا

ساحر

وہ اُدھار باقی رہ گیا

خواجہ احمد عبّاس

ایک موقع پر سر سید احمد خاں نے کہا تھا "اگر خدا نے مجھ سے پوچھا کہ دنیا میں تم نے کیا کام کیا تو میں جواب دوں گا کہ میں نے خواجہ الطاف حسین حالی سے مسدسِ حالی لکھوائی۔" اسی طرح میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ایک تحریر میں نے لکھی جو تاریخی طور سے موثر ثابت ہوئی تو وہ ایک "کھلی چٹھی" تھی جو میں نے ۱۹۴۸ء میں ساحر لدھیانوی کے نام لکھی تھی۔ ساحر اُس وقت پاکستان چلے گئے تھے۔

یہ کھلا خط ساحر لدھیانوی کے نام تھا مگر اس کے ذریعہ میں اُن سب ترقی پسندوں کو آواز دے رہا تھا جو فسادات کے دوران یہاں سے ہجرت کر گئے تھے۔

تین مہینے بعد میں حیران رہ گیا جب میں نے ساحر لدھیانوی کو بمبئی میں دیکھا۔ اُس وقت تک میں ساحر سے ذاتی طور سے زیادہ واقف نہ تھا۔ لیکن اُن کی نظموں (خاص طور سے تاج محل) کا میں قائل تھا۔ اور اسی لئے میں نے وہ کھلی "چھٹی" ساحر کے نام لکھی تھی۔

جب ساحر کو میں نے بمبئی میں دیکھا تو میں نے کہا "آپ تو پاکستان چلے گئے تھے؟"

ساحر نے جواب دیا چلا تو گیا تھا۔ آپ نے بلایا۔ سو واپس آگیا۔

انہوں نے بعد میں تفصیل سے بتایا کہ جب میرا "خط" انہوں نے اخبار میں پڑھا تو وہ تذبذب میں تھے۔ پچاس فیصد ہندوستان آنے کے حق میں پچاس فیصد پاکستان میں رہنے کے حق میں۔ مگر میری کھلی "چھٹی" نے ہندوستان کا پلڑا بھاری کر دیا۔ اور وہ ہندوستان واپس آگئے۔ اور ایسے آئے کہ پھر کبھی پاکستان نہ گئے۔ حالانکہ وہاں بھی ان کے چاہنے والوں اور ان کی شاعری کو پسند کرنے والوں کی کمی نہیں۔

اُس وقت سے ایک طرح کی ذمہ داری ساحر کو ہندوستان بلانے کے بعد میرے کندھوں پر آپڑی۔

فلمی دنیا میں اندر راج آنند نے انہیں اپنی کہانی "نوجوان" کے گانے لکھنے کے لئے کاردار صاحب اور ڈائرکٹر مہیش کول صاحب سے ملوایا۔ اور پہلی فلم میں ہی ساحر نے ادبی شاعری کے جھنڈے فلم کے میدان میں گاڑ دیئے۔ اس دن سے مرتے دم تک ساحر نے اپنی روش نہ بدلی نہ چھوڑی جو بھی لکھا وہ ایک شاعر کے جذبات و احساسات کی نمائندگی کرتا تھا۔ کبھی انہوں نے اپنا فنی معیار گرنے نہ دیا۔

بلا کی مقبولیت نصیب ہوئی ساحر کو۔ اس میں اردو زبان کی لطافت، شیرینی، حسن اور زور کا بھی دخل تھا اور اس زبان کے سبب سے حساس اور نازک مزاج اور رنگیلے شاعر کی تخلیق کا بھی دخل تھا جو اس زبان کا بیک وقت عاشق بھی تھا اور معشوق بھی۔ عاشق صادق اس لحاظ سے کہ وہ اس زبان پر فریفتہ تھے۔ نہ صرف انہوں نے اپنی کئی فلموں کو اردو سنسر سرٹیفکیٹ دلوائے، بلکہ اردو کے لئے بہت سے دکھ جھیلنے کے لئے اور قربانیاں دینے کے لئے لڑتے رہے۔ معشوق ان معنوں میں کہ اس زبان نے جتنی چھوٹ ساحر کو دے رکھی تھی اتنی کسی اور شاعر کو کبھی نہیں دی۔

ساحر نے جتنے تجربات شاعری میں کئے ہیں وہ دوسروں نے کم ہی کئے ہوں گے۔ انہوں نے سیاسی شاعری کی ہے رومانی شاعری کی ہے، نفسیاتی شاعری کی ہے جس میں کسانوں اور مزدوروں کی بغاوت کا اعلان ہے۔ ایسی بھی شاعری کی ہے جو تخلیقی طور سے پیغمبری کی سرحدوں کو چھو گئی ہے اور ایسی شاعری بھی کی ہے جس میں رنگینی مزاج اور شوخی جھلکتی ہے اور یہ سب شاعری کی اصناف ان کے فلمی گانوں میں ملتی ہیں۔

فلمی شاعری کو ایک ادبی معیار سب سے پہلے ساحر نے ہی دیا۔ بعد میں اور بہت سے شاعروں نے بھی ان کی پیروی کی۔ مگر اس جرأت کا سہرا ساحر کے ہی سر ہے کہ انہوں نے فلم دیکھنے والوں کے ذوق کو نہ صرف اونچا اٹھایا، بلکہ ایک سچے شاعر کی طرح کبھی عوامی مذاق کو گھٹیا نہ سمجھا، ورنہ "میں پل دو پل کا شاعر ہوں" اور "کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لئے" جیسے گیت فلموں کے لئے کیسے لکھے جاتے اور کیسے مقبولیت حاصل کرتے؟

ساحر "جادوگر" کو کہتے ہیں، اس لئے جب لدھیانہ کے عبدالحئی نے "ساحر" تخلص اختیار کیا تو واقعی جادو جگا دیا۔ یہ ساحری اور شاعری ایک دوسرے کا نعم البدل تھیں۔ دونوں ایک ہی ہستی کے دو مختلف روپ تھے۔ میں نے ساحر کا 'جادو' لوگوں کے سر پر چڑھ کر بولتا ہوا دیکھا ہے۔ شاید بیس برس ہوئے ہم لوگ مرحوم سجاد ظہیر کی سرکردگی میں شاعروں اور ادیبوں کا ایک گروہ لے کر بہار اور مشرقی یو۔پی گئے تھے۔ الہ آباد کی کنیا ودیالیہ میں سب لڑکیاں ہندی داں تھیں اور ہمارا خیال تھا کہ اردو شاعری کی سمجھ بوجھ ان میں کہاں ہوگی۔ اس لئے سب سے پہلے ہم نے ساحر کو پڑھنے کے لئے کھڑا کیا۔ ساحر نے وہاں کوئی آسان گیت نہیں سنایا بلکہ اردو شاعری کے بہترین نمونے ہی سنا کر سامع خواتین کا دل جیت لیا۔ فرمائش ہوئی "تاج محل" سنائیے۔ تو ساحر نے "میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے" سے شروع کیا اور جب "ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر ۔۔ ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق" پر ختم کیا تو سارا ہال تالیوں سے

گونج رہا تھا۔ اُس دن مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ ساحر کی شاعری واقعی ساحری کے درجے پر پہنچ گئی ہے۔

ساحر کو ایک جنون تھا یا اسے ان کا (OBSESSION) سمجھئے کہ وہ شاعروں کے درجے کو فلمی دنیا کے تجارتی ماحول میں بہتر اور برتر بنانا چاہتے تھے۔ اُن سے پہلے فلمی شاعر کتنا ہی بڑا ہو، اس کا نام نہ تو پبلسٹی میں آتا تھا نہ ریڈیو پر جب اس کے گانے بجتے تھے تو اس کے ساتھ اس کا نام بھی نہیں لیا جاتا تھا۔ گیتوں کی قیمت بھی معقول نہیں ملتی تھی بلکہ اکثر حالات میں ملتی ہی نہیں تھی۔ ساحر نے دیکھا اور سنا کہ میوزک ڈائرکٹروں اور پلے بیک سنگروں کا ہر کوئی ذکر کرتا ہے لیکن جس نے گیت کے الفاظ لکھے اُس کا کوئی نام نہیں لیتا اور نہ ہی سامع اس کے نام سے واقف ہیں۔ یہ بات ساحر کو نہ صرف ذاتی طور سے کھلتی تھی بلکہ وہ اس کو شعراء اور شاعری کی ہتک سمجھتا تھا۔ اس لئے جب فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا اس کو وائس پریسیڈنٹ چنا گیا۔ میں اس سال پریسیڈنٹ تھا۔ تو اس نے شرط رکھی کہ ہم دونوں مل کر شاعروں کو ان کا حق دلوانے کی جدوجہد کریں گے۔ سب سے پہلے اس جدوجہد کے لئے ہم نے ریڈیو کا میدان چنا۔ ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل سے میں اور ساحر ملنے کے لئے دہلی گئے۔ وہاں جا کر اُن سے کہا کہ آپ ہر گانے کے ساتھ اس کے پلے بیک سنگر کا نام اناؤنس کرتے ہیں۔ میوزک ڈائرکٹر کا نام اناؤنس ہوتا ہے لیکن شاعر کو ہی کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ وہ بولے کہ بات یہ ہے کہ ہمارے پاس وقت کم ہوتا ہے اس لئے شاعر کا نام نہیں دے سکتے۔ اس پر ساحر نے ان سے کہا کہ ہر ریکارڈ کے ساتھ فرمائش کرنے والوں کے نام کئی منٹ تک سنائے جاتے ہیں تو اس میں وقت ضائع نہیں ہوتا؟ یہاں پر ڈائرکٹر جنرل بھی قائل ہو گئے۔ اور چند روز بعد انہوں نے ہدایت دیدی کہ ہر گیت کے ساتھ اس کے شاعر کا نام بھی براڈ کاسٹ ہونا چاہئے۔

یہ کام اتنا بڑا تھا کہ ساحر کو اگلے سال ہی فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا پریسیڈنٹ منتخب کر لیا گیا۔ اب ہر گانے کے ساتھ شاعر کا نام آتا ہے یہ کوئی کم کامیابی نہیں ہے۔ مگر ساحر تو ہمیشہ شاعروں اور ادیبوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے جدوجہد کرتے رہے خواہ جنگ گورنمنٹ سے ہو یا پروڈیوسروں سے۔

ساحر کی ذاتی کامیابی اتنی بڑھی کہ اُسے ہر چیز خود اپنے لئے حاصل ہو سکتی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو اپنا نام ریڈیو پر بھی لے آتا۔ فلم پبلسٹی میں بھی اس کا نام پروڈیوسر خود دینا چاہتے تھے لیکن ساحر کا سماجی شعور اس ذاتی کامیابی کو کوئی کامیابی نہیں سمجھتا تھا۔ اُسے طبقاتی جدوجہد کا مارکسی شعور تھا اور اسی لحاظ سے وہ "دماغی کام کرنے والوں" BRAIN WORKERS کے حقوق کا تحفظ چاہتا تھا اور جب تک سب شاعروں اور ادیبوں کے حقوق کی گارنٹی نہ مل جائے وہ چین سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔

ویسے ساحر ہر معنی میں ایک انسان تھا جو انسان سے محبت کرتا تھا۔ انسان کی عزت کرتا تھا۔ اور انسان کی سب اچھائیاں اور کمزوریاں اس کے اندر موجود تھیں۔

"دوست" انسان کا بہترین روپ ہے۔ ساحر واقعی "دوست" تھا۔ دوستوں کا دوست۔ جب ایک ٹیکسی ایکسیڈنٹ میں میری پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ بعد میں پلاسٹر چڑھایا گیا مگر میں یہ نہیں بھول سکتا کہ ساحر نے اس چوٹ اور بیماری میں برابر میرا ساتھ دیا۔ بات کار میں لے جانے کی نہیں ہے ٹیکسی میں بھی جا سکتا تھا۔ لیکن بات یہ ہے کہ "دوست آں باشد

کہ گیر دوست در پریشان حالی و درماندگی۔" درجنوں ایسے واقعات ساحر کا ہر دوست بیان کر سکتا ہے۔

ہم نے بہار اور یوپی کے دورے کے سلسلے میں کوئی دو ہزار کلو میٹر ایک ہی کار میں سفر کیا، کار ساحر کی تھی۔ مگر مجال ہے کہ کسی موقع پر ساحر نے یہ ظاہر کیا ہو کہ کار اس کی ہے۔ ڈرائیور اس کا ہے۔ پٹرول بھی اس کا ہے اور ہم صرف اس کے ہم سفر ہیں۔

ساحر سے ایک ہی شکایت تھی مجھے۔ جب کبھی وہ اپنے گھر کھانے پر بلاتا تو سب کو کھانا کھلا کر آخر میں خود کھاتا۔ مجھے ایک بار اُس پر بڑا غصہ آیا۔ میں کھانا کھائے بغیر وہاں سے چلا آیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ ساحر صاحب سب سے آخر میں کھانا کھائیں گے۔ اگلے دن ساحر صاحب خود میرے یہاں آئے۔ دوپہر کے کھانے سے کچھ پہلے۔ کہا۔ آپ رات بنا کھانا کھائے چلے آئے مگر یہ شکایت نہ تھی۔

میں نے کہا "سچ ہے ہم تو آپ کے ساتھ کھانا کھانے گئے تھے، جب آپ ہی دستر خوان پر نہیں تھے تو ہم وہاں کھانا کیوں کھاتے؟

کہنے لگے "آپ نے جو کیا اچھا کیا۔ میں نے بھی رات سے کھانا نہیں کھایا۔"

"کیوں؟" میں نے تعجب سے کہا۔ آپ نے کیوں کھانا نہیں کھایا؟

میں کیسے کھا سکتا ہوں؟ جب میرا ایک دوست اور عزیز ساتھی بھوکا اٹھ آیا ہو — خیر مقصد تو مل کر ساتھ کھانا کھانے سے تھا۔ میرے یہاں نہیں تو آپ کے یہاں سہی۔"

"مطلب"

مطلب یہ کہ میں اب آپ کے یہاں کھانا کھانے آیا ہوں۔ بغیر اطلاع کے۔ کھانا کھلائیں گے آپ؟

"ضرور کھلاؤں گا۔"

میں نے کھانا منگوایا۔ جو بھی روکھی سوکھی دال روٹی حاضر تھی، اس کو ہم دونوں بھوکوں نے بہایت اشتہا سے کھایا۔

رات کو آپ کے یہاں تو دو قسم کا پلاؤ اور بریانی تھی، کوفتے تھے، شامی کباب تھے، مرغ مسلّم تھا، پراٹھے تھے، شیرنی اور دو قسم کی پڈنگ تھی۔ اس وقت میز پر آپ کے سامنے ابلی ہوئی گوبھی اور مسور کی دال رکھی ہے۔

کھانا صرف کھانا ہوتا ہے وہ سب دکھاوٹ تھی تا کہ لوگ یہ نہ شکایت کریں کہ ایک شاعر کھانا نہیں کھلا سکتا۔ کھانا تو اسی کو کہتے ہیں۔ تین روٹیاں، گوبھی اور دال ساحر نے کھائیں۔

تین روٹیاں میں نے کھالیں۔ بعد میں ساحر صاحب نے اٹھ کر ہاتھ دھوئے۔ پھر مجھ سے رخصت ہوتے ہوئے بہت بہت شکریہ ادا کیا۔" میں نے کہا "کیوں شرمندہ کر رہے ہیں مجھے۔"

"شرمندگی مٹانے تو میں آیا تھا آپ کے یہاں"

شرمندگی تو مجھے ہے کہ آپ کو کچھ میٹھا نہیں کھلایا۔"

"میٹھا آپ پر اُدھار رہا۔"

مگر جانے والا چلا گیا۔ اب وہ اُدھار کیسے ادا کیا جائے گا؟

ساحر ـــ میرا یار بیلی

فکر تونسوی

ساحر لدھیانوی چل بسا یوں جیسے پنجرا اُڑ گیا ہو پنچھی یہیں رہ گیا ہو۔ اسکے نغمے اس کی شاعری اُس کی ساحرانہ یادیں وہ ہمارے پاس زندہ ہے۔ خدا میں اتنی طاقت نہیں کہ انہیں ہم سے لے جا سکے۔ خدا کتنے معاملے میں کتنا بے بس ہوتا ہے اس کے ہاتھ تو ایک پنجرا لگا جسے وہ لے کر اڑ گیا۔ شاید خدا کے نصیب میں یہی پنجرا لکھا ہے اور بس . . . مگر ساحر لدھیانوی کی روح ــــ کل ہی میں اُس کا ایک شعر گنگنا رہا تھا۔

غریب شہر کے تن پر لباس باقی ہے
امیر شہر کے ارمان ابھی کہاں نکلے

ہاں خدا کا کوئی موت کا فرشتہ اس شعر کو فنا نہیں کر سکتا اسے ہم سے الگ نہیں کر سکتا کیونکہ ساحر تو اس شعر اور ایسے ہی کئی شعروں میں زندہ ہے۔

اخبار۔ ریڈیو۔ اور ٹی۔ وی پر یہ خبر تو دی جا سکتی ہے کہ ساحر لدھیانوی کو بمبئی کے ایک قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ لیکن یہ خبر دینے کی طاقت کس میں ہے کہ اس کے نغموں کو خیالات کے تکیے اور رکھے لہجوں کو کفن پہنا کر دفن کر دیا گیا۔

میں نے اوپر عنوان میں دعوا کیا کہ وہ میرا یار بیلی تھا۔ لیکن پھر سوچتا ہوں وہ تو سب کا یار بیلی تھا۔ آپ یقین نہیں کریں گے کہ کل جب میرے محلے کی ایک نوجوان لڑکی نے یہ خبر سُنی تو بے اختیار چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اندر سے اس کی ماں کی آواز آئی کیا ہوا؟ وہ نوجوان لڑکی اسے کیسے جواب دیتی کہ میرا دل ٹوٹ گیا نہیں وہ کچھ نہیں کہہ سکی کیونکہ وہ تو ایک دم گونگی ہو گئی تھی سر سے پاؤں تک اُداس۔ پھر وہ کپکپاتی ٹانگوں سے اندر گئی اور ساحر کی کتاب "تلخیاں" اٹھا لائی اور اس میں سے یوں آہستہ۔ آہستہ پڑھنے لگی۔ جیسے آہستہ۔ آہستہ اپنے صدمے کو بھُلا رہی ہو ــــ

ساحر نے جب نظم تاج محل لکھی تھی تو تاج محل کو دُنیا کا ایک عظیم الشان عجوبہ اور محبت کی امر نشانی کہا

جاتا تھا۔ تاج محل چھپی تو کئی لوگ تھرّا اٹھے کئیوں کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ لیکن ساحر کے بیباک ضمیر نے اس عجوبے اور علامت کو جیسے سرِبازار چیلنج کر دیا تھا۔ اُس نے محبت کے عظیم جذبے کو محلوں کی روایتی منوپلی سے آزاد کرانے کا اعلان کیا تھا۔ کہ محبت صرف دولت و سرمایہ کی غلام نہیں ہے بلکہ اُس جوڑے کی محبت عظیم ہے جو اس محل کی اینٹیں ڈھوتا ہے جو دفتروں میں قلم گھستا ہے انجینرنگ یا میڈیکل میں پڑھ رہا ہے جو گریجویٹ بننے کے باوجود بے روزگار ہے ان سب کو محبت کرنے کا حق ہے اور اس حق کا استعمال کہیں بھی کر سکتا ہے۔ اس کے لئے تاج محل کے سائے میں پناہ لینے کی ضرورت نہیں۔ تاج پیسے کی نشانی ہے اور محبت کو پیسے کی قید میں نہیں رکھا جاتا۔

جوانی کے دیوانوں کے نوجواں لڑکے لڑکیوں کی روح کو میں لاہور۔ لدھیانہ امرتسر دِلّی کے کوچے بازاروں میں گھومتا پھرتا اپنی آنکھوں سے دیکھتا کانوں سے سنتا اس کے عہد کے نوجوان لڑکے لڑکیاں ساحر کے سرکش نغموں پر جان چھڑکتے تھے کیوں کہ یہ ان کی آرزوؤں کی آواز تھے۔ کالج کے لڑکے لڑکیاں ساحر کو گھیر لیتے اُس کے ساتھ فوٹو کھنچواتے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے کا ایک کپ پینے کو فخر کی بات سمجھتے تھے کیوں کہ وہ ان کا محبوب شاعر تھا۔ آواز اُن کی تھی۔ شعر ساحر لکھتا تھا۔

اور پھر جب وہ بمبئی کے فلمی سنسار کا باسی بنا اس نے محبت اور اس کے استعمال کو اپنے قلم کا موضوع بنائے رکھا چونکہ ۵۷ برس کی عمر میں بھی وہ نوجوان نسل کا مقبول ترین شاعر بنا رہا تبھی تو میرے محلے کی اس نوجوان لڑکی کے ہاتھ سے چائے کا کپ گر کے ٹوٹ گیا جیسے ساحر کے انتقال پر اس کا اپنا دل ٹوٹ گیا ہو۔

جذبات اور الفاظ کا شاعر

اے۔ حمید (لاہور)

پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں محفلِ مشاعرہ برپا تھی۔ بزرگ رہنما اقبال شیدائی صاحب جو طویل مدت کے بعد وطن عزیز پاکستان میں لوٹے تھے، مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے۔ شعرائے کرام کی ایک بڑی تعداد اس محفل میں موجود تھی۔ ان میں بزرگ شعرائے کرام کے ساتھ ساتھ نوجوان شعراء بھی تھے۔

قیام پاکستان کے بعد یہ سب سے پہلا اور بڑا مشاعرہ تھا۔ اس لئے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سینکڑوں نوجوان طلباء مشاعرہ کے سامعین میں شامل تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا پہلے شاعر مائیک پر تشریف لائے ایک ہی شعر پڑھا اور ہوٹ ہو گئے۔ پھر دوسرے شاعر کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ تیسرے چوتھے۔ پانچویں شاعر بھی حاضرین کی "بیداد" کا شکار ہوئے۔ اب ترنم سے پڑھنے والے ایک شاعر آئے۔ مگر آدھی غزل سن کر انہیں بھی چلتا کر دیا گیا۔ اکثر شعراء کے ساتھ ایسا ہی ہوا تو منتظمین گھبرا گئے۔ آخر اسٹیج سکریٹری نے ایک نوجوان شاعر کو پکارا۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور نوجوان شاعر مائیک پر آیا۔ اور ہال میں سے آوازیں بلند ہوئیں۔ تاج محل، تاج محل" شاعر نے نظم شروع کی۔ ہال میں سکوت طاری ہو گیا۔ تمام سامعین یوں دم سادھے بیٹھ گئے گویا ایک ایک مصرعے کو اپنی روحوں میں اتار رہے ہوں۔ نوجوان شاعر تحت اللفظ پڑھ رہا تھا۔ وہ نظم کے آخری حصے پر پہنچا۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق
مری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

شاعر نے نظم ختم کی تو "ایک اور، ایک اور" کا شور مچ گیا۔ چنانچہ شاعر کو اپنی تازہ نظم بھی سنانا پڑی۔

یہ نوجوان شاعر ساحر لدھیانوی تھا۔ وہ جس مشاعرے میں بھی جا پہنچتا وہاں بڑے بڑے شاعروں کے چراغ ٹمٹمانے لگتے تھے۔ حاضرین محفل ہر بار ساحر سے "تاج محل" نظم سنانے کی فرمائش کرتے۔ اس نظم کی بے پناہ مقبولیت کی وجہ غالباً یہ تھی

کر ساحر نے تاج محل پر سے جسے عام طور پر محبت کا سمبل سمجھا جاتا ہے روایتی سوچ کی چادر اتار کر پھینک دی تھی۔ اور ایک نئے پُرجوش اور باغیانہ انداز سے اسے پیش کیا تھا اور یہی پُرخلوص اور پُرجوش انداز ساحر کا انداز تھا۔ نیا، منفرد اور اچھوتا انداز۔

ساحر نے یہ انداز محض شاعرانہ فیشن کے طور پر نہیں اپنایا تھا بلکہ اس کے شعور اور حسیات تک میں ظلم، ناانصافی اور نابرابری کے خلاف احتجاج بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے کلام ہی میں نہیں اپنی زندگی میں بھی ناانصافی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لدھیانے میں اس کا باپ جتنا متمول شخص تھا اتنا ہی گھریلو زندگی میں غیر متوازن بھی تھا۔ چنانچہ ساحر باپ سے الگ ہو کر اپنی ماں اور نانی کے ساتھ اپنے گھر کو چھوڑ کر لاہور چلا آیا تھا۔

لاہور آتے ہی ساحر کی شاعری کا طوطی بولنے لگا تھا۔ اس نے پورے خلوص اور جذبے کی شدت کے ساتھ شعر لکھے اور نوجوانوں میں بے حد مقبول ہو گیا۔ بے پناہ مقبولیت، شہرت اور عزت پانے کے باوجود اُسے لاہور چھوڑنا پڑا۔ وہ بمبئی چلا گیا۔ جہاں فلمی صنعت گویا ہاتھ پھیلائے اس کی منتظر تھی۔ ساحر فلمی دنیا میں داخل ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شاعرانہ شخصیت فلمی دنیا پر چھا گئی۔ فلم وہ کان نمک ہے جہاں جاتے ہی انسان نمک بن جاتا ہے۔ لیکن ساحر نے ایسا نہیں کیا۔ بجائے اس کے کہ فلمیں اسے اپنے رنگ میں رنگیں، ساحر نے انہیں اپنے انداز میں ڈھال لیا۔ ساحر نے فلمی شاعری کو تک بندی کے تنگ و تاریک احاطے سے نکال کر اُسے جیتی جاگتی سانس لیتی اور دلوں کی طرح دھڑکتی ہوئی وسعتیں عطا کیں۔

ساحر نے اپنی زندگی کے کم و بیش پینتالیس سال اردو شاعری کو دیئے۔ بے شمار فلمی گیتوں کے ذریعہ بھارت میں اردو شاعری کو زندہ رکھا اور اسے عزت بخشی۔ اردو کو احترام اور دوام کی اس منزل پر پہنچانے کے بعد وہ ایک منزل کو روانہ ہو گیا۔ آخری منزل۔ ساحر جا چکا ہے۔ لیکن اس کی نظمیں اور اس کے گیت حق اور انصاف کی منزل کی جانب رواں انسانی قافلے کو ہمیشہ راہ دکھاتے رہیں گے۔

بے شمار آنکھیں روتی ہیں

عذرا اصغر
مدیرہ "تخلیق" لاہور

ساحر لدھیانوی مرگیا ہے۔ بظاہر یہ ایک خبر ہے، ایک جملہ ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساحری کا ایک پورا عہد ختم ہوگیا ہے، ایک روایت بکھر گئی ہے۔ ایک ایسی روایت جس کا بانی اور خاتم ساحر لدھیانوی ہی تھا۔ لکھنے والے اب سو حوالوں سے اس کا جائزہ لیں گے۔ کچھ لوگ "نظریات" کا چمٹا ہاتھ میں پکڑ کر مرحوم کی ذات سے سو سو کیڑے نکالیں گے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو اسے ایک جذباتی اور کچی عمر کے لوگوں کا شاعر کہہ کر بات ختم کردیں گے۔ مگر ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اس کے لئے بے شمار آنکھیں روتی ہوں گی۔ ان گنت لوگ پریشان ہوئے ہوں گے کہ ساحر ایسا شاعر تھا جسے منوانے کے لئے کسی اور کے زور کی ضرورت تھی نہ کسی نقاد کی تعریف کی بیساکھیوں کی حاجت۔ کہتے ہیں کہ اردو شاعری میں دیوانِ غالب کے بعد سب سے زیادہ چھپنے والی اور بکنے والی کتاب ساحر کی "تلخیاں" ہے۔ بلکہ معاملہ شاید الٹ ہوگیا ہے۔ کیونکہ دیوانِ غالب تو صرف اسی عنوان سے چھپتا ہے "تلخیاں" بیسیوں بار دسیوں ناموں سے چھپی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔

اشاعتی کام کرنے والوں میں ایک بات عام ہے کہ اگر کسی کا کتابی کاروبار ٹھپ ہوگیا ہو یا وہ کم سرمائے سے دھندہ شروع کرنا چاہتا ہو تو وہ ساحر کی کتاب چھاپ لے۔ چاہے اسے تلخیاں کا نام ہی دے یا کوئی اور عنوان سوچ لے — واقعتہً ایسا ہوتا آیا ہے اور شاید اور تیزی سے ہونے لگا ہے۔

کسی تنگ نظر نقاد نے ایک بار رائے دی تھی کہ اگر اردو شاعری میں فیض نہ ہوتا تو ساحر لدھیانوی کا وجود بھی نہ ہوتا — یہ بات تو بالکل ایسی ہے جیسے کوئی لکھ دے کہ اگر غالب نہ ہوتا تو فیض نہ ہوتا۔ اگر میر نہ ہوتا تو ناصر کاظمی نہ ہوتا — لیکن ایسی کسی بھی رائے کے باوجود وقت نے ثابت کردیا ہے کہ ساحر ایک منفرد شاعر ہے اور آج سے پچاس برس بعد جب ایسی رائے دینے والے نقاد لائبریریوں کے شیلفوں میں دفن ہوچکے ہوں گے ساحر پھر بھی بے شمار دلوں کی دھڑکنوں میں بستا رہے گا، اور امر رہے گا۔ ساحر عظیم شاعر ہے۔ ساحر نہایت ممتاز شاعر ہے۔

نظریات سے بحث نہیں ۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ساحر نے امن کا پرچار کیا ہے ۔ اور جب ۱۹۶۵ء میں ہند ۔ پاک جنگ کے موقع پر ساحر نے ایک خوبصورت نظم کہی تھی ۔ اس نظم کا ایک بند ہے ۔

برتری کے ثبوت کی خاطر
خوں بہانا ہی کیا ضروری ہے
گھر کی تاریکیاں مٹانے کو
گھر جلانا ہی کیا ضروری ہے

ساحر نے محبوس ماحول میں رہ کر اردو کی جس قدر خدمت کی ہے شاید کسی بڑے سے بڑے جغادری نے یہاں بھی اتنا کام نہ کیا ہو ۔ جب بھارت میں غالب کی صد سالہ برسی منائی گئی تو ساحر نے ایک عظیم نظم لکھی ۔ اور واضح طور پر اس میں حکومت اور اس کے کارپردازوں پر تنقید کی کہ انہوں نے اردو پر کیا کیا ظلم ڈھائے ہیں ۔ ساحر دو سال تک مسلسل فلم ورکرز فیڈریشن کا بلا مقابلہ صدر منتخب ہوتا رہا تھا ۔ یہ فیڈریشن فلم سے متعلق ہر شعبے کی یونین کے عہدیداروں سے ترتیب پاتی تھی ۔ اور جب بھارتی فلم سنسر بورڈ نے سنسر سرٹیفکیٹ دیتے وقت اس پر ہندی فلم کا لیبل لگانا چاہا تو سب سے پہلے احتجاج کی آواز اس نے اٹھائی ـــ مگر ہوا یوں کہ خود اردو ہی کے کچھ دوسرے شاعروں نے ساحر کے موقف کی مخالفت کی اور یہ احتجاج موثر نہ ہو سکا ۔

ساحر کم گو شاعر تھا اس نے کم کہا مگر ستھرا اور سچا کہا ـــ گزشتہ ربع صدی سے وہ فلم سے متعلق تھا اس لئے اس کی بیشتر شاعری فلم کی نذر ہوتی گئی ۔ مگر وہ ایسا شاعر تھا جس نے وہاں بھی نئے انداز پیدا کئے ، نئی روایتوں کو جنم دیا ۔ اس نے شعر اور شاعری کی آبرو کو قائم کیا ۔ اور اب ایسا نقش کندہ کر گیا ہے کہ کوئی آنے والا شاعر فلم کی دنیا میں سبک سار نہیں ہو گا ۔ اس نے گلوکاروں اور موسیقاروں کے جھوٹے بھرم کو پاش پاش کیا ۔ اور یہ ثابت کیا کہ اصل چیز شاعری ہے ، آواز اور ساز ثانوی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اور اس وقت جب وہ فلم کے سمندر میں بڑے بڑے مگرمچھوں کے سامنے ایک نومولود مچھلی کی طرح تھا اس نے لتا منگیشکر جیسی مغنیہ اور شنکر جے کشن جیسے موسیقار سے ٹکر لی اور آخر انہیں اپنا معترف کر دیا ۔

وہ تادم مرگ سب سے مہنگا اور ایک لحاظ سے سب سے نک چڑھا فلمی شاعر تھا ۔ کہانی پسند آئے ، موسیقار مرضی کے مطابق ہو ، ہدایت کار میں سوجھ بوجھ ہو اور گانے والے سلیقے کے ہوں تو وہ گیت کی حامی بھرتا تھا ۔ بڑے بڑے مارواڑی سیٹھ اردو زبان سے ناآشنا ہونے کے باوجود ساحر کے نام سے آشنا تھے اور اس کے گھر کے باہر ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے

جاں نثار خود بہت بڑا شاعر تھا ۔ مگر جب اس نے فلم بنائی تو گیت ساحر سے لکھوائے ۔ بات فلم کے حوالے میں کھپ رہی ہے مگر ذکر چونکہ ساحر اور اس کی شاعری کا ہے اس لئے یہ حوالے آنے ضروری ہیں کہ اس فلم کے لئے لکھی ہوئی شاعری بھی ادب کے معیار پر پوری اترتی ہے ۔ اور شاعری اور اردو کی سربلندی اور سرفرازی اسی سے عبارت ہے ۔ مشکل یہ ہے کہ ساحر پر کم سے کم وقت اور تھوڑی سی جگہ میں بہت کچھ نہیں لکھا جا سکتا ـــ اس کا انتخاب کرنے لگو تو یہ مرحلہ پیش ہوتا ہے کہ کسے رکھا جائے کسے چھوڑا جائے ۔ ساحر زندگی کا شاعر تھا ۔ ساحر زندگی ہے ۔ *

میرا دوست میرا ہمدم

پرکاش پنڈت (مرحوم)

ساحر کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔

۱۹۴۳ء میں جب وہ ساحر کم اور کالج کا طالب علم زیادہ تھا اور خود کو ساحر یعنی شاعر منوانے اور اپنا کلام 'تلخیاں' چھپوانے کے لئے لدھیانہ سے لاہور آیا تھا۔

۱۹۴۵ء میں جب 'تلخیاں' کی اشاعت کے ساتھ ہی اس نے شہرت کی کئی سیڑھیاں ایک دم طے کر لیں اور وہ اردو کے مشہور ادبی جریدے 'ادب لطیف' اور 'شاہکار' کا ایڈیٹر بنا تو اس سے میرا باقاعدہ تعارف ہوا۔

۱۹۴۸ء میں جب وہ شہرت کی بلندی پر پہنچ چکا تھا اور بمبئی کی فلمی دنیا سے نکل کر ایک مہاجر کی حیثیت سے لاہور میں آباد ہوا تھا تو میں نے ہندوستانی ادیبوں کے ایک غیر سرکاری وفد کی رکن کی حیثیت سے اس کے یہاں دو دن قیام کیا تھا۔

لیکن ان ملاقاتوں کے باوجود ساحر کی شخصیت اور اس کی بنیاد پر اس کی شاعری اس کے مطالعہ اور تجزیے کا مجھے حق نہ پہنچتا اگر ۱۹۴۹ء میں میری اس سے دہلی میں ملاقات نہ ہوتی۔

دہلی میں ساحر سے میری ملاقات اچانک تو تھی مگر تعجب خیز نہیں۔ لاہور میں اس کے یہاں دو دن رہ کر ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ساحر وہاں خوش نہیں رہ سکتا۔ ساحر وہاں اس لئے خوش نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ اسے اپنے چاروں طرف ایک ہی فرقے اور ایک ہی مذہب کے لوگوں کا جم غفیر نظر آتا تھا۔ وہاں قلم کی آزادی تھی نہ زبان کی۔ اور ان احباب کی جدائی تو اس کے لئے ناقابل برداشت ہو چکی تھی جو اپنے ناموں سے ہندو یا سکھ تھے اور جن کے ساتھ ساحر نے اپنی اس وقت تک کی زندگی گزاری تھی۔ اور میں نے دیکھا کہ ساحر کے ساتھ ساتھ اس کی والدہ کو بھی ہندوؤں کو اپنے یہاں دیکھ کر دلی مسرت ہوتی تھی۔ اس لئے دہلی میں جب میری ملاقات ہوئی تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوا اور جب اس نے اپنے مخصوص نٹ کھٹ انداز میں مجھے بتایا کہ پاکستان سرکار نے اس کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے ہیں تو میں نے اس کا سبب دریافت کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ دو ماہی رسالہ 'سویرا' میں، بحیثیت مدیر اس کے قلم سے پاکستان سرکار کے خلاف زہر کی چند ایک بوندیں ٹپک گئی تھیں۔

دہلی، ساحر کی منزل نہیں تھی، پڑاؤ تھا۔ وہ جلد سے جلد بمبئی پہنچنا چاہتا تھا، جہاں اس کے خیال میں فلمی دنیا اس کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی لیکن اس خیال سے کہ راہ گیر پڑاؤ کا بھی کچھ حق ہوتا ہے۔ اس نے پورا ایک سال دہلی کی نذر کر دیا اور میں اگرچہ ساحر سے اس کے بعد بھی لاتعداد بار ملتا رہا ہوں لیکن اسے اور اس کی شاعری کو بدرجہ اتم سمجھنے اور جانچنے پرکھنے کا موقع مجھے اسی ایک سال میں ملا جب کہ رسالہ 'شاہراہ' اور رسالہ 'پریت لڑی' کی ادارت کے سلسلے میں ہم دونوں نے نہ صرف ایک ساتھ کام کیا بلکہ ایک ساتھ ایک ہی مکان میں رہے۔ یوں برابر چار سال تک میں بمبئی میں بھی ساحر کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہ چکا ہوں اور کچھ سال پہلے اپنے گلے کے کینسر کے علاج کے سلسلے میں مہینوں اس کا مہمان رہ چکا ہوں۔

ساحر، ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے (اکثر دس گیارہ بجے سے پہلے وہ سو کر نہیں اٹھتا) اور معمول کے مطابق اپنے اپنے لمبے قد کی جلیبی بنائے، لمبے لمبے پیچھے کو پلٹنے والے بال بکھرائے، بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے کسی بھی نقطے پر مسمیریزم کی سی ٹکٹکی باندھے بیٹھا ہے کہ ایک طویل وقفے کے بعد معاً چلا اٹھتا ہے —— "چائے!"

اور صبح کی اس آواز کے بعد دن بھر اور موقع ملے تو رات بھر وہ لگاتار بولے جاتا ہے۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ کسی جگہ پر ٹک کر بیٹھ نہیں سکتا اور دوستوں، ملاقاتیوں کا مجمع تو اس کے لئے نعمت خداوندی ہے کہ وہ ان کو سگریٹ پر سگریٹ پیش کرتا ہے (خود سگریٹ کے دو ٹکڑے کر کے پیتا ہے تاکہ گلا خراب نہ ہو لیکن ٹکڑے ایک ساتھ پی جاتا ہے)، چائے کے پیالوں کے پیالے ان کے حلق میں انڈیلتا ہے (خود بھی دو چار پیالے پی لیتا ہے) اور اس دوران میں اپنی نظموں، غزلوں کے علاوہ درجنوں دوسرے شاعروں کے سیکڑوں اشعار جو اسے نظموں غزلوں کی طرح ہی زبانی یاد ہیں، بڑی دلچسپ تمہید کے ساتھ سناتا چلا جاتا ہے۔ صرف اپنی ، غزلیں اور دوسرے شعراء کی تخلیقات ہی نہیں اسے اپنی زندگی کا ہر چھوٹا بڑا واقعہ یاد ہے۔ اپنے دوستوں اور اخبار، رسالوں کے مدیروں کے پورے کے پورے خطوط یاد ہیں۔ اس کی شاعری کی مخالفت یا موافقت میں لکھی گئی ہر ہر سطر یاد ہے۔ یہاں تک کہ بچپن میں دیکھی ہوئی میڈن تھیٹر کی 'اندر سبھا' اور 'شاہ بہرام' نامی فلموں کے پورے کے پورے مکالمے یاد ہیں۔

اور رات کے دس گیارہ، بارہ یا ایک بجے جب اس کے دوست اور ملاقاتی دوسرے دن ملنے کا وعدہ کر کے یکے بعد دیگرے اس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور اگرچہ ایک آدھ مرد مجاہد اس وقت بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے، اسے بڑی تلخ قسم کی تنہائی کا احساس ہونے لگتا ہے اور نہ جانے کہاں سے اس کے اندر لاابالی پن کے جراثیم داخل ہو جاتے ہیں کہ دن بھر کا ہنس مکھ اور سادہ فطرت ساحر ایک دم بدل جاتا ہے۔ دن بھر کی باتوں کو (جن کا ایک ایک لفظ اسے یاد ہو جاتا ہے) دہرا دہرا کر وہ اپنے احباب کی حماقتوں اور بزعم خود غلط اداؤں پر (جن کی وہ صحیح تعریف کر چکا ہوتا ہے) طنز کے تیر برساتا ہے

دکیا پڑی کیا پدّی کا شوربا، کہہ کر ان کا مذاق اڑاتا ہے اور طے کرتا ہے کہ آئندہ وہ کبھی بھی 'بقراط' قسم کے ان دوستوں پر اپنا پیسہ اور وقت برباد نہیں کرے گا۔ لیکن دوسرے ہی دن جب ان دوستوں پر اس کی نظر پڑتی ہے تو وہ لپک کر انھیں اپنی باہوں میں بھر لیتا ہے، انھیں چائے کی بجائے وہسکی پلاتا ہے اور ڈٹ کر کھانا کھلاتا ہے اور ان کی خود پسندیوں اور خوش فہمیوں کی تعریف کر کے آپ ہی آپ ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔

یہ سوالیہ نشان راستہ چلتے چلتے کبھی بہت آگے نکل جاتا ہے، کبھی بہت پیچھے رہ جاتا ہے اک ذرا سی بات پر اکتا جانا شرما جانا، گھبرا جانا اس کی فطرت ہے۔ اور جہاں تک کوئی فیصلہ کرنے کا تعلق ہے، زندگی کے اہم مسائل تو درکنار، وہ کسی مشاعرے میں نظم یا غزل سنانے سے پہلے یہ بھی فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اس وقت اسے کیا چیز سنانی چاہیے۔ یہاں تک کہ کس قمیض کے ساتھ وہ کون سی پتلون پہنے اور ناشتے میں پراٹھے اور املیٹ کھائے یا توس مکھن۔ اس کے لئے بھی اسے اپنے پاس بیٹھے کسی مستقل یا عارضی، دوست کی مدد درکار ہوتی ہے اور شاید اسی لئے وہ اب تک شادی نہیں کر سکا۔ دوسروں کی پسند کی ہوئی لڑکی کو وہ پسند کرنا نہیں چاہتا اور خود پسند کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ساحر کی عادتوں یا اداؤں کو میں تصنع سمجھ کر کبھی کبھی اس سے بڑا ناپسندیدہ مذاق کر بیٹھتا تھا مثلاً وہ لباس کے بارے میں میری رائے لیتا تو میں بڑی سنجیدگی سے کپڑے چھانٹ کر اسے اچھا خاصا کارٹون بنا دیتا اور ناشتہ تو میں نے اسے کئی بار آئس کریم تک کا کروایا۔ لیکن رفتہ رفتہ مجھ پر یہ حقیقت ظاہر ہوتی گئی کہ وہ مذاق نہیں، ہمدردی کا مستحق ہے اگر یہ سب عادتیں اس نے خود نہیں ڈالیں، خودرو پودے کی طرح خود جڑ پکڑ گئی ہیں اور اس کی تہہ میں کار فرما ہیں ساحر کے وہ ناساز گار حالات ہیں۔ جن میں اس نے آنکھیں کھولیں، پروان چڑھا اور جو اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اس کی شخصیت کا جزو بن گئے۔"

عبدالحئی، ساحر ۱۹۲۱ء میں لدھیانہ کے ایک جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی اپنی والدہ کے علاوہ اس کے والد کی کئی بیویاں اور بھی تھیں۔ لیکن اکلوتا بیٹا ہونے کے سبب ساحر کی پرورش بڑے لاڈ و پیار میں ہوئی۔ مگر ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ اس کی زندگی کے خوشحال دروازے یکایک اس پر بند ہو گئے۔

شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آکر اس کی والدہ نے ساحر کے باپ سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور چونکہ ساحر نے عدالت میں اپنی ماں جی کو اپنے والد پر ترجیح دی تھی اس لئے اس کے بعد والد اور اس جائیداد سے ساحر کو محروم ہونا پڑا۔

اس طرح ساحر کی زندگی میں تلخیوں، مایوسیوں اور محرومیوں کے دور کا آغاز ہوا۔ عیش و آرام کی زندگی چھن تو گئی لیکن حسرت تو باقی رہی۔ نوبت والدہ کے زیورات فروخت کرنے پر آ گئی لیکن خودداری باقی رہی اور مقدمہ ہارنے پر اُس کے والد نے یہ دھمکی دے دی تھی کہ وہ ساحر کو مروا ڈالے گا یا کم سے کم اس کی ماں کے پاس نہ رہنے دے گا، اس لئے ممتا کی ماری ماں نے کچھ محافظ قسم کے ایسے لوگ ساحر پر تعینات کر دیئے جو ایک لمحہ کے لئے بھی اسے تنہا نہ چھوڑتے تھے۔ اس طرح ساحر کے دل میں نفرت کے جذبے کے ساتھ ساتھ ایک عجیب قسم کا خوف بھی

پنپتا رہا۔ نتیجے کے طور پر وہ ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہوگیا۔ اس نے محبت کی اور غربت، کم حوصلگی اور سماجی بندشوں کے سبب ناکام رہا۔ اور پھر اسے اپنی خواہش اور اپنی فطرت کے خلاف اپنا اور اپنی والدہ کا پیٹ پالنے کے لئے طرح طرح کی چھوٹی موٹی نوکریاں کرنا پڑیں۔ سسک سسک کر اور سُلگ سُلگ کر اس نے دنوں کو دھکّے دیئے قدم قدم پر غموں اور مسرتوں میں جنگ ہوئی، یہ جنگ عقل اور جذبے میں بھی ہوئی اور زندگی اور موت میں بھی ـــ اور یہی وہ جنگ تھی جس نے اسے ایک معمولی شخص سے ساحر بنا دیا اور اس کے دل و دماغ کی ساری تلخیاں شعروں کا لباس پہن کر باہر نکل پڑیں۔

شاعر کی حیثیت سے ساحر نے اس وقت آنکھ کھولی جب اقبال، جوش، جگر اور فراق کے بعد فیض، مجاز وغیرہ کے نغموں سے نہ صرف لوگ واقف ہو چکے تھے بلکہ شاعری کے میدان میں اُن کا طوطی بول رہا تھا۔ ایسے دور میں ظاہر ہے کوئی نیا شاعر اپنے ان قادر الکلام ہمعصر شعراء سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے ساحر پر بھی مجاز اور فیض کا خاصا اثر پڑا۔ بلکہ شروع شروع میں لوگوں کو اس کی شاعری پر فیض کے تتبع کا گمان ہوا۔ وہی نرم و نازک لہجہ، الفاظ وہی حسین ترش خراش اور وہی خواب میں ڈوبی ہوئی فضا ـــ لیکن ساحر کے ذاتی تجربات اس کے آڑے آئے اور اس طبقے کے خلاف (جس کا ایک فرد خود اس کا باپ تھا اور دوسرا فرد اس کی محبوبہ کا باپ تھا) نفرت اور بغاوت کا سیلابی نظریہ اس کے کام آیا اور دنیاوی رنج و غم میں تپ کر نکلے ہوئے شعور نے اسے راستہ سمجھایا۔ اور لوگوں نے دیکھا کہ فیض اور مجاز کی پیروی کرنے کے بجائے ساحر کے کلام پر اس کے ذاتی تجربوں کی مُہر ثبت ہے اور اس کا اپنا ایک منفرد رنگ بھی ہے۔ ساحر کے ذاتی حالات و تجربات ہی اس سے کہلوا سکتے تھے کہ ؎

مَیں اُن اجداد کا بیٹا ہوں جنہوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعتِ ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

[illegible]

°

کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گذرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی
مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے
نہ کوئی جادہ، نہ منزل، نہ روشنی کا سُراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
انہی خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر

میں جانتا ہوں مری ہم نفس مگر پھر یوں ہی
کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے

اور میں سمجھتا ہوں کہ ساحر کو جو اپنے بہت سے ہمعصر شاعروں سے الگ اور بلند مقام حاصل ہوا، اس کا بنیادی سبب اس کے یہی تجربے اور تجزیے ہیں جن میں فن کارانہ حسن کے علاوہ کسی اور طرح کی آمیزش کئے بغیر اس نے انھیں جوں کا توں پیش کر دیا۔ محبت کے درد و غم کے ساتھ اس کی شاعری میں ہمیں جو تلخی اور زہر نظر آتا ہے، وہ مانگے تانگے کا نہیں، اس کی اپنی ہی زندگی کی صدائے بازگشت ہے۔

ساحر بنیادی طور ایک رومانوی شاعر ہے۔ محبت میں ناکامی نے اس کے دل و دماغ پر اتنی کاری ضرب لگائی کہ زندگی کے دوسرے آلام پیچھے جا پڑے۔ راہوں میں حریری ملبوس، دیکھ کر سرد آہوں میں اپنی محبوبہ کو یاد کرنے کے سوا اسے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ ہر وقت اسے اپنی آنکھوں پر اپنی محبوبہ کی جھکی ہوئی پلکوں کا سایہ محسوس ہوتا اور وہ تڑپ تڑپ کر اس سے پوچھنے لگتا ؎

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی　　تیرے خوابوں میں کہیں میرا گذر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو　　میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

اور

میری درماندہ جوانی کی تمناؤں کے
مضمحل خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
تیرے دامن میں گلستاں بھی ہیں ویرانے بھی
میرا حاصل مری تقدیر بتا دے مجھکو

اور ممکن ہے کہ زندگی بھر وہ اپنی محبوبہ سے اسی طرح کے سوالات کرتا رہتا اور مناسب جواب نہ پانے پر مایوسی اور رحم و کرم کے گھنے اور گھناؤنے سائے تلے جا پناہ لیتا اور عورت کی محبت سے شروع ہونے والی اس کی شاعری عورت کی محبت تک ہی محدود ہو کر رہ جاتی ــــــ لیکن بار بار سوال کرنے پر بھی اسے کوئی دو ٹوک جواب نہ ملا، بلکہ ہر جواب نئے سوال کی شکل میں سامنے آنے لگا تو اس تکرار سے گھبرا کر اس نے سوچنے کی عادت ڈالی ــــ ایسا کیوں ہوا؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اور وہ اس نتیجے پر آپہنچا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اور اس طرح اُس کا ذاتی عشق مختلف مراحل سے گذرتا ہوا بالآخر اس مقام تک پہنچ گیا جہاں ذاتی عشق یا محبت، اجتماعی عشق و محبت میں بدل جاتا ہے اور شاعر اپنی محبوبہ کا ہی نہیں بنی نوع انسان کا عاشق بن جاتا ہے اور ؎

تم کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے

کہتے کہتے پہلے اپنی محبوبہ سے دبی آواز میں کہتا ہے ؎

میں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے

اور پھر بڑے واضح الفاظ میں یوں کہہ اٹھتا ہے

تمہارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے
نجات جن سے میں اک لمحہ پا نہیں سکتا
یہ اونچے اونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے
ہر ایک گام پہ بھوکے بھکاریوں کی صدا
یہ کارخانوں میں لوہے کا شور و غل جس میں
ہے دفن لاکھوں غریبوں کی روح کا نغمہ
گلی گلی میں یہ بکتے ہوئے جواں چہرے
حسین آنکھوں میں افسردگی سی چھائی ہوئی
یہ شعلہ بار فضائیں یہ میرے دیش کے لوگ
خریدی جاتی ہیں اٹھتی جوانیاں جن کی
یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو
اداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو
تمہارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ ساحر کی زخم خوردہ روح نے جس قدر اسے تڑپایا اور کرب و بلا میں مبتلا رکھا، اس کے اندر اسی قدر ان غموں سے لڑنے اور ان پر فتح پانے اور انھیں مسرتوں میں بدلنے کی ضد سی پیدا ہوتی گئی اور اپنی اسی ضد میں اس نے ان تمام موضوعات کو گرفت میں لینے کی کوشش کی جو اُس کے اور اس صدی کے سامنے ہیں۔ اگرچہ کچھ موضوعات کو وہ شاعری کا اس قدر حسین لباس پہنانے میں زیادہ کامیاب نہیں رہا جس قدر اپنے مخصوص موضوع، محبت، کو۔ اور کہیں کہیں تو وہ جوشِ جذبات میں اپنے حدود سے اتنا باہر نکل گیا کہ تعجب ہوتا ہے، زندگی بھر خود کو شاعر منوانے کی کوشش کرنے والا ساحر کیوں اس بات پر مُصر ہے کہ لوگ اسے فن کار نہ مانیں اور جب اس نے عہد کیا کہ ؎

آج سے اے مزدور کسانو! میرے راگ تمہارے ہیں
فاقہ کش انسانو! میرے جوگ بہاگ تمہارے ہیں

اور

آج سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا

تو شک سا ہوا کیا واقعی ساحر اتنا کڑا عہد کر رہا ہے اور مستقل طور پر وہ اپنے اس فیصلے پر قائم رہ سکے گا؟ کیا اب وہ کبھی ایسے گیت نہ گائے گا جن میں ؎

. . . . . . امید بھی تھی پسپائی بھی
موت کے قدموں کی آہٹ بھی، جیون کی انگڑائی بھی
مستقبل کی کرنیں بھی تھیں حال کی بوجھل ظلمت بھی
طوفانوں کا شور تھا اور خوابوں کی شہنائی بھی

یعنی زندگی کا ایک پہلو ہی نہیں تمام رنگ روپ موجود رہیں گے۔

خوش قسمتی سے ساحر اردو غزل کا روایتی 'معشوق'، ثابت ہوتا ہے اور اپنے وعدے سے پھر جاتا ہے، پھرتا نہیں تو دامن ضرور بچاتا ہے اور یہاں وہاں دو چار جلوے دکھانے کے بعد واپس اپنے بت خانے یا حدود میں لوٹ آتا ہے۔ اسے احساس ہو جاتا ہے کہ اس کا کام 'پرچم لہرانا' نہیں 'بربط پر گانا' ہے۔ ؎

تم سے قوت لے کر اب میں تم کو راہ دکھاؤں گا
تم پرچم لہرانا ساتھی میں بربط پر گاؤں گا

پرچم کی اپنی اہمیت ہے اور بربط کی اپنی۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ بربط بجانے والے ہاتھوں نے جب جذبات میں آکر یا کسی بھی سبب سے بربط کے ساتھ ساتھ پرچم اٹھانے کی کوشش کی تو بربط بھی ٹوٹ گیا اور پرچم بھی نہ لہرا سکا۔ اور یہ تو سراسر غلط رجحان ہے کہ صرف مزدوروں اور کسانوں کے بارے میں لکھ کر ہی کوئی قلمکار اپنے آپ کو ترقی پسند شاعر یا ادیب کہلانے کا حقدار بن سکتا ہے۔ ہمارا سماج مختلف طبقوں میں منقسم ہے اور ہمارے فنکار الگ الگ طبقوں سے آئے ہیں۔ اگر کوئی شاعر یا ادیب کسی وجہ سے اپنے حدود سے باہر نہیں نکل پاتا مگر وہ ذہنی طور سے باشعور ہے تو اپنی حدود میں رہتے ہوئے بھی وہ صحت مند، عینیت پسند اور ترقی پسند ادب تخلیق کر سکتا ہے۔ بورژوا اور اونچے درمیانہ طبقے کا ادیب اپنے طبقے کی بے عملی اور بے راہ روی دکھا کر اتنا ہی بڑا کام انجام دے سکتا ہے جتنا کی طبقاتی جدوجہد میں براہ راست حصہ لینے والا کوئی مزدور یا کسان۔ اس کے برعکس اپنے حدود میں رہتے ہوئے اگر کوئی شاعر یا ادیب فیشن کے طور پر، یہ جانے بغیر کہ کپڑا بننے کی مشین کے پاس مزدور کھڑا ہو کر کام کرتا ہے یا لیٹ کر، یا دھان کس موسم میں بویا جاتا ہے اور گیہوں کی بالیوں کا کیا رنگ ہوتا ہے، مزدوروں اور کسانوں پر قلم اٹھائے گا تو اس کی تخلیق میں وہ خوبی پیدا نہ ہو سکے گی جو تجربے اور مشاہدے پر منحصر ہوتی ہے اور بلاشبہ ادبِ عالیہ کی بنیاد بھی ——

تجربات ومشاہدات کے تخلیقی استعمال پر ہے خوش نصیبی سے ساحر بحیثیت ہمیں وہی دیتا ہے جو تجربات وحوادث کی شکل میں دنیا نے اُسے دیا۔

"تجربات وحوادث" کے علاوہ دنیا نے اسے بنگلے اور موٹریں بھی دیں، پدم شری کا اعزاز اور سوویت نہرو انعام عطا کیا، لدھیانہ میں اس کے نام پر ایک سڑک اور ہندوستانی فوجیوں نے اس کے نام پر ایک چوکی منسوب کی اور اس کی کئی نظموں کا ہندوستانی زبانوں کے علاوہ انگریزی، روسی، عربی، فارسی، چیک وغیرہ زبانوں میں تراجم ہوئے۔

☆

برصغیر کا مایہ ناز شاعر

عبدالقیوم ۔ کراچی

یوں تو متعدد فلمی شعراء نے بھارتی فلمی صنعت کو لاکھوں نغمے دیئے لیکن جب بھی ناقابل فراموش نغمات کا ذکر آئے گا تو ان میں ساحر کا نام سرفہرست رہے گا۔

یوں تو شکیل بدایونی، جاں نثار اختر اور مجروح سلطان پوری اور متعدد دوسرے شعراء نے فلمی نغموں میں اردو ادبی رنگ کو نمایاں طور پر پیش کیا۔ لیکن ساحر کا رنگ ہی منفرد تھا۔ وہ جس طرح اردو ادب کے صفِ اول کے شاعر تھے اسی طرح فلمی صنعت کے بھی چوٹی کے شاعر تھے۔ ان کے گیتوں میں بھی عامیانہ پن اور تک بندی نہیں تھی حالانکہ عام طور پر فلمی شاعر موسیقار کی دھن پر گیت لکھتے ہیں۔ لیکن ساحر کے گیتوں اور غزلوں میں اتنی موسیقت ہوتی تھی کہ کوئی بھی سنگر اور موسیقار انہیں فلم کے لئے اپنانے میں خطرہ نہیں سمجھتا تھا۔

یوں تو ساحر لدھیانوی فلمی دنیا میں آنے سے پہلے ہی منفرد شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ لیکن فلمی دنیا میں آنے کے باوجود بھی انہوں نے اردو ادب کے لئے بہترین غزلیں اور لکھنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کی چند مشہور نظمیں اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ مثلاً طویل نظم پرچھائیاں۔ پڑھ کر ساحر کے سیاسی اور سماجی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ "تاج محل" پر انکی نظم ہمیشہ زندہ رہے گی۔

ساحر لدھیانوی کی تحریر میں عوامی دکھ درد سمویا گیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب انہیں فلمی دنیا میں عروج ملا اور زندگی کی آسائشیں اور آسانیاں میسر آئیں تو ان کا ناطہ عوام سے کم ہو گیا۔ لیکن کبھی کبھار وہ اس ناطہ کی تجدید اپنے کلام کے ذریعے کر دیا کرتے تھے۔ وہ ترقی پسند ذہن کے مالک تھے۔ اس سلسلے میں نقاد ان کے اس گیت کا حوالہ دیتے ہیں جسے محمد رفیع نے اپنی پاٹ دار آواز کے ذریعہ زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

دراصل فلم کی سچوایشن کچھ یوں تھی کہ ایک ہندو کو ایک لاوارث بچہ پڑا ملا۔ وہ اُسے اٹھا کر اپنے گھر لے آتا ہے اور جب ہندوؤں کو پتہ چلتا ہے کہ یہ بچہ مسلمان کا ہے تو وہ آگ بگولا ہو جاتے ہیں اور بچے کے ناپاک وجود سے بڈھے کے گھر کو پاک کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور جب بڈھا تنگ آجاتا ہے تو ایک رات وہ لوری کے انداز میں بچے کو جھولا جھلاتے ہوئے یہ گیت گاتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس گیت کا ایک ایک شعر انسانیت کے احترام میں ڈوبا ہوا ہے۔

اسی طرح ساحر لدھیانوی کا ایک گیت ہے عورت کے بارے میں، جسے لتا منگیشکر نے بڑے ہی موثر انداز میں گایا ہے۔

عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اُسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا جب جی چاہا دھتکار دیا

یہ گیت ان مردوں کے منہ پر ایک طمانچہ ہے جو عورت کی بے بسی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور پھر انہیں جائز حقوق دینے کے بھی روادار نہیں ہیں۔ میرے اپنے خیالوں میں عورت کی عظمت کے بارے میں کوئی فلمی گیت اس قدر موثر انداز میں اب تک نہیں لکھا گیا جتنا یہ گیت ہے اس کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

جن سینوں نے ان کو دودھ دیا ان سینوں کا بیوپار کیا
جس کوکھ میں اُن کا جسم ڈھلا اس کوکھ کا کاروبار کیا
جس تن سے اُگے کونپل بن کر اس تن کو ذلیل و خوار کیا
عورت نے جنم دیا مردوں کو ....

عورت سنسار کی قسمت ہے پھر بھی تقدیر کی ہیٹی ہے
اوتار پیمبر جنتی ہے پھر بھی شیطان کی بیٹی ہے
یہ وہ بدقسمت ماں ہے جو بیٹوں کی سیج پہ لیٹی ہے
عورت نے جنم دیا مردوں کو ....

اس طرح فلم "پھر صبح ہوگی" میں مکیش نے ساحر کا گیت گایا جس میں مستقبل کے سہانے خوابوں کا ذکر ہے۔ جب انسان کی قدر کی جائے گی دولت کی نہیں۔ جب عورت کی عصمت کو چند سکوں کے عوض نیلام نہیں کیا جائے گا۔ جب لوگ بھوکے ننگے نہیں رہیں گے جب بوڑھے اور لاوارث بچے بے سہارا ہونے پر در در کی ٹھوکریں نہیں کھائیں گے اور نہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں گے۔ جب دولت کی ترازو میں محبت کو نہیں تولا جائے گا۔ اور ارمانوں کی قدر کی جائے گی۔ غرض یہ کہ اُن کے فلمی گیت سماجی انصاف کی پکار ہیں اور ظلم کی مذمت کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے بول ہیں:۔

'وہ صبح کبھی تو آئے گی'۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

مجبور بڑھاپا جب سونی راہوں کی دھول نہ پھانکے گا
معصوم لڑکپن جب گندی گلیوں میں بھیک نہ مانگے گا

حق مانگنے والوں کو جس دن سولی نہ دکھائی جائے گی

وہ صبح کبھی تو آئے گی . . .

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ساحر لدھیانوی کے ہلکے پھلکے گیتوں کی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔
ملاحظہ ہوں، فلم "تاج محل" میں محمد رفیع اور لتا کا ایک ڈویٹ "جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا" آج بھی کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔

فلم "گمراہ" میں مہندر کپور کا گایا ہوا یہ گیت کون بھول سکتا ہے۔

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

اور حق بات یہ ہے کہ محمد رفیع کے اس شاگرد نے جس طرح ڈوب کر یہ گیت گایا ہے اس کا جواب نہیں۔
اسی طرح فلم "برسات کی رات" میں محمد رفیع کا گایا ہوا یہ گیت جوان دلوں کے تاروں کو چھیڑ کر ہلچل مچا دیتا ہے۔

زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات

ایک انجان حسینہ سے ملاقات کی رات

فلم "دلیو داس" میں لتا کا گایا ہوا گیت ہمیشہ شوق سے سنا جائے گا۔

جسے تو قبول کر لے وہ ادا کہاں سے لاؤں

تیرے دل کو جو لبھائے وہ صدا کہاں سے لاؤں

اس گیت کا ایک بند ملاحظہ ہو:

میں وہ پھول ہوں کہ جس کو گیا ہر کوئی مسل کے

میری عمر بہہ گئی ہے میرے آنسوؤں میں ڈھل کے

جو بہار بن کے برسے وہ گھٹا کہاں سے لاؤں

تیرے دل کو جو لبھائے وہ . . . . .

اس کے علاوہ ان سدابہار گیتوں کو بھلا کون بھلا سکتا ہے:

۱۔ جائیں تو جائیں کہاں، سمجھے گا کون یہاں

درد بھرے دل کی زباں — طلعت محمود

۲۔ میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی — محمد رفیع

۳۔ محفل سے اٹھ جانے والو تم لوگوں پر کیا الزام

تم آباد گھروں کے باسی میں آوارہ بدنام

میرے ساتھی خالی جام — محمد رفیع

۵۔ جو بات تجھ میں ہے تری تصویر میں نہیں — محمد رفیع

۶۔ یہ بہاروں کا سماں چاند تاروں کا سماں

کھو نہ جائے آ بھی جا — ہیمنت کمار

۷۔ تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے

ہم بھری دنیا میں تنہا ہو گئے — لتا

۸۔ تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالے

اپنے پہ بھروسہ ہے تو یہ داؤ لگالے — گیتا دت

۹۔ بھولے سے محبت کر بیٹھا ناداں تھا بے چارا دل ہی تو ہے — مکیش

۱۰۔ مجھے گلے سے لگالو بہت اداس ہوں میں — آشا بھونسلے

ساحر لدھیانوی کی موت دراصل اس شاعر کی موت ہے جس نے اردو کی شمع کو بھارتی فلمی صنعت میں مرتے دم تک فروزاں رکھا۔
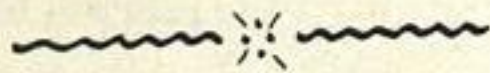
اشاریہ
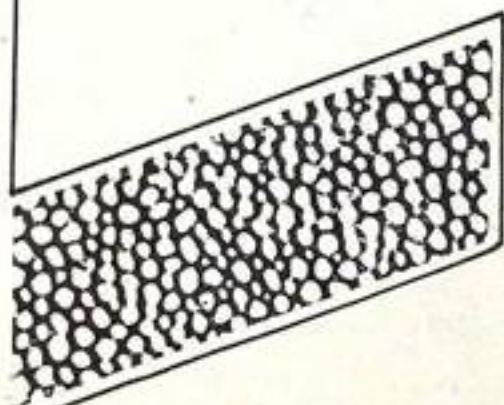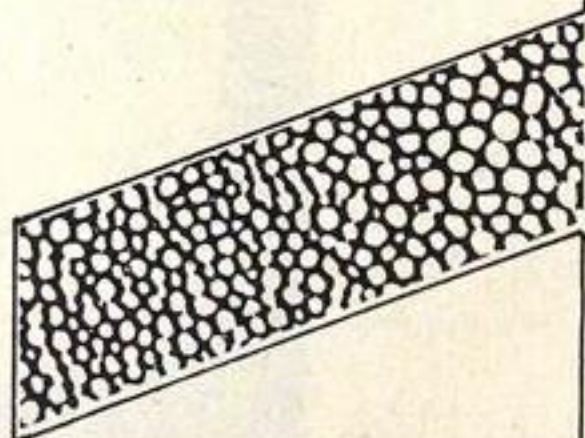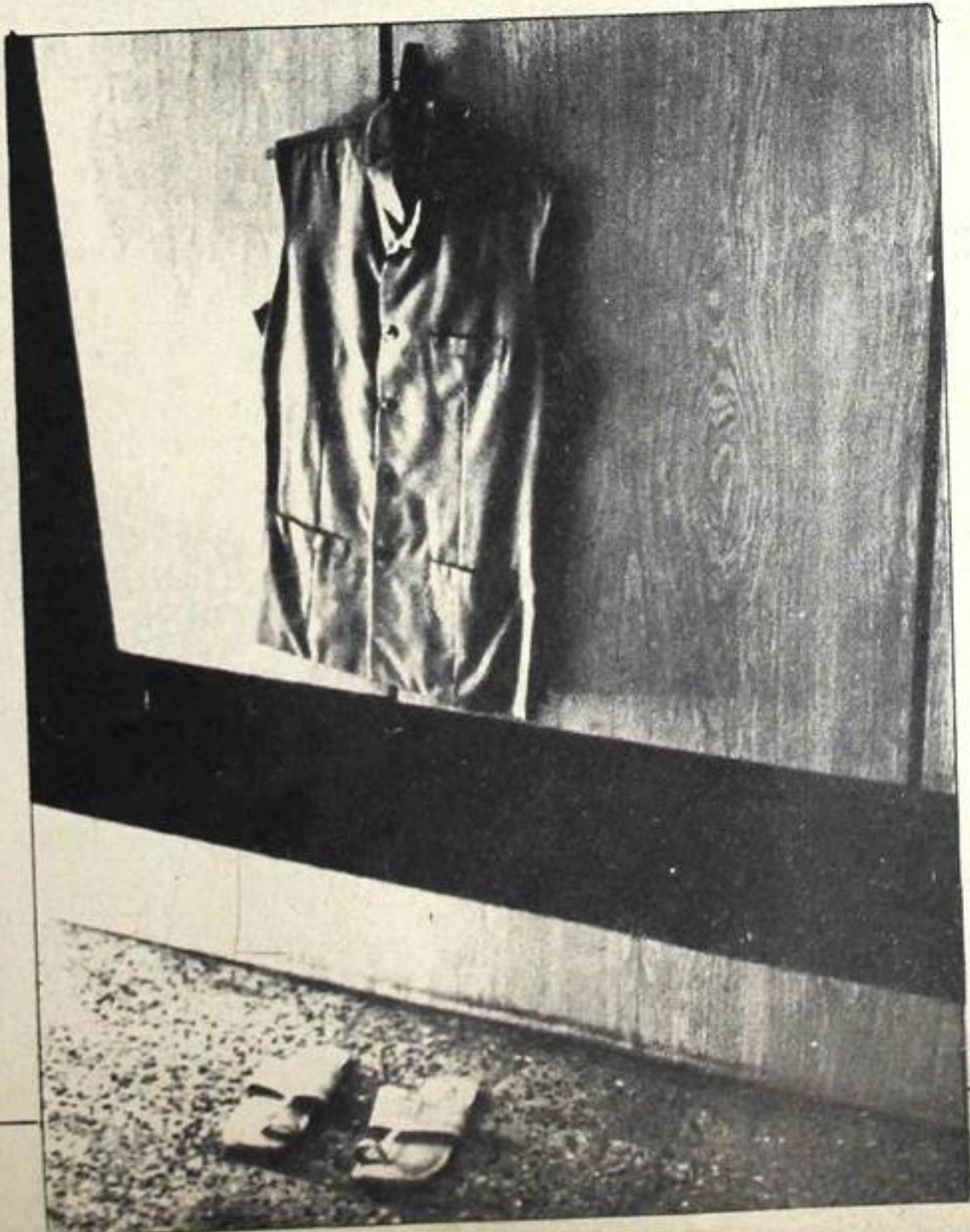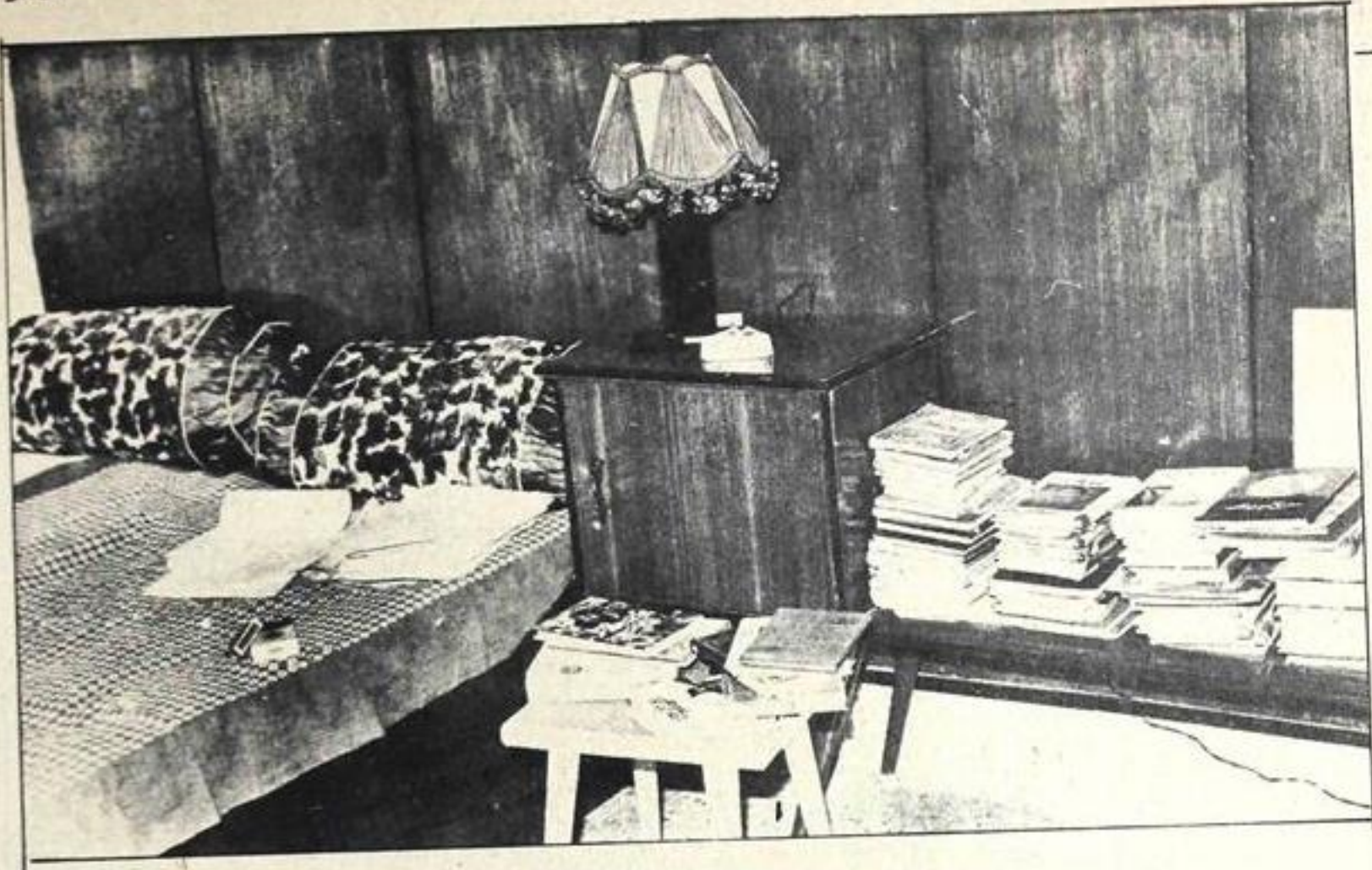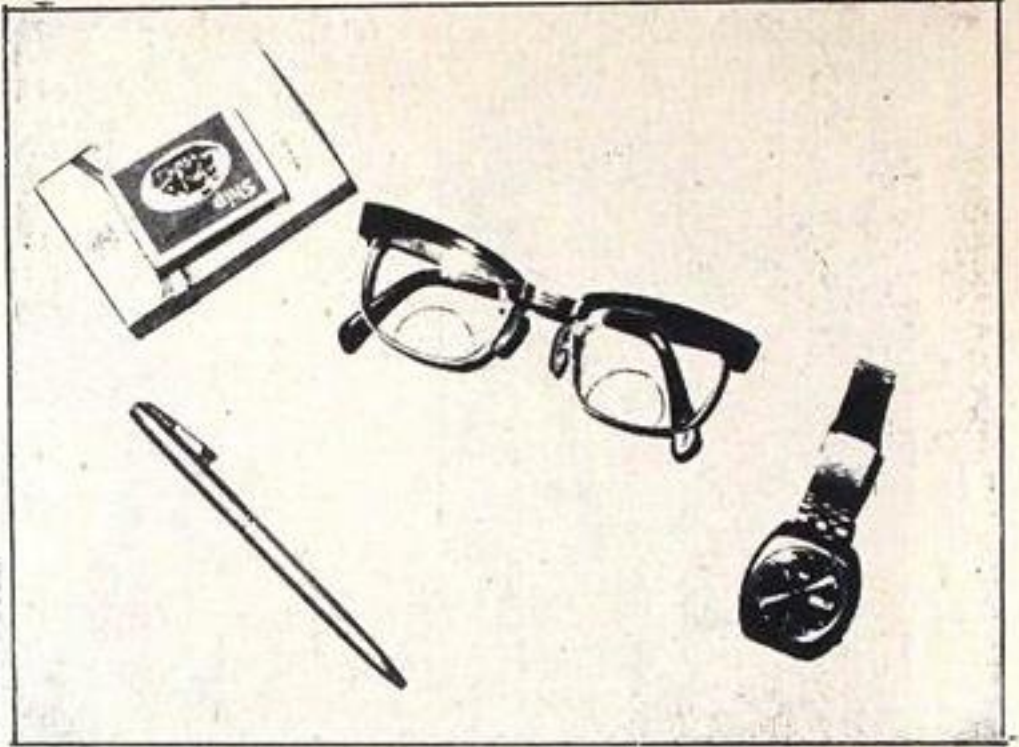
انورؔ بھائی کی یاد میں سراپا غم زدہ

Kaala
Patthar
100 WEEKS
TRISHUL

Silver
Jubilee
DIAMOND JUBILEE

Laila Majnu
Kabhi
Kabhie

Bhai Ho To Aisa
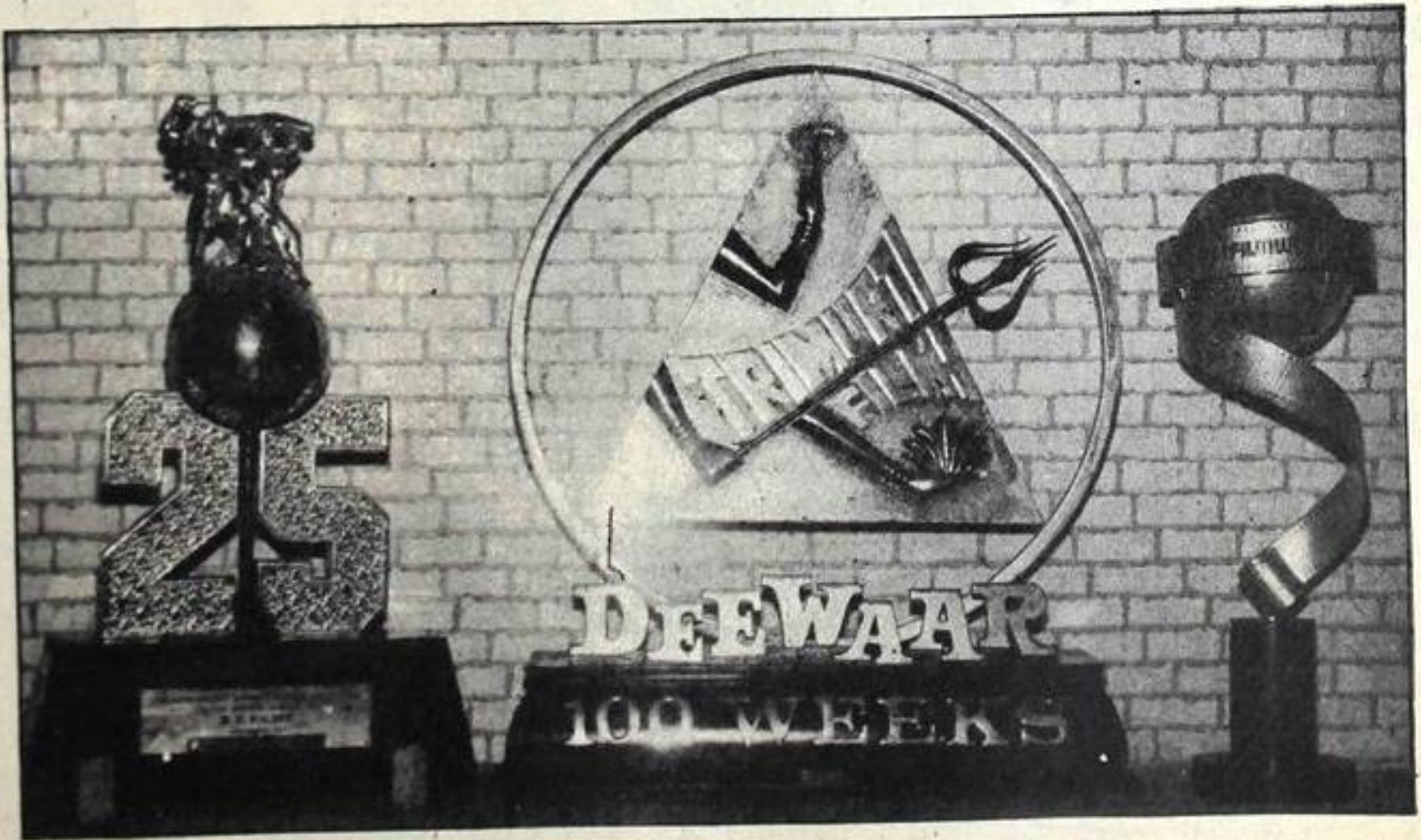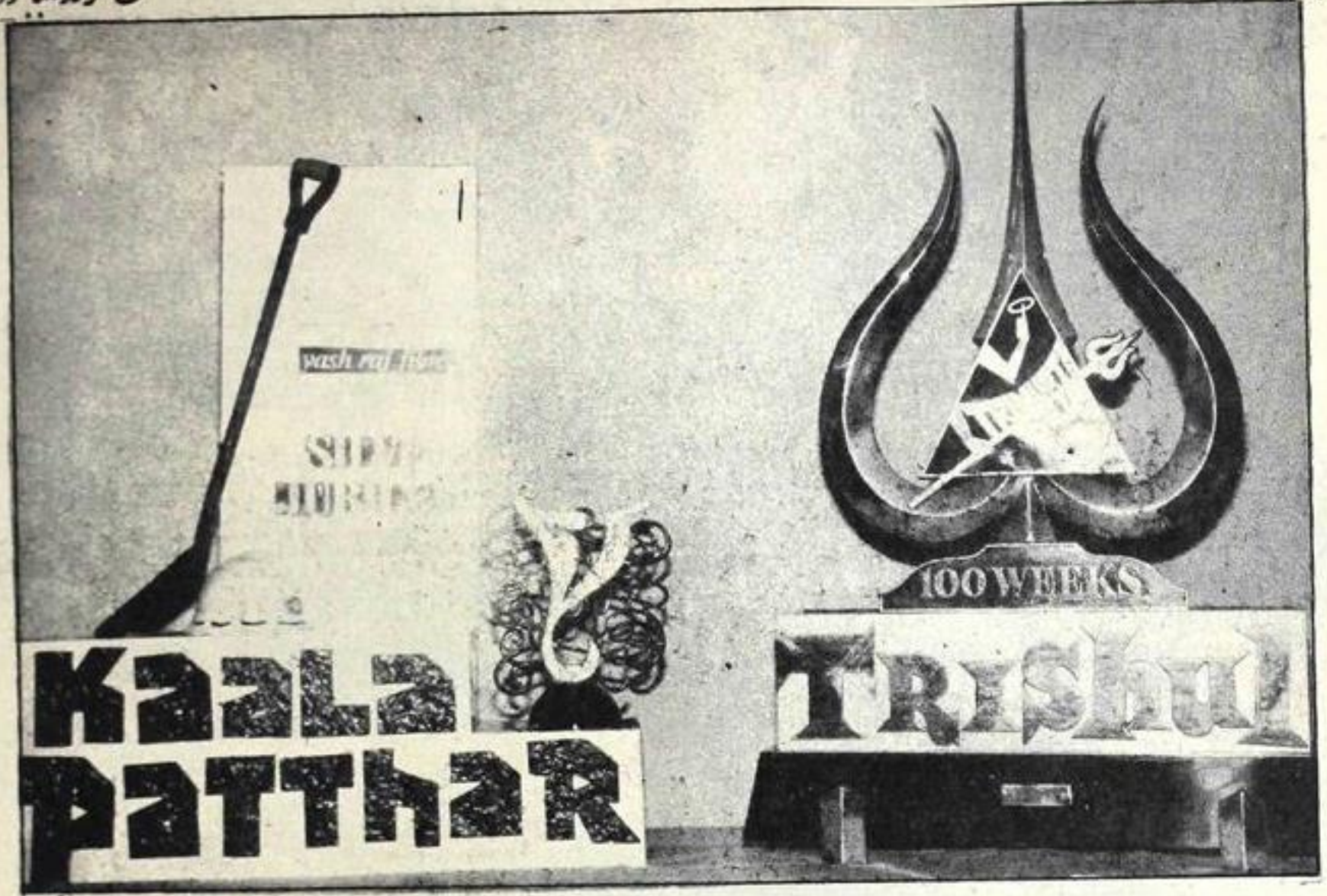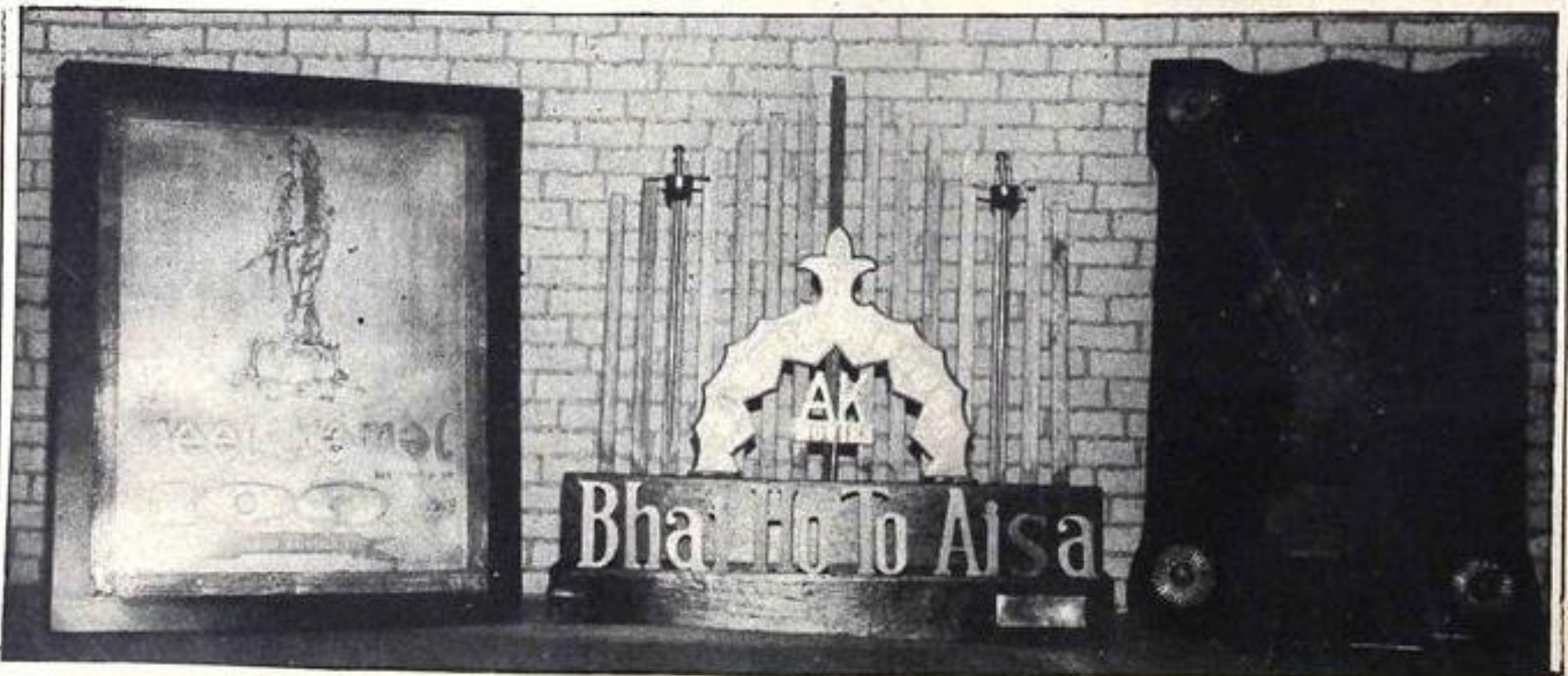
آج کا پیار تھوڑا بچا کر رکھو

آپ کیا جانیں مجھ کو سمجھتے ہیں کیا
میں تو کچھ بھی نہیں
اس قدر پیار، اتنی بڑی بھیڑ کا۔ میں رکھوں گا کہیں ؟
اس قدر پیار رکھنے کے قابل نہیں۔ میرا دل میری جان
مجھ کو اتنی محبّت نہ دو دوستو
پیار اک شخص کا بھی اگر مل سکے
تو بڑی چیز ہے زندگی کے لئے
آدمی کو مگر یہ بھی ملتا نہیں۔ یہ بھی ملتا نہیں
مجھ کو اتنی محبّت ملی آپ سے
یہ میرا حق نہیں، میری تقدیر ہے
میں زمانے کی نظروں میں کچھ بھی نہ تھا
میری آنکھوں میں اب تک وہ تصویر ہے
اس محبّت کے بدلے میں کیا نذر دوں
میں تو کچھ بھی نہیں
عزتیں۔ شہرتیں۔ چاہتیں۔ الفتیں
کوئی بھی چیز دنیا میں رہتی نہیں
آج میں ہوں جہاں کل کوئی اور تھا
یہ بھی اک دور ہے وہ بھی اک دور تھا
آج اتنی محبت نہ دو دوستو
کہ میرے کل کے لئے
کل جو گمنام ہے، کل جو سنسان ہے
کل جو انجان ہے، کل جو ویران ہے
میں تو کچھ بھی نہیں، میں تو کچھ بھی نہیں

مسیح پاک روح تھے

مسیح بے گناہ تھے
مگر انہیں بھی کیا ملا
یہی کہ اپنے واسطے صلیب خود اٹھا کے لاؤ
اور اپنے قاتلوں کی خواہشِ ستم کے کام آؤ
جو ہم گناہ چھوڑ دیں، ہمیں ملے گا کیا بتاؤ
کہ ہم مسیح بھی نہیں

بہشت میں نہ آدم اور حوا پاک رہ سکے
فرشتے اُن کو اس زمیں پہ ڈال کر چلے گئے
ہماری زندگی ہے کیا؟ انہی کے جرم کی سزا
گناہ اس کی ابتدا، گناہ اس کی انتہا
وہاں گناہ شوق تھا، یہاں گناہ بے بسی
کہ زندگی کے چار سانس کاٹنے کے واسطے
یہاں ہیں دو ہی راستے
ہے ایک راستہ گناہ، دوسرا ہے خودکشی
جو خود بھی اِک گناہ ہے

ہمارے اِرد گرد جتنے لوگ ہیں وہ سب گناہ گار ہیں
وہ سب سیاہ کار ہیں
انہی کی نسل سے ہیں ہم　　خدا کی نسل سے نہیں
گناہ کر لیا تو کیا؟　　کہ ہم مسیح بھی نہیں
مسیح پاک روح تھے
مسیح بے گناہ تھے

پیار کا تحفہ

(اپنے جگری دوست یش چوپڑہ کی شادی کے موقع پر)

کار گر ہو گئی احباب کی تدبیر اب کے
مانگ لی آپ ہی دیوانے نے زنجیر اب کے

جس نے ہر دام میں آنے میں تکلف برتا
لے اڑی اُس کو زلفِ گرہ گیر اب کے

جو سدا حُسن کی اقلیم میں ممتاز رہے
دل کے آئینے میں اُتری ہے وہ تصویر اب کے

خواب ہی خواب جوانی کا مقدّر تھے کبھی
خواب سے بڑھ کے گلے مِل گئی تعبیر اب کے

اجنبی خوش ہوئے اپنوں نے دعائیں مانگیں
اس سلیقے سے سنواری گئی تقدیر اب کے

یار کا جشن ہے اور پیار کا تحفہ ہیں یہ شعر
خود بہ خود ایک دعا بن گئی تحریر اب کے

۲۷ اگست ۱۹۷۰ء۔ دہلی

ورثہ

یہ وطن، تیری میری نسل کی جاگیر نہیں
سینکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اِسے

کتنے ذہنوں کا لہو، کتنی نگاہوں کا عرق
کتنے چہروں کی ضیا، کتنی جبینوں کی شفق
خاک کی نذر ہوئی تب یہ نظارے نکھرے

پتھروں سے یہ تراشے ہوئے اصنام جواں
یہ صداؤں کے خم و پیچ، یہ رنگوں کی زباں
چمنیوں سے یہ نکلتا ہوا پُر پیچ دھواں
تیری تخلیق نہیں ہے، میری تخلیق نہیں
ہم اگر ضد بھی کریں اس پہ تو تصدیق نہیں

علم سولی پہ چڑھا تب کہیں تخمینہ بنا
زہر صدیوں نے پیا تب کہیں نوشینہ بنا
سینکڑوں پاؤں کٹے، تب کہیں اِک زینہ بنا
تیرے قدموں کے تلے، یا میرے قدموں کے تلے
نوعِ انساں کے شب و روز کی تقدیر نہیں
یہ وطن تیری میری نسل کی جاگیر نہیں
سینکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اِسے

تیرا غم کچھ بھی سہی، میرا الم کچھ بھی نہیں

اہلِ ثروت کی سیاست کا ستم کچھ بھی سہی
کل کی نسلیں بھی کوئی چیز ہیں، ہم کچھ بھی سہی

اُن کا ورثہ ہوں کھنڈر، یہ ستم ایجاد نہ کر
تیری تخلیق نہیں جو اسے برباد نہ کر

جس سے دہقاں کو روزی نہیں ملنے پاتی
میں نہ دوں گا تجھے وہ کھیت جلانے کا سبق
فصل باقی ہے تو تقسیم بدل سکتی ہے
فصل کی خاک سے کیا مانگے گا جمہور کا حق

پل سلامت ہے تو پار اُتر سکتا ہے
چاہے تبلیغ بغاوت کے لئے ہی اُترے
ورنہ غالبؔ کی زباں میں مرے ہمدم، مرے دوست
دام موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
سوچ لے پھر کوئی تعمیر گرانے
تیری تعمیر سے ہے جنگ کی تخریب سے جنگ
اہل منصب ہیں غلط کار تو ان کے منصب
تیری تائید سے ڈھالے گئے، تو مجرم ہے
میری تائید سے ڈھالے گئے میں مجرم ہوں
پٹریاں ریل کی، سڑکوں کی بسیں، فون کے تار
تیری اور میری خطاؤں کی سزا کیوں بھگتیں

اُن پہ کیوں ظلم ہو جن کی کوئی تقصیر نہیں
یہ وطن تیری میری نسل کی جاگیر نہیں
سینکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اسے

تیرا شکوہ بھی بجا، میری شکایت بھی درست
رنگِ ماحول بدلنے کی ضرورت بھی درست
کون کہتا ہے کہ حالات پہ تنقید نہ کر
حکمرانوں کے غلط دعووں کی تردید نہ کر
تجھ کو اظہارِ خیالات کا حق حاصل ہے

اور یہ حق ___ کوئی تاریخ کی خیرات نہیں
تیرے اور میرے رفیقوں نے لہو دے دے کر
ظلم کی خاک میں اس حق کا شجر بویا تھا
سالہا سال میں جو برگ و ثمر لایا ہے

اپنا حق مانگ مگر ان کے تعاون سے نہ مانگ
جو ترے حق کا تصوّر ہی فنا کر ڈالیں
ہاتھ اٹھا اپنے، مگر ان کے جلو میں نہ اٹھا
جو ترے ہاتھ ترے تن سے جُدا کر ڈالیں

خواب آزادیٔ انساں کی یہ تعبیر نہیں
یہ وطن، تیری میری نسل کی جاگیر نہیں
سینکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اِسے

○

کرشن پھر آئیں گے

آج اس نظم کو پڑھ کر بڑا عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ جناب ساحر لدھیانوی نے یہ جذباتی تحفہ کرشن چندر کو ان کے جشن کے موقع پر نذر کیا تھا۔ آج جبکہ کرشن جا چکے ہیں۔ ساحر کی یہ نظم "کرشن نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پھر آئیں گے" بڑا دردبھرا احساس چھوڑتی ہے۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کرشن گئے نہیں۔ وہ اپنے ادب کے قیمتی خزانے میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

کرشن نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پھر آئیں گے
جب بھی دھرتی پر گناہوں کا اندھیرا چھایا
جب بھی ظلم اور شقاوت کا علم لہرایا
کرشن نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پھر آئیں گے

اور جب ایسے ہی حالات نے پنجے گاڑے
ظلم نے سولیاں وحشت نے شکنجے گاڑے
اور بھارت پہ کڑا وقت پڑا
کرشن پھر آئے غلاموں کا لہو گرمانے

کرشن پھر آئے مگر اب کی بار
بانسری کی جگہ ہاتھوں میں قلم تھا اُن کے

یہ قلم رسم و روایات کے آگے نہ جھکا
زنگ آلود خیالات کے آگے نہ جھکا
ظلم کے جبر کے آفات کے آگے نہ جھکا
صبح کا نور تھا یہ رات کے آگے نہ جھکا
اور جب ظلم کے بندھن ٹوٹے
قید افرنگ سے قیدی چھوٹے
یہ قلم اور بھی بے باک ہوا

اب اسے اپنا نہیں سارے جہاں کا غم تھا
سارے مظلوموں کا یہ ہمدم و دمساز بنا

اس کی آواز کو کانگو کی فضا جانتی ہے
الجزائر کے شہیدوں کی قبا جانتی ہے
کوریا کے دل صد چاک کو ہے اس کی خبر
ہیروشیما کی سم آلود ہوا جانتی ہے
ویتنام آج بھی سنتا ہے صدائیں اسکی
مصر کی ارض حسین اس کی وفا جانتی ہے
اپنے حق کے لئے لڑتی ہوئی ساری مخلوق
اس کی آواز کو پیغام بقا جانتی ہے

کرشن نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پھر آئیں گے
کرشن پھر آئے ....

مگر اب کی بار ہم انہیں دیر میں پہچان سکے
سارے سنسار نے جب جان لیا تب کہیں جان سکے
ہم بہت دیر میں یہ مان سکے
کرشن ایک ذات نہیں ایک عمل ہوتا ہے
کرشن ایک سلسلۂ جہد بقا ہے یعنی
آج ہوتا ہے کوئی اس کا نہ کل ہوتا ہے
کرشن ہر دور میں آتا ہے نیا روپ لئے
کرشن ہر دور کے ارمانوں کا پھل ہوتا ہے.

آخری بُرائی

شراب بند کرو، اب یہی بُرائی ہے
کہ جس سے ملک کی عزت پہ حرف آتا ہے

فساد بند ہوا لوٹ مار بند ہوئی
ہر ایک رسم جو تھی ناگوار، بند ہوئی
مکان بن گئے بے گھر بھکاریوں کے لئے
لباس سل گئے ننگی کنواریوں کے لئے
وطن میں خیر سے بے روزگار کوئی نہیں
وہ منصفی ہے کہ شکوہ گزار کوئی نہیں
کوئی مریض ترستا نہیں دوا کے لئے
کوئی ضعیف بھٹکتا نہیں عصا کے لئے
ستم کا، غم کا، جہالت کا دور ختم ہوا
تمیزِ بندہ و آقا مٹی، سب ایک ہوئے
وزیر خادمِ ملت، رئیس نیک ہوئے

شراب بند کرو، اب یہی بُرائی ہے
کہ جس سے ملک کی عزت پہ حرف آتا ہے

اِک دیا اور بُجھا

نظریاتی اختلافات کے باوجود ساحر صاحب کے شورش کاشمیری سے تعلقات، بہت گہرے تھے۔ یہ مرثیہ شورش کے چھوٹے بھائی یورش کاشمیری کی موت پر ساحر صاحب نے لکھا۔ جسے ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ یہ ان کے کسی مجموعے میں نہیں ہے۔

(ادارہ)

اِک دیا اور بُجھا اور بڑھی تاریکی
شب کی سنگین سیاہی کو مبارک کہہ دو
جاؤ بجھتی ہوئی آنکھوں کے سسکتے اشکو
جاؤ فرعون کی شاہی کو مبارک کہہ دو

جاؤ جمہور کے روندے ہوئے بے بس جذبو
جاؤ پگھلا ہوا، تپتا ہوا لاوا بن جاؤ
جاؤ معصوم جنازے کے فسردہ پھولو
جاؤ قانون کے ایوان پہ شعلے برساؤ

جاؤ اے وقت کے تاریک بھیانک سایو
میکڈانلڈ سے کہو اب کوئی زحمت نہ کرے
جاؤ اس قتل کے بالواسطہ مجرم سے کہو
اب کوئی وعدہ تکلف و مروت نہ کرے

جاؤ پنجاب کی سرکار سے جاکر کہہ دو
سینکڑوں سینوں میں چنگاریاں درخشندہ ہیں
موت ایوانِ وزارت پہ کھڑی ہنستی ہے
جاؤ اور خضر سے کہہ دو ابھی ہم زندہ ہیں

لہو میں بھیگی ہوئی پھانسیوں کے سائے میں
علم اٹھائے ہوئے آستیں چڑھائے ہوئے

نئے نظام نئے دور کی بشارت سے
فقیہہ و میر و سلاطیں کی نیند اڑائے ہوئے

حقیقتوں کے پیمبر مشیتوں کے رقیب
نقاب چہرہ ارض و سما اٹھائے ہوئے

فنا کے آہنی قدموں کے شور پیہم میں
سرود بربط ہستی کی لے بڑھائے ہوئے

بشر کی قوت و عظمت کے زمزمے گاتے
زمیں کے در پر جبین فلک جھکائے ہوئے

مرا سلام تمہیں اے مجاہدانِ حیات
حیات آج تم ہی سے ہے لو لگائے ہوئے

مرگھٹ کی سرزمیں سے

میرے تصوّرات کہن کی امین ہے تو
مرگھٹ کی سرزمین مقدّس زمیں ہے تو
اِک بے وطن اسیرِ محن کا سلام لے
آزردۂ بہارِ چمن کا سلام لے
فطرت ترے حرم پہ تقدس فشار ہے
تو میرے دل کی خاک کی سرمایہ دار ہے

ویرانیاں تری مجھے جنّت سے کم نہیں
یہ دھوپ مجھ کو سایۂ رحمت سے کم نہیں
گو تیرے راستوں میں ہر اک شو ببُول ھیں
دامن میں تیرے اس کی جوانی کے پھول ہیں
جو میری زندگی کی تمنّا بنی رہی
ذوقِ نیازِ روح کا کعبہ بنی رہی

حوریں ہیں تیرے پاک مناظر پہ گلفشاں
اے ارضِ شوق، اے مری امّید کے جہاں
مٹی مہک رہی ہے تری رہ گذار کی
اُرتھی گئی ہے یاں سے عروسِ بہار کی
بھر بھر کے اشک دیدۂ خوننابہ بار میں
موتی بچھاؤں گا میں تری راہ گذار میں

کندن سے کم نہیں مجھے راکھ اس دیار کی
دنیا لُٹی ہے یاں میرے صبر و قرار کی
اِن گھاٹیوں میں اشک بہانے کے واسطے
نقش و نگارِ زیست مٹانے کے واسطے
آیا ہوں دل میں داغِ تمنا لئے ہوئے
برباد حسرتوں کا سہارا لئے ہوئے

اے ارضِ پاک تجھ سے مرے دل کو ہے گِلہ
تو نے مری امید کو کیوں راکھ کر دیا
کیوں میری زندگی کو جہنم بنا دیا
کیوں ایک بے گناہ کلی کو جلا دیا
کیوں مجھ سے میری روح کی تنویر چھن گئی
کیوں ایک حور آگ کے شعلوں کو سونپ دی

تجھ سے بھی انتظار کی زحمت نہ ہو سکی
محفوظ دو گھڑی وہ امانت نہ ہو سکی
اک بے وطن کے درد کا چارہ نہ ہو سکا
میں دیکھ لوں اسے یہ گوارا نہ ہو سکا
یہ دوپہر، یہ دھوپ، یہ ویران آسماں
تو ہی بتا کہ اب میں پکاروں کسے یہاں

کوثر میں وہ دُھلی ہوئی باہیں بھی جل گئیں
جو دیکھتیں مجھے وہ نگاہیں بھی جل گئیں
عنبر سرشت گیسوئے شب گوں بھی جل گئے
وہ دیدہ ہائے مست وہ پُر افسوں بھی جل گئے
معصوم قہقہوں کا ترنم بھی مٹ گیا

جھینپی ہوئی نظر کا تبسم بھی مٹ گیا

اب میری آرزوؤں کی جنت یہ راکھ ہے
سرمایۂ حصولِ محبت یہ راکھ ہے
یہ میری شاعری کی کہانی کی راکھ ہے
یہ راکھ ایک پاک جوانی کی راکھ ہے
یہ راکھ میرے دل کی تمنا کی راکھ ہے
ذوقِ طلب کی "جرأت تنہا" کی راکھ ہے

اس راکھ میں فلک کے ستاروں کا نور ہے
اس راکھ میں زمین کی معصوم حور ہے
شعلے پھر ایک بار اسی راکھ سے اٹھا
اور ختم کر دے میرے مصائب کا سلسلہ

آزاد وطن کو دیکھ ذرا

لے میرے بدن کو دیکھ ذرا
اندر سے ایسی ہوتی ہے بیٹی کو بہن کو دیکھ ذرا

خوش حال ہے تو، زردار ہے تو مجبور ہوں میں مختار ہے تو
عزت ہو کہ محنت مفلس کی ہر نعمت کا حق دار ہے تو
جلووں کی پھبن کو دیکھ ذرا

جنگل میں یہی کچھ ہوتا ہے جنگل ہی کی اولاد ہے تو
تہذیب ہے کیا، اخلاق ہے کیا اِن چیزوں سے آزاد ہے تو
عزت کے کفن کو دیکھ ذرا

قانون ملازم ہے تیرا اسی جرم کو اک تفریح سمجھ
جس نسل پہ تیرا سایہ ہے اس کے کل کی تشریح سمجھ
وحشت کے چلن کو دیکھ ذرا

کپڑے ہی نہیں، روٹی کیلئے یاں کھال بھی نوچی جاتی ہے
بیٹی ہو، بہن ہو یا ماں ہو ہر لاش دبوچی جاتی ہے
آزاد وطن کو دیکھ ذرا

مَیں پل دو پل کا شاعر ہوں

مَیں پَل دو پل کا شاعر ہوں ، پل دو پل میری کہانی ہے
پَل دو پَل میری ہستی ہے ، پل دو پل میری جوانی ہے

مجھ سے پہلے کتنے شاعر آئے اور آکر چلے گئے
کچھ آہیں بھر کر لوٹ گئے ، کچھ نغمے گا کر چلے گئے

وہ بھی اِک پل کا قصہ تھے ، میں بھی اِک پل کا قصہ ہوں
کل تم سے جدا ہو جاؤں گا ، گو آج تمہارا حصہ ہوں

پل دو پل میں کچھ کہہ پایا ، اتنی ہی سعادت کافی ہے
پل دو پل تم نے مجھ کو سنا ، اتنی ہی عنایت کافی ہے

کل اور آئیں گے ، نغموں کی کھِلتی کلیاں چُننے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے ، تم سے بہتر سننے والے

ہر نسل اک فصل ہے دھرتی کی ، آج اُگتی ہے کل کٹتی ہے
جیون وہ مہنگی مدرا ہے ، جو قطرہ قطرہ بٹتی ہے

ساگر سے اُبھری لہروں میں ساگر میں پھر کھو جاؤں گا
مٹی کی روح کا سپنا ہوں ، مٹی میں پھر سو جاؤں گا

کل کوئی مجھ کو یاد کرے ، کیوں کوئی مجھ کو یاد کرے
مصروف زمانہ میرے لئے کیوں وقت اپنا برباد کرے

(نامکمل)

میں ہر اک پل کا شاعر ہوں
ہر اک پل میری کہانی ہے
ہر اک پل میری ہستی ہے
ہر اک پل میری جوانی ہے

رشتوں کا روپ بدلتا ہے، بنیادیں ختم نہیں ہوتیں
خوابوں اور امنگوں کی معیادیں ختم نہیں ہوتیں

اک پھول میں تیرا روپ بسا ۔ اک پھول میں میری جوانی ہے
اک چہرہ تیری نشانی ہے ۔ اک چہرہ میری نشانی ہے
میں ہر اک پل کا شاعر ہوں
ہر اک پل میری کہانی ہے

تجھ کو مجھ کو جیون امرت اب ان ہاتھوں سے پینا ہے
ان کی دھڑکن میں بسنا ہے ان کے سانسوں میں جینا ہے
تو اپنی دعائیں بخش انہیں، میں اپنی وفائیں دیتا ہوں
جو اپنے لئے سوچیں تھیں کبھی، وہ ساری دعائیں دیتا ہوں
میں ہر اک پل کا شاعر ہوں
ہر اک پل میری کہانی ہے

REGD. NO.
27847/75
FANN
AUR
SHAKHSIYAT
BOMBAY